میں اور یہ جہاں

(فن اور شخصیت پر مضامین و مقالات کا مجموعہ)



ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

Razi\Mera Sahib Sai Ishaq ha tu\Bismillah Final.jpg not found.

یہ جہاں اور میں

نجمہ شاہین کھوسہ

ضابطہ

نام کتاب	یہ جہاں اور میں
مرتب کنندہ	نجمہ شاہین کھوسہ
تاریخ اشاعت	یکم جنوری 2022
ناشر	عبدالحنان
پرنٹر	ناصر ظہیر (0300-6362756)
ٹائٹل	ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ
قیمت	1000 روپے
کتاب منگوانے کے لیے رابطہ	0300-6359941 0318-6780423
بذریعہ ڈاک خط و کتابت	73۔اے، جلیل آباد کالونی۔ملتان
	جان سرجیکل ہسپتال بلاک 48 ڈیرہ غازیخان
	0333-2401818

انتساب

صرف اور صرف اسکے نام جو
خاک کو شمس و قمر بنا دے

وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ

یہ رمز سکھائی عشق نے بس
راہوں میں نہیں دیوار پیا

کیوں آنکھ ترستی جلووں کو
جب ہر سو ترا دیدار کیا

مجھے سارے لفظ عطا کیجئے
کرنا ہے مجھے اظہار پیا

شکریہ جہاں والو!

ترتیب

منظوم ہدیہ تبریک

مضامین

تحقیقی مقالہ جات

شاعرہ جادو والی

اُس کی آنکھوں میں عجب چیز ہے جادو والی
لوگ کہتے ہیں جسے شاعرہ خوشبو والی

گنگ جذبوں کی زباں ہے گھنے ابرو والی
بھیگے موسم میں لچکتے قد و گیسو والی

اس کے ہر شعر میں احساس کی لو روشن ہے
اس کے ہر اشک میں تنویر ہے جگنو والی

منتظر دشت میں ہے اسکی ابھی چشمِ غزال
شاخِ زیتوں ہے، امر بیل ہے، مہ رُو والی

جاوید احسن

تاریخِ آئندہ، نجمہ شاہین کھوسہ

یہ مجموعہ ادب کی مستقل جاگیر ہو جائے
جو ہے ''تاریخِ آئندہ'' وہاں تحریر ہو جائے

مرا ہے نام نجمہ اور میں ''آنکھیں بند رکھتی ہوں''
مرے خوابوں کی دلکش اب کوئی تعبیر ہو جائے

بہت عمدہ ہیں یہ نظمیں، بہت دلکش ہیں یہ غزلیں
جو شخص اِن کو پڑھے، دل پر بہت تاثیر ہو جائے

عجب درد و الم کی کیفیت غزلوں میں ملتی ہے
نظر سے جس کی یہ گزریں، وہی دلگیر ہو جائے

یقیناً آج کے اردو ادب میں اک اضافہ ہے
ادب آئندہ، کا ہر شعر پر تعمیر ہو جائے

ثمر بانو صدارت کیلیے تشریف لائی ہیں
الٰہی وقت یہ، تاریخ میں تحریر ہو جائے

یہ نجمہ شاہین کھوسہ کی عجب تخلیق ہے مشتاق
جو لفظوں میں ہے پیدا دل میں وہ تنویر ہو جائے

مشتاق کھوکھر

سخن ورفورم کے زیرِ اہتمام ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کی تعارفی تقریب میں پڑھی گئی نظم

توشیحی نظم: ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (پاکستان)

ڈ۔ ڈگراحساس کی کھل جائے تو آگے قدم رکھوں
پھر اس کے بعد میں منزل کی سمتوں کا بھرم رکھوں

ا۔ ادب کی آبیاری فکرو فن کی آبیاری ہے
حقیقت میں یہ گلزار سخن کی آبیاری ہے

ک۔ کرشمات سخن کے جلوے دیکھے بند آنکھوں سے
کئی خوابوں کے ہم نے جلوے دیکھے بند آنکھوں سے

ٹ۔ ٹھر اے جذبہ ء دل یہ سخن کی ارجمندی ہے
نظر کے روبرو اب فکر شاہیں کی بلندی ہے

ر۔ رسائی ہے کہاں تک کون بتلائے تصور کی
حدیں آخر کون سمجھائے تصور کی

ن۔ نئے احساس کے حامل نئے ادراک کی حامل
ہے ایسی شاعرہ قدموں میں جس کی ہے نئی منزل

ج۔ جبین وقت پر مہتاب کی صورت منور ہے
تیرے اندر چمکتا اور دمکتا جو سخن ور ہے

م۔ محبت کے جہاں کوروشنی بخشی ہیشاہین نے
غزل ہو کر غزل کوزندگی بخشی ہیشاہیں نے

ہ۔ ہماری اور تمھاری زندگی کا ماحصل؛؛ فن،، ہے
کہانی فن، فسانہ فن ہے،احساس غزل فن ہے

ش۔ شعور ذات کا اظہار ہے یہ شاعری کیا ہے
حسیں جزبات کااظہار ہے یہ شاعری کیا ہے

ا۔ ادب میں با ادب ہونے سے اونچا نام ہوتا ہے
جو سچے کام کرتے ہیں تو سچا نام ہو تا ہے

ہ۔ ہزاروں خواہشیں مٹتی ہیں تب اک شعر ہوتا ہے
بھلا اتنی بھی آسانی سے کب اک شعر ہوتا ہے

ی۔ یہ لفظوں کے جواہر ہیں لٹاتی جا رہی ہو تم
سخن کی خوب فیاضی دکھاتی جارہی ہو تم

ن۔ نجم تقدیر کا نجمہ رہے گا ہر گھڑی روشن
دعا ہے یہ منور کی رہے تابندہ تیرا فن

ڈاکٹر منور احمد کانڈے

غزل سراپا غزل شاعرہ

نظر کی خیر ہو، یہ بجلیاں سلامت ہوں
تمہاری زلف کی سب بدلیاں سلامت ہوں

تمہارے ہاتھ تو چاہت کی داستانیں ہیں
یہ شعر لکھتی تری انگلیاں سلامت ہوں

جئیں ہزار برس سب، یہی دعائیں ہیں
کہ تیرے ساتھ ترے ہمرہاں سلامت ہوں

تمہارے ساتھ تمہارے شریر لہجے کی!
مری دعا ہے سبھی شوخیاں سلامت ہوں

تمہاری سالگرہ ہے سو دل سے کہتی ہوں
کہ تم سی لڑکیاں، سب تتلیاں سلامت ہوں.

ایمان قیصرانی

سالگرہ کی ڈھیروں ڈھیر مبارک اور دعاوں کی ساتھ میری یہ غزل سراپا غزل شاعرہ کو بطور ہدیہ قبول ہو۔

محبت کے اصولوں کا دفینہ

جو آنکھیں بند کر کے تو رقم کرتی فسانہ ہے
محبت کے اصولوں کا دفینہ ہے ،خزانہ ہے

جو آنکھیں کھول کر لکھو گے حیرت زمانے کو
کہیں گے لوگ فطرت کی امنگوں کا ترانہ ہے

غلام قادر بزدار

حسن مجسم ہی نہیں، خوشبو کا استعارہ ہے

تو صرف حسنِ مجسم ہی نہیں، خوشبو کا استعارہ ہے
صرف میں ہی نہیں، فدا تجھ پر شہر سارا ہے

رنگوں، پھولوں اور خوشبوؤں کی تو شاعرہ ہے
اسی بات پہ اپنا دل تجھ پہ ہارا ہے

مسیحائی ہے ایسی تیرے ہاتھوں میں فقط اے شاہیں!
جیسے تپتی دھوپ میں ہم پہ ابر برسا، سارا ہے

باہر دور سے جو اک ٹمٹماتا ستارہ ہے
پاس جاؤ، تو اک کہکشاں سب کا سہارا ہے

وہ صرف شاہین ہی نہیں، نجمہ بھی ہے اک جان کی
اسی لیے تو وہ سب کے دکھوں کا سہارا ہے

امتعہ ان جھیل سی آنکھوں میں جھانک کے تو دیکھ
خلوص، پیار، امید، آس کا وہ پیکر سارا ہے

کنیز ملک

شام کیوں ٹھہرتی ہے؟

رضی الدین رضی

ڈیرہ غازی خان کے نواح میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جسے بستی جندانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اسی بستی کی ایک بچی اپنی بہن کے ہمراہ بستی سے دور ایک سکول جایا کرتی تھی۔ایک چھوٹا سا سکول۔۔جیسے دورافتادہ بستیوں میں ہوتا ہے۔ایک روز اس بچی سے اس کی استانی نے پوچھا''تم بڑی ہوکر کیا بنوگی''۔بچی نے کسی توقف کے بغیر جواب دیا ''ڈاکٹر بنوں گی''۔استانی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ممکن ہے کلاس کی باقی لڑکیاں بھی ہنس پڑی ہوں اور یہ بات بھی ہنسنے کی ہی تو تھی۔ایک چھوٹی سی بستی کی بچی ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔اتنی چھوٹی سی بستی اتنی چھوٹی سی بچی اور اتنا بڑا خواب۔خوابوں پر اگرچہ کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی،سوچوں کو پابندِ سلاسل کرنا بھی ممکن نہیں۔لیکن معاشرے کا ایک رویہ ہے اور طے شدہ اصول بھی کہ خواب ہمیں اپنی حیثیت کے مطابق دیکھنا چاہیے۔کہاں میڈیکل کالج اور کہاں بستی جندانی سے دور ایک پرائمری سکول اور اس پرائمری سکول کی ایک بچی کہتی تھی کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔کوئی لڑکا یہ بات کرتا تو شاید اس کا مذاق نہ اڑایا جاتا۔اسے تھپکی بھی دی جاتی کہ لڑکے کیلئے تو بہت آسان ہوتا ڈاکٹر بننا۔وہ پرائمری کے بعد کسی قصبے یا شہر میں جا کر مڈل یا ہائی سکول میں داخلہ لیتا۔پھر کسی اور شہر میں جا کر ڈاکٹر بھی بن جاتا۔ لڑکوں کیلئے تو سب کچھ بہت آسان ہوتا ہے۔

استانی کی حیرت بھی غلط نہیں تھی۔وہ اس علاقے کی روایات سے واقف تھی۔وہ جانتی تھی کہ اس علاقے میں بیٹیوں کو پرائمری کے بعد گھر بٹھا دیا جاتا ہے اور دو چار سال بعد

بیاہ دیا جاتا ہے۔لڑکی کے خواب کیسے ہی کیوں نہ ہوں؟وہ کتنی ہی اعلیٰ تعلیم کیوں نہ حاصل کرنا چاہتی ہو؟قبائلی رسوم ورواج میں اُس کی خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔اور ہم قبائل ہی کو کیوں الزام دیں ماڈرن شہروں میں رہنے والے ہم جیسے نام نہاد ترقی پسند اور روشن خیال لوگ بھی تو عورت کے حوالے سے کم وبیش یہی رویہ رکھتے ہیں۔مذہب نے جب عورت کی گواہی آدھی اور وارثت میں اس کا حصہ ایک چوتھائی کر دیا تو مرد بھلا کیوں خاموش رہتا۔اس نے مذہب کا نام لے کر عورت کے رہے سہے حقوق بھی سلب کر لیے۔اور مذہب کا نام لینے کا تو تکلف ہی کیا گیا،عورت کا بھلا کونسا کوئی مذہب ہوتا ہے۔شادی سے پہلے وہ اپنے والدین کے اپنائے ہوئے مذہب یا فرقے کے مطابق زندگی گزارتی ہے اور شادی کے بعد اسے اپنے شوہر کے عقیدے کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں عقیدت اور عقیدے کی یہی تو اہمیت ہے۔بات دوسری جانب نکل گئی ذکر ہو رہا تھا اُس بچی کا جس نے اپنی استانی کے سامنے ڈاکٹر بننے کا خواب بیان کیا تھا۔استانی حیران تھی کہ بستی جندانی کی اس بچی کو یہ خواب دیکھنے کی جرأت کیسے ہوئی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک دیہاتی بچی نے یہ خواب دیکھنے کا حوصلہ اس لیے کیا کہ یہ خواب اسے اس کے والد نے دکھایا تھا اور بچی بھی جانتی تھی کہ جس نے اسے یہ خواب دکھایا ہے وہ اس کی تعبیر بھی ضرور لا کر دے گا۔

پھر ایک روز اسی بچی نے ریڈیو پر کوئی غزل سن کر اپنی کاپی میں نوٹ کر لی۔ہوم ورک یا کلاس ورک چیک کرتے ہوئے غزل پر استانی کی نظر پڑ گئی۔''ہائے میں مر جاؤں تم تو شاعری کرتی ہو''استانی تو جیسے بے ہوش ہوتے بچی۔''نہیں استانی جی یہ میری شاعری نہیں ہے میں نے تو ریڈیو پر کچھ سنا،مجھے اچھا لگا اور میں نے اسے کاپی پر لکھ لیا''۔لیکن یہ وضاحت بھی استانی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔بلکہ اس وضاحت میں ایک اور وضاحت طلب سوال یہ تھا کہ آخر اس لڑکی کو کسی اور کی شاعری بھی کیوں پسند آئی۔ہمارے ہاں تو اگر کوئی نوجوان لڑکا بھی شاعری کی طرف راغب ہو تو معاشرے اور خاندان میں خاصی ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ہمیں یاد ہے 1978ء میں جب ہمارے گھر والوں کو علم ہوا کہ ہم نے

شعر کہنا شروع کر دیئے ہیں تو ہمارے گھر میں بھی گویا صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔شاعری چونکہ لڑکے نے شروع کی تھی اس لیے سب نے صبر وشکر کیا اور خاموش ہوگئے۔لیکن معاملہ اگر لڑکی کا ہوا اور وہ بھی بستی جندانی کی لڑکی کا تو یہ نا قابلِ معافی ہو جاتا ہے۔لیکن اس وقت ابھی اس بچی نے شاعری شروع نہیں کی تھی۔

وہ بچی جب پیدا ہوئی تو اُس کے والد نے اُس کا نام نجمہ شاہین رکھا تھا۔یہ نام بلندی کی علامت ہے۔''نجمہ'' ایک چمکتا ستارہ اور''شاہین'' جو بہت بلندی پر پرواز کرتا ہے۔اس کے والد جان محمد کھوسہ نے یہ نام ممکن ہے لاشعوری طور پر ہی رکھا ہو لیکن آج نجمہ شاہین واقعی بلندی پر ہیں۔اور اس مقام تک پہنچنے میں بنیادی کردار ان کے والد کا ہی ہے کہ اس معاشرے میں کسی بھی عورت کو عملی زندگی میں آگے بڑھنے کیلئے مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ سہارا شادی سے پہلے اس کا باپ اور بھائی، شادی کے بعد اس کا شوہر بنتا ہے۔جن خواتین کو یہ سہارا میسر نہ ہو ان میں کتنی ہی صلاحیت کیوں نہ ہو وہ پرواز نہیں کرسکتیں۔نجمہ شاہین کو شادی سے پہلے اپنے والد جان محمد کھوسہ اور شادی کے بعد اپنے شوہر غلام فرید کھوسہ کا سہارا میسر آیا تو ان کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں دور ہو گئیں۔

پہلا مرحلہ ڈاکٹر بننے کا تھا۔نجمہ شاہین کھوسہ نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ ان کے والد انہیں ڈیرہ غازی خان کی ایک لیڈی ڈاکٹر کی مثال دیا کرتے تھے۔اس لیڈی ڈاکٹر کا نام ڈاکٹر ثریا نثار تھا۔آج سے کئی سال پہلے کے ڈیرہ غازی خان کو چشم تصور میں دیکھیں، اس زمانے میں ایک ہی خاتون ڈاکٹر وہاں کی خواتین کے زخموں پر مرہم رکھتی تھیں۔جان محمد کھوسہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی ڈاکٹر ثریا نثار کی طرح انسانیت کی خدمت کرے۔نجمہ شاہین 1991ء میں ملتان آئیں اور جب نشتر میڈیکل کالج سے انہوں نے 1996ء میں ایم بی بی ایس کیا تو ان کی اپنی ہی نہیں ان کے والد کی خوشی بھی دیدنی تھی۔بستی جندانی سے دور پرائمری سکول میں اپنی استانی کو اپنا خواب بتانے والی بچی اب ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بن چکی تھی۔آج وہ ڈیرہ غازی خان میں اپنا ہسپتال چلا رہی ہیں اور

سرائیکی وسیب کے طول وعرض سے آنے والی خواتین کے زخموں پر مرہم رکھتی ہیں۔

شاعری کا سفر بعد میں شروع ہوا۔جب بچی نے سکول کی ایک کاپی پر ریڈیو سے کوئی گیت یا غزل نقل کی تھی تو اس وقت اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ کبھی اس نے بھی ایسی ہی غزلیں کہنی ہیں۔لیکن یہ عمل بتاتا ہے کہ شاعری اس کے لاشعور میں کہیں اس وقت بھی موجود تھی۔شعری سفر اس نے اس وقت شروع کیا جب وہ ڈاکٹر بن چکی تھی۔وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔روز وشب معمول کے مطابق بسر ہو رہے تھے۔موسم تبدیل ہوتے، شاموں صبحوں اور صبحیں شاموں میں بدلتی تھیں۔ایسے میں ایک شام دبے پاؤں آئی اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے جیون میں ٹھہر گئی۔ملتان میں ہی اپنے قیام کے آخری دنوں کی ایک شام ان کے شعری سفر کا آغاز بنی۔شام دلفریب بھی ہوتی ہے اور دل فگار بھی۔یہ دن ڈھلنے کا استعارہ بھی ہے اور وصل کا پیغام بھی۔ہاں یہ شام اگر جیون میں ٹھہر جائے تو آنکھوں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے اور اداسی چہرے پر تحریر ہوتی ہے۔کوئی منظر، کوئی لمحہ، کوئی ساعت ایسی ضرور ہوتی ہے کہ جو ہمارے جیون اور ہماری روح میں بسیرا کرتی ہے۔یہ ساعت کوئی صبح بھی ہوسکتی ہے اور کوئی شام بھی، کوئی مسکراتا لمحہ بھی اور کوئی اشک بہاتا موسم بھی۔لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہوتی ہے کہ موسم، لمحے یا ساعتیں جیون میں نہیں ٹھہرتیں ہم خود ہمیشہ کیلئے کسی موسم، کسی لمحے یا کسی ساعت میں ٹھہر جاتے ہیں۔جیسے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک شام میں خود ٹھہر گئیں اور اب کہتی ہیں''اور شام ٹھہر گئی''۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے تیسرے شعری مجموعے کو''اور شام ٹھہر گئی'' کا عنوان دیا تو شام کو ایک نئی معنویت مل گئی۔یہ عنوان ان کی ذات سے بالاتر ہو کر پورے معاشرے کا منظر نامہ بن گیا ہے۔ہم جس معاشرے میں سانس لیتے ہیں، جس ماحول میں بظاہر زندہ ہیں وہاں ہم سب کی زندگیوں میں شام ٹھہر چکی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں بہت سی سچائیاں ہیں اور بہت سی تلخیاں۔وہ تمام تلخیاں اور سچائیاں جو ہمارے گرد وپیش میں موجود ہیں۔بہت کچھ انہوں نے کہہ دیا اور بہت کچھ ان کہا رہنے دیا۔یہ

کتاب سرائیکی وسیب کی خواتین کی زندگیوں سے وابستہ شام کی کہانی ہے۔ وہ شام جوان کے جیون میں ٹھہر گئی یا جس شام میں انہیں ہمیشہ کیلئے مقید کر دیا گیا۔ ایک شامِ غریباں ہے جو اب صرف شام کے بازاروں اور درباروں سے ہی وابستہ نہیں اس دھرتی کی ہر گلی، ہر کوچے اور ہر بستی میں برپا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی اس کتاب میں ہمیں ان کے ذاتی دکھ اجتماعی دکھوں سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں اور یہی اچھے شاعر کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنے دکھوں کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہنے دیتا۔ اگر ان کے شعر، ان کی غزلیں اور ان کی نظمیں ہر خاص و عام میں پسند کی جاتی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ ان کے جذبوں کی سچائی ہے۔ بات دل سے نکلتی ہے تو پھر دلوں پر دستک بھی ضرور دیتی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں ہمیں ایک خاص اداسی دکھائی دیتی ہے جو قاری کو اپنے حصار میں لیتی ہے۔

آج ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ تین شعری مجموعوں کی خالق ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' اور دوسری ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ ہر مرتبہ ہمیں وہ آگے کا سفر طے کرتی دکھائی دیں۔ وہ استانی جس نے ان کی ڈائری میں غزلیں دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا تھا اب کہاں اور کس حال میں ہیں یہ تو کسی کو معلوم نہیں لیکن ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اب ڈیرہ غازی خان ہی اپنے پورے وسیب کی پہچان بن چکی ہیں، مان بن چکی ہیں۔ ایک مسیحا کی حیثیت سے بھی اور ایک شاعر کے طور پر بھی۔ وہ دن رات مسیحا بن کر خواتین کے زخموں پر مرہم رکھتی ہیں۔ ان کے دکھ سنتی ہیں اور ان دکھوں کا مداوا بھی کرتی ہیں۔ پھر انہی دکھوں کو قرطاس پر رقم کر دیتی ہیں۔ ان کی شاعری عورت کے دکھوں کی کہانی ہے۔ وہ عورت جس کے قدموں کے نیچے جنت ضرور ہے لیکن اس تنگ نظر معاشرے کا مرد اسے اپنے پاؤں کی جوتی سمجھنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ وہ عورت جسے تیزاب پھینک کر قتل کیا جاتا ہے، جسے مرد کی غیرت کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اور جسے قرآن کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اب ان تمام خواتین کی آواز ہیں۔

وہ ایک باوقار، مہذب اور شائستہ خاتون ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ عورت

اپنے تقدس کو برقرار رکھتے ہوئے بھی وہ سب کچھ حاصل کر سکتی ہے جس کے حصول کیلئے بعض خواتین سبھی کچھ داؤ پر لگا دیتی ہیں۔ وہ ایک مثال ہیں ان سینکڑوں ہزاروں لڑکیوں کے لئے اور ان کے والدین کیلئے جنہیں کسی انجانے خوف اور اندیشے کے باعث تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ والدین جب اپنی بیٹیوں پر اعتماد کرتے ہیں تو بیٹیاں بھی ان کے اعتماد پر پورا اترتی ہیں اور ان کے وقار کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دیتیں۔ انہیں اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے شاعری کیلئے بہت کم وقت ملتا ہے لیکن اس کم وقت میں بھی انہوں نے جس تیزی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کیے وہ قابل ستائش ہیں۔ ان کے پاس نثر میں بھی بہت کچھ موجود ہے۔ بہت سی تحریریں اور بہت سی ڈائریاں جوان کے نثر پاروں سے بھری ہوئی ہیں ابھی اشاعت کی منتظر ہیں۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ان کی نثر بھی جلد منظر عام پر آئیگی اور وہ اسی ثابت قدمی، لگن اور وقار کے ساتھ یہ ادبی سفر جاری رکھیں گی۔ اور ان کی تقلید میں دور افتادہ بستیوں کی اور بہت سی لڑکیوں کو بھی پرواز کا حوصلہ ملے گا اور جب بستیوں کی لڑکیوں میں حوصلہ آئے گا تو معاشرے سے بہت سی پستیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

نجمہ شاہین کی شاعری۔لاحاصلی کے دکھ اور سرشاری

رضی الدین رضی

جس معاشرے میں غربت اور بے روزگاری اس حد تک بڑھ جائے کہ لوگ موت میں زندگی تلاش کرنے لگیں ،جس معاشرے میں ہر طرف ظلم کا راج ہو، جہاں خودکش دھماکے اور ٹارگٹ کلنگ فیشن کی صورت اختیار کرگئی ہو۔۔ جہاں لہو میں لتھڑے لوگ اور ان کے بکھرے ہوئے اعضا ذہنوں کو ماؤف اور اعصاب کو شل کر رہے ہوں، جہاں منصف مجرم دکھائی دینے لگیں ،حکمران غلام نظر آئیں اور جس معاشرے میں بدصرتیوں کو حسن قرار دیا جانے لگے اس معاشرے میں سانس لینے والی شاعرہ اگر اپنی آنکھیں بند رکھنے کا اعلان کرتی ہے تو ہمیں اس پر حیران نہیں ہونا چاہئے ۔ہمیں سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ یہ معاشرہ آخر کس نہج پر پہنچ چکا ہے کہ یہاں وہ آنکھیں جنہیں نعمت قرار دیا جاتا تھا سوچنے سمجھنے اور فکر کرنے والوں کے لئے بوجھ بنتی جارہی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آنکھوں کو دنیا کی سب سے بڑی نومت قرار دیا جاتا ہے۔ ہم ان آنکھوں سے خوبصورت مناظر دیکھتے ہیں، اپنے پیاروں کو تکتے ہیں اور ان کے جدا ہو جانے کے بعد انھی آنکھوں سے ان کے ہجر میں اشک بھی بہاتے ہیں ۔لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ یہی آنکھیں ہمیں وہ بہت سے مناظر بھی دکھاتی ہیں جنہیں ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔کسی نے بصارت سے محرومی پر ایک بار کہا تھا اور درست کہا تھا کہ بصارت سے محرومی نے مجھے بہت سی خوبصورتیوں سے محروم تو کر دیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجھے اس کے نتیجے میں کئی بدصورتیوں سے بھی نجات مل گئی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی کتاب ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میرے سامنے آئی تو میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعے کا یہ چونکا دینے والا نام کیوں رکھا ہے ؟اس کی فوری توجیہ دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔ایک تو وہی کہ جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین اپنے گرد و پیش کے بدنما مناظر کو نہیں دیکھنا چاہتیں۔وہ اپنی آنکھوں کے رستے مزید دکھوں کو اپنے دل تک نہیں پہنچانا چاہتیں۔وہ اپنی آنکھوں کو ان دکھوں سے مزید اشک بار نہیں کرنا چاہتیں اور اسی لئے آنکھیں بند رکھنے کا اعلان کرتی ہیں۔یہاں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ کیا وہ ان بدصورتیوں سے فرار چاہتی ہیں؟ کیا وہ دکھوں سے فرار چاہتی ہیں اور کیا وہ حوصلہ ہار چکی ہیں؟ ہم ان شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں ایسے بہت سے بدنما مناظر وہاں بھی
دکھائی دیتے ہیں لیکن وہاں وہ ان مناظر کو دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کرتیں بلکہ ان منظروں کو اپنی شاعری کا حصہ بناتی ہیں۔

ہے عجب رُت یہ میرے گلشن میں
لے کے دامن میں جو لہو آئی

اور پھر یہ اشعار دیکھئے

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو
زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے

تم ستم گر ہو نہ گھبراؤ مری حالت پر
زخم سہنے کا ابھی مجھ میں ہنر باقی ہے

زخم سہنے کا ہنر اگر ابھی ان کے پاس موجود ہے تو پھر انہوں نے آنکھیں بند رکھنے کا اعلان کیوں کیا ؟اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اس عنوان کو ایک اور زاویے سے دیکھنا اور ان کی شاعری کو سمجھنا ہوگا۔

دوسرا زاویہ یہ ہے کہ آنکھیں صرف بدصورتیوں سے نظریں چرانے کیلئے بند نہیں کی جاتیں بسا اوقات ہمیں خوبصورتیوں کی تلاش بھی آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں۔وہ خوبصورتیاں جو ہمارے گردوپیش میں تو موجود نہیں ہوتیں لیکن ہمارے دل کے نہاں خانے میں ضرور ہوتی ہیں۔ہم ان خوبصورتیوں کو مجسم کرنے کیلئے آنکھیں بند کرتے ہیں اور وہ سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہمیں میسر نہیں ہوتا۔کوئی ناممکن رفاقت ،کوئی مکالمہ اور کوئی وصال ۔۔ یہ سب بسا اوقات بلکہ اکثر اوقات کھلی آنکھوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔اس کیلئے آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں اور جب ہم آنکھیں بند کرتے ہیں تو چشمِ تصور وا ہو جاتی ہے۔پھر ہم اپنی مرضی کی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ایک ایسی دنیا میں جو ناممکن نہیں ہوتی، ایک ایسی دنیا جسے خوابوں کی دنیا بھی کہا جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا جو شاعر اپنی قوتِ متخیلہ کے زور سے آباد کرتا ہے۔خوابوں کی دنیا میں رہنا ہمیں اس لئے بھی اچھا لگتا ہے کہ خواب ہمیں جینے کا حوصلہ دیتے ۔ہمیں ہماری محرومیوں سے نجات دلاتے ہیں۔وہ سب کچھ جو ہم حقیقی زندگی میں حاصل نہیں کر پاتے خوابوں کے ذریعےحاصل کرتے ہیں۔روز ٹوٹتے ہیں ۔روز بکھرتے ہیں اور نئے حوصلے کیساتھ نئے خواب کی خواہش میں آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' ڈاکٹر نجمہ کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے۔ان کی پہلی کتاب ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' 2007ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔یہ دونوں کتابیں ان لمحوں کی کہانی بیان کرتی ہیں جن کے بارے میں نجمہ شاہین خود لکھتی ہیں کہ ''وہ لمحے جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں مگر وہی
لمحے اثاثہ ہوتے ہیں''۔یہ لاحاصل عشق کی کہانی ہے اور لاحاصلی ہی عشق کا حاصل ہوتی ہے کہ عشق اگر حاصل ہو جائے تو وہ عشق نہیں رہتا ہوس بن جاتا۔عشق میں رائیگانی کی دولت کمانے والے اسی سرشاری میں جیون بِتاتے ہیں کہ انہوں نے عشق کو عشق ہی رکھا ہوس نہیں بننے دیا۔اس سرشاری میں رہنے والوں کو اس کی قیمت بھی چکانا پڑتی ہے کہ یہ سرشاری ان کی روح کو گھائل کرتی ہے اور ان کا وجود ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔رائیگانی

کی یہ دولت آنکھوں میں رتجگوں کو امر کرتی ہے،خوبصورت چہروں پر اداسی رقم کرتی ہے،دلوں کو دکھوں سے آباد کرتی ہے اور پھر ایسے لوگوں کو زمانے میں محترم بنا دیتی ہے۔

یہ عشق کی لاحاصلی کا ہی اعجاز ہے کہ آج ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی شاعری کے ذریعے معتبر قرار پائی ہیں۔ورنہ تو وہ بہت اچھی ڈاکٹر ہونے کے باوجود ایک عام سی خاتون ہوتیں۔ان ہزاروں لاکھوں خواتین میں سے ایک جو ہمارے معاشرے میں صرف چولہا جلانے یا شوہروں کے مظالم سہنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔نجمہ شاہین نے اپنے دکھ کو شعر کی زبان دی ہے۔ان کی شاعری ان کے ریزہ ریزہ خوابوں کی کہانی ہے۔ان کی غزلوں اور نثری نظموں کے اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی جذبوں کی یہ وہ شدت ہے جسے وہ فن پر قربان نہیں ہونے دیتیں۔خاص طور پر نظموں میں جذبوں کی یہ شدت ہمیں نمایاں نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنے دکھوں کو اس خوبصورتی کے ساتھ کاغذ کی زینت بنایا کہ وہ ہمیں اپنے دکھ محسوس ہونے لگتے ہیں۔اور یہی فنکار کا اصل ہنر ہوتا ہے کہ وہ اپنے دکھوں کو قاری کے دکھوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی یہ کتاب ایک احتجاج ہے اس معاشرے کی ناانصافیوں ،رسوم ورواج اور مظالم کے خلاف۔۔انہوں نے آنکھیں بند رکھنے کا اعلان کر کے ایک طرف ان بدصورتیوں سے نظریں چرائیں تو دوسری جانب اس خوبصورت معاشرے کا عکس تلاش کرنے کی کوشش بھی کی جو سرِ دست ہمارے اور آپ کے خوابوں میں ہی موجود ہے۔دعا ہے کہ ہم سب کو ان خوابوں کی تعبیر حاصل ہو اور ان بدصورتیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے جن کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے آنکھیں بند رکھنے کا اعلان کیا ہے۔اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ بدصورتیوں سے نجات کے لئے صرف آنکھیں بند کرنا کافی نہ ہوگا۔ہمیں آنکھوں کے ساتھ ساتھ اپنے کان بھی بند رکھنا ہوں گے کہ بقول شاعر'' کان ہوں گے تو مجھے شور سنائی دے گا''

ہجر اور بلندی کا استعارہ

رضی الدین رضی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نئے شعری مجموعے نے مجھے حیران کیا ہے۔ حیرت کے کچھ سامان تو ان کی گزشتہ کتابوں میں بھی موجود تھے لیکن وہ اپنے شعری سفر میں جس ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اس کا مکمل عکس ان کی نئی کتاب میں موجود ہے۔ ''پھول سے بچھڑی خوشبو' ان کی پہلی کتاب تھی جسے ہم نے سرسری انداز میں دیکھا اور اس پر توجہ نہ دی۔ ویسے بھی وہ ان کی ابتدائی شاعری تھی اور ہمارا خیال تھا کہ وہ شاید اپنے شعری ذوق کی تسکین کے لیے اپنی کچھ نظمیں اور غزلیں کتابی صورت میں منظر عام پر لائی ہیں اور جیسے اور بہت سے لوگ اپنی پہلی کتاب شائع کروانے کے بعد منظر سے غائب ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر نجمہ شاہین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اپنا دوسرا شعری مجموعہ سامنے لے آئیں۔ پہلی کتاب کے مقابلے میں دوسری کتاب زیادہ مربوط تھی اور اس میں شعری حسن بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ تیسری کتاب اس سے آگے کا سفر تھا اور اس دوران ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بھی ان کی شرکت تواتر کے ساتھ شروع ہو چکی تھی۔ تیسری کتاب سامنے آنے کے بعد ناقدین اور معاصرین نے تمام تر حسد کے باوجود ان کی شاعری پر توجہ دی اور انہیں غور سے پڑھا لیکن اس کے باوجود یہ بحث جاری رہی کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث شاعری پر بھرپور توجہ نہیں دے سکیں گی۔ نئی کتاب میں ہمیں ان کا ہنر پہلی تمام کتابوں کے مقابلے میں زیادہ بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ غزلوں اور خاص طور پر نظموں میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے نئے رنگ سامنے آئے ہیں۔

کسی بھی شاعر کے فن کو پرکھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کا ادبی سفر کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض شاعر ابتدائی کتابوں میں بہت مضبوط اور منجھے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن بعد کے دنوں میں ان کے ہاں وہ شاعرانہ مہارت کم دکھائی دیتی ہے یا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک حقیقی قلمکار کی طرح ہمیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بتدریج اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتی دکھائی دے رہی ہیں۔ ان کی پہلی کتاب اگر ان کی نثری نظموں اور غزل کے رنگ میں بیان کئے گئے احساسات کا مجموعہ تھی تو دوسری کتاب میں ان کی شاعری فنی اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر نظر آئی لیکن پھر بھی بعض مقامات پر اور خاص طور پر ہمیں نظموں میں وہ روانی نہ ملی جو اگلے مرحلے میں ان کی تیسری اور اب چوتھی کتاب میں پڑھنے کو مل رہی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ان تمام شعری مجموعوں میں مضامین احساسات اور جذبوں کی کہانی ایک سی ہے۔ وہی دکھ اور نارسائی کا کرب جو ہمیں پہلی کتاب میں دکھائی دیتا ہے تسلسل کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے ایک ہی جست میں منزل تک پہنچنے کی بجائے دھیرے دھیرے اپنے خیال کا سفر جاری رکھا ہے۔

''پھول خوشبو اور تارہ'' ہجر کا استعارہ ہے۔ ہجر جو زندگی بھی ہے اور موت بھی۔ ہجر جو روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی۔ ہجر جو بے سکون بھی کرتا ہے اور اطمینان بھی بخشتا ہے۔ یہی بندگی ہے اور یہی زندگی ہے۔ یہی تشنگی ہے اور یہی آسودگی۔ یہی خواب ہے اور یہی سراب۔ یہی حقیقت ہے اور یہی گمان۔ اور جب ہجر آپ کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے تو پھر حقیقت اور گمان کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور ہجر ہی آپ کی پہچان بن جاتا ہے جیسے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی پہچان بن گیا۔ ہجر کا استعارہ ہمیں ان کی تمام کتابوں میں کسی نہ کسی انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ نسائی جذبے ہمیں جس انداز میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں پڑھنے کو ملے وہ اس خطے کی کسی اور خاتون کی شاعری میں موجود نہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین نے دکھوں کو اپنی اظہار کی قوت میں تبدیل کیا اور نارسائی کے ذریعے اس منزل تک رسائی

حاصل کی جو ہر شاعر کا خواب ہوتا ہے۔ہجران کی شاعری میں ہمیشہ نئے زاویوں کے ساتھ پڑھنے کو ملتا ہے۔ کہیں کہیں ان کے ہاں تصوف کا وہ رنگ بھی دکھائی دیتا ہے جہاں وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی جانب سفر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔زیرِ مطالعہ کتاب کی بہت سی نظموں میں ہمیں اس کیفیت کا بھرپور اظہار یہ دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے اگر اس کتاب میں پھول اور خوشبو کے ساتھ تارہ بھی جوڑا تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کی نظر آسمان کی طرف ہے اور وہ بندگی کے سفر میں بلندیوں تک پہنچنا چاہتی ہیں۔وہ شاعری میں بھی اسی رکھ رکھاؤ اور سلیقے کو مدنظر رکھتی ہیں جو مشرقی خاتون کا خاصا ہے۔ہر شعر اور مصرعے میں وہ مکمل بات بھی کہتی ہیں اور وقار، متانت اور تمکنت کو بھی برقرار رکھتی ہیں۔خواتین کے ہاں جذبوں اور نارسائی کا اظہار بسا اوقات اس حد تک واشگاف ہوتا ہے کہ وہ بے باکی کے زمرے میں آجاتا ہے۔آج ملک بھر اور خاص طور پر سرائیکی علاقے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو اگر عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جذبوں اور نارسائی کو بہت سلیقے کے ساتھ اور شاعرانہ حسن کے ساتھ بیان کیا اور یہاں وہ عورت کے دکھوں کی ترجمان بھی بنیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی گزشتہ کتابوں کے مقابلے میں زیرِنظر کتاب

ناقدین کی زیادہ توجہ حاصل کرے گی اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری ان کے لیے صرف ہجر ہی نہیں بلندیوں کا استعارہ بھی ثابت ہوگی۔

برسوں کی تپسیا

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

آج اگر ڈیرہ غازیخان کے ادب کا تذکرہ ہو تو سب سے نمایاں نام جو ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا ہے۔ یہ نام، مقام اور عزت ایسے ہی کوئی جھولی میں ڈال کر نہیں چلا جاتا۔اس کے لیے برسوں کی تپسیا چاہیے ہوتی ہے۔خداداد صلاحیت کے ساتھ ساتھ محنت اور ریاضت کام آتی تو دن بھر کے الام غمگین شام اور جگراتے بھی حصے میں آتے ہیں جو لفظ لفظ بن کر قطار اندر قطار آپ کے اندر اترتے اور سماتے ہیں تو بیرونی دنیا کے ساتھ ساتھ اندرونی دنیا سے بھی کبھی ہم آہنگ اور کبھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

ادب کی آبیاری کے لیے سازگار ماحول بہت ضروری ہوتا ہے مگر محض یہی ایک عمل ہی درکار ہوتا تو پھر سوچیں صحرا میں بھی تو پھول اگتے ہیں۔ ریتلے میدانوں میں جہاں زمین پانی کو ترستی ہے وہاں تربوز اگتے ہیں تو نجانے ان کے اندر اتنا پانی ہاں سے آجاتا ہے۔کیا یہ قدرت کی عطا نہیں ہے؟ اور یقیناً یہی قدرت کی عطا ادب کی روشنی بن کر نجمہ شاہین کھوسہ کے دل میں اتر گئی۔سخت گیر بلوچ قوم کے ہاں ایسی لڑکی کا پیدا ہونا کسی معجزہ سے کم نہیں ہے کہ جس کے اندر سے ادب کے ابلتے ہوئے چشمے کے پانیوں کی چمک اور بہاؤ نے قبیلے کے دل بھی نرم کر دیئے۔ جندانی کے سکول میں پڑھنے والی نجمہ شاہین کھوسہ کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اس کے والد محترم جان محمد کھوسہ نے اسے ڈیرہ غازیخان کے سکول میں داخل کروادیا اور یہی ایک ایسا قدم اٹھایا گیا کہ پھر نجمہ شاہین کھوسہ کے قدم کسی ایک منزل پہ نہ رکے۔تبھی تو وہ خود جب اپنی پوری زندگی پر مڑ کر نظر پھیری ہے تو بے ساختہ

کہہ اٹھتی ہے۔

؎ دنیا کا سہارا نہ محبت کا سہارا
مجھ کو ہے مرے بابا کی شفقت کا سہارا

اس کا یہ سفر ڈیرہ غازی خان سے شروع ہو کر ملتان جا پہنچتا ہے جہاں وہ مسیحائی کی تعلیم حاصل کرنے نشتر میڈیکل کالج پہنچتی ہے اور پھر شفاء بانٹنے واپس اپنی نگری ڈیرہ غازیخان آ ٹھہرتی ہے۔ تاہم اس کے اندر کی شاعرہ آخر کار کسمساتی ہوئی اس کے وجود سے باہر نکل آتی ہے۔ ایسا ہونے میں دیر کیوں لگی، کسی نے پوچھا تو وہ بولی:

''ہمارے قبیلے میں شاعری تو کجا پڑھنا لکھنا بھی لڑکی کے لیے شجر ممنوعہ تھا۔ اس لیے میرے اندر کی لڑکی کو شاعرہ کا روپ دھارنے میں بہت وقت لگا۔''

شاعرہ کا پہلا روپ ایک نظم 'ملاقات آخری' کی شکل میں 1996ء میں سامنے آیا وہ خود کہتی ہیں:

''2007ء میں گائنی کانفرنس میں جاتے ہوئے میں ایک حادثے کا شکار ہوئی اور دو ماہ تک مکمل طور پر بستر کا حصہ بن گئی۔ ایک مصروف بندے کے لیے فراغت کسی سزا سے کم نہیں ہوتی۔ سو میں نے ان دو ماہ میں اپنی ڈائری ترتیب دی اور اس میں نثر اور شاعری علیحدہ علیحدہ کی۔ سرائیکی کے ایک بزرگ شاعر چاچا رمضان طالب باقاعدہ میری عیادت کو آتے تھے۔ انہوں نے ضد کر کے اور میری فیملی سے اجازت لے کر میری شاعری والے حصے ایک کتابی صورت میں شائع کرائے جس کا نام میں نے اپنی نظم ''پھول سے بچھڑی خوشبو' سے لیا یوں ایک ڈاکٹر ایک شاعرہ کے روپ میں سامنے آئی۔''

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی یہ ریاضت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ جو سچا ادیب اور شاعر ہوتا ہے وہ جتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو ادب اُس کے اندر ابلتا رہتا ہے اور

سینہ چیر کر باہر آنا چاہتا ہے اور جب تک اسے ادیب یا شاعر صفحہ قرطاس پر منتقل نہ کرے وہ اس انسان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ سو دن رات کو مریضوں کی بے انتہا مصروفیت کے باوجود اب تک ان کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ا۔ پھول سے بچھڑی خوشبو 2007ء
۲۔ میں آنکھیں بند رکھتی ہوں 2010ء
۳۔ اور شام ٹھہر گئی 2013
۴۔ پھول خوشبو اور تارہ 2016ء

ہمیں ان کی موخر الذکر کردہ کتابوں ''اور شام ٹھہر گئی'' اور ''پھول، خوشبو اور تارہ'' کی تقاریب رونمائی میں شرکت کرنے اور اظہار خیال کرنے کا موقعہ ملا ہے جہاں ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ محبت کو وارفتگی کے ساتھ ان کے اشعار سے بے حد متاثر ہین۔ یقیناً جس کلام میں شاعر کا اپنا جذبہ جنون، شوق، لہو، ریاضت اور محبت شامل ہو وہ قاری کے دل میں کیوں نہ گھر کرے گا۔

ادبی دنیا میں ان کا اگلا پڑاؤ ''میرا صاحب سائیں۔۔۔ عشق ہے تو'' اس نئ کتاب کا کلام ہمیں گاہے بگاہے سننے اور دیکھنے کو ملا ہے۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ کلام شاعر بزبان شاعر سننے کا اعزاز بھی حاصل ہوا ہے۔ جہاں ان کے کلام میں درد کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ وہاں اس میں پختگی بھی آتی جا رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کا پہلا پڑاؤ عشق مجازی میں ہوتا ہے۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ اب ان کی سوچوں کا قافلہ عشق حقیقی کی طرف رواں دواں ہے۔ وہ اب پہلی چار منزلیں طے کر کے پانچویں منزل پر قدم رکھتے ہوئے عارفانہ کائنات کے حصار میں داخل ہو چکی ہیں۔ یہ بھی رب تعالیٰ کی بہت بڑی دین ہے۔ ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ ایک ہی غزل سے آگے نہیں بڑھ سکے گو دنیاوی طور پر وہ حجم کے حساب سے کافی اشعار کہہ چکے ہوتے ہیں مگر کئی کتابیں آنے کے بعد بھی یوں لگتا ہے کہ وہ اسی مقام پہ کھڑے ہیں جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ دکھ اور آلام کی بھٹی میں

جل کر عشق کی منازل طے کر رہی ہیں جیسا کہ ان کی شاعری سے عیاں ہے۔
حضور پاکؐ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

میری اجڑی لمبی رات سئیں
کب بدلیں گے حالات سئیں

کردے سفینہ پار وے سائیں
بس تو ہی درکار وے سائیاں

شاہیں نبیؐ کے دم سے مجھ کو ہوئی عطا
مرتے ہوئے وجود میں جینے کی روشنی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے اس سفر کو مدنظر رکھیئے اور ان کے کلام 'جوڑ دے سائیاں' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ ان کے کلام میں کس قدر گہرائی ہے۔

ریزہ ریزہ ٹوٹ رہی ہوں اب تو مجھ کو جوڑ دے سائیاں
رنج اور غم کا یہ کاسہ اب اپنے کرم سے توڑ دے سائیاں

میرے اندر مر گیا کوئی درد سمندر بھر گیا کوئی
ڈوبنے والی جیون کشتی، رخ ساحل ول موڑ دے سائیاں

اور اشعار دیکھیں:

میں تو آس تھی میں تو پیاس تھی کسی پور کی میں باس تھی
میری پتیاں گریں جابجا انہیں شاخ پر تو سجا پیا

یہ جو من میں ہے روشنی یہی زندگی یہی بندگی
میری فکر میں تیرے ذکر میں جو چراغ ہیں وہ جلا پیا

اس میں عاجزی کے ساتھ درد ہے، سوز ہے، التجاء ہے، گزارش ہے، بکھری ہوئی ہستی کو سمیٹنے کی بات ہے، من کے چراغ میں روشنی عطا کرنے کی استدعا ہے۔ یہ کس قدر دل کو چھو لینے والے اشعار ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اور محبوب کی بارگاہ میں ماتھا ٹیک دیا ہے۔

یہی روشنی اور یہی خوشبو ان کی غزل کے اس مطلع میں دکھائی دیتی ہے اور فضا کو معطر کرتی ہے۔

عشق کو آنکھ میں جلتے دیکھا
پھول کو آنکھ میں کھلتے دیکھا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں شام کا استعارہ بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شام کا یہ منظر ان کی ادراک کے کئی در وا کرتا ہے۔ ان کی ذات پہ بہت سی چیزیں منکشف ہوتی ہیں اور ایسی واردات قلبی سے انہیں گزرنا پڑتا ہے۔ لفظ خود بخود ان کے قلم سے ٹپ ٹپ گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کی تو ایک کتاب کا نام بھی ''اور شام ٹھہر گئی'' ہے۔ یہاں وہ لکھتی ہیں:

الم کی شام آ گئی لو میرے نام آ گئی
چراغ لے کے راہ میں اے کاش مہرباں ملے

لگتا ہے انہیں مہربان کی تلاش ہے اور ابھی یہ محض کی حسرت کی صورت میں ان کے وجود میں اور ان کے رگ و پے میں دوڑ رہی ہے۔

زمیں ملے کہیں ہمیں کہیں تو آسماں ملے
دکھوں کی دھوپ میں شجر کوئی تو مہرباں ملے

تو نہیں جان جاں پھر یہ جہاں کچھ بھی نہیں
جز تیرے رنگینی کون و مکاں کچھ بھی نہیں

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لوں لوں درد میں جکڑا ہوا ہے

آنکھوں میں لیے درد کا طوفاں کھڑی ہوں
اے عشق تیرے در پہ میں حیراں کھڑی ہوں

خود سے ہی اگر میری شناسائی نہیں ہے
میں اپنے ہی گھر میں کیوں بھلا مہماں کھڑی ہوں

انسان کو اگر درد کا درماں نصیب نہ ہو تو اسے یہ جہاں، یہ جگہ، یہ کون ومکاں یہ گھر بے معنی لگتا ہے۔ اسے یہ سب کچھ بیکار دکھائی دیتا ہے یہاں تک کہ اپنا وجود بھی تبھی تو وہ اپنے ہی گھر میں کیوں مہمان کھڑی ہوں جیسا سوال آسمان کی طرف اچھال رہی ہیں۔

کبھی کبھار وہ اپنی ساری قوتیں مجتمع کر کے کہہ اٹھتی ہیں:

حوصلوں کی بات ہے ریگ رواں کچھ بھی نہیں
ہو جلو میں عزم تو کوہ گراں کچھ بھی نہیں

مگر عشق کا کوہ گراں سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ یہ بوجھ اٹھانا تو بالکل سہل نہیں۔ اس میدان میں اترنا پڑتا ہے تو پھر سے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کہہ اُٹھتی ہیں:

پھر کار گاہ عشق میں لایا گیا مجھے
پھر زندگی کا خواب دکھایا گیا مجھے

تب وہ درد سے کراہتے ہوئے کہتی ہیں:

درد کا بوجھ ترے شہر سے لائے ہوئے لوگ
اب کہاں جائیں یہ زخموں کو سجائے ہوئے لوگ

تکلیف کی شدت انہیں یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے:

آنکھوں میں پھر سے خواب ہوں دلدار معذرت
سرکار معذرت مرے سرکار معذرت

یہی درد کا احساس ان کی نظم میں بھی نظر آتا ہے:

تاہم یہ بھی ہے جہاں پہ بھی ظلم وستم ہوتا نظر آئے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ چاہے وہ فلسطین میں ہونے والے ظلم وستم کی داستان ہو یا پھر سانحہ آرمی پبلک سکول ہو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں اور اور ان موضوعات پہ بھی اپنے متاثر کن اشعار میں دکھ کا اظہار کیا ہے:

یہ زندگی اک سراب کی سی کیفیتی میں مبتلا کر دی ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جو حساس دل رکھتے ہوں۔ اور اللہ نے انہیں لکھنے کی قوت ودیعت کی ہو۔ زندگی کو سمجھتے سمجھتے وہ خود کہیں کھو جاتے ہیں۔ اہل شعور کی طرح ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی اسی کیفیت کی شکار ہیں اور یہ ایسا تبھی ہوتا ہے جب آپ نے زندگی کو کھوجنے کی کوشش کی ہو، اسے سمجھنے کی سعی کی ہو گو یہ کہاں سمجھ آنے والی ہے۔ لیکن اہل علم تو اس گتھی کو سلجھانے میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں۔ تبھی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کہتی ہیں:

اے زندگی مجھے ترا کوئی اب سرا ملے
کہ کس نگر ملے گی تو کوئی اب پتہ ملے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ شاعری کی منزلیں طے کرتی ہوئی محبت والفت سے اب معرفت کی طرف رواں دواں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا یہ سفر لائق تحسین ہے اور ہم دعا گو ہیں کہ یہ سفر اسی کامیابی سے جاری رہے۔ آمین۔

تخلیق ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اور شام

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

یہ درد بھی بڑی ظالم چیز ہے جب ہوتا ہے تو ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس درد دل نے تو آنسوؤں سے آہ لیا۔ رشتہ گانٹھ لیا ہے۔ کہ کوئی لاکھ روئے مگر آنسو ہیں کہ امڈ آں ے کو پڑتے ہیں۔ پاس ناموس عشق کی وجہ سے انسان انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ آنکھ کے کونے میں ہی بندر ہیں۔ مگر یہ بھی پلکوں تک آن ٹپکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آنسو اگر ٹپک پڑیں تو نجانے کیوں دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ شاید درد کی وجہ وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔ تاہم اس درد آشنائی کے بغیر بھی تو زندگی کے اسرار درموز کہیں کھلنے نہیں پاتے۔ درد کی لذت سے جو ناواقف رہا اس نے بھلا زندگی کو کیسے سمجھا درد بھری شب جہنم ہوتی ہے یوں کہیں کہ نظروں سے اوجل ہوتی ہے۔ تو روشنی کی کرنیں طلوع صبح کی نوید سناتی ہیں۔ مگر وقت کے پہیے نے تو چلتے ہی رہنا ہے۔ دن بھر کی روشنی کے بعد آخری شام آ کے ہی رہتی ہے۔

2) پھر نجانے کیوں یہ شام ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی آنکھوں میں آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ شام کے وقت سورج کے ڈوبنے کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر یہ دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتا ہے۔ شام کے اس منظر میں روحانیت کی چاشنی بھی گھل مل جاتی ہے۔ اداسی گھیرا ڈالنا شروع کر دیتی ہے۔ کوئی اہل دل، اہل درد اس اثر سے بچ نہیں پاتا اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی روح میں تو شام ایسے رچ بس گئی ہے کہ وہ ان کے استعار میں جا بجا در آتی ہے۔ جیسے وہ کہتی ہیں۔

میرے آنگن میں جب بھی شام کے سائے اترتے ہیں
مجھے شاہین محبت کا ہی سایہ یاد آتا ہے

وہ جیون کی شام کے حوالے سے فرماتی ہیں:

جیون میں دائمی سی کوئی شام کر گیا
وہ رت جگے ابد کے مرے نام کر گیا

یوں لگتا ہے شام کا منظر، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظر سے اُتر کر ان کی ہڈیوں میں رچ بس گئی ہے اور پھر ان کی روح میں سرایت کر گیا ہے۔ جبھی تو اسی شام کے نام انہوں نے پوری غزل کر دی ہے:

اجنبی شہر کی اجنبی شام میں
زندگی ڈھل گئی ملگجی شام میں

شام آنکھوں میں اُتری اسی شام کو
زندگی سے گئی زندگی شام میں

درد کی لہر زندگی بہہ گئی
عمر یوں کٹ گئی ہجر کی شام میں

عشق بر آفریں جو سلامت رہا
اس بکھرتی ہوئی مرتی شام میں

میری پلکوں کی چمن میں جو خواب تھے
وہ تو سب جل گئے اس بجھی شام میں

ہر طرف اشک اور سسکیاں ہجر کی
درد ہی درد پر گھڑی شام میں

آخری بار آیا تھا ملنے کوئی
بجر مجھ کو ملا وصل کی شام مین

رات شاہین آنکھوں میں کٹنے لگی
اس طرح گم ہوئی روشنی شام میں

جب روشنی شام میں گم ہونے لگی ہے۔تو درد کی شدت بھی بڑھنے لگتی ہے۔تب وہ پکار اٹھتی ہے۔درد کی شدت اور بڑھتی تھی شہر وفا کی شاموں میں اور ویرانی بیٹھ گئی تھی ان اکھیوں کے پانی میں اور جب شام ہوتے ہی اکھیوں کے پانی میں ویرانی قدم جمانے لگتی ہے۔وہ کہہ اُٹھتی ہے:

شام کی دہلیز پر بس درد نے انگڑائیاں لیں
جاگ اٹھتے ہیں غم سبھی اور رو پڑیں تنہائیاں

بے بسی کی شام پر سسکی ہے پیروں زندگی
خواب کی خواہشیں ہیں ہم تو کھو چکے بینائیاں

وفا کی تلاش میں بھٹکتی شاہین سمجھتی ہے کہ ان دور جبر میں جینا بہت محال ہے۔تبھی تو وہ وفا کو مخاطب ہو کر کہتی ہے:

رستے میں شام ہوگئی اب تو ذرا ٹھہر
کتنا ہمیں تو اور تھکائے گی اے وفا

کب تک رہے گی منظر شام وصال کی
کب تک فریب درستی کھائے گی اے وفا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو:

زندگی بے قرار لگتی ہے
درد کی آبشار لگتی ہے

اس لیے تو اپنے آپ کو مخاطب ہوتے ہوئے کہتی ہیں:

پھر سے شام فراق آئی اب
آنکھ بھی اشکبار لگتی ہے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی ہم سب کی طرح زندگی کے راز کو ہائے اور اس گتھی کو سلجھانے میں مگن نظر آتی ہیں۔کی جاناں ہیں کون؟ کی تلاش ہی انسان کو درد سے آگاہی اور زندگی کے اسرار ورموز کی خانکاری کے رستے کی طرف لیے جاتی ہے۔تبھی تو وہ اپنی نظم رستہ مجھے دکھا دے۔میں یہی سوال زندگی سے پوچھتی ہوں تو بھی شام کا ذکر کیئے بنا نہیں رہ سکتی۔

اے زندگی میں تجھ سے
بس اتنا پوچھتی ہوں

منزل کہاں ہے میری ؟
کچھ تو مجھے بتا دے

صبح ازل کہاں ہے
شام ابد کہاں ہے ؟

موت وحیات کیا ہے؟
یہ کائنات کیا ہے؟

جسموں کی موت کیسی ؟
روح حیات کیا ہے؟

میرا وجود کیا ہے؟
اور میری ذات کیا ہے؟

سورج کی ہر کرن میں کیوں جستجو سجن کی ؟
ہر پھول پر کلی میں کیوں آرزو ملن کی؟

صبح وصال کہاہے؟
شام فراق کہا ہے

میں گلشن وفا کی بچھڑی ہوئی کلی ہوں
کرنیں میرا تبسم شبنم ہیں میرے آنسو

روؤں کہ مسکراؤں ؟
کیسے یہ بھید پاؤں !

گر ہوسکے تو مجھ کو
اے زندگی بتاں

بھٹکی ہوئی سافر
رستہ مجھے دکھا دے

وہ اس دکھ سے بھی آگاہ ہیں جو شام ہوتے ہی بازاروں کے سینے میں اتر آتا ہے:

کیسے کٹتی ہے اُداسی میں ہر ایک شام فراق
دو گھڑی تم بھی گزارو کبھی نادار کے ساتھ

زندگی میں کہاں کسی کو دوام ملا ہے۔ گو ایسے لمحے لوٹ کے نہیں آتے مگر وہ منظر دائمی طور پر ہمارے اندر رچ بس جاتے ہیں۔ ہم تمنا تو کرتے ہیں کہ وہ پیار بھرے لمحے

لوٹ آئیں مگر یہ کہاں ممکن ہوسکا ہے اک خواہش نے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ سے "نظم دوام کرنا"، تخلیق کروائی ہے:

یہ بات کہی ہے تم سے جاناں
جو ہوسکے تو پلٹ کے آنا
جو مرے خوابوں کر چیاں ہیں وہ آ کے چننا

وہ کرچیاں جن میں آج بھی کچھ نشانیاں ہیں۔ شرارتیں ہیں، اداسیاں ہیں۔ گئے دنوں کی کہانیاں ہیں۔ وہ دن کہ جن میں تمھیں سنا تھا تمھارے لہجے کی چاشنی جب میری سماعت میں بس گئی تھی۔ جو آج تک بھی بسی ہوئی ہے۔ وہ جواب جن کے طفیل آنکھیں۔ اداسیوں سے سنوا گئی ہیں:

وہ اک گھڑی جو ملن کی تھی بس
وہ شام بن کہ ٹھہر گئی ہے
پلٹ کے آؤ تو ایک چھوٹا سا کام کرنا
اس اک سماعت کو ڈھونڈ نا ہے
وہ ڈھونڈ کر میرے نام کرنا
جو ہوسکے تو پلٹ کر آنا کلام کرنا، دوام کرنا
جب اُن لمحات کو کوئی ڈھونڈ کر واپس نہیں لاتا
کلام نہیں کرتا، دوام نہیں بخشتا تو کہہ اُٹھتی ہیں
نہ دن نکلتا ہے اس کا نہ شام ہوتی ہے
اب اس طرح سے بھی کوئی جہاں میں رہتا ہے
میں اس طرح سے ہوں آزاد اپنی دنیا میں
کہ جیسے کوئی پرندآنا سہاں میں رہتا ہے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اور تخلیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلا عمل تو وہ تھا جب

خدا تعالیٰ نے نہایت خوبصورتی اور فرصت کے لمحوں انہیں تخلیق کیا۔ پھر انہوں نے آسمان پر رہنے والے خالق، زمین پر پیدا کرنے والی پیاری ماں سے محبت کر کے ان کا شکر گزار ہوئیں ۔تو رب کریم نے انہیں اسے شعبہ میں داخل کر دیا کہ جہاں پہلے انہوں نے تخلیق کے عمل کو پڑھا، سمجھا اور دیکھا بھی اور اس کے خاص کرم سے ماں بننے کے عمل سے بھی گزریں اور میڈکل کے ایسے نسوانی شعبے سے وابستہ ہوئیں جہاں قدرت کے اس تخلیق کے عمل میں بطور ماہر امراض نسواں محدومعاون ثابت ہو رہی ہیں۔ تاہم بات یہیں پہ ختم نہیں ہوتی کہ اس تخلیق کے عمل نے ان کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ دماغ میں دوڑتی تخیلیں ایسی جگہ مگر یہ دل ایسے مچلا کہ اس میں بسے سب خیالات شاعری کی صورت میں صفحہ قرطاس پہ آن بکھرے اور پھر ان لفظوں کی خوشبو کی مہک سارے جہاں میں پھیل گئیں۔ فی الحال تو یہ مہک سارے جہاں میں پھیل گئی۔ فی الحال تو یہ مہک تیسرے شعری مجموعے ''اور شام ٹھہر گئی'' تک آن پہنچی ہے۔ اس سے پہلے وہ ''پھول سے بچھڑا خوشبو'' کی تلاش میں رہی ہیں۔ پھر انہیں خوشبو کہیں بھرتی بھراتی مل گئی تو اس کے احساس کو روح میں اتارتے ہوئے کہنے لگی۔

میں آنکھیں بند رکھتی ہوں اور پھر جو پلکیں وا ہوئیں تو دیکھا کر اور شام ٹھہر گئی ہو جیسے۔ ابھی انحکوں کی داستانیں باقی ہیں ابھی امید سحر باقی ہے۔ لیکن اپنے تخلیق کیے جانے کے مقصد کی تلاش میں وہ رب اور انسانیت کی خدمت کیے جا رہی ہیں۔ سچے اور سچے من سے منزل کی تلاش جاری ہے تو بھلا وہ ایک سندر بھی منزل کیونکہ نہ پا لیں گے جہاں وہ ادب اور انسانیت دونوں میدانوں میں سرخرو ٹھیریں گے۔ ہماری نیک تمنائیں اور دعائیں ہمیشہ اُن کے ساتھ رہیں گی۔

میں آنکھیں بند رکھتی ہوں

ڈاکٹر محمد وسیم انجم
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ، وفاقی جامعہ اُردو، اسلام آباد

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ 'شاہینؔ' تخلص سے لکھتی ہیں۔ ان کی شاعری علامہ اقبال کے 'شاہین' سے مختلف نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے 'شاہین' کے اوصاف کی بدولت اسے اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے اور ڈاکٹر نجمہ شاہین میں ایسے اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتیہیں اگر انہیں علامہ اقبال کا 'شاہین' کہا جائے تو بجا ہوگا۔ انہوں نے اپنی تعلیم (ایم بی بی ایس) کے دوران اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کا بغور مطالعہ ہی نہیں ان گنت تجربات بھی کیے ہیں جو ہمیں ان کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ انہیں فطرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے پیشے کے تقدس میں انسانیت کی خدمت کا جذبہ بھی نمایاں ہے جو ہمیں ان کے شعری مجموعوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'پھول سے بچھڑی خوشبو' کی پذیرائی کے بعد 'میں انکھیں بند رکھتی ہوں' میں اپنے تخلیقی سفر کی بلندی پر دکھائی دیتی ہیں۔

'میں آنکھیں بند رکھتی ہوں' کا انتساب بھی چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اپنے 'پیش لفظ' میں انسانی ارتقاء کی ایک دلآویز داستان کا بیان ہے جو ہمیں غزلوں اور نظموں میں ایک ماحصل کی طرح اس شعری مجموعے کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے آنکھوں کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے یہ انوکھا انداز کوئی آنکھوں کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔

انہوں نے آنکھیں بند کر کے جو سوچا اور دیکھا اسے آنکھیں کھول کر تلاش کرنے کی متمنی ہیں۔ آنکھیں بند کر کے خواب ہی نہیں دیکھے جاتے بعض اوقات ایسے خیالات بھی انسانی شعور میں اُمڈ آتے ہیں جنہیں حقیقی زندگی میں تلاش کیا جاتا ہے۔ شاعرہ جس طرح سوچتی ہے اور چیزوں کو دیکھتی ہے اس طرح وہ دوسروں سے بھی توقع رکھتی ہے لیکن دوسروں کی سوچ کو تبدیل کرنے کے لیے لفظوں کا سہارا لیتی۔۔۔۔ ان لفظوں کو شعری پیرائے میں بیان کرتی ہے تا کہ اس کا پیغام دوسروں تک بھی پہنچ سکے۔

اس مجموعہ کلام میں کل 77 غزلیں اور 86 نظمیں شامل ہیں فلیپ پر شاعری کی تصویر کے ساتھ دو غزلیں نمایاں ہیں جو کتاب کے صفحہ 130 اور 121 میں موجود ہیں۔ معروف شاعر سعد اللہ شاہ نے بھی دادِ تحسین سے نوازا ہے۔ دیکھنے میں جتنی خوبصورت کتاب ہے اس سے زیادہ شعری کلام قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شاعری کو مزید ہمت و استقلال عطا فرمائے اور ان کا یہ شعری سفر رواں دواں رہے۔ آمین

نئے شعری امکانات کی مشعل بردار

جاوید احسن

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہمارے وسیب کی ایک ہر دلعزیز لیڈی ڈاکٹر، دلآویز شخصیت کی مالک اور اُردو شاعرہ ہیں۔ ان کا تعلق ضلع ڈیرہ غازی خان کے معروف قبیلہ کھوسہ کے ایک معزز بلوچ گھرانے سے ہے جو حصولِ تعلیم، اور روزگار کے بہتر مواقع کے پیش نظر گاؤں سے شہر میں منتقل ہوا۔ پھر یہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ نجمہ نے ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں سے حاصل کی اور ایف ایس سی (پری میڈیکل) گورنمنٹ گرلز کالج ڈیرہ غازی خان سے نمایاں پوزیشن کے ساتھ پاس کی۔ بعدازاں نشتر کالج ملتان میں داخلہ لیا اور 1996ء میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر بن گئیں۔ آپ نے نشتر ہسپتال ہی میں دو سال تک گائنی اور میڈیکل کے شعبوں میں ہاؤس جاب کی۔ چنانچہ نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال میں نہ صرف آپ کی زندگی کا ایک سنہرا خواب تعبیر آشنا ہوا بلکہ اس کالج کی خوشگوار یادیں ان کی زندگی کا بہترین اثاثہ بن گئیں۔ شاید ان کی شاعری کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین سے پہلے پہل، میرا تعارف اس وقت ہوا، جب وہ اپنا پہلا مجموعہ کلام ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' 2007ء میں منظرِ عام پر لا چکی تھیں اور مقامی ادبی حلقوں میں بطور شاعرہ متعارف ہو رہی تھیں۔ کتاب کا نام اتنا جاذبِ نظر تھا کہ اُردو کی نامور شاعرہ پروین شاکر کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

ابھی اس شعری گلدستے کی پذیرائی جاری تھی کہ تین سال کے قلیل عرصہ میں اِن کا دوسرا دیدہ زیب شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' 2010ء میں مارکیٹ

میں آ گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شاعرہ کا نام قومی سطح پر میڈیا اور ادبی منظر نامے میں نمایاں نظر آنے لگا۔

ڈیرہ غازی خان کے مشہور شاعر سید محسن نقوی مرحوم کے بعد ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ دوسرا نام ہے جسے میڈیا اور ادبی حلقوں میں یکساں پذیرائی حاصل ہے۔ ان کی متاثر کن فعال شخصیت، وجاہت، خوش اخلاقی اور پیہم تخلیقی عمل کا کرشمہ ہے کہ وہ سالوں کا فاصلہ دنوں میں طے کر رہی ہیں۔ بقول شاعرہ:

شاہیںؔ راہِ شوق میں منزل کہیں نہیں
پیشِ نظر ہے زندگی میدان کی طرح

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری، آزاد اور نثری نظمیں اور جدید شگفتہ غزلیں اس بات کی غمازی ہیں کہ وہ بھرپور تخلیقی توانائی اور خوبصورت مقصد کے ساتھ نئے شعری امکانات کی کہکشاں سجانے اور اپنی باطنی کیفیات کا کیتھارسس کرنے میں مصروف ہیں اور یہی ان کی ذات کا بھید بھی ہے اور تشنہ لب روح کی آواز بھی۔ اس حوالے سے دیکھیے چند اشعارِ آبدار:

وہ بھی دن تھے کہ نگاہوں میں دھنک رہتی تھی
اب تو گھیرے ہوئے رہتی ہے سیہ رات ہمیں

سب کے سب سونپ دیئے حرفِ محبت تجھ کو
اس سے بہتر نظر آئی نہیں سوغات ہمیں

اک مہک سی گذری ہے وہ جہاں سے گزرا ہے
راستہ وہ اب سارا گلستان جیسا ہے

بھیگتے موسموں اور شاداب لمحوں کی شاعرہ

جاوید احسن

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہمارے وسیب کی گائنا کالوجسٹ اور دلآویز شخصیت کی مالک اور شاعرہ ہیں۔ 5 دسمبر 1973ء کے دن ضلع ڈیرہ غازیخان کے ایک پسماندہ دیہات کی بستی جندانی میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اسی بستی کے سرکاری سکول سے حاصل کی جبکہ مزید تعلیم مڈل، میٹرک گورنمنٹ گرلز ہائی سکول نمبر 2 ڈیرہ غازیخان اور انٹر ایف ایس سی مقامی گورنمنٹ گرلز کالج ڈیرہ غازیخان سے نمایاں پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ بعد ازاں 1981ء میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر کے کورس کے لئے گورنمنٹ نشتر کالج ملتان میں میرٹ پر داخلہ حاصل کیا۔ آپ نے اس تاریخی کالج میں اپنا تعلیمی دورانیہ 1996ء میں شاندار کامیابی کے ساتھ مکمل کیا اور ہاؤس جاب کے لئے مزید دو سال نشتر ہسپتال ملتان میں گائنی اور میڈیشن کے شعبے میں انتہائی لگن سے کام کیا۔ چنانچہ نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال میں نہ صرف آپ کی زندگی کا ایک سنہرا خواب (لیڈی ڈاکٹر بننے کا) تعبیر آشنا ہوا بلکہ اس کالج کی خوشگوار یادیں آپ کی زندگی کا اثاثہ بن گئیں اور یہیں سے آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔ غالبًا اسی کالج کو الوداع کہتے ہوئے اپنی پہلی نظم ''آخری ملاقات'' سپردِ قلم کی۔ بعد ازاں محکمہ صحت میں ملازمت اختیار کی اور 1998ء اور 2004ء تک ضلع ڈیرہ غازیخان کے صدر ہسپتال اور دیہی مراکز صحت ٹبی قیصرانی، شاہ صدر دین اور چھابری زیریں میں دکھی انسانیت کی خدمت اور مسیحائی کا فریضہ بہ احسن وخوبی ادا کیا۔ بعد ازاں اپنے والد گرامی کے مشورے سے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئیں اور ڈیرہ غازیخان شہر

میں اپنا پرائیویٹ میٹرنٹی ہوم قائم کرلیا اور جدید بنیادوں پر اس کی تعمیر و ترقی کے لئے ہمہ تن مصروف ہوگئیں۔ کہتے ہیں کہ طبی اخلاقیات میں معالج ڈاکٹر کا پہلا وصف خندہ پیشانی اور اپنے مریض کے ساتھ ہمدردانہ رویہ ہے جو علاج سے قبل ہی مریض کی ڈوبتی نبضوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ مقام شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وصف ڈاکٹر نجمہ کو بڑی فیاضی سے عطا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی سعادت مندی دیکھئے کہ انہوں نے جدید ماحول میں رہتے ہوئے اپنی بلوچی روایات کے مطابق 1997ء میں اپنے والدین کی مرضی سے اپنی برادری کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان غلام فرید خان کھوسہ کے ہمراہ شادی کی اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو بیٹوں محمد عمر اور محمد حمزہ کی ماں بن چکی ہیں اور خوشگوار ازدواجی زندگی کی نعمت سے بہرود ہیں۔

کہتے ہیں کہ عشق کی طرح شاعری بھی معصوم جوان دلوں کی کمزوری ہے اور یہ بھی آکاش بیل کی طرح آدمی کے تن و جاں سے لپٹ جاتی ہے اور پھر بقول غالب

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

چنانچہ شاعری کی دیوی نے نجمہ شاہین کو بھی بالی عمریا میں اپنی گرفت میں لے لیا اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود ابھی تک اس اثاثہ سے اپنی جان نہیں چھڑا سکی۔

مقام مسرت ہے کہ اسی وقت ڈیرہ غازیخان کی شعری قوس قزح جن خوبصورت رنگوں سے عبارت ہے ان میں نجمہ شاہین کی شاعری کا رنگ سب سے جداگانہ اور جاذب نظر ہے۔ ہر چند آپ کی شاعرانہ عمر اتنی زیادہ نہیں لیکن اس دوران آپ جو وہ خوبصورتی شعری مجموعے منظر عام پر لائی ہیں وہ حسن طباعت اور پیشکش کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کا پہلا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' 2007ء میں منظر عام پر آیا تو یوں لگا کہ جیسے درد کی مشہور شاعرہ پروین شاکر کی روح نے دوبارہ جنم لے لیا ہے کیونکہ کتاب کے نام نظموں اور لفظوں میں وہی خوبصورتی، وہی تازگی اور وہی رنگا رنگی ہے۔ اہل

ذوق نے ان کتاب کی اتنی پذیرائی کی کہ ایک سال کے قلیل عرصے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ آپ کا دوسرا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' حال ہی میں 2010ء منظر عام پر آیا ہے اور یہ قول فارسی ''تلاش نقش ثانی بہتر کند ز اول'' کے مصداق پہلی کتاب سے کئی گنا زیادہ دیدہ زیب اور دلفریب ہے۔ اسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ صرف تازہ ہو نرم خیز جھوٹا ہی نہیں بلکہ وادی پرشوق کی سیاحت ہے۔ بقول غالب:

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

اس کا شعر میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری جدید وزن اور ڈکشن سے آراستہ ہے جس میں متنوع موضوعات، لطیف احساسات اور خوبصورت لفظیات کا رچاؤ انتہائی متاثر کن ہے۔ ان کی نظموں میں جو تخلیقی بہاؤ پایا جاتا ہے وہ شاعر کے روشن مستقبل کا عکاس ہے۔ قدرت نے شاعرہ کو بے پناہ ابدی جذبوں اور فکر و احساس کی دولت سے نوازہ ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں بعض مقامات پر طوفانی بارش کی سی کیفیت پائی جاتی ہے جس کا تند و تیز پانی تاہم مجموعی طور پر ان کی شاعری ایک چمتانی ندی کا نرم رو انداز لئے ہوئے ہے۔ اس حوالے سے ان کی ایک نظم ''آکاش بیل'' کے تیور دیکھئے۔

کبھی بچے تھے تو سنتے تھے
آکاس بیل چھوڑ درخت کو جکڑ لے
تو اس کی طاقت اس کے حسن کو
اپنی بانہیں پھیلا کر ختم کر دیتی ہے
تب پہروں بیٹھ کر سوچا کرتے تھے
آکاس بیل ہوتی ہے کیا؟
جب عشق ہجر کے دکھ نے
من کے تناور ہجر کو گھیرا

تو تب معلوم ہوا
آکاس بیل ہوتی ہے کیا
آکاس بیل کے معنی ہیں کیا؟
(حوالہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'')

اسی طرح نجمہ شاہین کی ایک اور نظم ''محبت کا چاند گرہن'' ہمارے وسیب کی ایک اساطیری کیفیت لئے ہوئے ہیں جو ہماری نفسیاتی ساخت اور روحانی پس منظر کا پتہ دیتی ہے۔وہ لکھتی ہے کہ:

ماں کہتی تھی
میری ننھی گڑیا
آج باہر نہ نکل
کیا تجھکو معلوم نہیں
آج سورج گرہن ہے
دیکھنے سے آنکھیں بینائی کھو دیتی ہیں
چہرے مرجھا جاتے ہیں
بہاریں خزاں میں ڈھل جاتی ہیں
یہاں تک کہ سمندر میں بھنور پڑتے ہیں اور
زمین کی ہریالی زردی میں بدل جاتی ہے
اے میری گڑیا
آج تو باہر نہ نکل
کہ تیری غزالی آنکھوں اور پہلے چہرے کو
کہیں چاٹ نہ لے یہ سورج گرہن
مگر آج ماں کو کون بتائے کہ

تیری گڑیا کو
جسے زرد کرنہ سکا سورج گرہن
اسے ڈس گیا ہے محبت کا چاند گرہن
(حوالہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'')

اہل نقد ونظر کا خیال ہے کہ افسانہ، کہانی اور آزاد شاعری کو عام طور پر خواتین کی طبع لطیف سے زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ بلکہ بالی عمریا کے اکثر نوجوان لکھاری بھی جذباتی بہاؤ کے تحت نثری شاعری کی اجرک اوڑھنا پسند کرتے ہیں۔لیکن غزل ایک ایسی کرشمہ ساز غزالہ ہے جو ہر طبع اور سطح کے شائقین کو اپنے جسم میں لے لیتی ہے۔

محبت کی شاعرہ

ڈاکٹر ستیہ پال آنند۔واشنگٹن ڈی سی امریکہ

آج کا اردو شاعر اس عبوری دور میں سانس لے رہا ہے' جہاں اس کے پیچھے کلاسیکی غزل کی وہ تابناک روایت بھی ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں ہی ختم ہوگئی اور پھر وہ اندھا کنواں بھی ہے جس میں سکہ بند روائتی غزل آج تک ڈوبی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاھیں کھوسہ کی ''اور شام ٹھہر گئی'' میں مشمولہ غزلوں پر میں رائے دینے سے احتراز کروں گا لیکن ان کی نظموں نے مجھے یقیناً متاثر کیا ہے۔ ان کی نظمیں دیگر معتاد، اسٹیریوٹائپ شعرا کی طرح گذشتہ نصف صدی کے شہرہ ور نظم گو شاعروں، (بطورِ خاص فیض احمد فیضؔ) کی لفظیات کے دسترخوان کے باقی ماندہ بچے کھچے ٹکڑوں سے پاک ہیں جن پر قانع رہ کر بہت سے شاعر آج تک غزلیں اور نظمیں لکھے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ جدیدیت کی تحریک میں بہہ کر مضمون' متن' اور اسلوب کی سطحوں پر انتشار' افشار' ابہام اور یادہ گوئی کا شکار ہونے سے بالکل بچ رہی ہیں۔ انہوں نے اس تحریک کا اثر بالکل قبول نہیں کیا۔ ان کی کچھ نظمیں یقیناً ''بڑی'' نظمیں ہیں جنہیں سراہا جانا چاہیے۔ محبت ایک پاک جذبہ ہے، اس میں صوفیانہ عشق کی آسماں بدست بلندی سے لے کر تعشق اور ہوس کی تحت الثرا تک شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ نجمہ شاھیں کی نظموں میں یہ جذبہ ان دو بے نہایت حدود کے درمیان اس سطح مرتفع پر قائم ہے، جسے ہم ''من وتو'' کا علاقہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس 'من و تو' میں 'من' تو یقیناً شاعرہ کا واحد متکلم ہے' وہ خود ہے یا اس کی انا ہے لیکن 'تو' محبوب بھی ہوسکتا ہے' دوست بھی ہوسکتا ہے' نامہرباں آسماں بھی ہوسکتا ہے اور ظالم وحاکم بھی۔ اس کی

ایک وجہ تو غزل کی چار سو برس پرانی اور مستحکم وہ روایت ہے جس نے غزل ہی کو نہیں بلکہ اردو نظم کو بھی اب تک 'من وتو' کے حصار میں قید کر رکھا ہے اور دوسری وجہ آسان راہوں کے سفر کو پرپیچ راستوں پر فوقیت دینا ہے۔ ''محبت اک ضرورت ہے''، ''یہ عشق بستی بسانے والو''، ''محبتوں کا یہ طورِ سینا''، ''موسمِ وصل کے استعارے میں ہوں''، ''تجھے تو خبر ہے''، ''گر ہم کو تم جھٹلاؤ گے'' جیسی کئی اور نظمیں اس پاک وصاف جذبے کو جہاں خوشروئی اور شائستگی سے بیانیہ یا مکالمہ کے فارمیٹ میں ڈھالتی ہیں، وہاں پُرکاری اور سحر کاری کا انداز بھی اپناتی ہیں۔ وصل اور ہجر تو کیفیات ہیں، لیکن ان کے تہہ در تہہ معانی میں وفاداری یا بے وفائی اور ان کے متعلقات کے بیسیوں حصاروں میں مقید تازہ کاری سے مزین وہ مضامین بھی ہیں جو شاعرہ کی غزلوں اور نظموں دونوں میں بکثرت موجود ہیں۔ مجھے نجمہ شاھیں کھوسہ کی شاعری سے بہت امیدیں ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا' صاحب سائیں عشق' کون؟

کرامت اللہ غوری۔ کینیڈا

یہ جو ہماری دنیا کرونا کے عذاب میں مبتلا ہے اس کے ہاتھوں ہم گھروں میں محصور تو ہو گئے لیکن اس لعنت نے اہلِ سخن کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ زوم کے ذریعہ گھر بیٹھے مشاعروں اور شعر و سخن کی محفلوں کی شکل میں عطا کی ہے جو دولتِ بے بہا ہے اور جس سے اس پرانے قول کی صداقت پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ ہر سیاہ بادل کے حاشیہ پر ایک روپہلی کرن بھی ہوتی ہے۔

ان مشاعروں کا احسان ہے کہ مجھے یہاں شمالی امریکہ میں رہتے ہوئے بھی دور دراز کے o میں آباد اپنے قلم اور سخن قبیلے کے ان افراد سے شناسائی کا تحفہ ملا جن میں سے اکثر سے میں اس سے قبل بالکل لاعلم تھا۔ کوئی واقفیت نہیں تھی مجھے کہ کہاں کہاں، کیسی کیسی گدڑیوں میں کیسے کیسے نایاب لعل چھپے ہوئے ہیں۔

ایسا ہی ایک درِ نایاب مجھے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ میں نظر آیا۔ میں نے جب پہلی بار اس لڑکی کو سنا تو حیرت ہوئی کہ ہمارے پاکستان کے ان شہروں میں بھی جو ثقافتی اور ادبی جغرافیہ میں کوئی نام، کوئی شہرت، نہیں رکھتے ایسے سخنور ہیں جو جاندار شعر کہتے ہیں لیکن اس ستائش و شہرت سے خال خال ہی شناسا ہوتے ہیں جو فن کی بنیاد اور استعداد کے اعتبار سے ان کا حق بنتا ہے۔

مجھے نجمہ شاہین کو سن کر اور حیرت یوں ہوئی کہ یہ لڑکی پیشہ کے لحاظ سے کارِ مسیحائی کرتی ہے، مریضوں کو شفا دینے کا جتن کرتی ہے لیکن اس ہمہ وقت مصروفیت کے باوجود وہ

سخن کی گہرائیوں میں اتر کے اپنی روح کی مسیحائی کا سامان کرنے کیلئے وقت نکال لیتی ہے۔ مجھے اس خوشگوار دورنگی پر اپنے عہد کے صاحبِ طرز شاعر سراج الدین ظفر کا یہ شعر یاد آ گیا:

ہم سا رندِ باکرامت کیا کوئی ہوگا کہ ہم
دن کو درویشی کریں راتوں کو سلطانی کریں

ڈالٹر نجمہ شاہین سخن کی سلطانی کرتے کرتے اب اس قلمرو کو فتح کرنا چاہ رہی ہے جہاں قال کا نہیں حال کا راج ہوتا ہے۔

تصوف کا کون طالبعلم ہے جو مولانا روم یا جلال الدین رومی سے واقف نہیں۔ اور رومی کے تعلق سے ان کے مرشد شمس تبریز سے بھی ہر عاشقِ رومی واقف ہے۔ رومی کو مولانائے روم بنانے والے یہی شمس تبریز تھے جن کے ہاتھ پر مولانا نے بیعت کی تھی۔ اور اس بیعت کی روایت یہ ہے کہ مولانا کسی حوض کے کنارے کتب بینی کر رہے تھے کہ شمس تبریز وہاں آ گئے اور مولانا سے ان کتابوں کی بابت سوال کیا۔ مولانا نے ان کا حلیہ دیکھ کر فرمایا کہ تمہیں ان کتابوں سے کیا لینا دینا؟ شمس تبریز نے یہ سنا تو کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دیں جس پر مولانا کو جلال آ گیا اور فرمایا کہ تم نے حکمت کے وہ نسخے ضائع کر دیئے جن کا ملنا محال ہے۔ یہ سن کر شمس تبریز نے ہاتھ ڈال کر ان کتابوں کو حوض سے نکال لیا اور مولانا یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کتابیں ویسی ہی خشک تھیں جیسی پانی میں پھینکنے سے پہلے۔ مولانا کی حیرت دیکھ کر شمس تبریز نے کہا یہ حال کی باتیں ہیں جنہیں تم جیسا صاحبِ قال کیا جانے۔ یہ سنتے ہی مولانا نے ان کے ہاتھ پہ بیعت کی اور وہاں سے تسوف کی وہ آفاقی شاعری شروع ہوئی جس کا ذخیری مثنوی کی چھ جلدیں ہیں اور یہ مولانا روم کی وہ تاریخی مثنوی ہے جس کے متعلق شارحین کا یہ فتوی دائمی ہے: ہست قرآں درزبانِ پہلوی۔

سچا سخنور جب قال سے آگے کا سفر شروع کرتا ہے تو وہ بھی صوفی کی طرح حال کی منازل طے کرتا ہے۔ اس کا سفر اس ذات ازل تک پہنچنے کی کھوج اور جستجو کا سفر ہوتا ہے جو انسان کو پیدا کرنے والا اور اسے شعور عطا کرنے والا ہے۔ وہ وہاں لوٹنا چاہتا ہے جہاں

سے اس نے اس دنیائے فانی کا سفر شروع کیا تھا۔ اس کی کھوج اس مبدا کو پانا چاہتی ہے جس سے اس کا وجود ہوا۔

مثنوی کا پہلا شعر ہی سفر کا مدعا بیان کر دیتا ہے:

بشنواز نے چوں حکایت می کند
(بانسری کی سن کہ وہ کیا حکایت بیان کرتی ہے)
دز جدائی ہا شکایت می کند
(اور جدائیوں کی کیا شکایت کرتی ہے)

اور یہ بھی

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
(جو کوئی اپنی اصل سے دور ہوجاتا ہے)
باز جوید روزگارِ وصل خویش
(وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے)

لیکن اس تمام بحث کو اسداللہ خاں غالب نے کس سادگی سے ایک شعر میں بیان کر دیا:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

نجمہ شاہین کی کھوج بھی وہی ہے جس نیرومی کیلئے قال سے حال تک کی منزل کو زیست کا حاصل قرار دیا اور اس تلاش کا ماحصل یہ زیرِ نظر مجموعۂ 'میرا صاحب سائیں عشق' ہے۔ نجمہ شاہین کو مشاعروں میں سننے والے شاید اس کو سمجھنے میں دشواری محسوس کریں کہ روایتی شاعری کرتے کرتے یہ ڈاکٹر شاعرہ روح کی مسیحائی کیوں کرنے لگی؟

اس سوال کا بڑا مسکت جواب شان الحق حقی صاحب نے دیا ہے۔ فرماتے ہیں:''اردو شاعری کے سر یہ الزام رہا ہے کہ یہ عشق و عاشقی، شراب و ساغر کی شاعری ہے۔۔۔ دراصل صورتِ حال اس سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے ہاں غیر رومانی شاعری کا

تناسب دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے

حقی صاحب کی یہ تحریر میں نے اس دیباچہ سے لی ہے جو انہوں نے میری مرحومہ شریک حیات اور شریک فن، عابدہ کرامت کے حمد کے مجموعے، 'جبینِ نیاز' کو ادبی دنیا سے متعارف کرواتے ہوئے لکھا تھا۔ عابدہ کرامت کا یہ مجموعہ شائد اردو ادب کی تاریخ کا واحد وہ مجموعہ ءکلام ہے جو تمام کا تمام اللہ تعالی کی حمد وثنا پر مشتمل ہے۔ حقی صاحب نے لکھا:

''دنیا کی شاعری بیشتر رومانی، فکری یا تفریحی ہے۔ ہمارے ہاں شاعروں نے اپنی عمریں قوم کی غم خواری میں گذار دیں۔ اسی سلسلے میں دینی یا ڈیوشنل شاعری کا نام بھی لے سکتے ہیں۔ حالی کے 'مسدس' 'مد و جزر' اور حفیظ کے 'شاہنامہ ءاسلام' جیسی ملی شاعری کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، سلام، مراثی کے لامتناہی دفتروں کی طرف نظر کیجئے تو حیرت ہوتی ہے اردو غیر رومانی شاعری کا کتنا زبردست ذخیرہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جس کا جواب کہیں نہیں ملے گا''۔

نجمہ شاہین بھی اپنے اس تازہ رثائی یا صوفیانہ کلام کے مجموعہ سے اردو کی دینی یا ڈویشنل شاعری کے ذخیرہ کو اور وسیع، اور زیادہ عمیق، کرنے کی راہ پر گامزن نظر آتی ہیں۔

صوفیانہ کلام کے امام اور سرخیل بلاشبہ ہمارے فارسی اور اردو زبانوں کی شاعری میں مولانا رومی ہیں اور ان کی مثنوی اس ذخیرہ کا کوہِ نور ہے۔

صوفیانہ کلام کی اساس اللہ کا عشق اور اس کو پا جانے کی کھوج ہے۔ اس ضمن میں اردو شاعری کے قارئین اور اکثر ناقدین کے ہاں بھی ایک غلط فہمی جو عام پائی جاتی ہے اور جس کا میں سمجھتا ہوں کہ ازالہ بہت ضروری ہے وہ یہ کہ صوفی اللہ کی تلاش میں فنائے ذات کا بھی پرچار کرتا ہے اور ترکِ دنیا کا بھی جب کہ حقیقت میں یہ دونوں مفروضے غلط ہیں۔

انسان خدائے تعالی کی تخلیق کا شاہکار ہے تو پھر وہ صوفی جو خدا کی صناعی پر عاشق ہے اس کے بنائے ہوئے شاہکار کی فنا کیوں چاہے گا؟ زندگی لینا بھی حق اور استحقاق اسی ذاتِ واجب کا ہے جو پیدا کرنے والا اور تخلیق کا رِازل ہے۔

اسی طرح ترکِ دنیا صوفی کا مسلک نہیں ہے کیونکہ یہ دنیا اسی خلاقِ ازل کی بنائی ہوئی ہے جس تک وہ اسی دنیا میں رہتے ہوئے پہنچنا چاہتا ہے۔

فرق صرف ایک عام انسان اور ایک صوفی کے دنیا برتنے کے انداز میں ہے۔ طریقت کا داعی اور صوفیانہ طریق کا سالک تو وہ ہے جو اس چیلنج کو قبول کرتا ہے کہ دریا میں رہو لیکن دامن تر مت ہونے دو۔ یہ مفہوم فارسی کے اس ایک شعر میں اپنے تمام تر مفہوم کیساتھ ادا ہو گیا ہے:

در میانِ قعرِ دریا تخت بندھم کرگئی
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

میرے مولا علی مرتضیٰ، جن سے طریقت کے تمام سلسلے چلے، ان کا قولِ صادق بھی تو یہی ہے۔ فرمایا میرے مولا نے کہ دنیا میں رہو لیکن دنیا کو اپنے اندر نہ آنے دو اسلئے کہ کشتی پانی میں اس وقت تک چلتی ہے جب تک وہ پانی کے اوپر رہے لیکن اگر پانی کشتی میں آجائے تو پھر وہ ڈوب جاتی ہے۔

تو صوفی ترکِ دنیا نہیں کرتا بلکہ عشقِ خدا کی آگ کو اپنے دامن میں بھر کر طریقت کا سفر طے کرتا ہے۔ جگر مراد آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اسلئے مجھے حیرت بالکل نہیں ہے کہ مسیحائی کا پیشہ اختیار کرنے والی ایک نوعمر شاعرہ اپنے اللہ سائیں کے عشق میں ڈوب کر اور بے اختیار ہو کر صدا لگاتی ہے:

مرے چارہ گر، میں ہوں دربدر، میں تو تھک گئی، ہے عجب سفر
مری بے نشاں سی ہیں منزلیں، مجھے راستہ بھی دکھا پیا

اور اسی عالم استغراق میں یہ بھی اس کے لحن سے ادا ہوتا ہے:

نہ حدود میں، نہ قیود میں، مرا دل ترے ہی وجود میں
یہ سجود کا حسیں پیرہن میری روح پر تو سجا پیا

مرے آسماں، مرے سائباں، تو ہی رازداں، تو ہی مہرباں
جہاں لامکاں کے ہیں سلسلے، وہیں میرا گھر بھی بنا پیا

یہ جو میرے من میں ہے روشنی، یہی زندگی، یہی بندگی
مری فکر میں، ترے ذکر میں، جو چراغ ہیں وہ جلا پیا

یہ اپنے پیدا کرنے والے تک پہنچنے اور اسے پا جانے کی کھوج ویسی ہی تو ہے جو بقول رومی بانسری کو پریشان رکھتی ہے کہ وہ اس بانس تک پہنچ جائے جس سے کاٹ کر اسے بنایا گیا تھا۔

یہ تلاش، یہ کھوج، یہ سفر آسان نہیں ہے دنیا میں رہتے اور اسے برتتے ہوئے۔

بقول عابدہ کرامت

دنیا کے شور میں تو سنائی نہیں دیا
اتنا قریب تھا کہ دکھائی نہیں دیا

نجمہ شاہین ایک طبیب ہیں اور دن بھر مسیحائی کا فریضہ نبھاتی رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بیوی اور ایک ماں کی ساری ذمہ داریاں بھی نبھاتی ہیں۔ مجھے ان میں اور اپنی بیوی میں اس لحاظ سے بڑی مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ میری عابدہ کرامت بھی میرے ساتھ ملکوں ملکوں پھرتی رہیں،، ایک پیشہ ور سفارتکار اور سفیر کی شریکِ حیات ہونے کا بارِ گراں اٹھائے رہیں لیکن نہ روایتی شاعری کو ترک کیا اور نہ ہی اپنے معبود تک پہنچنے کا طریق چھوڑا۔ اپنی نواسی سے عشق کیا تو اس کیلئے نظموں، گیتوں کا ایک پورا مجموعہ تخلیق کر دیا۔ ہماری نواسی کا نام رباب ہے تو اس کے نام کی مناسبت سے ’’ربابیات‘‘ کے عنوان سے ایک ایسی کتاب تخلیق کی جو اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے لیکن پھر ’’جبینِ نیاز‘‘ بھی ان ہی کے ذہنِ رسا نے تخلیق کی جو ان کے معبود اور پالن ہار کے نام حمد یہ ہے اس دعا کے ساتھ کہ:

مرے رتجگوں کا یہ مول دے
مری چشمِ فکر کو کھول دے

نجمہ شاہین اسی مدعا کو کمال سادگی سے یوں ادا کرتی ہیں

میرا روپ سنوار دے سائیاں
بس تو ہی درکار ہے سائیاں

ترکِ دنیا کئے بغیر اپنے معبود تک رسائی کا سفر جاں گسل بھی ہوتا ہے اور صبر آزما بھی۔ طریقت کی اس راہ پر تلاشِ منزل میں سرگرداں میں نے اپنی مرحومہ بیوی کے وہ رتجگے دیکھے ہیں جو نیند کو کوسوں دور رکھتے ہیں اور پھر اس سوال کی صورت ایک شعر میں ڈھل جاتے ہیں:

رگِ جاں سے بھی بڑھ کر قرب ٹھہرا
تو کیوں دوری مرے معبود رکھی

اور مجھے چنداں حیرت نہیں کہ نجمہ شاہین اسی درد اور کرب کو یوں بیان کرتی ہیں:

تو ہی میرا مولا ہے، تو آج کہاں ہے سائیاں
کیسی دوری، جب میرا دل تیرا جہاں ہے سائیاں

میں بس یہی دعا کرونگا کہ نجمہ شاہین کا سفرِ طریقت انہیں منزلِ مراد تک اس لگن اور تڑپ کے ساتھ پہنچا دے جو اس مجموعہء کلام کے ہر شعر اور ہر مصرعہ سے یوں جھلک رہا ہے جیسے روشنی قندیل کے آئینے سے ہویدا ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس لگن اور خلوص کے ساتھ نجمہ شاہین نے اپنے عشقِ الٰہی کو شعر کا قالب عطا کیا ہے تو وہ معبود جس کی شان ہی سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے ان کی دعائیں اور مناجات کو شرف قبولیت بخشے گا اور ان کی یہ دعا ضرور مستجاب ہوگی:

میرے لیکھ سنوار دے سائیاں
بس تو ہی درکار ہے سائیاں

اور شام ٹھہر گئی

امجد اسلام امجد (لاہور)

ایک تو ڈیرہ غازی خان جیسے نسبتاً دُور افتادہ اور پسماندہ علاقے سے تعلق اُس پر ڈاکٹری جیسے سائنس نژاد مضمون میں تخصیص اور ان دونوں مشکِلات کے باوجود تین عمدہ شعری مجموعوں کی تخلیق، اپنی جگہ پر ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو جتنی داد دی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں آج کل کی بیشتر خواتین شعرا کے مقابلے میں ایک مخصوص نوع کی بے باکی کے بجائے ایک قسم کا Restraint پایا جاتا ہے بات کو نہ کہتے ہوئے بھی کہہ جانے کا یہ رنگ خوشنما بھی ہے اور دِلکشا بھی۔ غزل یوں تو ہے ہی بہت دھوکے باز قسم کی صنفِ سخن لیکن اس کے بعض مضامین تو ایسے ہیں کہ جو مرد شاعروں کے ہاں تو بظاہر بڑے سیدھے سادے اور Predictable سے دکھائی دیتے ہیں مگر جب یہ کسی خاتون کی زبان سے ادا ہوں تو ان میں ایک بالکل مختلف انداز کا جہانِ معنی کُھلنے لگتا ہے

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کا یہ تازہ ترین شعری مجموعہ اچھے اور باذوق قارئین کو مایوس نہیں کرے گا اور امید کرتا ہوں کہ ان کے اس فنی سفر کا اگلا پڑاؤ اس سے بھی زیادہ بہتر علاقے اور موسم میں ہوگا۔

احساسات کی شاعرہ: نجمہ شاہین کھوسہ

پروفیسر خواجہ اکرام الدین
ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو زبان وادب کے ارتقا اور تاریخی تسلسل کو دیکھیں تو کئی دلچسپ حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ اس زبان کو پروان چڑھانے اور اس کو عروج بخشنے والوں میں اکثر نام ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست اردو زبان کی تدریس سے نہیں رہا ہے اور نہ وہ پیشہ ورانہ طور پر براہ راست اس زبان وادب سے منسلک رہے لیکن ان کے کارہائے نمایاں ایسے ہیں جو زبان کی ارتقائی تاریخ میں یا تخلیقی تاریخ و تسلسل میں ہمیشہ احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اہل زبان ایسے اسمائے گرامی سے بخوبی واقف ہیں۔ نجمہ شاہین کا نام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک طبیبہ ہیں اور اپنے پیشے میں مہارت کی وجہ سے شہرت کی حامل بھی ہیں۔ ان کی شخصیت کا خوش آئند پہلو اردو زبان وادب سے ان کی خاص دلچسپی ہے۔ شعری تخلیق کیا وصف وہ دیگر اُصناف میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں لیکن شاعری کی جولانگاہ ان کا خاص میدان ہے۔ اردو کے بعض ایسے الفاظ ہیں جن کا اطلاق ہر شخصیت پر بخوبی نہیں ہوتا، ان میں ایک لفظ ''ہمہ جہت شخصیت'' کا بھی ہے۔ نجمہ شاہین پر اس لفظ کا بخوبی اطلاق ہوتا ہے۔ انتہائی نفیس اور منکسر المزاج، ملنسار اور خدمت خلق کے جذبے سے بھرپور، ادبی ذوق اور شعور ان کی شخصیت کا خاصہ ہیں۔ اکثر سوچتا ہوں کہ وہ اپنے پیشے میں اس قدر مصروف رہتی ہیں پھر تخلیق کے لیے کیسے وقت نکال پاتی ہیں کیونکہ تخلیق کے لیے یکسوئی درکار ہوتی

ہے۔ نجمہ شاہین مسلسل لکھتی رہی ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے اس حوالے سے میرا ہمیشہ تجسس رہا ہے اسی لیے ان کی تحریروں سے ان کے تخلیقی تجربے کو جاننے کی کوشش کی تو اس سلسلے میں خود ان کی تحریر نے رہنمائی کی ۔ ''اور شام ٹھہر گئی'' کے پیش لفظ میں وہ لکھتی ہیں:

"پھول سے بچھڑی خوشبو' اور ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کے بعد سوچا تھا کہ شاید سفر کٹ گیا۔ مگر یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ تنہائیوں، محرومیوں، محبتوں اور جدائیوں کے دکھ، کہیں انت ہی نہیں ٹھہرتا ان کا۔

کبھی گھٹن بن کر دل کو مٹھی میں کر لیتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انت ہو گیا اور کبھی دور پرے کھڑے مسکراتے اُسی گھٹن کو کم کرتے ہیں، روشنی بنتے ہیں اور اپنی ذات کی تلاش پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔ اِک چاک مل جاتا ہے جس پر ہم گھومتے ہیں اور اِک محور مل جاتا ہے جو ہمیں اپنے گرد دائرہ در دائرہ گھماتا ہے۔ ہم اپنی جستجو میں ہوتے ہیں مگر بھلا دائرے میں بھی کوئی جستجو مکمل ہوئی؟ دائرہ بن کے گھومنا تو بس گھومنا ہے جب رُک گئے تو دائرے میں گھومنے والا ہر ذرہ صرف اپنی جگہ سمٹ کر رُک جائے گا وہ اُس خلا کو پُر نہیں کر سکے گا جو اُسے ذات کے اندر قطار در قطار کھڑے دُکھوں، گرد بنتی ہواؤں اور پس منظر میں سمٹتی، جدائیاں بانٹتی رفاقتوں نے عطا کیا۔''

ذات کی تلاش میں خود کو سرگرداں رکھنا تخلیقی عمل کا وہ سوتا ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ نجمہ شاہین کی تخلیقی کا یہ بنیادی محور ہے اور اسی محور کے گرد کائنات کی رنگارنگی کو سمجھنے کی کوشش کا نام نجمہ کی شاعری ہے۔ اس اقتباس میں اپنے تخلیقی محرکات کے لیے جس طرح کا نثری بیانیہ اختیار کیا ہے وہ بھی شاعری کے طرح تہہ دار جملے ہیں۔ ''اِک چاک مل جاتا ہے جس پر ہم گھومتے ہیں اور اِک محور مل جاتا ہے جو ہمیں اپنے گرد دائرہ در دائرہ گھماتا ہے۔'' یہ کوئی معمولی جملہ نہیں ہے بلکہ اس جملے میں چاک اور محور کی مدد سے نجمہ نے حیات و کائنات یا گردش ایام کی بات بہت ہی خوبصورتی سے کی ہے۔ لیکن بات

یہیں ختم نہیں ہوتی ان کا ذہن مسلسل چاک کی طرح گھومتا رہتا ہے اور ہر دائرے میں گردش کرنے والی شئی کو وہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔موضوعات و مسائل اور رازہائے سربستہ کو سمجھنے یا اسے شاعری میں پیش کرسکنے کا بھی انھیں خیال آتا ہے تو وہ لکھتی ہیں:

''مگر کیا شاعری سب بولتی ہے۔کیا شاعری وہ سب کہہ سکتی ہے جو کہا جانا چاہئے؟ اِن سنگلاخ درد کے پہاڑوں سے گزرتی، اپنی ناتواں جاں پر تندوتیز ہواؤں کے طوفان برداشت کرتی، کرب کی اِن مسلسل راتوں کی کہانی، بے یقنی اور مایوسی کی دُھول سے اٹی ہوئی بے خواب راتوں کی کہانی، یہ رتجگوں کے عذاب اندھی راتوں میں اِک امید سحر باندھے مسلسل جاگتی، بینائی کھوتی اُن آنکھوں کی کہانی، کیا یہ شاعری کہہ سکے گی مگر کہاں؟'' (اور شام ٹھہر گئی۔نجمہ شاہین کھوسہ)

یقیناً آج کا عہد ایسا ہے جس میں مسائل و موضوعات کا انبار ہے۔کس کس کو دیکھا جائے، کس کس پر آنسو بہایا جائے یا کس کس کرب وانتشار کی بات کی جائے؟ یہ اہم سوال تو ہے۔ان سوالات پر غور کرنیوالا ہی ان سوالات پر بات کرسکتا ہے یا کرسکتی ہے۔نجمہ شاہین صرف غور ہی نہیں کرتیں بلکہ ان کو اپنی شاعری کا موضوع بناتی ہیں۔پیش لفظ میں جوانھوں نے لکھا وہ ان کے عجز بیان کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ وسعت بیان کا غماز ہے۔نجمہ کی شاعری کے کچھ خاص موضوعات بھی ہیں ان میں ایک اہم موضوع 'تلاش ذات کا تصور' بھی ہے بلکہ یہ بہت گہرا ہے۔آج کے اس مردم بے زار اور انتشار سے بھری دنیا میں انسان کہیں غائب ہوگیا ہے۔حالانکہ وہ اپنے مطب میں ہر روز سینکڑوں انسانوں کو دیکھتی ہیں، لیکن وہ مرض سے نجات کی تلاش میں آتے ہیں، جن کے چہرے اور جسم سے صرف بے بسی اور لاچاری جھلکتی ہے، وہ چلتے پھرتے انسان تو ہیں مگر صرف ایک خواہش رکھتے ہیں کہ دکھ سے نجات مل جائے۔اسکے علاوہ معاشرے میں جن انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے ان میں انسان کو تلاش کر نے کا عمل ایک انسان ہی کرسکتا ہے۔نجمہ کو یہ کرب اکثر ستاتا ہے تب ہی یہ کہتی ہیں:

جو کھو چکے ہیں وہ منظر تلاش کرتی ہوں
بکھر گئے ہیں جو پیکر تلاش کرتی ہوں

کبھی تلاش جو کرنا ہو اپنا آپ مجھے
تو اس کی ذات کے اندر تلاش کرتی ہوں

کبھی جو حد سے گزر جائے دکھ تو ہنستی ہوں
خوشی نہیں جو میسر تلاش کرتی ہوں

قریب رہ کے بھی کرتی رہی تھی قرب تلاش
میں چاہتوں کے ہی زیور تلاش کرتی ہوں

یہ آرزو ہے صنم کو قریب تر دیکھوں
سو ریگزار میں پتھر تلاش کرتی ہوں

کروں گی اس کا طواف عمر بھر میں بس شاہیںؔ
اب اپنا مرکز و محور تلاش کرتی ہوں

تلاش وجستجو ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو انکشاف اور ایجاد کی منزل تک لے جاتا ہے۔نجمہ اسی کے سہارے انکشاف ذات تک پہنچتی ہیں اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ انکشاف ادراک کی منزلوں کی سیر کراتا ہے:

ان کے یہ اشعار دیکھیں:

رت جگے، آنسو، دعائے بے اثر ہے اور میں
عشق لاحاصل ہے، اک اندھا سفر ہے اور میں

چھوڑ کر آئی ہوں ہر منزل کو میں جانے کہاں
یہ دلِ سودائی اب تک بے خبر ہے اور میں

اب تلک رستے وہی اور عکس آنکھوں میں وہی
اور خود کو ڈھونڈتی میری نظر ہے اور میں

ان اشعار میں ''میں''، یعنی متکلم صرف نجمہ نہیں ہیں بلکہ ہر وہ حساس انسان ہے جو آج کے پُر فتن اور پُر آشوب دور میں جی رہا ہے جہاں خود کو خود کی خبر نہیں ہے۔اسی طرح کے موضوعات کو انھوں نے کئی مسلسل غزلوں میں بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔کئی نظموں میں بھی یہ لَے موجود ہے۔ان کی ایک مشہور نظم کو دیکھیں:

نظم 'محبتوں کا یہ طور سینا'

سنو مسافر
یہ دل صحیفہ سہی مگر اس پہ چاہتوں کی
کوئی کہانی رقم نہ ہوگی
کہ چاہتوں کی ہر اک کہانی اداس آنکھوں سے جھانکتی ہے
اداس چہروں پہ ہی رقم ہے
سو میری مانو تو دل صحیفے کو گزرے وقتوں کی داستانوں سے ہی سجاؤ
یہ دل کی زرخیز جوز میں ہے
تم اس پہ خوشیوں کے رنگ کاڑھو
اسے گلابوں سے ہی سجاؤ
سنو مسافر
محبتوں کا یہ طور سینا
بھٹکتے رہنے کا راستہ ہے

بہت بلندی پہ جانے والوں کو منزلوں کی خبر نہیں ہے
کئی مسافر بھٹک چکے ہیں
کہ ان کو رستے جھٹک چکے ہیں
ہر اک مسافر کے راستے میں نہ کوئی جنت نہ کوئی دوزخ
اگر ملا بھی کسی کو کچھ تو
ملا ہے بس ہجر کا ہی برزخ
ہاں کچھ مسافر جو طور سینا کی عشق منزل پہ جا کے ٹھہرے
انہیں بھی مایوسیاں ملی تھیں
انہیں تجلی نہیں ملی تھی
کوئی تسلی نہیں ملی تھی
سو وہ محبت کی آیتوں کے بغیر لوٹے
عنایتوں کے بغیر لوٹے
سواے مسافر
مری جو مانو تو لوٹ آؤ
یہ دل صحیفہ سہی مگر
اس پہ چاہتوں کی کوئی کہانی رقم نہ ہوگی

یقیناً ان کو رقم کرنا ممکن نہیں لیکن کیا بھی جا سکتا ہے جیسا کہ اس نظم میں بیان ہوا ہے۔اس کی توجیح خود نجمہ کے اس شعر میں موجود ہے:

زمانے بھر کی یہ تلخیاں ہیں جو میرے لہجے میں آ بسی ہیں
میں اپنے شعروں میں دھیرے دھیرے یہ زہر مایہ اگل رہی ہوں

اس غزل کے تمام اشعار حصارِ ذات اور تلاشِ ذات کے ترجمان ہیں، اسی غزل کے دو شعر اور دیکھیں:

یہ ہجر کا راستہ ہے جس پر میں تنہا تنہا سی چل رہی ہوں
بس اس کی یادوں کی دھوپ ہے اور میں قطرہ قطرہ پگھل رہی ہوں

شکستہ خوابوں کی کرچیاں ہیں جو میری آنکھوں میں چبھ رہی ہیں
میں خارزاروں میں چل رہی ہوں میں گرتے گرتے سنبھل رہی ہوں

کروں گی کیا بال و پر کو اپنے قفس میں جینا جو لازمی ہے
کہاں ہے شاہیںؔ شادمانی دکھوں کی دنیا میں پل رہی ہوں

نجمہ کی شاعری کے کئی رنگ ہیں ان میں ایک رنگ عشق اور ہجر و وصال کی کیفیت اور لذت کا بھی ہے۔ یوں تو اردو غزل کا یہ عمومی رنگ ہے مگر ہر شاعر نے اسے اپنے رنگ میں پیش کر کے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ نجمہ کا یہ رنگ ملاحظہ ہو جس میں ان کی الگ شناخت نظر آتی ہے:

عشق کو آنکھ میں جلتے دیکھا
پھول کو آگ میں کھلتے دیکھا

عشق کے راز نہ پوچھو صاحب
عشق کو دار پہ چڑھتے دیکھا

عشق کے دام بھی لگ جاتے ہیں
مصر میں اس کو بھی بکتے دیکھا

عشق وہ باغ ہے جس کو ہم نے
ہجر کی رت میں مہکتے دیکھا

غم کیا ہجر و وصال کا اس کو
عشق میں جس کو بھٹکتے دیکھا

ہجر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو
زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے

تم ستم گر ہو نہ گھبراو؟ مری حالت پر
زخم سہنے کا ابھی مجھ میں ہنر باقی ہے

ان اشعار میں عشق اور ہجر و وصال کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ نجمہ کا اپنا مخصوص انداز ہے اور اس کو پیش کرنے کے لیے انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ ان کی شناخت ہے۔

نجمہ شاہین کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے وہ نئے نئے انداز میں مضامین کو پیش کرتی ہیں۔ کبھی مختصر بحروں کی غزل لکھتی ہیں تو کبھی طویل بحروں کے استعمال سے نغمیت پیدا کرتی ہیں۔ غزل کے بجائے میں حمد کے کچھ اشعار مثال میں پیش کرتا ہوں:

اے میرے مولا اے میرے آقا، بس اپنے رستے پہ ڈال دے تُو
یہ فانی دنیا کے غم ہیں جتنے، یہ میرے دل سے نکال دے تُو

ہو نام تیرا ہی دل کے اندر، ہو ذکر تیرا مرے لبوں پر
ہو اتنی سچی یہ میری چاہت، کہ عشق بھی بے مثال دے تُو

کسی کو رنگ اور نور دے دے، کسی کو عقل اور شعور دے دے

تُو جس کو جو کچھ بھی دے اے مولا، مجھے اک اپنا وصال دے تُو

غزل کے علاوہ نظموں میں بھی نجمہ شاہین نے اپنا ہنر دکھایا ہے اور نئے خیالات و مضامین کو پیش کیا ہے ان کی ایک نثری نظم کی مثال لیں جس کا عنوان ہے ''بکتے دیکھا جہاں'':

جب چھوٹے تھے ہم
ماں ہم کو پیسے دیتی اور کہتی تھی
جاو؟ فلاں دوکان سے جا کر چیزیں لاو؟
ہم معصومیت سے ماں سے سوال کرتے
ماں کیا پیسوں سے ہر شے مل جاتی ہے
ماں مسکرا دیتی
اور کبھی ایسا بھی ہوتا
ایسے ہی کسی چبھتے سوال پر
جب ماں مسکراتی تو یوں لگتا
جیسے اُس کی داہنی آنکھ کا کونہ بھیگ گیا ہے
تب ذہن الجھتا
ماں کے اس طرح مسکرانے پہ
اور یوں اس کی آنکھ کا کونہ بھیگ جانے پہ
پھر یوں ہوا
وقت نے پیرہن بدلا
اٹکھیلیاں کرتا بچپن
جوبن کے رنگ و روپ بدلتے

ذہن و دل کے دریچے بھی وا کرتا گیا
باہر نکلے تو دیکھا
ہر چیز پیسوں سے مل رہی ہے
وفا بھی بِک رہی ہے
اور مروت کے بھی خریدار ہیں بہت
پھر ہم نے سوچا
محبت تو بے مول ہے
یہ تو نہیں بِک سکتی
مگر ظالم وقت کے پیرہن نے
سوچ کا یہ دریچہ بھی بدل ڈالا
عشق کے بھی دام لگتے ہیں یہاں
شاید خرید و فروخت کے لئے بنا ہے یہ جہاں

اس نظم کا آخری مصرعہ اس دنیا کی حقیقت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ بات بچپن کی کہانی شروع ہوتی ہے تو اس دنیا کی حقیقت تک پہنچتی ہے انسانی ذہنیت کی بدلتی ہوئی یہی وہ تصویر ہے جہاں اقدار و روایات کی جگہ مادیت نے لے لی ہے اسی لیے اب انسان اور معاشرے کو دیکھنے کا نظریہ بدل گیا ہے۔ یہی وہ آج کا سب سے بڑا کرب ہے اسی کرب کو نجمہ نے اپنی شاعری میں جا بجا پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ نجمہ شاہین کی شاعری میں موضوعات و اسالیب کی رنگارنگی بھی ہے اور خیالات و افکار کی جلوہ سامانیاں بھی ہیں۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت، گیت اور مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

اور شام ٹھہر گئی

انور سدید (لاہور)

اجنبی شہر کی اجنبی شام میں
زندگی ڈھل گئی ملگجی شام میں

آخری بار آیا تھا ملنے کوئی
ہجر تجھ کو ملا وصل کی شام میں

یہ اشعار ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کی جھوک چکا چوند شہروں سے دور ایک صحرائی بستی میں آباد کر رکھی ہے اور اپنے جزبہ واحساس کے ایسے پیکر مصور کر رہی ہیں جو صرف دور افتاد اور مضافات کے تخلیق کاروں کے باطن میں پرورش پاتے ہیں اور جب شعر کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے ان پر مضامین غیب سے اتر رہے ہیں زیر نظر کتاب "اور شام ٹھر گئی" میں ان کی زندگی کا استعارہ بن گئی ہے بشری' رحمان کو اس لہر کا رنگ، رعنائی اور آہنگ غنائی محسوس ہوا اور انہوں نے شاعرہ کو مشورہ دیا کہ دل کے لہو میں قلم ڈبو کر نشتر کی طرح چلاتی ہو کہ یہی تمھارا سنگھار ہے اور یہی تمھارا پیار ہے۔میں نے اور "شام ٹھر گئی" کی غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو محسوس ہوا کہ 'نجمہ شاہین' زمانہ پوشیدہ، بشری' رحمان کے سیاست گزیدہ مشورے پر صرف اتنا عمل کیا ہے کہ قلم کو دل کے لہو میں ڈبو دیا لیکن اسے نشتر کی طرح چلنے کی اجازت نہیں دی اور انسانی دکھ سے آگہی کا احساس پیدا کیا اور درد کی وہ کہانی بیان کی جو سرائیکی وسیب کی عورتوں کا مقدر ہے۔ملتان

کے مشہور شاعر رضی الدین رضی نے درست لکھا کہ اس کتاب (اور شام ٹھہر گئی) میں ہمیں اس کے ذاتی دکھ اجتمائی دکھوں سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں اور ان کی غزلوں اور نظموں میں ہمیں ایک خاص اداسی دکھائی دیتی ہے جو قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔"ایک سوال۔محبت ایک ضرورت ہے" آدھا سکٹ"

سوال کر کے کیا ملا؟؟"اور موسم ہیں بس چار"

ڈاکٹر نجمہ شاہین کا باطن نئے زاویوں سے سامنے آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے" کہ غزل کی لخت لخت کیفیت ایک حزن مسلسل میں تبدیل ہوگئی ہے۔

'مجھے امید ہے کہ اور""شام ٹھر گئی"" کو اہل نظر بہت پسند کریں گے۔۔یہ کتاب سنگ میل پبلیکیشنز نے اپنی روایتی حسن اور سلیقے سے شائع کی ہے۔

حسنِ وروں کی شاعرہ

ڈاکٹر مقصود جعفری (اسلام آباد)

ڈاکٹر نجمہ شاہین ڈیرہ غازی خان کے چمنِ ادب میں گُلِ سرمدی اور نغمہ ابدی ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے آپ گائنیکالوجسٹ (Gynecologist) ہیں۔ عورت جب موت سے کھیلتی ہے تو تحفہ تخلیق بصورتِ زندگی عطا کرتی ہے۔ ذہنی تخلیق کا عمل بھی بہت جانکاہ ہوتا ہے۔ محترمہ نے اپنی شاعری کی تین کتابوں کی واٹس ایپ ارسال کی ہے۔ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، ''اور شام ٹھہر گئی'' اور '' پھول سے بچھڑی خوشبو''۔ آنکھوں کو کھلا رکھنا شیوہ دانشوراں اور صاحب نظراں ہے۔ لیکن نجمہ شاہیں مُصر ہیں کہ آنکھیں بند رکھی جائیں۔ اس کا جواز وہ کتاب کی ایک نظم جسکا عنوان'' میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں یوں دیتی ہیں کہ میں آنکھیں اِس لئے بند رکھتی ہوں کہ میرے ٹُوٹے ہو؟ خوابوں کی کرچیاں میری آنکھوں کو زخمی نہ کر دیں اور اگر میری کُھلی آنکھوں نے بے وفا اور بے ضمیر لوگوں کو آئینہ دکھایا تو کوئی لوگ اِس کی تاب نہ لا سکیں گے۔ گویا کتاب کا عنوان ہی یہ اعلان کر رہا ہے کہ اُن کی شاعری ذاتی اور آفاقی نوحہ ہے۔ محترمہ کی شاعری میں دردِ ہجراں کی کسک اور غُنچہ وفا کی مہک ہے۔'' میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کے پیش لفظ میں زندگی کو دُکھ اور سُکھ کا آمیزہ قرار دیتی ہیں۔ آگہی کے لمحے کو حاصلِ زندگی گردانتی ہیں۔ مرزا غالب نے کہا تھا'' اے روشنیءطبع تو برمن بلا شدی''۔ یہی حال نجمہ شاہین کا بھی ہے۔ کہتی ہیں:

بڑی مشکل سے ملتا ہے مقامِ آگہی شاہیں
عجب شہکار دیتا ہے ہمیں یہ دردِ تنہائی

وہ خود کو دشتِ وحشت اور دشتِ تنہائی کی راہی قرار دیتی ہیں اور عشقِ لا حاصل کے انجام پر نوحہ کناں ہیں اور اشک فشاں ہیں۔

ممتاز انگریزی زبان کی شاعرہ املی ڈکنسن (Emily Dickinson) کہتی ہیں۔

''Iconfess that Ilove him,
Irejoice that Ilove him,
Ithank the maker of Heaven and Earth,
that gave him me to love''.

ڈاکٹر نجمہ شاہین الزامِ عشق پر مشرقی روایتی خواتین کی طرح نہ شرماتی ہیں نہ لجاتی ہیں اور نہ ہی گھبراتی ہیں بلکہ محبّت کو سرشاری کا سر چشمہ سمجھتی اور انسان کا فطری حق گردانتی ہیں۔ بقولِ حافظ شیرازی:

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
ای بی خبر ز لذّتِ شُربِ مُدامِ ما

وہ دشتِ وحشت میں سرگرداں ہیں اور بانگ دہل اعلان کرتی ہیں:

دشتِ وحشت میں لیے جاتے ہیں جذبات ہمیں
جانے ہوتی ہے کہاں شام کہاں رات ہمیں

روایتی شاعری میں عشق کا حق مرد کو دیا گیا اور عورت کو بتِ طنّاز، بے وفا، سنگدل اور بے نیازِ عشق و وفا کہا گیا۔ گویا شاہراہِ عشق پر یکطرفہ ٹریفک چلتی رہی۔ آتشِ عشق کو مرد کے قلبِ سوزاں میں بھڑکتا دکھایا گیا اور عورت کو شبنم اور برف زار گردانا گیا۔ آج کی جدید دنیا میں عورت نے غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کر کے برملا محبّت کے گیت گا؟ جو اُس کا فطری میلان اور تقاضا ہے۔

نجمہ شاہین کی شاعری میں شدتِ عشق کا جذبہ نمایاں ہے۔ اُن کے جذبات و احساسات میں بلا کی حدّت و شدّت ہے۔ وہ عشق کو کارِ گناہ نہیں بلکہ کارِ ثواب سمجھتی ہیں۔ آج بھی مشرق میں نوجوان لڑکے اور لڑکی کو محبّت کی یہ سزا دی جاتی ہے کہ انہیں بے حیا، بے

شرم اور بدکار جیسے مکروہ خطابات سے نوازا جاتا ہے۔نوجوانوں کو مرضی کی شادی کرنے پر غیرت کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ اُن کا قانونی، اسلامی اور انسانی حق ہے۔

نجمہ شاہین نے اخلاقی اور معاشرتی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے محبّت کو ہر انسان کا حق قرار دیا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں:''محبّت جتنی زیادہ ہو پھر بھی کم ہے اور نفرت جتنی کم ہو وہ زیادہ ہے''۔

نجمہ شاہین کی شاعری سادہ وسلیس ہے مگر روانی اور شیرینی کی آئینہ دار ہے۔ سلاست و بلاغت وموسیقّت کی شہکار ہے۔فطری شاعری ہے۔ رومانوی شاعری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ چند اشعار سنیں اور سر دُھنیں

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تُجھ کو
زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے

سوزِ فراق و ہجر میں رنجور ہو گئے
اپنی فصیلِ درد میں محصور ہو گئے

شاعر صاحبِ شعور ہوتا ہے۔اُس کی آپ بیتی میں جگ بیتی بھی ہوتی ہے۔

جہاں نجمہ شاہین کی شاعری میں جذبہ عشق کی فراوانی اور تابانی ہے وہاں کہیں کہیں اُن کا دلِ دردمند انسانی حقوق اور وطن کی محبّت میں شدّت سے بیتاب دکھائی دیتا ہے۔کہتی ہیں؟

عجیب سی رُتیں تھیں اور عجب ہی پیرہن ملا
کہ لوگ پھول مانگتے تھے اور اُنہیں کفن ملا

گلی گلی میں بس رچی ہوئی ہے خون کی مہک
یہ موسمِ بہار بھی عجب تجھے وطن ملا

وطنیت کا جذبہ علامتِ ایمان ہے۔ نجمہ شاہین کی شاعری دوآتشہ ہے یعنی غمِ جاناں بھی اور غمِ دوراں بھی۔ یہ صدا؟ بروں بھی ہے اور نوا؟ دروں بھی۔ اکثر نظمیں نہایت دلدوز اور دلسوز ہیں۔غمِ ہجراں اور کم نظرء انساں کا نوحہ ہیں۔خصوصاً یہ نظمیں بہت رومانوی ہیں۔''بس ایک لمحہ اگر مل جا؟''،''فکر یہ''،''اعترافِ وفا''،''آکاس بیل''،آخری ملاقات کا منظر''،اور''ہاں میں ایک شاعرہ ہوں''۔

نجمہ شاہین عشقِ مجازی کی تلخیوں کو بُھلا کر عشقِ حقیقی کی جانب بہ صد نیاز رواں دواں ہیں۔اُن کی نظمیں''مجھے فرائضِ محبّت سے آزاد کر دے''،''معبود بن خود میرا''،اور''دیدارِ کعبہ''روحانی سفر کی غماز ہیں۔اب اُن کی جاسکوں عشقِ الٰہی اور حبِّ رسول صلعم ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین نے گیسوئے اردو ادب کو خونِ دل سے سنوارا ہے- وہ اُس ادبی کارنامہ کے لیے داد وتحسین کی مستحق ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین عشق مجازی کے سنگلاخ صحرا کو عبور کر کے عشقِ حقیقی کی وادی میں مصروفِ گُلگشت ہیں- اردو شاعری میں خواجہ میر درد عشقِ حقیقی کے بحرِ عمیق میں غوطہ زن تھے۔اُن کا مشہور شعر ہے:

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا
تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

شیخ محی الدین ابنِ عربی کو امامِ تصوف کہا جاتا ہے۔اُن کی تصنیف''فصوص الحکم'' تصوف کا سرچشمہ گردانی جاتی ہے- حقیقی تصوف اقرارِ وحدانیّت اور احترامِ انسانیّت ہے- ڈاکٹر صاحبہ حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کا پیکر ہیں اور اسی حسن کے بارے میں فرمایا گیا''اللہ جمیل ویحب الجمال''-ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری''حسنِ مجسّم'' کی آئینہ دار ہے-''میرا صاحب سائیں عشق ہے تو''اُن کا زیرِ اشاعت شاعری کا مجموعہ ہے جو روح کی آواز اور دلِ شکستہ کا ساز ہے- قرآنِ مجید میں آیتِ مبارکہ ہے''اپنے دلوں کو ذکرِ الٰہی سے اطمینان دو''- دلِ بے تاب کی روحانی آب و تاب ذکرِ الٰہی میں مستور ہے اور یہی مینارہ نور اور سرمایہء کیف وسرور ہے- ڈاکٹر صاحبہ کی تازہ تصنیف شبِ تیرہ و تار میں چراغِ طور ہے-

استادِ محترم پروفیسر صفی حیدر دانش مرحوم کی تصنیف اردو ادب اور تصوف کے موضوع پر بہت معلوماتی کتاب ہے۔ڈاکٹر صاحبہ نے جُرعِ عشق پیا اور بقولِ حافظ شیرازی

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدِ عالم دوامِ ما

آپ نے عشقِ حقیقی کا جام پی کر بقائے دوام حاصل کرلیا ہے اور یہی زندگی کی معراج ہے۔مشتے ازخروارے اُن کی تازہ غزل کے دو اشعار سنیئے اور سر دُھنیے۔

آنکھوں میں لیے درد کا طوفان کھڑی ہوں
اے عشق ترے در پہ میں حیران کھڑی ہوں

محشر میں مرے اشک گواہی مری دیں گے
دُنیا کے خدا کا لئے احسان کھڑی ہوں

ڈاکٹر مرحوم کی تصنیف اردو ادب اور تصوف کے موضوع پر بہت معلوماتی کتاب ہے۔ڈاکٹر صاحبہ نے جُرعہ عشق پیا اور بقولِ حافظ شیرازی

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

آپ نے عشقِ حقیقی کا جام پی کر بقاۓ دوام حاصل کرلیا ہے اور یہی زندگی کی معراج ہے۔مشتے ازخروارے اُن کی تازہ غزل کے دو اشعار سنیئے اور سر دُھنیے:

آنکھوں میں لیے درد کا طوفان کھڑی ہوں
اے عشق ترے در پہ میں حیران کھڑی ہوں

محشر میں مرے اشک گواہی مری دیں گے
دُنیا کے خدا کا لئے احسان کھڑی ہوں

شام کے سائے میں روشنی کے متلاشی

سلیم ناز

میری طرح کئی شعری ذوق رکھنے والے ایک عرصہ تک اس سوچ میں مبتلا رہے کہ نجمہ شاہین کامیاب ڈاکٹر ہیں یا کامیاب شاعرہ لیکن ان سے مل کر یہ احساس ہوا کہ وہ ایک کامیاب خاتون ہیں۔جن کی شخصیت کئی پہلوؤں سے مالا مال ہے۔ان کے میاں فرید صاحب کے چہرے پر خوشی واطمینان دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ تابعدار زوجہ ہیں۔ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت پر نظر ڈالیں تو نجمہ شاہین ایک سلیقہ مند ماں کے روپ میں بھی سامنے آتی ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین خاندانی روایات سے باغی ہونے کے باوجود اپنے خاندان کا عزت وقار مقدم سمجھتی ہیں۔انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ پھول سے بچھڑی خوشبو کا انجام کیا ہوتا ہے۔وہ آنکھیں ضرور بند رکھتی ہیں مگر شعور کی آنکھ سے اپنے اردگرد کے حالات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔اُنہوں نے اپنی شناخت کے لیے معاشرتی رویوں اور محبت کو بنیاد بنایا ہے۔گہرے تفکرات اور حساس جذبات کے مدوجذر کی روانی کو جب اظہار کا ذریعہ بناتی ہیں تو خوبصورت شاعری جنم لیتی ہے۔

وہ گھٹن زدہ ماحول اور فرسودہ روایات کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں تو کہیں اپنے ٹوٹے ہوئے جذبوں اور زخمی خواہشوں کو شعریت کا لبادہ پہناتی ہیں۔کبھی انہیں سوچوں کی ٹھہری ہوئی جھیل میں دائرے بناتے دیکھتا ہوں تو کبھی بادلوں میں اڑتی نظر آتی ہیں اور حال ہی میں منظر عام پر آنے والے تیسرے شعری مجموعہ میں تو شام کو ٹھہرا کر روشنی کی تلاش میں نظر آتی ہیں اس لیے تو کہتی ہیں:

جو کھو چکے ہیں وہ منظر تلاش کرتی ہوں
بکھر گئے ہیں جو پیکر تلاش کرتی ہوں

کبھی تلاش جو کرنا ہو اپنا آپ مجھے
تو اس کی ذات کے اندر تلاش کرتی ہوں

اگر نجمہ شاہین اپنی خاندانی روایات سے بغاوت نہ کرتیں تو ڈی جی خان کے ایک پسماندہ گاؤں میں بسنے والی مظلوم خاتون ہوتیں۔ان کی شاعری میں محرومی کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آج بھی اپنے ان خوابوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو انہوں نے میڈیکل کی تعلیم کے دوران اپنی آنکھوں میں سجائے تھے ان کا کہنا ہے:

خاک ہو جائیں گے ہم تعبیر کی خواہش لیے
خواب میں ہی اپنا یہ جیون بسر ہو جائے گا

مجھ کو شاہین خوف ہے تو بس اس لمحے سے
جب وفا کا نام ہی دُنیا میں ڈر ہو جائے گا

شعر کہنا کوئی آسان کام نہیں مگر جب کوئی خاتون شعر کہے تو غزل کے معنی اُلٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست تو صنف نازک کی شاعری کے سخت خلاف ہیں۔ ان کا موقف ہے مرد تو اسے سراپا غزل تصور کرتے ہوئے شاعری کرتا ہے جب عورت بذات خود شعر کہنے لگے تو مرد کس پر غزل کہیں۔یہی وجہ ہے کہ بعض شاعر عورت کی شاعری کو بمشکل ہی ہضم کر پاتے ہیں۔ یقیناً ڈاکٹر نجمہ شاہین بھی ایسی مشکل صورت حال سے دوچار ہوتی ہوں گی ۔ یہ انکی خود اعتمادی کا ثمر ہے کہ وہ اب ڈی جی خان جیسے شہر میں منفرد لہجے کی شاعرہ شمار ہونے لگی ہیں۔ کہتی ہیں:

ابتدا درد ہے انتہا درد ہے
عشق کا درد تو لادوا درد ہے

میں نے پوچھا وفا کا صلہ جو کبھی
اس نے ہنس کر یہ مجھ سے کہا درد ہے

سنجیدگی، بردباری، عاجزی، دردمندی، مذہب سے وابستگی کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی گہرائی ان کی شخصیت میں رچی بسی ہوئی ہے۔اس لیے گھر کے سوا اردگرد کے حالات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر بھی ہیں اور وسعت فکر بھی۔ میں سمجھتا ہوں ان کی کامیابی میں دو مردوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک ان کے والد محترم جان محمد صاحب، خاندانی روایات کے باوجود جنہوں نے ہر قدم پر ان کی حوصلہ افزائی کی اور دوسرے ان کے شوہر فرید صاحب ہیں جو صابر بھی ہیں اور شاکر بھی۔ اگر ڈاکٹر صاحبہ اپنی مصروفیات میں سے تھوڑا وقت گھر اور گھر والوں کے لیے نکال لیں تو فرید صاحب شکر ادا کرتے ہیں ورنہ اُنہیں صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں نے تو انہیں مشورہ دیا ہے کہ آپ بھی شاعر بن جائیں۔ ''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو''اور وہ خوبصورت جواب دے کر مجھے لاجواب کر دیتے ہیں کہ'' کیسے بن جاؤں شاعر تو ہوتا ہے بنتا کب ہے ۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کو اس بات کا قطعاً زعم نہیں کہ وہ ڈیرہ غازی خان کی مشہور ڈاکٹر اور معروف شاعرہ ہیں لیکن انہیں اس بات پر فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے خاندان کی روایات کی پاسداری کو مقدم رکھا ہے۔ اُنہیں اس بات کا گلہ ہی رہتا ہے کہ گھر میں ان کا کوئی سامع نہیں جب داد دینے کا وقت ہو تو فرید صاحب خراٹے لینا شروع کر دیتے ہیں اور مریض بھی واہ واہ کی بجائے ہائے ہائے کرتے ہوئے کلینک میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا تھا اگر مریضہ کے آپریشن کے دوران کوئی شعر وارد ہو تو ڈاکٹر صاحبہ کیا کرتی ہوں گی ۔ کہتے ہیں مسلسل پڑھنے سے بعض ڈاکٹر زدماغی طور پر غیر حاضر ہوتے ہیں۔اس

لیے تو اکثر مریضہ کے پیٹ کے اندر تولیہ قینچی بھولنے کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مجھے ڈر رہتا ہے کہ کبھی ایسی خبر پڑھنے کو نہ ملے کہ شاعرہ ڈاکٹر مریضہ کے پیٹ میں غزلوں اور نظموں والے ’’نسخے‘‘ بھول گئیں۔ ایک دن ان سے پوچھ ہی بیٹھا تو کہنے لگیں جب ہاتھ میں نشتر اور قینچی ہو تو شعر نہیں بلکہ ذہنی اُفق پر زچہ و بچہ کی صحت کے لیے دعائیں اُتر رہی ہوتی ہیں۔ میں پہلے ڈاکٹر ہوں اور بعد میں شاعرہ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تخلیقی اظہار کا وصف وہ نرم رو تمازت ہے جو درد و کرب کو شخصیت میں جذب کرنے کے بعد ہی عورت کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ پکار اٹھتی ہیں:

اس سے بڑھ کر مری وفا کا کوئی نہیں گواہ
غزلیں نظمیں، سجدے، آنسو اور اک شب سیاہ

’’میرا صاحب سائیں، عشق ہے تو‘‘:

محسن علوی صدر دائرہ ادب نیویارک

ممتاز شاعرہ محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا شمار دور حاضر کی یقیناً صف اول کی شاعرات میں ہو رہا ہے۔ جہاں ان کی ہم عصر شاعرات میں بہت سارے نام ادب کے افق پر جگمگا رہے ہیں۔ وہیں محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا نام بھی ایک دمکتا اور جگمگاتا نام ہے جن کی شاعری کو سن کر اور پڑھ کر انکی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ شاعری نام ہی انسانی جذبات و احساسات کا ہے اور جب ان کو لفظوں کا پیراہن عطا کر دیا جائے تو شاعری دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری سچی حقیقتوں کی محبت وفا روا داری مروت اور خلوص و پیار اور اپنی اقدار کی علمبردار نظر آتی ہے:

محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی کتاب میں اللہ اور اسکے رسول سے ان کی سچی محبت کا احساس ہوتا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں؛

میرا روپ سنوار دے سائیاں
بس تو ہی درکار ہے سائیاں

شاہیں نبی ﷺ کے دم سے ہی مجھکو ہوئی عطا
مرتے ہوئے وجود میں جینے کی روشنی

یہ دین ہے ایماں ہے اور عشق کا یہ مان ہے
سب درد والوں کے لئے قرآن ہی اکسیر ہے

یزداں بھی بھیجتا ہو جب ان ﷺ پر درود پاک
اس سے بلند تر تو کوئی شان ہی نہیں

وہیں ان کی غزلیں بھی بعض جگہ فکر وفن کی بلندی کا احساس دلاتی نظر آتی ہیں۔وہ اپنی شاعری میں عورت کے مسائل کی سچی ترجمان نظر آتی ہیں۔ہجر و وصال کی کیفیات،غم و اندوہ کے تانے بانے کچھ اسطرح بنتی ہیں کہ دوسروں کے غم بھی ان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی غزلوں کے چند اشعار دیکھیئے :

غزلیات

تو نہیں تو جان جاں پھر یہ جہاں بھی کچھ نہیں
جز ترے رنگینیء کون و مکاں بھی کچھ نہیں

آنکھوں میں لئے درد کا طوفان کھڑی ہوں
اے عشق ترے در پہ میں حیران کھڑی ہوں

حال پوچھو نہ کبھی بچھڑے دلوں کا شاہیں
اپنے لاشوں کو ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے لوگ

کھلنے لگے ہیں زخم گلابوں کے رنگ میں
رنگ خزاں میں ایسے سجایا گیا مجھے

میں چپ تھی جب تو کوئی تذکرہ نہیں تھا کہیں
لیا جو نام ترا پھر تو ہرزباں پہ رہی

خاک ہوجاتا ہے انسان جنوں میں اکثر
عشق کی تو یہی پہچان ہے آئے کوئی

یقین ہے کہ وہ مجھ پر یقین رکھتا ہے
گمان ہے کہ وہ اب تک گماں میں رہتا ہے

میں اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر ممتاز شاعرہ محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔

اور شام ٹھہر گئی

جاوید اختر چودھری (لندن)

میں اپنے عہد میں اپنے ہم عصروں سے بہت ساری باتوں میں بہت پیچھے ہوں۔ مجھ کو سمارٹ فون استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں۔ برسوں نوکیا کا چھوٹا سا فون زیرِ استعمال رہا۔ چند ہفتے پہلے وہ خراب ہوا تو نیا فون لیا اور اب اس کے استعمال کا ہنر سیکھ رہا ہوں اسی طرح میری سوشل میڈیا سے بھی وابستگی نہیں۔ میں خط و کتابت اور ٹیلی فونی رابطوں پر یقین رکھتا ہوں۔

کچھ عرصہ قبل ایک دوست نے فیس بک پر اکاؤنٹ بنانے کا مشورہ دیا۔ فیس بک پر جہاں نام نہاد دانشوروں اور پروفیسروں سے پالا پڑا وہاں اچھے بلکہ بہت اچھے لوگوں کی رفاقت بھی ملی۔ فیس بک پر ادبی حضرات۔۔۔ ڈاکٹر غلام شبیر رانا، خورشید بیگ میلسوی، سید ساجد علی شاہ بخاری، میجر غلام نبی اعوان، دردانہ نوشین،

صائمہ بخاری، ڈاکٹر اشرف کمال، عذرا اصغر، سید حامد سراج، اختر سردار چودھری ، میاں وحید الرحمٰن اور مجید سالک جیسے دیگر معتبر لوگوں سے متعارف ہوا، ان سے فیض حاصل کیا۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین سے بھی فیس بک کے ذریعے شناسائی پیدا ہوئی۔ وہ اپنی ٹائم لائن پر اپنا کلام لکھتی اور داد حاصل کرتی رہی ہیں۔ کسی لمحے انہیں میرے comments پسند آئے اور انہوں نے اپنی تصنیف ’’اور شام ٹھہر گئی‘‘ کے دو نسخے مجھ کو ارسال کیے۔ ایک میرے لئے اور ایک اپنے والد صاحب کے دوست کے لئے جو مانچسٹر میں مقیم ہیں۔ کتاب کے عنوان نے مجھے چونکا دیا۔ سرورق پر شام ڈھلنے کا منظر ہے۔ درختوں کے جھنڈ اور پانی

میں غروب ہوتے سورج کا عکس نمایاں ہے۔ یہ شعری مجموعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے 2013 میں شائع کیا۔ ابتدا میں ڈاکٹر نجمہ شاہین نے اپنی غزل کے دو شعر لکھے ہیں:

اجنبی شہر کی اجنبی شام میں
زندگی ڈھل گئی ملگجی شام میں

آخری بار آیا تھا ملنے کوئی
ہجر مجھ کو ملا وصل کی شام میں

اور انتساب ہے:

’’امی ابو اور عمر حمزہ کے نام جو میرے جیون کا بہانہ ہیں۔ اور۔۔ اُن دکھوں کے نام جو سرمایہ حیات ہیں۔‘‘

کتاب کی ابتدا ڈاکٹر نجمہ شاہین کے مضمون ’’کچھ سوچیں، کچھ باتیں آپ سے‘‘ ہوئی ہے اور اس کے بعد امجد اسلام امجد، بشریٰ رحمان، شاکر حسین شاکر، رضی الدین رضی، قمر شہزاد اور جاوید احسن کے خوبصورت مضامین ہیں۔ بشریٰ رحمٰن لکھتی ہیں ’’حسن اتفاق ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین مسیحائی کی ڈگر پر نکلی ہیں۔ یہ ڈگر تھی تو مشکل مگر اس کے اندر انسانیت کے لئے وقار اور پیار کا انمول خزینہ تھا۔ قدرت نے ویسے بھی عورت کے ذمے کوئی نہ کوئی مسیحائی لگا رکھی ہے۔ وہ ماں کی صورت میں ہو بہن، بیٹی یا بیوی کی شکل میں ہو۔ اس کا وجود، اس کا دَم درود اور اُس کا مقصود انسانی زنجیر میں بندھے رشتوں کو بڑھاوا دینا اور دوام بخشنا ہوتا ہے۔ اس لئے تقدیر نے نجمہ کے ہاتھ میں قلم کے ساتھ نشتر بھی پکڑا دیا۔ ایک طرف حنائی ہنر عطا کر دیا تو دوسری طرف مسیحائی کی ادا بھی بخش دی۔ غنائی لہجہ اُس کو شاعری نے دیا۔‘‘

نجمہ شاہین کی کتاب مجھے جوں ہی ملی میں نے اپنی پہلی فرصت میں اس کی رسید کی اطلاع دی اور دوسری کتاب فراہم کردہ پتے پر بھیج دی۔ مجھ جیسے جز وقتی افسانہ نگار اپنے سینئرز کو کتاب اس لئے روانہ کرتے ہیں تا کہ اپنی تحریر کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ چل

سکے۔لیکن اکثر بڑے نام اپنی دانشوری اور رعونت کے باعث جونیئرز کو گھاس تک نہیں ڈالتے۔رسید کی اطلاع دینا تک گوارا نہیں کرتے۔حالانکہ ای میل،اور فیس بک پر اطلاع دینے پر چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔میری نجمہ شاہین سے دو یا تین بار ٹیلی فون پر بات بھی ہوئی۔پہلی گفتگو میں میں نے کتاب کی رسید کی اطلاع دی اور یہ گفتگو مختصر تھی۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی مسیحائی اور شاعری دونوں سے اپنا مقام پیدا کرلیا ہے۔لوگ انہیں ان کے اچھے کاموں اور اچھی شاعری کی وجہ سے یاد کرتے ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کے دوسرے شعری مجموعے میری نظر سے نہیں گزرے۔لیکن اس مجموعے کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحبہ نے شعری راہوں پر اپنے پیر مضبوطی سے جما لئے ہیں۔اور اعتماد سے شعر کہہ رہی ہیں۔وہ جو، جیسا دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں شعری قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین اب ادبی دنیا میں نووارد نہیں۔وہ بہت پرعزم ہیں،کوئی بھی ادیب جب ادبی دنیا کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو پہلے پہل وہ نووارد ہی ہوتا ہے پھر وقت اس کی صلاحیتوں کو صیقل کرتا ہے۔ریاضت،لگن اور محنت نے ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری کو کندن بنا دیا ہے۔شیر شاہ سوری کو زندگی کی شام میں حکمرانی کا موقع ملا تو اس نے پانچ سال کی مختصر مدت میں تاریخی کام سرانجام دیا۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کی اوائل زندگی میں ہی ''شام ٹھہر گئی'' تو اس نے خوبصورت شاعری کے تحفے سے لوگوں میں خوشیاں بانٹیں اور عورتوں کی مسیحائی کا سبب بنیں۔ڈاکٹر شاہین کھوسہ محبت کی شاعر ہیں۔لہٰذا ان کی ایک نظم حاضر ہے بعنوان ''محبت اک ضرورت ہے'' جو بہت دلپذیر ہے:

''محبت اک ضرورت ہے''

بہت سے لوگ کہتے ہیں//کہ رشتے گر ضرورت سے جڑے ہوں تو//وہ اکثر ٹوٹ جاتے ہیں//ضرورت پوری ہونے پر ضرورت مند ایک دوجے سے//اکثر روٹھ جاتے ہیں//مگر یہ بھی حقیقت ہے//کہ یہ دنیا ضرورت ہے//یہاں پر سانس لینا،بات کرنا//ساتھ چلنا اور دھڑکنا//ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہونا//اور پھر چپکے سے رونا//یاد

رکھنا،بھول جانا//بھول جانے پر کسی کو یاد کر کے مسکرانا//سب ضروری ہے//کسی کا نام لکھ کر ڈائری کو خود چھپانا//گیت لکھنا،گنگنانا//خواب تکنا،راہ تکنا//ور پھر اک دن کسی کی راہ میں چپکے سے مرنا//سب ضروری ہے//یہاں سب کچھ ضرورت ہے//یہاں سب کچھ ضروری ہے//سو تم مانو نہ مانو//بس مجھے تو اچھا لگتا تھا//وہ جب بھی مجھ سے کہتا تھا//مجھے تیری ضرورت ہے//مجھے تیری ضرورت ہے//محبت اک ضرورت ہے//یہی تو اک عبادت ہے//ریاضت ہی ریاضت ہے۔'ایک مؤثر نظم یا کہانی لکھنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کسی سدرہ کی جھاڑی سے ٹیک لگا کر استراحت میسر آنے کی امید۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کا مطالعہ وسیع ہے اور رب العزت نے انہیں خوبصورت تحریر لکھنے کا سلیقہ بھی عطا کیا ہے۔مزید ان کے پیشے نے انہیں وہ نگاہ دے دی ہے جس سے وہ اپنے ہم جنس کے درد کی تشخیص اور اس کا مداوا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔چنانچہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کی تحریریں اردو ادب کا ایک مؤثر ورثہ ہیں۔اور اس ورثہ کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔

ٹھہری ہوئی شام میں روشنی کی تلاش

شاکر حسین شاکر

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا شمار اُن شاعرات میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت مختصر وقت میں اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کروایا۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران شائع ہونے والے اُن کے شعری مجموعوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں اُن کے ہاں بتدریج ایک ارتقائی عمل دکھائی دیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری میں جو پختگی آئی اُس کا ثبوت اُن کا زیرِ نظر شعری مجموعہ ہے۔ نجمہ شاہین کی شاعری سرائیکی وسیب میں رہنے والی ہر عورت کے دکھوں کی کہانی ہے۔ محبت اُن کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے جس کی دھیمی دھیمی آنچ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ وہ بہت سادگی کے ساتھ بات کرتی ہیں۔ وہی انداز جو اُن کی شخصیت سے بھی جھلکتا ہے۔ لفظوں کی بُنت، جذبوں کی سچائی مل کر ایک ایسا منظر بناتی ہیں جس میں اُداسی ہے، ہجر کے دُکھ ہیں اور معاشرتی ناانصافیوں کا نوحہ بھی۔ انہوں نے بہت وقار کے ساتھ یہ شعری سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود شاعری کو وقت دینا اُن کی کمٹمنٹ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کہ آپ ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض بھی تندہی سے انجام دیں اور پھر شاعری کے کٹھن خارزار میں بھی ثابت قدمی کے ساتھ سفر جاری رکھیں۔ ادبی حلقوں نے اُن کے پہلے دو شعری مجموعوں کو بھرپور پذیرائی دی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تیسرا شعری مجموعہ اُس سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل کرے گا اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ٹھہری ہوئی شام میں سے روشنی تلاش کرنے کی کوششیں جاری رکھیں گی۔

روایتی جبر شاعرات کی ترقی میں بڑی رکاوٹ

شاکر حسین شاکر

روایتی جبر شاعرات کی ترقی میں بڑی رکاوٹ ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ تخلیقی شعور کی عکاس ہونے کے علاوہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں۔ میں شروع سے اس بات سے اختلاف کرتا ہوں کہ شاعروں کو زنانہ اور مردانہ خانوں میں تقسیم کرنے والے وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ خواتین شاعری نہیں کرسکتیں وہ حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔ جس وقت اردو شاعری میں فیض، فراز کا ڈنکا بج رہا تھا اس زمانے میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور ادا جعفری کی شاعری بھی بڑی توجہ سے پڑھی جارہی تھی۔ وقت گزرتا تھا فیض اور فراز کی فہرست میں امجد اسلام امجد، قتیل شفائی، ابن انشاء جیسے شعراء شامل ہوگئے تو دوسری جانب پروین شاکر، نوشی گیلانی اور دیگر شاعرات نے اردو شاعری میں جگہ بنانی شروع کردی۔ نوشی گیلانی کے آغاز سفر میں اگرچہ بہت آسانی رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نوشی گیلانی کی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مشکلات کا سامنا پروین شاکر کو بھی کرنا پڑا لیکن عین جوانی کی موت نے انہیں بہت سے معاملات سے محفوظ کرلیا۔ البتہ نوشی گیلانی کا تذکرہ اس لیے تفصیل سے آگیا ہے کہ یہاں کی خواتین پڑھنے لکھنے کے باوجود روایتی جبر کا شکار ہیں وہ جبر گھر سے لے کر گھر تک اور گھر سے باہر ہر جانب ان کا استقبال کرتا ہے۔ یہاں کی عورت زخم سہتی تو ہے لیکن بغاوت نہیں کرتی۔ جنوبی پنجاب کی عورت کے پاؤں زخمی ہیں لیکن اس کا سفر جاری ہے۔ میرے وسیب کی عورت روایتی مرد کے جبر کا شکار تو ہورہی ہے۔ لیکن وہ جبر کے بارے میں آواز بلند نہیں کرسکتی۔ یہ جبر کا ماحول ہمیں اپنے علاقے میں ہر جگہ ملتا ہے لیکن جب میں

لغاری، گیلانی، خاکوانی، مزاری، کھوسہ، قریشی خاندان کی کسی خاتون کو علم وادب کے ساتھ وابستہ دیکھتا ہوں تو میرے دل سے ان کی سلامتی کے لیے بے ساختہ دعا نکلتی ہے۔ اسی طرح جب میرے ہاتھوں میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا پہلا شعری اثاثہ آیا تو مجھے یوں لگا کہ ڈیرہ غازی خان کی سنگلاخ زمینوں میں ایک لیڈی ڈاکٹر اپنے نازک ہاتھوں سے گلاب کے پودوں کی آبیاری کر رہی ہے۔ اس شعری مجموعے کا نام ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' تھا۔ لیکن اس کے ہر صفحہ پر خوشبو اشعار کی صورت میں اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دوسرا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا تو وہ بے ساختہ کتاب کے انتساب میں کہہ رہی تھی۔

اسے کہو جب بھی وہ میری تصور دیکھے
میری آنکھوں میں چھپے گرداب پڑھ لے

اسے کہو میں اس کے ذکر میں رہوں نہ رہوں
وہ ہے میرا حرف طلب میرا انتساب پڑھ لے

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کی شاعری میں وہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ موجود نہیں تھی جو پہلے مجموعہ کلام میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دوسرے شعری مجموعے میں بتا دیا کہ وہ اب شاعری کے میدان میں نیا جنم لے رہی ہے۔ سو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنے دوسرے شعری مجموعے میں اپنے گردوپیش کے علاوہ ان لوگوں سے بھی مکالمہ کرتی نظر آتی ہے۔ جن سے عام زندگی میں بات کرنا بھی مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کہتی ہیں۔ خلوص چاہت موت سب اس گونگے، چہرے، اندھے لاحاصل عشق میں رائیگاں ہیں اور جب کبھی شعور پہ منکشف بھی ہو تو تب بھی عشق اندھا بہرہ ہے۔ عشق کو تو بس ایک پیکر چاہئے والے کے لیے۔ اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ پیکر کیا ہے اس کا طلب گار ہے بھی یا نہیں۔ اس کا سارا سرو کار اسی پیکر سے ہے اور جب وقت کا دیو اس سے وہ پیکر چھین لے تو عشق کا

انجام صرف گور رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس پس منظر میں جب شاعری کرتی ہیں تو ان کی ہر غزل میں نیا رنگ ترنگ دکھائی دیتا ہے۔ محبت کے معانی کو نئے مطالب عطا کرتی ہیں اور کہہ اٹھتی ہیں۔

کسی کو میں اب تک خدا لکھ رہی ہوں
میں مجرم نہیں پر سزا لکھ رہی ہوں

میں ہوں ہیر اپنی وفا میں ابھی تک
سو رانجھے کی خود کو صدا لکھ رہی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں رنگ اور پھول نمایاں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نظموں میں روزمرہ کے مسائل کے علاوہ رسم ورواج قدر اور کائنات کے دکھوں کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ تخلیقی شعور کی عکاس ہونے کے علاوہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں جس نے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کر دیا ہے وہ اپنی شاعری میں اردگرد میں پھیلی ہوئی سچائیوں اور بدصورتیوں کو موضوع بناتی ہے۔ جس سے اس کی شاعری میں زیادہ دردانگیزی اور زیادہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ وہ خود پر وار ہونے والے سالحات کو آسانی سے قلم بند کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اسلوب میں نسائی جذبات کے ساتھ روزمرہ کے مسائل پر بات بھی احسن طریقے سے کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ بظاہر آنکھیں بند رکھتی ہیں لیکن بند آنکھوں سے وہ کچھ دیکھ لیتی ہیں جو ہم لوگ کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی پرواز آسمانوں کی طرف جا رہی ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ ان کی شاعری کے رنگ ہمیں قوس قزح میں جلد دکھائی دیں گے۔

باطن کی سچائیوں کا اظہاریہ

قمر رضا شہزاد

جس طرح ادب کو ذات، مذہب، نسل اور علاقائی خانوں میں میں رکھ کر پرکھا نہیں جا سکتا اسی طرح صنفی سطح پر بھی اس کی قدر و قیمت طے نہیں کی جا سکتی۔ مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے تعصّبات کی قید سے رہا ہو ہی نہیں سکتے۔ کبھی کسی کو ''مضافاتی ادیب یا شاعر'' کہہ کر اپنی ناکامیوں اور محرومیں سے نظریں چرا رہے ہوتے ہیں اور کبھی خواتین کی شعری صلاحیتوں سے انکار کر کے اپنی خود ساختہ مردانگی کا ڈنکا پیٹ رہے ہوتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، روشنی اپنا راستہ خود تلاش کر لیتی ہے اور خوشبو کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح شاعر یا ادیب کسی بھی زبان کا ہو یا کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو اُس کے لفظ اُس کے ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

محترمہ نجمہ شاہین کھوسہ بھی جنوبی پنجاب کے ایک پسماندہ ضلع ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی ہی شاعرہ ہیں جو اپنی شاعری کے حوالے سے ادبی منظرنامے پر نمایاں ہوئی ہیں۔ بطور ڈاکٹر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے ساتھ ساتھ تخلیقِ فن سے بھی اپنی کمٹمنٹ نبھا رہی ہیں اور یہی وہ راستہ ہے جو کسی بھی تخلیق کار کو اُس کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

محترمہ نجمہ شاہین کی غزل اور نظم اُن کے باطن سے پھوٹتی سچائیوں کا اظہاریہ ہے۔ اور یہ وہ سچائیاں ہیں جو نہ صرف اُن کے اپنے دکھ سکھ کا احاطہ کر رہی ہیں بلکہ اردگرد پھیلی ہوئی تمام خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کو بھی نہایت سلیقے سے بیان کر رہی ہیں۔ چونکہ

محبت ان کا بنیادی مقصد ہے لہٰذا یہ تمام معاملات محبت تک پہنچنے کے لئے اُن کی شاعری میں ڈھل رہے ہیں۔ اُن کے لفظ لفظ سے چھلکتی محبت کی خوشبو پوری کائنات کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔

محترمہ نجمہ شاہین کھوسہ کا یہ تیسرا شعری مجموعہ اُن کے تخلیقی سفر کا اگلا پڑاؤ ہے اور کسی شاعر کے لئے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ابھی خدا نے اُس کے تخلیقی چشمے کو رواں دواں رکھا ہوا ہے جس سے وہ تشنگانِ ادب کی پیاس بجھانے پر قادر ہے

محترمہ نجمہ شاہین اپنے نئے شعری مجموعے میں نئے رنگ سے ادبی افق پر طلوع ہو رہی ہیں۔۔ ان کا تخلیقی بیانیہ مروجہ موضوعات سے ہوتا ہوا ان کی اندر کی دنیا میں موجود ایک صوفی کو دریافت کرتا ہوا ان کی شاعری میں ظہور کر رہا ہے۔۔۔ یہ وہ خالص جذبات ہیں جو انسان کے انسان اور خدا سے تعلق کو مضبوط تر بناتے ہیں۔۔۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر پر ذات اور کائنات کے بہت سے چھپے ہوئے بھید آشکار ہوتے ہیں۔ محترمہ نجمہ شاہین کا تازہ مجموعہ ایسے ہی بہت سے بھید اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

حسن و لطافت سے بھرپور شاعری

امجد مرزا امجد (لندن)

پھول سے بچھڑی خوشبو،، جب اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے تو پھر اس سے ایسے ہی سخن کی خوشبو فضا کو معطر کر دیتی ہے جیسے ہماری محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام اور اپنی شاعری کی خوشبو سے دنیائے ادب کو معطر کر دیا۔ مجھے ان کا یہ خوبصورت مجموعہ کلام لندن میں مقیم ممتاز شاعر اور معروف کالم نگار محترم سہیل احمد لون نے بھیجا کہ اس پر اپنی رائے لکھیں۔۔ لکھنے کو تو میں نے اب تک تین سو سے قریب کتابوں پر مضامین لکھ ڈالے جو مطبوعہ بھی ہوئے مگر اس دیدہ زیب کتاب نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ سوچتا ہوں کہ مضمون مکمل کرنے کے بعد اخلاقی طور پر یہ کتاب سہیل لون صاحب کو واپس دینی ہوگی۔۔اور کتاب اس قدر خوبصورت ہے اس کی شاعری اس قدر عمدہ ہے کہ۔۔۔نیت خراب ہو رہی ہے۔۔!!(گو ایسا نہیں کروں گا۔)اس میں کوئی شک نہیں کہ میری ذاتی لائبریری میں کم از کم بھی چار سو کتب موجود ہیں گیارہ اپنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اپنے ذاتی ادارے ''سویرا اکیڈیمی'' سے اٹھارہ کتابیں شائع کر چکا ہوں مگر آج تک اس قدر خوبصورت کتاب نہیں دیکھی،اے فور سائز میں گلاسی قیمتی کاغذ سے مزین عمدہ جلد بندی چہار رنگا ڈبل سرورق،نہایت اعلیٰ کوالٹی کی پرنٹنگ،اس پر ڈاکٹر نجمہ شاہین کی خوبصورت تصویر کے ساتھ اعلیٰ وارفع شاعری سونے پر سہاگہ۔۔کتاب ہاتھ میں لیں تو جیسے سارے گلستان سے چنے ہوئے خوبصورت پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں آ گیا۔میں مبارکباد دیتا ہوں محترمہ ڈاکٹر صاحبہ کو ان کے اعلیٰ ذوق و پسند اور خوبصورت درد سے بھری شاعری پر۔۔۔ جسے پڑھ کر کبھی

آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور کبھی دل دھڑکنا بند کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا مگر ان کی شاعری نے یہ سارے فاصلے طے کر دیئے کیونکہ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ سچا اور کھرا قلمکار وہی لکھتا ہے جو اس کا من کہتا ہے اس کی تحریر اس کا پرتو ہوتی ہے وہ اپنی تحریر سے ہی پہچانا جاتا ہے۔اگر ایسی بات نہ ہو تو اس کی تحریر قاری کو متاثر نہیں کر سکتی۔ڈاکٹر نجمہ شاہین انسانیت کے ایک اعلیٰ ترین مقدس پیشے سے تعلق رکھتی ہیں وہ بیمار جسموں میں نئی روح پھونک کر انہیں زندہ رکھنے کا ہنر جانتی ہیں۔اسی طرح وہ اپنے اشعار میں بھی یہ سحر انگیزی کرتی دکھائی دیتی ہیں انہوں نے زندگی کے ہر دکھ سکھ، حالاتِ حاضرہ، ملکی حالات، دکھی انسانیت، انسانی نفسیات، محبت پیار، نفرت، دھوکہ فریب، غرضیکہ زندگی کے تمام عناصر پر نہایت خوبی سے قلمکاری کی ہے۔شاعر ہمیشہ دوسروں کے دکھوں کو اپنے اندر سمو کر محسوس کرتا ہے اور اپنے قلم سے اس کا اظہار کرتا ہے۔یہاں تو بات ہی ایک ڈاکٹر کی ہو رہی ہے جو اپنے ہر مریض کا درد اپنے دل میں سمو کر اس کا علاج کرتا ہے۔سچ لکھا ہے سعداللہ شاہ جی نے کہ اپنے شعبے سے جنوں کی حد تک عشق کر کے انسانیت کی خدمت کیلئے ہمہ تن مصروف رہتے ہوئے زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنے خوابوں کو متشکل کر کے اپنی امنگوں کو تصویروں میں ڈھالنا کسی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔۔!!بلا شبہ یہ کام ہماری شاعرہ نے کیا جو قابل تحسین ہے۔

شبِ فرقت کے ستارے یہ گواہی دیں گے
ہم دل و جاں میں کئی روگ بسا لائے ہیں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کے کلام سے جو مجموعی تاثر ملتا ہے کہ انہوں نے جھوٹی روایات کے بجائے مثبت قدروں سے رشتہ جوڑا ہے ان کی شاعری ایسا آئینہ ہے جس میں ان کے احساسات و جذبات کی نزاکتیں اور لطافتیں، ان کے متخیلہ کا انداز ان کی فکر کی گہرائیوں اور وسعتوں میں یکجا ہو کر کلیتہً نظر آتی ہیں۔

اپنے مجموعہ کلام کو اللہ پاک کے نام سے شروع کیا۔

ہر ایک بحر و بر میں تُو ، وجودِ خیر و شر میں تُو
ہر ایک سمت جلوہ گر جہاں میں اے خدا ہے تُو

نعت رسول مقبول کہنے کا انداز ملاحظہ ہو:

کہوں نعت کیسے، سلیقہ سکھا دو
مری سانس کو موجِ خوشبو بنا دو

اور پھر سخن کی خوشبو ہر سُو اس طرح پھیلی کہ میں کتاب کے آخر تک ایک ایسے سحر میں ڈوبا رہا کہ:

اب مہک تیری مری ہر پور میں یوں رچ گئی
منتظر ہیں آنکھ میں کچھ حیرتیں دہکی ہوئی

دیدہ و بینا رکھنے والے کسی بھی شاعر کا ذہن اپنے دور کی تلخ اور بے رحم حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین بھی اپنے ملکی وملی وسماجی ماحول کے نمایاں مسائل سے متاثر ہیں:

گلی گلی میں بس رچی ہوئی ہے خون کی مہک
یہ موسم بہار بھی عجب تجھے وطن ملا

اور پھر ایک طویل بے یقینی اور بے اطمینانی کے بعد وہ کس قدر مایوسی سے کہتی ہیں:

لبوں پہ جو دعائیں تھیں کہاں نہ جانے کھو گئیں
ہر ایک راہ گزار پر ہمیں تو راہزن ملا

اس خوبصورت مجموعہ کلام میں غزلیں نظمیں شامل ہیں جو الگ الگ حصوں میں تقسیم کی گئیں۔ قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے جب وہ مختلف اصناف میں پڑھتا رہے اس طرح یکسانیت کی بوریت نہیں رہتی۔ تین سو ساٹھ صفحات کی ضخیم جہازی سائز کتاب جس میں شاعرہ اپنی آنکھیں بند کرکے مگر کھلے دل کے ساتھ اپنے من کی باتیں اپنے دل کی باتیں کرتی چلی جاتی ہے، وہ گلہ کرتی ہے کہ:

جس کے خیال نے کیا سب سے جدا مجھے
زخموں سے کر گیا ہے وہی آشنا مجھے

اور جب وہ انسانوں کی بھیڑ میں کبھی تنہا رہ جاتی ہے تو تنہائی اسے ایک نیا کردار دے جاتی ہے:

غضب کی مار دیا ہے ہمیں یہ دردِ تنہائی
نیا کردار دیتا ہے ہمیں یہ دردِ تنہائی

اور پھر اسی دردِ تنہائی کی زمین سے سخن کے پودے پھوٹنے لگتے ہیں:

بڑی مشکل سے ملتا ہے مقامِ آگاہی شاہیںؔ
عجب شاہکار دیتا ہے ہمیں یہ دردِ تنہائی

غزل میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کی فکر کا محور محبوب کی ذات ہے، محبوب سے گلے شکوے اس کی بے وفائی کا گلہ، اپنے محبت کا یقین، تنہائی درد، یادیں، اداسی، آہیں سسکیاں اور آنسو ان عناصر کے بغیر غزل رہتی بھی تو ادھوری ہے نا! انہوں نے انہی موضوعات کو زیادہ استعمال کیا ہے۔ ہم لوگ محبت سے بتا کس کو پکاریں دنیا میں کوئی ہم سا ہمارا نہیں ملتا

انہوں نے اپنے اس خوبصورت مجموعے کو جہاں کئی رنگوں سے سجایا ہے وہاں وہ خود کہتی ہیں کہ انہوں نے اپنے قلم سے لفظوں، خیالوں دکھ اور سکھ سے سجے موتیوں، یادوں کے ڈھیروں پر اٹھنے والی چنگاریوں کو شعلہ بنانے اور دل کی بنجر زمین پہ پھول اگانے کی تمنا کی ہے اور پھر ان تمام تمناؤں کو سخن کا بیج کی طرح کاغذ کی زمین میں بو دیا۔ اور دیکھئے کیسے کیسے رنگ برنگے پھولوں کے گلستان کھل اُٹھے۔۔ جسے انہوں نے ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کا نام دیا۔

ان کی نظمیں بھی درد کی زمین سے اٹھتی ہیں اور حسرتو یاس کے فلک میں کھو جاتی ہیں۔ ان کی نمائندہ نظم ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' نہایت عمدہ تحریر ہے جس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں نا دیگ سے ایک دانہ چاول کا چکھنے سے ساری دیگ کے ذائقے کا علم

ہو جاتا ہے۔

''جب کرچی کرچی شیشوں میں/ بکھرے بکھرے شہروں میں/ جب دل کی نگری لٹتی ہے/ اور دولت کی دیوی پر/ محبت قربان ہوتی ہے/ اور سچائی دم توڑ دیتی ہے/ جب اندھی الجھتی بجلیاں/ آسمان سے گرتی ہیں/ کسی غریب کا گھر جلاتی ہیں/ تو ایسے بے بس لمحوں میں / میں آنکھیں بند رکھتی ہوں۔''

گو مجھے ایک بات عجیب سی لگی۔۔ کہ معاشرے میں ناانصافی دیکھ کر شاعر یا قلمکار اپنی آنکھیں بند نہیں کرتا بلکہ اسے کھلی آنکھوں سے دیکھ کر اس ظلم کے خلاف اپنی قلم سے جہاد کرتا ہے احتجاج کرتا ہے۔ میری کم فہمی کہ میں محترمہ شاعرہ کے اس فلسفے کو سمجھ نہیں پایا جس کے تحت انہوں نے اپنے اس مجموعے کا نام ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''۔۔۔!!

ان کی نظموں کے ہر بند ہر سطر میں ان کی جودتِ طبع اور طرزِ فکر کا نمونہ نمایاں ہے جہاں موجودہ معاشرے میں ناانصافیاں بے رحمانہ رویہ اور سچائیاں سسکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔اس مجموعہ میں ان کی بے شمار نظمیں اسی طرح آنسوؤں میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھی ہوئی لگتی ہیں۔ جسے ہر حساس قاری سانسیں روک کر پڑھتا ہے۔

میں جوں جوں اس کتاب کے اوراق پلٹتا گیا اس کی کہکشاں میں چمکتے ستارے میری آنکھوں کو خیرہ کرتے گئے، میری انگلیاں بے تابی سے کی بورڈ پر رقصاں ہونے لگیں اور الفاظ کا جھرنا بہنے لگا جو اپنی وسعتوں میں ایک عمیق سمندر لئے ہوئے کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا مگر افسوس کہ کاغذ کا پیرہن تنگ سے تنگ ہوتا مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں دعائیہ کلمات کے ساتھ اپنے مضمون کا اختتام کردوں۔

ان کا تخلیقی عمل ایک طرح کا اعترافِ خود شناسی ہے جو اشعار کے نزول کا نہ صرف باعث بنتا ہے بلکہ ان کے اور قاری کے درمیان ایک نہ مٹنے والا ذہنی و قلبی رشتہ بھی استوار کرتا چلا جاتا ہے۔ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی ایسی روانی ہے کہ قاری پڑھتا چلا جاتا ہے۔ میں دوسروں کی مانند مجموعہ کلام کے چیدہ چیدہ اشعار سے کاغذ کا پیٹ

نہیں بھرتا۔۔ یہ کام آپ کا ہے کہ کتاب حاصل کر کے ڈاکٹر نجمہ شاہین کی خوبصورت شاعری کا لطف اٹھائیں۔ میرا کام ان کا اور ان کے اس مجموعہ کلام سے تعارف کرانا ہے۔

مجھے یقینِ کامل ہے کہ جس طرح ان کے پہلے مجموعہ کلام ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' نے قارئین کی تمام توجہ حاصل کی اسی طرح انشاءاللہ ان کا یہ خوبصورت دیدہ زیب مجموعہ کلام بھی دنیائے ادب کے پروانوں کو اپنی جانب کھینچ لے گا اور پوری پذیرائی حاصل کرے گی:

میں اپنی نظم و غزل ان کے نام کرتی ہوں
کہ جن کا ذکر محبت کی داستان میں ہے

میں شاعری میں اسے ڈھال دوں مگر شاہیںؔ
کہاں وحسن و لطافت مری زبان میں ہے

اللہ کرے آپ کی قلم ہمیشہ محبتوں کی داستانوں کو حسن و لطافت سے بھرپور شاعری میں ڈھالتی رہیں اور آپ کے گلستانِ ادب میں سخن کے پھول مہکتے رہیں۔۔۔ آمین

نجمہ شاہین کھوسہ: مطلع اور مقطعے کے بیچ نظم

کرنل ڈاکٹر میجر اسد

(۱) شاعری کیا ہے اور شاعر کون ہوتا ہے؟ شاید ادراک والہام کے بیچ کی منزل جہاں واقعیت، حقیقت اور اصلیت کی گھمن گھیری ہے، جہاں اصالتِ وجود کے کاندھے پر دھری رنگ برنگے کپڑوں سے باندھی ہوئی ایک گٹھڑی؛ جس میں احساسات؛ احساسات سے جڑے درد، رنج اور آنسو، جس میں کیفیات، کیفیات سے جڑا وہمہ، مشاہدہ اور ادراک، جس میں موجودات، موجودات سے جڑا وقت، سفر اور رفتار، جس میں روایات، روایات سے پھوٹتی محبت، نفرت اور حیات، جس میں مدارات، مدارات میں گھومتے سُکھ، دُکھ اور علاج، جس میں امکانات، امکانات سے جڑی آس، یاس اور قیاس، جس میں خیالات، خیالات سے جڑا تخیل، تخلیق اور تعبیر، جس میں وجوہات، وجوہات سے جڑا اسبب، دلیل اور شعور، جس میں سوالات، سوالات سے جڑا موضوع، مسئلہ اور تصدیق و تردید، جس میں جوابات، جوابات میں تشریح، تصریح اور توضیح، جس میں جذبات، جذبات سے جڑی نظم ونثر اور تخلیق جسے کچھ اور نہیں کہا جائے گا بس شاعری......شاعری کہا، شاعری لکھا اور شاعری ہی پڑھا جائے گا۔ یہ وہ منزل ہے جسے پانے کے لیے، ایک تخلیق کار مراد شاعر اغتشاشِ زیست کی گھمبیرتا کو سلجھاتے ہوئے خود مرگِ زیست کی چوکھٹ تک جا پہنچتا ہے، البتہ اُس کی تخلیق مراد شاعری حیاتِ لایزال پالیتی ہے۔

اگر یہ شاعری ہے تو شاعر کون ہوا، وہی ناں جو کہے کہ: ''یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں، تنہائیوں، محرومیوں، محبتوں اور جدائیوں کے دکھ، کہیں انت ہی نہیں ٹھہرتا اِن کا۔ کبھی

گھٹن بن کر دل کو مٹھی میں کر لیتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انت ہو گیا اور کبھی دور پرے کھڑے مسکراتے اُسی گھٹن کو کم کرتے ہیں، روشنی بنتے ہیں اور اپنی ذات کی تلاش پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔ اِک چاک مل جاتا ہے جس پر ہم گھومتے ہیں اور اِک محور مل جاتا ہے جو ہمیں اپنے گرد دائرہ در دائرہ گھماتا ہے۔ ہم اپنی جستجو میں ہوتے ہیں مگر بھلا دائرے میں بھی کوئی جستجو مکمل ہوئی؟ دائرہ بن کے گھومنا تو بس گھومنا ہے جب رُک گئے تو دائرے میں گھومنے والا ہر ذرہ صرف اپنی جگہ سمٹ کر رُک جائے گا وہ اُس خلا کو پُر نہیں کر سکے گا جو اُسے ذات کے اندر قطار در قطار کھڑے دُکھوں، گرد بنتی ہواؤں اور پس منظر میں سمٹتی، جدائیاں بانٹتی رفاقتوں نے عطا کیا۔ ایسی رفاقتیں جو اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید، یاس، سُکھ، دُکھ، ہنسی، آنسو، آرزو، خلش اور کسک بانٹتی ہیں۔ جو دل کی دنیا کو غم کے اندھیروں کے باوجود روشن و منور کرتی ہیں۔ سرِ شام یادوں کے دیئے جلائے، دل کے اندر بہتے لہو کے آنسوؤں سے اپنی لَو کو جلانے کی صدیوں پرانی روایت پر ڈگر بہ ڈگر چلتی جاتی ہیں اور بھلا ایسا کیوں نہ ہو یہ رفاقتیں وہی تو ہیں جنہیں اپنی اہمیت کا احساس ہے جنہیں فخر اور غرور ہے اپنے ہونے کا اور دوسروں کے دل میں سب سے اونچی مسند پانے کا۔ جنھیں معلوم ہے کہ وہ کوئی مرہم رکھیں یا نہ رکھیں دل کا زخم ناسور بنتا رہے گا اور بن بن کے بگڑے گا مگر ازل تا ابد ختم نہیں ہوگا۔ انہیں تا حشر اپنی ذات کا زعم ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ ایسی لوح تو کہیں کہیں ملتی ہے کہ جس پر کسی انمٹ سیاہی سے جو نقش کندہ کر دیا جائے وہ پھر مٹا نہیں کرتا۔ یہ سُکھ، یہ آرزوئیں، یہ سانسیں، یہ حرف، یہ لفظ، یہ شاعری غلام ہی تو ہیں بس اُن رفاقتوں کے''۔

اگر یہ سب شاعری اور کہنے والا شاعر ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ نجمہ شاہین کھوسہ ایک مکمل اور خوب صورت شاعرہ ہے جو یہ سب سہتی، شعر کہتی اور شاعری بلکہ خوب صورت شاعری کرتی ہے کیوں کہ اِن سب رفاقتوں کا تجربہ صرف ایک تخلیق کار مراد شاعر کو ہی ہو سکتا ہے۔

نجمہ شاہین کھوسہ، ادراک والہام کے بیچ کی منزل پر موجود ایک خوب صورت تخلیق کار جس کے کاندھے دھری رنگ برنگے کپڑوں والی پوٹلی میں احساسات، کیفیات،

موجودات، روایات، مدارات، امکانات، خیالات، وجوہات، سوالات، جوابات اور جذبات سے جڑی نظم ونثر اور تخلیق پڑی ہے جسے فقط شاعری کہا، لکھا اور پڑھا جائے گا بلکہ ایک خوب صورت تخلیق مراد شاعری کہا، لکھا اور پڑھا جائے گا کیوں کہ یہ وہ منزل ہے جسے پانے کے لیے اُس نے انتشارِ زیست کی گھمبیرتا کو سلجھانے کا قصد اُٹھایا اور ایک زندہ و جاوید تخلیق مراد شاعری پیش کی ہے۔ زندہ تخلیق اور خوب صورت شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قاری سے مکالمہ کرتی اور جذبات و کیفیات کی باہمی اشتراک کا معاملہ درپیش کرتی ہے جہاں قاری تخلیق کے سحر میں گرفتار، شدتِ جذبات اور حسِ ادراک کی زمینوں کے سفر پر نکل جاتا ہے۔

شدتِ جذبات اور حسِ ادراک کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو سیدھی سادھی ایک دیہاتی لڑکی کو ایک مہان تخلیق کار بن جانے پر مجبور کرتا ہے اور وہ زندگی کی تنہائیوں، محرومیوں، محبتوں اور جدائیوں کا انت تلاشنے نکلتی ہے جہاں یہ سب استعارے مسکراتے اور روشنی بنتے ہیں لیکن اِس کا اپنا آپ کہیں دور پیچھے رہ جاتا ہے۔ تخلیق کا چاک گھماتے گھماتے تخلیق کار خود گم ہونے لگتا ہے اور اِس کے آس پاس تخلیق کے بڑھتے ہوئے دائروں کا ایک گرداب بن جاتا ہے۔ گرداب کے ہر دائرے میں تخلیق کار کی اپنی زندگی گھومتی ہے، وہی زندگی جسے رفیق کرتے کرتے دکھ، تکلیف، پریشانی، اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید، یاس، سُکھ، ہنسی، آنسو، آرزو، خلش اور کسک کی روشنی میسر آتی ہے جو حرف، لفظ اور شاعری کر در پر سجدہ کرتی ہے۔ یوں دعا کی صورت سجدوں سے اُٹھنے والی تخلیق، اپنے قاری کو سحر میں جکڑے اُس سفر پر نکلتی ہے جسے تخلیق کا سفر کہتے ہیں جہاں تخلیق کو بخشی ہوئی زندگی خود تخلیق کار کی ہوتی ہے جبھی تو وہ خود کو خود سے تو جدا کر لیتا ہے لیکن خود کو اپنی تخلیق سے جدا نہیں کر پاتا اور یہی ایک سچی اور سُچی تخلیق کا بنیادی وصف ٹھہرتا ہے۔

(۲) خلیل جبران سے جب ایک عورت نے سُکھ اور دُکھ بارے سوال کیا تو اُس کا جواب تھا: ''تمہاری خوشی، تمہارا ہی بے نقاب غم ہے اور خوشیوں کا سرچشمہ تمہارے

ہی آنسوؤں سے پھوٹتا ہے اور اِس کے علاوہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ دُکھ جتنے گہرے ہوں گے سُکھ بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے تمہارے ہاتھ میں پکڑا ہوا میٹھے پانی کا خوب صورت پیالہ جو اُن بہت سے پیالوں کی قربانی کے بعد تیار ہوا جو کمہار کی بھٹی میں جل کر خاک ہو گئے تھے۔ عود کی لکڑی کی بھینی خوشبو جو تمہارے جذبات کو معطر کرتی ہے، وہ کئی کمزور لکڑیوں کی تراش خراش کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جب کبھی خوش ہو تو اپنے دل میں جھانک کر دیکھو، تمہیں پتا چلے گا کہ یہ سُکھ کسی دُکھ کی ہی دین ہوں گے۔ ٹھیک ویسے ہی جب کبھی غم زدہ ہو تو بھی اپنے دل میں جھانک کر دیکھو، تمہیں پتا چلے گا کہ یہ آنسو بھی کسی خوشی کی ہی دین ہوں گے''۔ اور اُسی عورت نے جس دم خلیل جبران کی بات سنی تو وہ بھی بے اختیار کہہ اُٹھی کہ:

> ''حقیقت ہے کہ یہ دُکھ کبھی کبھی تھکا دیتے ہیں کسی سُکھ کو پانے کی تمنا میں دل مچل اُٹھتا ہے، روح کی تھکن بڑھ جاتی ہے اور روشنیاں بانٹتی اس دنیا میں چاند کی کرنوں سے چند کرنیں لے کر اپنا جیون روشن کرنے کو دل کرتا ہے۔ چاند جو منور ہے، روشن ہے، جس کی ٹھنڈی چاندنی جب اَوج پر ہو تو ساحل کی لہروں میں طوفان برپا کر دیتی ہے اور جب بے آب و گیاہ صحرا پر پڑتی ہے تو سراب پیدا کرتی ہے مگر یہ دنیا ہے یہاں تو ہم نے کبھی کبھی کہیں کہیں چاند کو بھیاندھیرے بانٹتے دیکھا ہے۔ پہاڑ جیسی ہجر کی شاموں سے لے کر بھیانک اندھیری راتوں میں کہیں اِس کی ایک کرن بھی نہیں ملتی کہ زیست کو بتانے کا کوئی حوصلہ ہی مل سکے''۔

خلیل جبران نے سُکھ اور دُکھ کی بات ختم کب کہ ہے، مزید فرماتا ہے کہ: ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سُکھ، دکھوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں جب کہ کچھ کا خیال ہے کہ نہیں! دُکھ، سُکھوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت مل کر آتے ہیں، فرق اتنا ہوتا ہے کہ ایک جس دم تمہارے ساتھ

ہوتا ہے تو دوسرا اُس سے تمہارے ہی بستر پر تمہارے انتظار میں سویا ہوا ہوتا ہے۔ بے شک تم، سُکھ اور دُکھ کے بیچ جھول رہے ہوتے ہو، تم صرف اُسی سے سُکھ اور دُکھ کے بیچ پر سکون ہو گے یا مطمئن ہو گے جس سے سُکھ دُکھ کا حساب کتاب رکھنے والا خزانچی، تمہیں موقع دے کہ تم خود ترازو اُٹھاؤ اور دونوں پلڑوں کا وزن برابر کر پاؤ"۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے نجمہ شاہین کھوسہ کہتی ہے: ع

"دکھ اور سکھ
غم اور خوشی
دونوں ہی دریا کا بہتا پانی
جو بہنا چاہتے ہیں
فرار مانگتے ہیں
خوشی ہوتی ہے دمکتے چہروں سے عیاں
دکھ ہوتے ہیں آنسوؤں کی صورت رواں
کبھی رنج والم کبھی آہ وفغاں
فرار تو ضروری ہے بقاء کیلئے
سو دونوں ہی فرار مانگتے ہیں
اور میں نے اندر کی گھٹن سے یوں مانگا ہے فرار
کیے ہیں ساری زیست کے غم لفظوں کی صورت بیاں"

سُکھ اور دُکھ کا حساب رکھنے والا خزانچی جس سے یہ موقع دے کہ ایک شخص پلڑے کے دونوں ترازو برابر کر پائے تو ایسے میں ایک ہی صورت بن آتی ہے کہ جس کا اظہار خود نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی کیا ہے، کہا ہے: "ایسے میں سُکھ کی یہ خواہش خود بخود اپنی موت مر جاتی ہے۔ پھر ذات کی وہی تنہائی اور دُکھ کا وہی لامحدود صحرا۔ اور ازل سے لے کر ابد تک اکیلے پن کا وہی سفر، وہی ریزہ ریزہ خوابوں کی چُبھتی کرچیاں، محرومیوں کے بوجھ

تلے دبی خواہشیں، دم توڑتی محبتوں کی بے ترتیب ہچکیاں، پا بُریدہ حسرتوں کی لاشیں۔۔ بھلا اِس اُجاڑ سفر میں کون کسی کا ساتھ دے، کون مجروح جذبوں پر دلاسوں کے "پھاہے" رکھے ۔کون ساتھ دے سوائے اپنے ہی دُکھ اور تنہائی کے۔ اور اسی تنہائی کے بنجر بن میں گئی رُتوں سے یادوں کے چراغ جلا کر، جذبوں کی محفلیں سجانا اور اُن محفلوں میں گلاب اُگانا اور اپنے بے ربط اور بے ترتیب بہہ جانے والے آنسوؤں سے ان گلابوں کو سیراب کرنا اور ان سرابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے رنگوں اور روشنیوں سے سیاہی بنانا اور اسے صفحۂ قرطاس پر لفظوں کی صورت بکھیرنا اِسی کا نام شاعری ہے"۔ آپ بھی شاعری سے لطف اُٹھائیے، ایک مطلع ملاحظہ کیجئے: ع

اگرچہ موسم سنور رہے ہیں
مگر زمانے گزر رہے ہیں

خود دیکھئے نجمہ شاہین کھوسہ کی نظم "دُکھ میرے سنجوگ" اوپر کہی کہانی کا تسلسل نہیں ہے۔ آپ ہی کہیے کہ کیا سُکھ اور دُکھ کے سنگم سے پھوٹتی یہ شاعری بلکہ ایک خوب صورت شاعری نہیں ہے: ع

"دکھ دل کا چراغ
دکھ شب کا چراغ
دکھ تن کا روگ
دکھ من کا جوگ
دکھ تنہائی
دکھ رسوائی
دکھ عشق ہے
اور عشق جذبوں کا سوگ
دکھ پیار ہے

اور پیار روح کا سوگ
دکھ آنسو، دکھ خاموشی
جیسے زنداں کا جھوک
دکھ پت جھڑ ہے
دکھ شب تنہائی کا مقدر ہے
دکھ اذیت کی بزم ہے
صبح اور شام کے دائروں میں
پھیلا بس چار سو رنج والم ہے
دکھ خزاں، صحرا، دھوپ بھی
دکھ عشق کا انمٹ روپ بھی
دکھ تو بس ہے دکھ
دکھ بنتا نہیں کبھی سُکھ
دکھ جو کچھ بھی ہے
ہے میرا سنجوگ''

نجمہ شاہین کھوسہ کے نزدیک دکھ دل و شب کا چراغ، تن من کا روگ، تنہائی، رسوائی، عشق، پیار، روح، آنسو، خاموشی، زندان، پت جھڑ اور شب تنہائی کی اذیت ہیں۔ یہ صبح اور شام کے دائروں میں چکر کاٹتا رنج والم، موسم کا رنگ روپ جس میں خزاں، صحرا اور دھوپ نمایاں ہے لیکن یہ سب روپ ہی نجمہ کہ شاعری کا سندرتا جوبن ہیں اور یہی شاعری تو اِس کا کل اثاثہ ہے، جبھی تو مقطع بولتا ہے: ع

یہ دکھ اثاثہ ہیں مرا شاہین
یہ دکھ جو میرے ہی گھر رہے ہیں

عورت کے روپ میں جواب دینے والی نجمہ شاہین کھوسہ نے سُکھ اور دُکھ پانے

کی کہانی بول دی ہے لیکن کہانی بولنے کے لیے زبان شاعرانہ استعمال کی ہے جو دل اور روح دونوں پر اثر رکھتی ہے۔ اگر یہی شاعری کی زبان ہے تو کیا شاعری بولتی ہے؟ کیوں کہ وہ خود بھی تو یہی سوال اپنے آپ سے پوچھ رہی ہے، کہہ رہی ہے:

''کیا شاعری سب بولتی ہے۔ کیا شاعری وہ سب کہہ سکتی ہے جو کہا جانا چاہئے؟ اِن سنگلاخ درد کے پہاڑوں سے گزرتی، اپنی ناتواں جاں پر تندوتیز ہواؤں کے طوفان برداشت کرتی کرب کی اِن مسلسل راتوں کی کہانی، بے یقنی اور مایوسی کی دُھول سے اٹی ہوئی بے خواب راتوں کی کہانی، یہ رتجگوں کے عذاب اندھی راتوں میں اِک امید سحر باندھے مسلسل جاگتی، بینائی کھوتی اُن آنکھوں کی کہانی، کیا یہ شاعری کہہ سکے گی مگر کہاں؟''۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے سُکھ اور دُکھ کی زبان سمجھی بھی ہے اور سمجھ کر لکھی بھی ہے، جبھی تو الفاظ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو شاعری ہوتی ہے وہی شاعری جو بولتی بھی ہے اور جس کی زبان قاری بھی سمجھ جاتا ہے۔ ایسے میں یہ وہ سب کہہ دیتی ہے جو سہہ رہی ہوتی ہے یعنی یہ جو سہتی ہے وہی کہتی ہے جبھی تو بے توقیر لفظ بھی توقیر بن کر بولتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کس اذیت اور کرب سے گُزرے ہیں۔

جبھی تو نجمہ شاہین کھوسہ کہتی ہے کہ ''ہاں میں ایک شاعرہ ہوں'': ع

یہ سب کیا اس لیے ہے کہ
میں ایک شاعرہ ہوں
زندگی کے ہر ایک لمحہ میں
تجھ کو سوچوں
ہر دکھ سکھ کو تجھ سے منسوب کروں

کوئی خواب دیکھوں تو تجھ کو سوچوں
کوئی رنگِ بہار، گلاب دیکھوں
تو تجھ کو سوچوں
تنہا سفر کے عذاب دیکھوں
تو تجھ کو سوچوں
میری آنکھوں کی پتلیوں میں جو مر چکے ہیں
وہ سارے رنگِ ماہتاب دیکھوں
تو تجھ کو سوچوں
شام وسحر، روز وشب کے دائروں میں
اپنے کٹھن لمحوں کا حساب دیکھوں
تو تجھ کو سوچوں
ہاں! شاید میری ساری سوچوں کا سبب یہی ہے
کہ میں ایک شاعرہ ہوں
اور کچھ بھی تو نہیں، بس اک شاعرہ ہوں''

(۳) ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ڈیرہ غازی خان کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئی جہاں بچیوں کی پیدائش تو قابلِ برداشت تھی لیکن لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ابھی تک فروغ نہیں پایا تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں نصابی تعلیم بھی ممکن نہ ہو وہاں غیر نصابی تعلیم کی باتیں سوچنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن خوش قسمتی مہربان ہو تو سبب بھی بن جاتے ہیں اور نصاب بھی، نجمہ شاہین کھوسہ پر بھی قسمت کی دیوی مہربان نکلی جس نے نصابی تعلّی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی تعلیم کی راہیں بھی ہموار کیں۔ والدین باشعور تھے جو علم وآگہی کی معراج کو پہچانتے تھے جبھی تو تیسری کلاس میں علم کی خاطر پہلی ہجرت کی، باپ دادا کی جاگیر چھوڑی، بچپنہ بستے میں ڈالا اور تختی لہراتی ہوئی اپنی نانی کے گھر ڈیرہ غازیخان میں منتقل ہوگئی۔ یہیں نانی کے

ہاتھ کی چوری کھائی، لوری سنی اور تعلیم کی پہلی سیڑھی پانچویں جماعت پاس کر لی، تب ماں باپ نے بھی گاؤں کو خیرآباد کیا اور مستقل طور پر یہیں نانی کے شہر ڈیرہ غازیخان میں ہی منتقل ہوگئے اور یوں تعلیم کا سلسلہ بڑھنے لگا، منزلیں طے ہونے لگیں اور خواب تعبیر ہوتے دکھائی دینے لگے۔ پرائمری، میٹرک اور ڈگری کالج سے ایف ایس سی کے بعد نشتر میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا۔ جوں جوں نصاب کا بستہ بھاری ہوا توں توں غیر نصابی بستہ بھی بہتر ہوتا گیا یہاں تک کہ سکول میں پرنسپل آفس میں آویزاں بورڈ پر اِس کا نام نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اچھی کارکردگی والوں کی فہرست میں چمکنے لگا۔ نجمہ شاہین کھوسہ سکول، کالج کی ہی نہیں اپنے قبیلے کی بھی پہلی لڑکی تھی کہ جس نے نصاب وغیر نصاب کے سارے بورڈوں پر اپنا نام جلی حروف میں کندہ کروایا اور نہ صرف ایک قابل ڈاکٹر کی حیثیت سے خود کو منوایا بلکہ ایک خوب صورت شاعرہ کی حیثیت سے بھی حرف کی دنیا میں خود کو نمایاں کیا یوں یہ بات درست لگتی ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ کا سفر، علم وآگہی کا سفر تھا کہ جس میں ایک ننھی بچی جو کندھے پر دھرے بستے میں بچپن لے کر نکلی، جو گاؤں کی پگڈنڈی پر تختی لہراتے ہوئے چلی اور لفظوں سے ''کرکلی'' کھیلتے کھیلتے تعبیروں کے بیچ جا پہنچی؛ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ:

''اِک چھوٹی سی بستی کی پگڈنڈیوں پر ننھی، چہکتی، کھلکھلاتی گڑیا کا ایک لامحدود سفر، ایک انت نہ ہونے والا امتحان۔ کبھی کبھی یہ سوچ عجیب لگتی ہے کہ کیا کمی تھی، سُندرتا کے سانچے میں ڈھلی، عقل وشعور سے معمور، اِک کٹیا کے کونے کو اپنے سجدوں سے روشن منور کیے ہوئے، عشق اور آگہی کا حقیقی شعور لئے، چوڑیوں کی کھنک اور حنا کے رنگوں سے ماورا اپنے ہاتھوں میں شفاء کی نرمی لیے، مسیحائی کا روپ لیے، ملتزم اور حطیم میں کیے سجدوں سے سجی جبیں لیے، جذبوں کی رعنائی کے رتھ پہ سوار اُس معصوم لڑکی میں جو اتنا سچ، اتنا شعور پا لینے کے باوجود اپنی آنکھوں کو کسی ہجر کی شام کے دُکھ میں ڈھلتا دیکھ رہی ہے۔ ایسا ہجر جس میں وصل کا کوئی ایک پل بھی نہیں۔ یہ کیسی شام ہے جو اُس کی آنکھوں میں ٹھہر گئی ہے؟ یہ کیسا ادراک ہے جس میں کشف ہونے کو وہ موم کی مانند پگھل رہی ہے؟ یہ کیسی منزل ہے جس کے لیے وہ

ہاتھ اُٹھا بیٹھی؟''۔ بے شک اِس کے سجدے، آنسو، دعائیں، غزلیں اور نظمیں ہی اِس کے سفر کی ساتھی ہیں جنھوں نے اِسے لمحہ لمحہ آگاہی کے عذاب سہتے ہوئے دیکھا ہے، کہا ہے: ع

اس سے بڑھ کر مری وفا کا کوئی نہیں گواہ
غزلیں، نظمیں، سجدے، آنسو، اور اک شب سیاہ

کتابوں سے دوستی اور لفظوں سے محبت تو اِسے ہجرت کے طفیل مل چکی تھی جنھیں اِس نے پہلے پہل ڈائریوں میں محفوظ کیا اور خود کے پاس رکھا لیکن وقت نے کروٹ بدلی تو کتابوں کی صورت خود سے وداع کرنے اور قاری کے سپرد کرنے کا لمحہ آن پہنچا۔ اپنے آپ کو خود سے الگ کرنا اور الگ کر کے کسی اور کے رحم و کرم پر چھوڑنا ایک تخلیق کار کے لیے سب سے مشکل اور سب سے یادگار لمحہ ہوتا ہے جب وہ ایک طرف تو اپنا آپ گنوانے کی تیاری کرتا ہے اور دوسری جان اپنی تخلیق کی زندگی کی دعائیں مانگتا ہے لیکن سچ ہے کہ ایک سچی دعا اور کھری تخلیق کی ہمیش صورتی کو کوئی رد نہیں کر سکتا ہے، نجمہ شاہین کھوسہ کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ اِس کی دعا میں اثر آیا اور تخلیق میں زندگی عود آئی، ایک ایسی جاوداں زندگانی کہ جس کی تمنا ہر تخلیق کار کے من میں موجزن ہوتی ہے لیکن تعبیر کسی کسی کا نصیب بنتی ہے۔
نجمہ شاہین کھوسہ کی پہلی نظم ''ملاقات آخری''، 1996ء میں منصۂ شہود پر آئی جب کہ پہلی کتاب ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' غالباً 2007ء میں قاری کے ہاتھ پہنچ چکی تھی اور یوں ایک قابل ڈاکٹر، ایک خوب صورت شاعرہ کے روپ میں سامنے آئی جس نے بعد ازاں تواتر سے ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، ''اور شام ٹھہر گئی'' قارئین کی نذر کیں جب کہ تازہ ترین کاوش ''پھول، خوشبو اور تارہ'' بہت جلد قاری کے ہاتھ میں ہوگی لیکن یہ ہجرت کا سفر ہے جس کی منزل ایک نہ ختم ہونے والے سفر کے دوسرے کنارے پر ہے جبھی تو یہ بھی ٹھیک کہتی ہے: ع

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو
زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے

(۴) مولانا رومیؒ نے ''کتابِ عشق؛ اشعارِ وجد و اشتیاق'' میں ایک جگہ پر کہا ہے: ''شاعری خطرناک بھی ہو سکتی ہے، خاص طور پر خوب صورت شاعری کیوں کہ یہ خواب و خیال کی وہ صورت پیش کرتی ہے کہ جو درحقیقت ہمارے تجربے میں آئی ہی نہیں ہوتی''۔ لیکن یاد رہے کہ یہاں خوب صورت شاعری، اُس قاری کے لیے خطرناک ہے کہ جس نے درحقیقت ایسی کیفیات، جذبات اور احساسات کا عملی تجربہ نہیں کیا تھا جب کہ ایک تخلیق کار اور شاعر تو خواب و خیال کی منزل میں کئی کئی بار بھٹکتا ہے تب جا کر کسی درمیانی منزل کا آسرا، اِسے نصیب ہوتا ہے۔ درحقیقت ایک تخلیق کار اپنی تخلیق مراد ایک زندہ تخلیق یا شاعری مراد ایک خوب صورت شاعری کی منزل پر جبھی پہنچتا ہے جب وہ وجد و اشتیاق کی راہوں کی دُھول پھانک لیتا ہے۔ اب ہم دوبارہ مولانا رومیؒ کی ''کتابِ عشق؛ اشعارِ وجد و اشتیاق'' میں درج مقولہ دیکھتے ہیں تو بات کھل جاتی ہے؛ کہتے ہیں:

"Poetry can be dangerous, especially beautiful poetry, because it gives the illusion of having had the experience without actually going through it".

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری ایک خوب صورت شاعری، جو پڑھنے والوں کو اُس جہان کی سیر کراتی ہے جس کی سیر اِس نے تخیلاتی پرواز کے دوران کی تھی۔ یہ زندگی کی آنکھ میں آنکھ ڈالے جس دم اُسے مخاطب کرتی ہے تو آگاہی کا عذاب اِسے خوب صورت اشعار کا پھاہا پیش کرتا ہے جو اِس کے ساتھ ساتھ قاری کی تسکینِ جان کا بھی سبب بنتا ہے۔ ایک خوب صورت غزل کا مطلع دیکھئے: ع

زندگی جب بھی روبرو آئی
میں ہر اک دکھ کو خود ہی چھو آئی

اب مقطع سے پہلے ذرا یہ نظم ''کب دل اِس کی بات مانے گا؟'' بھی ملاحظہ ہو: ع

"آؤ !
دکھ کے اندھیروں سے پہلے
اپنی سحر سویرا کر لیں
ہے جہاں جہاں روشنی
آنکھیں خیرہ کر لیں
یہ دردِ دل اور وفاؤں کی باتیں
بہت پرانی باتیں ہیں
کیا رکھا ہے ان باتوں میں
بس یہ درد کی سوغاتیں ہیں
آؤ ہنستے ہنستے بچھڑ جائیں"

کیفیات، جذبات اور احساسات کا وہ عملی تجربہ جس سے نجمہ شاہین کھوسہ گزرتی ہے، اُس کا عکس غزل کے مقطع میں دیکھئے: ع

میں نے شاہین اسے پکارا جب بھی
اپنی آواز کو بکو آئی

مولانا رومیؔ نے "کتابِ عشق؛ اشعارِ وجد و اشتیاق" میں جس شاعری کے خطرناک ہونے کی بات کی ہے، اُس کا حقیقی عکس ہمیں نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں ملتا ہے جو خوب صورت ہے اور یہی خوب صورتی اِس کا سندرتا جوبن بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہاں نجمہ شاہین کھوسہ کی خوب صورت شاعرانہ تخلیق کے پیچھے اُن کیفیات، جذبات اور احساسات کا عملی تجربہ ہے جس سے پہلے پہل وہ خود گزرتی ہے اور بعد ازاں قاری بھی۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کا جو حظ شاعرہ اُٹھاتی ہے وہی حظ قاری بھی اُٹھاتا ہے۔

(۵) خلیل جبران کے سامنے بیٹھی پجارن دوبارہ بولی اور کہا کہ ہمیں "عقل اور عشق" کے بارے کچھ بتائیے، جس پر اُس نے جواب دیا کہ: "اکثر تمہاری روح،

میدانِ جنگ ہوتی ہے جہاں علم و عقل، عشق و عمل کے سامنے صف بند ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر مجھے تمہاری روح کے سامنے پیش ہونا تو شاید میں اِن دونوں کے بیچ کی دشمنی کو ختم کرا کر فریقین میں صلح کی منادی کرا دوں لیکن ایسی کسی بھی صورت میں خود تمہیں بھی امن و آشتی کا پیامبر بننا پڑے گا"۔ امن و آشتی اور صلح جوئی کا سبق ہمیں صرف مذہبی صحیفوں اور کتابوں میں ہی نہیں ملتا بلکہ اِسی پیغام کی تفسیر، ہمیں شاعری کی زبان میں بھی دکھائی دیتی ہے جہاں کم و بیش ہر شاعر اپنے رب کے حضور حاضری اور دعا سے آغاز کرتا ہے، اگرچہ آداب کے تقاضوں کے پیشِ نظر شاعرانہ زیبائش کی ضرورت سے قطع نظر سادگی اور سلاست کی چاشنی کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے لیکن کہیں بھی شاعرانہ شگفتگی کم نہیں ہونے پاتی ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی اپنی کتابوں کا آغاز ایسی ہی روایت کو نبھاتے ہوئے کیا جہاں شاعرانہ اسلوب اور اندازِ بیان، سادہ وصفی اور سلاست سے بھرپور شگفتگی سے مزین دکھائی دیتا ہے۔

اِس کے ہاں حمد و نعت اور سلام کی پیش کش نہایت خوب صورت ہے جہاں لفظ و معانی باوضو اور مصرعوں کی صف میں ہاتھ باندھے کھڑے ملتے ہیں۔ مطلع کے طور پر حمد کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں: ع

اے میرے مولا اے میرے آقا، بس اپنے رستے پہ ڈال دے تُو
یہ فانی دنیا کے غم ہیں جتنے، یہ میرے دل سے نکال دے تُو

یہ پھول کلیاں، ستارے خوشبو، مری زبان اور ترجماں ہوں
اب اپنی مدحت کی ایسی قدرت اے مالکِ ذوالجلال دے تُو

حمد اور نعت کے بیچ کی ایک دعائیہ نظم کی صورت دیکھئے گا جہاں تخلیق کار، خود اپنی تخلیق کے خالق کے سامنے سربسجود با آوازِ بلند اپنی تکملیت کا منظر بیان کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ یہ منظر بنا رہے اور یہ کرم برستا رہے، کہتا ہے: ع

"اے خدا، اک دعا

اک دعا، اے خدا
آج کعبے کا دیدار میں نے کیا
آج تُو نے مکمل کیا ہے مجھے
رحمتوں کو مرا یوں سہارا کیا
خاک تھی، آسماں کا ستارہ کیا
بس یہیں اب سپردِ زمیں کر مجھے
اپنے ہی شہر کی اب مکیں کر مجھے
کر غلام اب مجھے
مجھ کو باندی بنا
اے خدا، اک دعا
اک دعا، اے خدا
مجھ کو واپس نہ بھیج اُس جہاں میں کبھی
نفرتیں ہیں جہاں
ظلمتیں ہیں جہاں
ہر طرف ظلم کا، جبر کا راج ہے
بے بسی کا بسیرا جہاں آج ہے
اے خدا میں تہی دست آئی یہاں
پھر بھی سب کچھ مجھے آج یوں مل گیا
میں دکھی تھی، یہاں پرسکوں مل گیا
واسطہ ہے تجھے تیرے محبوب کا
چاہے زندہ رہوں یا کہ مر جاؤں میں
اُس جہاں میں نہ اب لوٹ کر جاؤں میں''

شاعرہ عقل وعشق کی جنگ میں جو پیغام لیے آگے بڑھتی ہے، اُس کی روح مدینے جا کر زندہ ہوتی ہے جہاں نور کے ہالے وضوح کی صورت بنا دیتے ہیں۔ مقطع کے طور پر نعت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں: ع

مدینے کو جاؤں، مدینے کو جاؤں
عقیدت کی ساری میں رسمیں نبھاؤں

ہے شاہین نعتِ نبیﷺ ان لبوں پر
تقاضے ادب کے میں کیسے نبھاؤں

(۶) نجمہ شاہین کھوسہ کے مضبوط استعاروں میں ''دُکھ'' ہر دو معانوں میں شعری روانی اور شعری مضبوطی کے ساتھ نظر آتا ہے؛ ایک دکھ ہی تو ہیں جو اِسے شعریت کے راستوں کی دھول اُٹھانے پر اکساتے ہیں اور یہ پابرہنہ اپنے سفر کا آغاز کر دیتی ہے، اُس سفر کا جس کی منزل خود اِس کی اپنی نفی کے مترادف ہے جہان تخلیق کی زندگی کی دعا مانگتے مانگتے خود اِس کی اپنی ذات کہیں پیچھے رہ جانے کا قوی امکان ہے اور ایسا ہوا بھی ہے کہ اِس کی تخلیق سامنے آئی تو اِس کی ذات کہیں دور رہ گئی۔ دوسرا دکھ کا ستعارہ کربلا کے وارثوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے نصیب ہوتا ہے اور یہ نصیب کا معاملہ ہی تو ہے کہ شہدائے کربلا کی بات کرتے ہوئے آنکھ بھی روئے اور دل بھی روئے لیکن جس دم اشک ڈائری کے صفحات پر گریں تو سلام کے موتی بن کر چمکیں۔ نجمہ شاہین کھوسہ کی جھولی پڑے اِن سلام کے موتیوں میں سے ایک کا مطلع ملاحظہ ہو: ع

دکھوں کی تفصیل لکھنے بیٹھوں تو اشک اپنے تمام لکھوں
لہو میں ڈوبیں جو حرف سارے، امام تیرا سلام لکھوں

یہ دکھ سمیٹنا نصیب کا معاملہ ہے، یہ مہر، محبت اور عشق کا معاملہ ہے، جبھی تو ''آزمائشِ عشق کا بوجھ اُٹھا'' جیسی نظم تخلیق ہوتی ہے؛ کہتی ہے:

''اے میرے پاک خدا
تو مجھ کو نہ آزما
کیا تجھ کو معلوم نہیں
ہے میری اوقات کیا
وہ تو پیغمبر تھے
جو تیری آزمائش کا بوجھ سہہ سکتے تھے
وہ تو بادشاہ بشر تھے (آدم وحوا)
جو پتھر یلے کہساروں میں
درد جدائی سہہ سکتے تھے
میدانِ عرفات میں چالیس سال تک
آنکھوں کو لہولہو کر سکتے تھے
میں تو مالک ایک ذرہ ہوں تیری خاک کا
جسے جب چاہے ہوا کہیں سے کہیں رکھ دے
کہاں جگہ ہے میری کہاں کوئی مقام ہے
نہیں ہے صبح کوئی نہ ہی کوئی شام ہے
تجھے واسطہ تیرے محبوب کا
مجھ سے آزمائشِ عشق کا بوجھ اُٹھا
رہنے دے مجھ کو ایک ذرہ ، راکھ کے ڈھیر پہ جما ہوا
مجھے نہ آزما
مجھ سے عشق کا بوجھ اُٹھا''

ذکر آل نبی ﷺ سے ملنے والی تسکین جہاں شاعرہ کی روح کو شانت کرتی ہے وہاں پڑھنے والوں پر بھی اپنا اثر قائم کرتی ہے اور یہی وہ کیفیت ہے کہ جو شاعرہ کو یہ احساس

دلاتا ہے کہ اُس کی حاضری کا سامان ہو گیا ہے اور یہی سامان اِسے ایک ایسی قوت بخشتا ہے کہ جو اِسے تحفظ کا یقین دلاتا ہے۔ سلام کا مقطع ملاحظہ ہو: ع

یہی تقدس ہے اب تو میرا،اسی سے نجمہ مری حفاظت
میں اپنی چادر کے چاروں کونوں پہ بی بی زینب کا نام لکھوں

(۷) نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں شعریت، رعنائی اور ترنم کی کیفیات کے ساتھ ساتھ نسبت وحرمت، تعظیم وتکریم اور عقیدت واحترام کے جذبات بھی بھر پور انداز میں جلوہ افروز دکھائی دیتے ہیں۔ موضوعاتی اور غیر موضوعاتی شاعری میں جہاں داخلی اور خارجی محرکات پیش پیش ہوتے ہیں وہاں برتنے کا انداز بھی اپنا آپ دکھاتا ہے۔ داخلی محرکات غیر موضوعاتی شاعری کا حسن نکھارتے جب کہ خارجی محرکات موضوعاتی رچاؤ کی صورت بناتے ہیں لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ خارجی محرکات کے زیر اثر جنم لینے والی تخلیق کا گھیراؤ کر لینا تو کچھ مشکل نہیں جب کہ داخلی محرکات کے طابع تخلیقی سراپا پانے والی صورت کا ادراک کچھ آسان عمل نہیں ہوتا جس کی بنیادی وجہ یقیناً عقل وعشق کی لڑائی میں صلح کی پیش کش کا معاملہ ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ عشق ومستی سرسرشار مطلع دیکھئے: ع

کیسے دکھ درد، دل وجاں میں چھپا لائے ہیں
دشت الفت سے ترے گرد اٹھا لائے ہیں

کون سے دکھ کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہوں
کیوں میں خود سے آنکھ چرائے پھرتی ہوں

نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں میں جذب ومستی کا رنگ نمایاں ہے، اسی رنگ میں رنگی ہوئی ایک نظم ملاحظہ کیجئے: ع

''اے میرے پاک خدا

آج ہی تو تو نے مجھے مکمل کیا
آج کے دن اس گھر کے دیدار سے
تو نے مجھے خاک سے اٹھا کر آسماں کا ستارہ کیا
سجدہ ریز ہوں آج آنکھوں نے جو نظارہ کیا
آج مجھ کو یہیں سپرِدِ زمین کر دے
یا کر قبول دعا اپنے شہر کا مکیں کر دے
مجھ کو باندی بنا ، مجھ کو غلام کر
مگر مجھ کو واپس نہ بھیج
اُس ادھورے تڑپتے جہاں میں
جہاں نفرتوں اور منافقتوں کا پہرہ ہے بس
جہاں چہرے کے پیچھے اک اور چہرہ ہے بس
مجھے آج جو تو نے اپنا پیار دیا
میری زندگی کو سولہ سنگھار دیا
میلے من کو مرے تو نے نکھار دیا
اس محبت کے صدقے ! مجھ سے یہ محبت نہ چھین
دنیا کی نفرتوں میں یہ سچی الفت نہ چھین
اپنے محبوب کے صدقے مجھے کر دے اس خاک پاک کا مکین
چاہے اب زندہ رہوں یا مر جاؤں میں
بس تیرے در کا ہی دیدار پاؤں میں''

جذب و مستی کے طابع تخلیق کا انداز ہی الگ ہوتا ہے، دھمال دالتے ہوئے مقطعے دیکھئے:

پھول کھلتے رہیں شاہین تیرے آنگن میں
ہم تہی دست بس یہی دعا لائے ہیں

شاہین اس سے روشن میری روح بھی ہے
میں جو ایک چراغ جلائے پھرتی ہوں

نجمہ شاہین کھوسہ کی کتابوں میں شامل چند حمد و نعت اور سلام جہاں داخلی اور خارجی محرکات و معاملات کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں احترام و احتیاط کے تقاضے بھی نبھاتے ہیں۔ غزل و نظم کی طرح یہاں اشعار کی تعداد برابر کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش نہیں کی گئی بلکہ جو، جس طرح کے معاملے کو ترجیح دی گئی ہے جس نے زبان کی سادگی و سلاست کو بھی قائم رکھا، آداب و احترام کے معاملوں کو سنبھالا اور شعریت کے تقاضوں کو بھی خوب نبھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمد و نعت اور سلام میں شامل اشعار براہِ راست اُترا ہوا کلام محسوس ہوتا ہے جو پہلے پہل خود شاعرہ اور بعد ازاں قاری کی کشتِ جان کو شاداب و سیراب کرتا چلا جاتا ہے۔

(۸) نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیات میں جھلنے والا جمالیاتی حُسن، خود شاعرہ کا حسنِ جمال اور حسنِ ذوق ہے جو ایک اچھے شاعر کو ودیعت ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ٹھہرتی ہے کہ ایک زندہ شعر کہنے کے لیے جہاں تخیل، ترتیب اور تعبیر کا معاملہ درپیش رہتا ہے وہاں شاعر کا حسن جمال اور حسن ذوق بھی اہم ثابت ہوتا ہے۔ یوں خارجی عوامل ترتیب و تخلیق کی اساس بناتے جب کہ داخلی عوامل اِس میں روح پھونکتے ہیں جو شاعری کے ایک مکمل جہان قاری کے سامنے پیش کرنے میں معاون ہوتے ہیں، یہ وہی جہاں ہے جس کے بارے شیخ صلاح الدین نے کہا تھا کہ: ''اندھیرے میں سے اُبھرتے اور ڈوبتے مناظر کا تسلسل ذہین اور تخیل میں جو کیفیت پیدا کرے، اُس سے ایک مربوط جہاں تخلیق کر لینا بعید از قیاس نہیں ہوتا۔ کھری شاعر کی زندگی کا ہر شعر ایسا ہی ایک کوندا اور پوری غزل ایک جہاں ہوتی ہے''۔ نجمہ شاہین کھوسہ نے غزلیات میں ایک رچاؤ کی کیفیت موجود ہے جو خوب صورت الفاظ کے استعمال کی سبب میسر آتا ہے۔ یہاں شعر اپنی اصل کیفت اور اصل رنگت کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہیں جن کی ظاہر زیبائش کی خاطر فطری شعر حسن کو بے جا تصنع کی شعوری

کوشش سے پامال نہیں کیا گیا ہے۔فطری رنگ وروپ سے مزین ایک غزل کامطع ملاحظہ ہو:ع

ابتدا درد ہے ،انتہا درد ہے
عشق کا درد تو لا دوا درد ہے

سب پرانے قصے ہیں پریم کی کہانی میں
کون ہے نئی سسی تھل کی بے کرانی میں

نجمہ شاہین کھوسہ کے شعری جہان میں جہاں مرصع غزلیات میں جھانکنے والی محبت اورمحبت کے جذبات کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے وہاں سیدھی سادی نظموں میں نغمغاتی آہنگ بھی جھلکتا ہے۔ یہاں بے شک اشعار میں محبت کا رنگ نمایاں ہے لیکن ایک عورت کی کھنک بھی دورتلک سنائی دیتی ہے جس میں دکھ، سکھ، تکلیف اور پریشانی کی کیفیات شعری حسن تو برقرار رکھتی ہیں لیکن شعری ماحول بدل دیتی ہیں۔شعری حسن سے مزین اور شعری ماحول بدلتی ہوئی ایک نظم ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' دیکھئے:ع

''جب رخ یہ وقت بدلتا ہے
تقدیر جو مجھ پہ ہنستی ہے
میری معصوم سی پلکوں پہ
جب خواب نئے وہ چنتی ہے
جب خواب وہ ٹوٹنے لگتے ہیں
ان خوابوں کی کرچیوں کے خوف سے
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
میرے خاموش لبوں سے
جب لفظ روٹھنے لگتے ہیں

اور یوں محسوس ہوتا ہے
جیسے دہکتے سورج کی تپش
نرم و نازک پھولوں کو
بیدردی سے مسلتی ہے
تو ایسے دشت لمحوں میں
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
جب کرچی کرچی شیشوں میں
بکھرے بکھرے شہروں میں
جب دل کی نگری لٹتی ہے
اور دولت کی دیوی پر
محبت قربان ہوتی ہے
اور سچائی دم توڑ دیتی ہے
جب اندھی الجھتی بجلیاں
آسمان سے گرتی ہیں
کسی غریب کا گھر جلاتی ہیں
تو ایسے بے بس لمحوں میں
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
جب معصوم سوچ کی راہوں میں
کوئی بن کے ہمراہی دورتک ساتھ چلتا ہے
بہت دورتک ساتھ چلتا ہے
پھر راہ بدلنے لگتا ہے
اور راہرو بننے لگتے ہے

تب جدائی کے خوف سے
ضبط کی حد سے گزر کر جب آنکھوں کا بند
یہ ٹوٹتا ہے
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
جب اُسکی یاوں کے جھروکوں میں
میں خیالوں کا ریشم بُنتی ہوں
اور وہ ریشم کھل کے بکھرتا ہے
میری تخلیق بکھرنے لگتی ہے
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
اگر میں آنکھیں کھولوں گی
کتنے دل خفا ہوں گے
میرے سچ کی سانس سے
اس شہر کی بھیڑ میں
کتنے چہرے رسوا ہوں گے
میں شکستہ دل ، چاک قبا
اپنے رِستے ہوئے زخموں کا لہو
اپنے صبر کی اوٹ میں ڈھکتی ہوں
جب درد کی ٹیسیں
میری پتلیوں میں چبھتی ہیں
اور روح بے چین ہوئی
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں‘‘

شاعری کا انداز فطری اور برمحل ہے جس میں عورت کی نمائندگی نے حساسیت اور

جڑت کے بیچ ایک جنوں کی کیفیت طاری کر رکھی ہے جس کا اثر اشعار میں بھی موجود ہے اور قاری پر بھی لامحالہ ہو جاتا ہے۔ غزلیات میں خارجیت کا عنصر جہاں شاعرہ کے حساس نسوانی رویوں کا پتا دیتا ہے وہاں شاعرہ کی سماج، معاشرے، تہذیب وثقافت سے فطری میلان کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے جو کسی طور بھی نہ تو نجمہ کو شعروں سے جدا ہونے دیتا ہے، نہ ہی شعروں کو خارجیت سے بیگانہ کرتا ہے اور نہ ہی قاری کو تخلیق اور تخلیق کار دونوں ہی سے الگ رہنے دیتا ہے۔ خارجیت سے جنم لینے والے نوحے جس دم داخلیت کے دریچوں پر دستک دیتے ہیں تو باہمی میلان سے ایک ترنم پُھوٹتا ہے جس کی آواز تخلیق بھی سنتی ہے، تخلیق کار بھی سنتا ہے اور قاری بھی سنتا اور حظ اُٹھاتا ہے۔ خارجیت اور داخلیت کے سنگم سے پھوٹنے والی ایک غزل کا مقطع ملاحظہ ہو: ع

چھوڑ شاہیں وفا کا تُو اب تذکرہ
بے وفا ہے خوشی ،با وفا درد ہے

ہم قفس کی قید میں مدتوں رہے شاھین
ذوقِ خود کلامی تھا اپنی بے زبانی میں

نجمہ شاہین کھوسہ نے زندہ شعروں تک رسائی کے لیے برسوں کا کشٹ کاٹا ہے جب کہیں یہ دولت نصیبہ ہوئی ہے۔ زندگی کے تلخ وشیریں تجربات نے فطری رنگینی کا جواز مہیا کیا ہے جس نے عورت کے ساتھ ناروا سلوک اور غیر منصفانہ معاشرتی رویوں کو بغاوت کی زبان بخشنے کا سبب کیا ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ کے اشعار میں لفظی اور صوتی تکرار جن نغموں کو چھیڑتی ہے وہ سب گنگناتے ہیں۔ شاعرہ کو لفظوں پر دست ترس کے سنگ استعمال کا ہنر بھی ودیعت ہے جو بے ترتیب لفظوں کو یوں سانچوں میں ڈھال لیتی ہے کہ ربط وتصویر دکھائی دینے لگتی ہے اور یہ وصف، مشقِ سخن میں مہارت سنگ فقط نصیب کا معاملہ ہی ہو سکتا ہے۔

(۹) نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں بہت سے استعارے ملتے ہیں لیکن محبت کا استعارہ سب پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ اس کا فطری سبب عقل وعشق کی بیچ موجود شاعرہ کا وجود

ہے جو جذبوں سے بھر پور زندگی کی طلب گار ہے، جس نے نفرتوں کے بیچ سہمی سہمی آنکھوں میں لہراتے ہوئے سائیوں کے بیچ، عورت کے ہر روپ میں، کہانی کے ہر موڑ پر، کتابوں کے مڑے صفحات پر، تذبذب میں گھری کیفیات پر، سورج کی گرمائش کے سامنے، چاند کی ٹھنڈی روشنی میں محبت کا نعرہ لگایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کی خواہش کے طابع اشعار بھی محبتوں کی خوشبوئیں بانٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محبت بانٹتی غزلوں کے چند مطلع ملاحظہ کیجئے: ع

بس چکی ہے جو دل و جاں میں محبت تیری
بھول سکتی ہوں کیسے بھلا وہ چاہت تیری

آؤ کہیں پہ بزمِ محبت سجائیں ہم
غم ہائے روزگار ذرا بھول جائیں ہم

وہ شخص ہے عزیز مجھے جان کی طرح
اس کا حسین خیال ہے وجدان کی طرح

محبتوں کا صلہ نہیں ہے
لبوں پہ حرفِ دعا نہیں ہے

عشق میں اپنی نسبت کے کچھ خاص حوالے رکھتی ہوں
اسی لئے تو دشتِ وفا کی دھول سنبھالے رکھتے ہوں

محبت نے میری ہستی میں خشتِ آستاں رکھ دی
جبینِ شوق میں خوئے نیازِ دلبراں رکھ دی

محبت کے جذبات سے بھر پور ایک نظم ''محبت ایک لمحہ حقیقت'' کی نغمگی کی تاثیر دیکھئے: ع

''جب شب کی اندھیر نگری میں
تیرے لیے ہاتھ اٹھیں
دل سے کوئی دعا نکلے
لب پہ کوئی سدا مچلے
تو ان وفور لمحوں کی کوئی تو حقیقت ہوگی
یادوں کی ویران بستی میں
تیری محبت کے قفس میں
میری روح ابھی تک قید ہے
اور شام کا سورج ڈھلتے ہی
اس قید میں یوں بھٹکتی ہے
لمحہ لمحہ کو زیست میری
یوں تیرے قرب کو ترستی ہے
یوں محبتوں کی تلاش میں
ریزہ ریزہ یہ وجود میرا
اور خالی ہاتھ کی لکیروں میں مری نگاہیں
تیرے ، ہاں صرف تیرے
تصور کو تلاشیں تو
مجھ کو تجھ سے کوئی تو نسبت ہوگی
ان اُداس لمحوں کی
آخر کوئی تو حقیقت ہوگی

مجھ کو تجھ سے محبت ہو گی''

نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں استعاروں کی محفل آباد دکھائی دیتی ہے لیکن ایسی محفل میں سے مناسب کا انتکاب اور برتنے کا سلیقہ بہر حال شاعرہ کی انفرادیت بھی قائم رکھتا ہے اور اشعار کا معیار بھی برقرار رکھتا ہے۔ غزلیات میں عشق و محبت کے استعارے کا استعمال جھرنوں سے گرتے ہوئے پانی کی موسیقی کی طرح ہے جو سننے والوں کو جہاں ہے وہیں سے اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ اِس ضمن میں چند غزلیات کے مقطعے دیکھئے: ع

ہم بھی دو چار گھڑی ساتھ رہے ہیں تیرے
ہم کو معلوم ہے شاہین طبیعت تیری

شاہیؔن طویل تر ہوئی جاتی ہے غم کی رات
دل کو طلوع صبح کا کوئی مژدہ سنائیں ہم

شاہیؔن راہ شوق میں منزل کہیں نہیں
پیش نظر ہے زندگی میدان کی طرح

میں کس لئے پار جاؤں شاہیؔن
وہاں مرا ناخدا نہیں ہے

مجھ کو شاہیؔن دریا پار بھی کب جانا ہے لیکن میں
کشتیٔ جاں کو اب ناحق منجدھار میں ڈالے رکھتی ہیں

مجھے شاہیؔن اپنے گھر میں ہر نعمت میسر ہے
خدا نے اپنی رحمت سے ہر اک عیشِ جہاں رکھ دی

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے آس پاس بہت سے واقعات ایسے رونما ہُوتے ہیں جن کی تہہ دار حقیقت کا ادراک عام آنکھ سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی طرح بہت سی باتیں ایسی عمومی کیفیت کی حامل ہُوتی ہیں کہ ہر کوئی نہ اسے محسوس کر سکتا ہے اور نہ ہی بیان کر سکتا ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ ایسے ہی عام واقعات کی تہہ اتار کر پیش کرتی ہے کہ اُس کے اشعار زبان و دل میں جاری ہو جاتے اور محبت کی زبان بولنے لگ جاتے ہیں۔

(۱۰) نجمہ شاہین کھوسہ کی ایک انفرادیت اس کی شاعری میں عورت اور رومانیت پسندی کا عنصر ہے۔ نجمہ نے اپنی شاعری میں اپنے عورت ہونے کے خوب صورت جواز کو خوب صورت سے نبھایا ہے۔ اِس کی شاعری میں عورت کے جذبات، کیفیات، حسیات اور اظہاریات کا ایک ایسا جہاں دکھائی دیتا ہے جہاں رومانیت دھیرے دھیرے رقصاں کھائی دیتی ہے۔ جہاں چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی ہے، جہاں پلو پر کاجل مچلتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جہاں حیا شرماتی اور اداِلجاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جہاں نسوانی و رومانی جذبے کے تحت پائی جانے والی خواست و خواہشات، طلب و تقاضات، کشمکش و مبازرات، حریت و انقلابات اور عشق و جذبات جیسے عوامل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ نے ایک عورت ہو کر عورت کو سمجھنے کا دقیع کام خود بھی کیا اور دوسروں کے سامنے پیش بھی کیا، یعنی اِس نے ڈاکٹر سلیم اختر کی اُس بات کا بھرم رکھا جس میں انہوں نے کہا تھا:

''عورت کا مطالعہ اور اس کی تفہیم مرد کے لیے بالواسطہ قسم کی چیز ہے اس لیے اس کی ناکامی تو معاف کی جاسکتی ہے لیکن عورت، عورت کو نہ سمجھ پائے، اس کی تو صرف تین ہی وجوہ ہو سکتی ہیں، کوتاہ فہمی سب سے بڑی وجہ اور پھر یا تو وہ اظہار سے خوف زدہ ہے ورنہ وہ اظہار پر قادر نہیں ہے''۔

نجمہ شاہین کھوسہ نے عورت کی نارسائی کو جس انداز میں پیش کیا، وہ اِس کی ایک نظم ''میری نارسائی'' میں دیکھا جا سکتا ہے جو خواتین کے عالمی دن کے موقع پر لکھی گئی اور

جس میں عورت ہونے کی سزا کو موضوع بنایا گیا لیکن جس خوب صورت انداز میں موضوع کو نبھایا گیا، وہ آپ بھی دیکھئے: ع

’’میں کیسے کروں بیاں اپنی نارسائی
عورت ہونے کی کیا میں نے ہے سزا پائی
میں جو بیٹی بہن اور ماں کا روپ ہوں
جو سچ پوچھو تو گود سے گور تک
ان رشتوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور
خود کے لیے کڑی دھوپ ہوں
میرے جنم نے میری ماں کو سوچوں میں اُلجھایا
میرا وجود اُس کے لیے بن کے آیا ایک تاریک سایہ
باپ نے کبھی حقارت سے مجھے ٹھکرایا
اور کبھی بے بسی سے مجھے زندہ دفنایا
کبھی وقت نے چھین لی مجھ سے مرے بچپن کی رعنائی
میرے معصوم ننھے ہاتھوں کو
کھلونے کی جگہ روشِ دوراں سکھلائی
میری روشن چمکتی آنکھوں کو
زمانے کی تیرگی دکھلائی
اور چھین لی مجھ سے میری بینائی
کبھی میری تقدیر پر روئی ہے شہنائی
کبھی دنیا کے ناخداؤں نے ڈولی کے نام پر
مجھے قربان کیا
اور کبھی حنا کے نام پہ

میرے خوابوں کو لہولہان کیا
اور کبھی خطا کے نام پہ مجھے سنگسار کیا
کبھی وفا کے نام پہ مجھے میرے ہی محبوب نے شرمسار کیا
میں جو تتلی کی طرح ہوا کے دوش پہ اڑتی
اپنے آنچل میں تاروں کے حسین رنگ بھرتی
مت پوچھ کہ
مجھے دنیا نے کیسے نیلام کیا
ناحق میرے خوابوں کو بدنام کیا
اس جہاں میں میرے کتنے ہی منصف بنائے گئے
فرائض کے سبھی حساب مجھ سے ہی چکائے گئے
جتنے بھی تھے آگہی کے باب مجھ سے چھپائے گئے
شہر کی مقتل میں میرے خواب لٹائے گئے
یوں زندگی موت کے پیرہن میں مرے پاس آئی
احساس کے قاتل لوگوں نے
میری روح کی کرچیوں سے
دنیا کی مقتل سجائی
مت پوچھ مجھ سے میری نارسائی
ایک عورت ہونے کی کیا میں نے ہے سزا پائی‘‘

نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری میں بطریقِ احسن عورت کے لین ومہین تصورات، لطیف و شدید جذبات، نرم و نازک خیالات اور عقل و عشق کے بیچ ڈولتی کیفیات اور نفسیات کی عکاسی کی ہے۔ نجمہ کی شاعری میں عورت، عورت کے روپ میں ملتی ہے جو اپنی نسوانی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہے اور شاعرانہ باریکیوں سے بھی مکمل جان کاری رکھتی

ہے ۔یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو نسوانیت کی ذمہ داریوں سے کوتاہ فہمی کرتی ہے اور نہ ہی وہ شاعرانہ اظہار سے خوف زدہ دکھائی دیتی ہے بلکہ وہ اپنی حسِ ادراک اور قوتِ اظہار کا استعمال اتنے خوب صورت انداز میں کرتی ہے کہ نہ ہی عشق ممنوع کا شائبہ گزرتا ہے اور نہ ہی تخلیقی اظہار میں کوتاہی کا گمان ہوتا ہے یعنی عورت ،عورت کا ایک بھرپور اور خوب صورے اظہار بن کر سامنے آتی ہے۔

(۱۱) خلیل جبران نے کہا تھا کہ:''عورت نے میری آنکھوں کی کھڑکیوں اور میری خواہشات کے دروازوں کو وَا کیا'' جب کہ خلیل جبران نے ہی اپنی کتاب ''Broken Wings'' میں یوں لکھا:

''جدید معاشرے نے خواتین کو کم عقل بنا دیا ہے لیکن مردوں کے طمع نے اِس کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔کل کی عورت ایک خوش بخت بیوی تھی لیکن آج کی عورت ایک بد بخت معشوقہ ہے۔کل وہ روشنی میں بند آنکھوں گھومتی تھی لیکن آج رات کی تاریکی میں آنکھیں کھول کھول کر چلتی ہے۔کل کی عورت اپنی کم عملی میں خوب صورت ،سادگی میں با فضیلت اور کمزوری میں پُر صلابت تھی۔آج کی عورت علمیت اور مہارت کمزور اور گمراہ ہو چکی ہے۔کیا کبھی وہ دن آئے گا جب خوب صورتی اور علمیت ،مہارت اور قسمت ،جسمانی کمزوری اور اخلاقی مضبوطی ،عورت کی طاقت ہوں گے''۔

نجمہ شاہین کھوسہ، ایک ایسی ہی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جس میں خوب صورتی ،علمیت ،مہارت ، قسمت اور اخلاقی مضبوطی یکجا نظر آتی ہے۔ نجمہ کی شاعری کا موضوع خود نجمہ ہے یعنی ایک عورت اور عورت کی نفسیات ہی ہے۔ کیوں وہ اِس مردوں کے معاشرے کا جیتا جاگتا کردار ہے اور کردار بھی وہ جو احساس کی دولت اور اظہار کی قوت سے مالا مال ہے۔یہی وجہ ہے کہ غزلوں اور نظموں میں ، اِس کے گرد و نواح میں بھنگڑا ڈالتی

محرومیوں ، ناکامیوں کے بیچ ایک عورت چکر کاٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔اشعار میں نظر آنے والا خارجیت کا عنصر دراصل خود اِس کا اپنے آپ ،عورت اور سماج ،معاشرے اور معاشرتی رویے ،تہذیب وثقافت اور روایات سے فطری جرٔت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔مثال کے طور پر ایک نظم ''ہم پاگل لڑکیاں'' ملاحظہ کیجئے:

''ہم ساری لڑکیاں
ہم ساری تتلیاں
اپنے اپنے قبیلوں سے جدا
اپنے اپنے گھونسلوں سے خفا
وقت کے آئینہ خانے میں
دلوں میں بے رنگ خواب سجائے
نینوں میں دکھ کے موتی چھپائے
منزلیں تلاشتی پھر رہی ہوں
خود کو خود میں ڈھونڈ رہی ہوں
کبھی منزلیں ہمیں ملتی نہیں
اور کبھی منزلوں کے قابل ہم نہیں
پھر بھی جستجوئے ذات میں خود کو تلاشتی پھر رہی ہوں
ہم ساری لڑکیاں
ہم ساری تتلیاں
ہم سورج کی روپہلی کرنوں میں
اپنا ستارہ ڈھونڈ رہی ہیں
بہتے ساگر کی موج میں
اپنا کنارہ ڈھونڈ رہی ہیں

غموں کے ہم طوفان اٹھائے
ہونٹوں پہ مسکان سجائے
اپنی ہستی کھوج رہی ہیں
خود کو خود میں ڈھونڈ رہی ہیں
ہم پاگل لڑکیاں
ہم اڑتی تتلیاں''

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں شعوری طور پر موضوع رومانیت پسندی نہیں ہوا ہو گا لیکن کہیں لاشعوری طور پر یہ ایک غالب موضوع بن کر سامنے آتا ہے۔ ایک نثری نظم ''آدھا بسکٹ'' میں موجود عورت اور عورت کا اظہار دیکھئے:

''کل ایک ہنستی مگر اُداس آنکھوں والی
معصوم لڑکی کو دیکھا
جو اپنے خوابوں کے شہزادے کی
سنہری آنکھوں میں جھانکتی
اُس کی ہر ادا کو اپنی نیل سمندر آنکھوں
میں اتار رہی تھی
وہ کھکھلاتا ہوا
ایک مٹھائی کا ٹکڑا
اس کے منہ تک لے جاتا اور پھر
جب وہ منہ کھولتی
تو ایک بھرپور قہقہے سے اپنے منہ میں لے لیتا
اور لڑکی پھر بھی اُسے دیکھتی رہتی
کچھ حیرت سے کچھ حسرت سے

شاید اُس کی آنکھوں میں کسی آنے والے
ہجر کی ریت چبھ رہی تھی
کسی جدائی کا طوفان اس کی سماعتوں کو
آواز دے رہا تھا
اُسے کسی آدھے بسکٹ
کی کہانی سنا رہا تھا
شاید وقت بے رحم
پھر ایک اور کہانی بنا رہا تھا
یا کسی کہانی کو دُہرا رہا تھا''

نجمہ شاہین کھوسہ نے ریت کے سمندر میں آنکھ کھولی، اِس لیے یہاں روہی کا رنگ نظر آنا بھی ایک فطری معاملہ ہوگا۔ ایک نظم ''ریت تو پھر ریت ہے'' روہی انداز دیکھئے: ع

''میرے گھر کی الجھی پگڈنڈیوں سے
اس کے گھر کے راستوں تک
چناب اور سندھ آتے ہیں
چناب پار کرنے کو تو
شاید کچا گھڑا مل بھی جائے
مگر سندھ کے پار اترنے کو
کچے گھڑے کی مٹی نہیں ملتی
کچا گھڑا کیسے بناؤں
ریت تو پھر ریت ہے
بھلا ریت سے بھی کچھ بنا؟''

نجمہ شاہین کھوسہ نے ایک عورت کی زندگی کی خواہشات و جذبات کو بڑے احسن

طریقے سے اپنے شعروں کی زینت بنایا اور نبھایا ہے۔ اِس نے محبت کے جذبات کے ساتھ ساتھ اپنے گردونواع میں بدلتی صورت حال کا نوحہ بھی شعر کیا ہے۔ اِس نے جہاں عقل و عشق کی بات کی ہے وہاں عورت کی معصوم خواہشات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ عورت کی جذباتی ونفسیاتی کیفیات کے اظہاریے کے لیے شاعرہ کو موضوعات تلاشنے یا الفاظ تراشنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ یہ سب کا سب کچھ ایک فطری انداز میں طے ہو جاتا ہے اور قاری تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں موضوعات میں نظر آنے والا تنوع اور سہل کاری تخلیقی عطا کے سوا کچھ اور نہیں کہی جاسکتی ہے جب کہ کیفیات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جانے والا پیمانی اور سانچا بھی انفرادیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

(۱۲) نجمہ شاہین کھوسہ کہ شاعری میں ماں اور محبت کا رشتہ کئی جہتیں لے کر سامنے آتا ہے۔ ماں، جس کے بارے خلیل جبران نے کہا تھا کہ: ''انسانوں کی زبان سے جو سب سے پیارا لفظ ادا ہوتا ہے وہ ماں ہے اور سب سے پیاری پکار جو سنی جاسکتی ہے، وہ میری ماں ہے۔ ماں کا لفظ محبت اور امید کا استعارہ ہے، میٹھا اور مہربان لفظ جو دل کی گہرائیوں سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ماں سب کچھ ہوتی ہے''۔ ماں اور محبت، شاعرہ کے نزدیک بھی سب کچھ کے معانی رکھتی ہے۔ ماں کی محبت میں لکھے گئے چند اشعار، مطلعے کے ساتھ ملاحظہ ہوں: ع

دکھ کے لمحوں میں مرا ایک سہارا ماں ہے
میں اگر ڈوبتی کشتی ہوں کنارہ ماں ہے

اُس کے قدموں میں جو جنت ہے تو مطلب یہ ہے
آسمانوں سے جسے رب نے اتارا ماں ہے

خوشبو ایسی کہ مری روح تلک مہکی ہے
روشنی ایسی کہ بس نور کا دھارا ماں ہے

شاعرہ اپنے بچپنے کو نہ بھول پائی اور نہ ہی بھولنے کی شعوری کوشش کی ہے بلکہ اپنی کیفیات کو اشعار میں ڈھال کر جو زندگی، اِس نے اپنی یادوں کو بخشی ہے، وہ ہمیش رہنے والی صورت ہے۔ ماں کی محبت میں لکھی گئی چند نظموں میں سے ایک ''ماں ایک ایسی ہستی ہے'' کا انداز دیکھئے: ع

''ابر کی صورت میرے سر پر
ایک دعا ہی رہتی ہے
میری اپنی ذات بھی اس کی
خوشبو سے ہی مہکی ہے
اپنے دکھوں پر رونے والی
میرے لیے تو ہنستی ہے
میری تاریکی میں ہر پل
جھلمل کرنوں جیسی ہے
میرا ہر اک دکھ جو سمجھے
بس وہ ماں کی ہستی ہے''

ماں اور محبت ایک ایسی کہانی ہے جس سے یہاں ہر شخص جڑا ہوا ہے، میں جڑا ہوں، آپ جڑے ہیں، یہ شعر جڑے ہیں اور بے شک ہماری شاعرہ بھی جڑی ہوئی ہے۔ شاعرہ جب اپنی ممتا کی محبت کو یاد کرتی ہے تو اُس کا بچپنہ بھی ساتھ یاد کرتا ہے۔ یوں ماں اور محبت کی کہانی ساتھ چلتی ہے، کہتی ہے: ع

''ماں کہتی تھی
میری ننھی سی گڑیا
آج باہر نہ نکل
کیا تجھ کو معلوم نہیں

آج سورج گرہن ہے
روایت کہتی ہے
سورج گرہن ہو تو
دیکھنے سے آنکھیں بینائی کھو دیتی ہیں
چہرے مرجھا جاتے ہیں
ان پہ زردی چھا جاتی ہے
مہکتے تن و من کُملا جاتے ہیں
پھول اوڑھ لیتے ہیں زرد رتوں کا پیرہن
بہاریں خزاں میں ڈھل جاتی ہیں
یہاں تک کے سمندر کے بھنور
اور زمین کے مدوجزر بھی بدل جاتے ہیں
مری گڑیا
تو باہر نہ نکل
کہ تیری غزالی آنکھوں اور روپہلے چہرے کو
کہیں چاٹ نہ لے یہ سورج گرہن
مگر آج ماں کو بتائے کون
اس کی گڑیا کو
جسے زرد کر نہ سکا سورج گرہن
اسے ڈَس گیا محبت کا چاند گرہن'

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں جہاں محبت کا عکس نمایاں ہے وہاں اِس کے سوتے ماں کی محبت سے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔ ماں کی ہستی یوں تو سبھی کی محبتوں کا محور ہوتی ہے لیکن یہاں شاعرہ کے اُس سُکھ اور دُکھ کہ جس کا ذکر لے کر ہم چلے

اور یہاں تک آن پہنچے ہیں، کا سہارا ماں کی ذات بتاتی ہے۔ ماں کی محبت میں لکھے گئے چند اشعار، مقطعے کے ساتھ ملاحظہ ہوں: ع

تپتے صحراؤں میں کس طرح بھٹک سکتی ہوں
مجھ کو جو راہ دکھائے وہ ستارہ ماں ہے

اُس کے ہر دکھ کو میں لفظوں میں سموتی کیسے
میں نے اشکوں سے بس اک لفظ اُبھارا ''ماں'' ہے

سب نے پوچھا کہ بھنور سے تُو بچے گی کیسے
میں نے بے ساختہ نجمہ یہ پکارا ''ماں ہے''

(۱۳) نجمہ شاہین کھوسہ، سے ملاقات ایک شاعرہ سے مختصر ملاقات کا معاملہ نہیں بلکہ یہ شاعری سے ایک تفصیلی نشت کا معاملہ ہے اور شاعری بھی وہ کہ جو احساسات، کیفیات ، موجودات، روایات، مدارات، امکانات، خیالات، وجوہات، سوالات، جوابات اور جذبات سے جڑی نظم و نثر اور تخلیق سے بھری پڑی ہے جسے فقط شاعری کہا جانا مناسب نہیں ہوگا بلکہ ایک خوب صورت تخلیق مراد شاعری کہا، لکھا اور پڑھا جائے گا کیوں کہ یہ وہ منزل ہے جسے پانے کے لیے شاعرہ نے اغتشاشِ زیست کی گھمبیرتا کو سلجھانے کا قصد اُٹھایا اور ایک زندہ و جاوید تخلیق مراد شاعری پیش کی ہے جو مجھ سمیت اپنے سبھی قارئین سے مکالمہ کرتی اور جذبات و کیفیات کی باہمی اشتراک کی منازل طے کرتی ہے جہاں تخلیقی سحر نئے جہانوں کی سیر کا سبب بنتا ہے۔ ایسی خوب صورت تخلیق پر جب ایک قاری تحسین و دعا پیش کرتا ہے تو شاعرہ میں خود خواہی و خود پرستی نہیں آتی بلکہ عجز و انکساری دَر آتی ہے جو دعا کرتی ہے، کہتی ہے: ع

میرے خدا، میرے محتسب مجھ پہ یہ احسان کر
بھول کر سب لغزشیں میری زندگی آسان کر

شدتِ جذبات اور حسِ ادراک کا معاملہ نجمہ شاہین کھوسہ کی کو ایک مہان تخلیق کار بن جانے پر مجبور کرتا ہے جو زندگی کی تنہائیوں، محرومیوں، محبتوں اور جدائیوں کا انت تلاشنے نکلی ہے۔ جس کی منزل کے راستے میں سُکھ، دکھ، تکلیف، پریشانی، اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید، یاس، ہنسی، آنسو، آرزو، خلش اور کسک کے استعارے مسکراتے ہیں، لفظ روشنی کرتے اور شاعری سجدہ کرتی ہے۔ یوں دعا کی صورت سجدوں سے اُٹھنے والی تخلیق کی جاودانی کے لیے، وہ خدا کے حضور سربسجود دعا کرتی ہوئی ملتی ہے، کہتی ہے: ع

''میں حاضر ہوں
مرے مالک ، مرے خالق
سربسجود ہوں معبود مرے
اپنے سجدہ ریز کو آج شاد کر دے
مرا دل اپنی معبودیت سے آباد کر دے
دنیا کی محبت سے مجھکو آزاد کر دے
مانا کہ !
محبت ہے زندگی ، رہبر ہے ، یقیں ہے
روشنی ہے ، نغمگی ہے
مگر میں جس چاہت میں سرگرداں رہی ہوں
وہ احساس زیاں ہے ، خلش ہے ، کم مائیگی ہے
مرے مہرباں ، مرے ہمدرد ، میرے غمگسار
بس تو ہی میرا اپنا ہے ، میرا سچا غم خوار
گرچہ پارسائی کا مجھکو دعویٰ نہیں

مگر جھوٹی محبت کا مجھکو یارا نہیں
تو جانتا ہے کہ !
دل کے زخم تو رستے ہیں سبھی
مرہم کیلئے مگر وفا کو بیچا نہیں
لمحوں کی خوشی کے بدلے اپنی روح کا مان کیا
میں نے وفا پہ اے یزداں خود کو قربان کیا
اے بارگاہِ ایزدی !
اے میرے مہربان خدا !
مجھے پھر سے مرے وہی دن دلا دے
گئے دنوں کا پھر مجھ کو حوصلہ دے
آج جو اپنی ذات میں میں ٹوٹ رہی ہوں
زیست کی تلخ سچائیوں سے روٹھ رہی ہوں
آج کیسے جذبوں میں بہکنے لگی ہوں
کیوں اندھیاروں میں بھٹکنے لگی ہوں
پھر سے مجھے وہ دل کی روشنی دکھا دے
ٹوٹے ہوئے میرے دل کو پھر آسرا دے
مجھے ایسی محبت سی لینا ہے کیا
مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے
جس میں محبوب عشق کو رسوا کرے
اور نفس سچے جذبوں سے کھیلا کرے
جس میں روح منتشر ہو اور
خاموشی بولا کرے

دکھ ، بے بسی ، اور صبر رویا کرے
جس میں کم مائیگی کا احساس رقصاں کرے
اور گھٹن زیست کی موت بن جایا کرے
جس میں بے وفائی ، وفا کو مسلا کرے
مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے
محبوب سے کم مائیگی ، رسوائی نہیں چاہیے
دل کو اور دکھوں سے شناسائی نہیں چاہیے
مجھے محبت کے فرائض سے لینا ہے کیا
وفاؤں پہ موقوف کب یہ دنیا ہوئی
حرص و ہوس اب اس میں شامل ہوئی
بے حسی ، دردِ ہجر کا حاصل ہوئی
اب تو بکتے ہیں محبوب بازاروں میں
بس محرومیاں ہیں وفا کی راہگزاروں میں
مجھے فرائض محبت اب نبھانا نہیں
بے حقیقت ، دردِ ہجر سے دل لگانا نہیں
مجھے طفل تسلی نہیں چاہیے
جھوٹے خوابوں سے دوستی نہیں چاہیے
اب کسی خوشی کی رفاقت نہیں چاہیے
اُداسی یوں میرا مقدر ہوئی
اور وفا میری یوں دربدر ہوئی
میں جیتی سکون سے سب لمحے زیست کے
فریب ملتے نہ اگر جھوٹی پریت کے

اداس شاموں میں جس کے نغمے گنگنائے
ویراں راتوں میں جس کی یادوں کے دیپ جلائے
رہا وہی آشنا یرے غموں کا نامہ بر
اپنی منزل کی بنا تا رہا مجھے گردِ سفر
مجھے ایسی خوشی نہیں چاہیے
اپنی آنکھوں میں رقصاں بے بسی نہیں چاہیے
مجھے فرائض محبت سے کچھ بھی لینا نہیں
مجھے فرائض محبت سے آزاد کر دے
بے آباد دل کو آباد کر دے
مجھے اپنی محبت سے شاد کر دے
صرف اپنی محبت سے شاد کر دے''

خلیل جبران نے درست کہا تھا کہ: ''تمہاری خوشی، تمہارا ہی بے نقاب غم ہے اور خوشیوں کا سر چشمہ تمہارے ہی آنسوؤں سے پھوٹتا ہے اور اِس کے علاوہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ دُکھ جتنے گہرے ہوں گے سُکھ بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے تمہارے ہاتھ میں پکڑا ہوا میٹھے پانی کا خوب صورت پیالہ جو اُن بہت سے پیالوں کی قربانی کے بعد تیار ہوا جو کمہار کی بھٹی میں جل کر خاک ہو گئے تھے۔ عود کی لکڑی کی بھینی خوشبو جو تمہارے جذبات کو معطر کرتی ہے، وہ کئی کمزور لکڑیوں کی تراش خراش کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جب کبھی خوش ہو تو اپنے دل میں جھانک کر دیکھو، تمہیں پتا چلے گا کہ یہ سُکھ کسی دُکھ کی ہی دین ہوں گے۔ ٹھیک ویسے ہی جب کبھی غم زدہ ہو تو بھی اپنے دل میں جھانک کر دیکھو، تمہیں پتا چلے گا کہ یہ آنسو بھی کسی خوشی کی ہی دین ہوں گے''۔ نجمہ شاہین کھوسہ کو ملنے والی تخلیق کی زندگی بھی، اِس کے کشٹ کی کہانی ہے جس کے لیے وہ دعا کرتی ہے، کہتی ہے: ع

جلتے ہیں وقت کی دھوپ میں تنہا یہ جسم و جاں
بچھا رحمت کی چادریں اپنا سایہ مہربان کر

یہاں تک آتے آتے ہم نے نہ صرف شاعری بلکہ خوب صورت شاعری کا سندرتا جوبن بھی دیکھ لیا اور ایک شاعرہ بلکہ خوب صورت شاعرہ نجمہ شاہین کھوسہ سے بھی مل لیا ہے اور یہ بھی جان لیا کہ شاعری کیا ہوتی ہے اور شاعر کون ہوتا ہے؟ وہی جو ادراک و الہام کے بیچ کی منزل جہاں واقعیت، حقیقت اور اصلیت کی گھمن گھیری میں اصالتِ وجود کے کاندھے پر دھری رنگ برنگے کپڑوں سے باندھی ہوئی ایک گٹھڑی میں احساسات؛ احساسات سے جڑے درد، رنج اور آنسو، کیفیات، کیفیات سے جڑا وہمہ، مشاہدہ اور ادراک، موجودات، موجودات سے جڑا وقت، سفر اور رفتار، روایات، روایات سے پھوٹتی محبت، نفرت اور حیات، مدارات، مدارات میں گھومتے سُکھ، دُکھ اور علاج، امکانات، امکانات سے جڑی آس، یاس اور قیاس، خیالات، خیالات سے جڑا تخیل، تخلیق اور تعبیر، وجوہات، وجوہات سے جڑا سبب، دلیل اور شعور، سوالات، سوالات سے جڑا موضوع، مسئلہ اور تصدیق و تردید، جوابات، جوابات میں تشریح، تصریح اور توضیح، جذبات، جذبات سے جڑی نظم و نثر اور تخلیق جسے کچھ اور نہیں، بس شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جسے پانے کے لیے، ایک تخلیق کار مراد شاعر اغتشاشِ زیست کی گھمبیرتا کو سلجھاتے ہوئے خود مرگِ زیست کی چوکھٹ تک جا پہنچتا ہے، اُسے شاعر کہتے ہیں اور یہاں پر مجھے ایک بار پھر کہہ لینے دیجئے کہ نجمہ شاہین کھوسہ ایک مکمل اور خوب صورت شاعرہ ہے جو نہ صرف شعر کہتی بلکہ خوب صورت شعر کہتی ہے، جس کے کہے کو شاعری بلکہ خوب صورت شاعری کہتے ہیں جس کے لیے نجمہ شاہین کھوسہ لائقِ تحسین بھی ہے اور ہم اِس کی زندہ تخلیق کی شادمانی کے لیے ہمیشہ دعا گو بھی ہوں گے۔

''جنونِ عشق کی داستان''

کرنل ڈاکٹر اسد محمود خان

عشق، مغلوب محبتوں پر فاتح اکلوتی محبت کی شدّت کا وہ احساس ہے جو اوّل اوّل دل میں عشق آباد رکھتا اور رفتہ رفتہ دل کو عشق میں آباد کرنے کا سامان کرتا ہے۔ کارِ عشق میں جہاں عشق کا معاملہ جدا دکھائی دیتا ہے وہاں عشاق کا معاملہ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ نجمہ شاہیؔن کھوسہ! کے ''میرا صاحب سائیں، عشق ہے تُو'' کا معاملہ بھی سب سے جدا اور سب سے الگ دکھائی دیتا ہے۔ یہ زندگی سے جڑی محبتوں، محبتوں سے پرے کُھلتی روشنیوں کا معاملہ ہے۔ عشق کے اِس سفر میں محبت ابتداء اور محبت انتہاء ہوتی ہے یعنی محبت دُعا سے پہلے اور محبت دُعا کے بعد؛ دُعا سے پہلے کی محبت، رشتوں کے تقدس جب کہ دُعا کے بعد بس ایک سفرِ عشق کی روشنی ہوتی ہے جو کشٹ کی منزل میں ننھے ننھے دیوں کی لڑی سنبھالتی ہے۔ ''میرا صاحب سائیں، عشق ہے تُو'' ادراک کی منزل پر روانہ عشاق، کے جذب و کیف کا فیض ہی ہوسکتا ہے جو نجمہ شاہیؔن کی جھولی میں گرا ایک انمول خزانہ کہا جاسکتا ہے:

عشق کو آنکھ میں جلتے دیکھا
پھول کو آگ میں کِھلتے دیکھا

عشق کے راز نہ پوچھو صاحب
عشق کو دار پہ چڑھتے دیکھا

عشق کے دام بھی لگ جاتے ہیں
مصر میں اس کو بکتے دیکھا

نجمہ شاہین، جذب و کیف کی جس بے خود حالت کا درشن کر چکی، اُس کیف کا سہنا لازم ٹھہرا لیکن سہنے کی ہنر آشنا، نصابِ عشق کا بیان دوسروں کی آسانی خاطر بڑی روانی سے کہہ جاتی ہے۔ ذرا عشاق کی جاگیر کا اندازہ کیجئے گا:

تدبیر ہے تقدیر ہے قرآن ہی جاگیر ہے
اللہ کے فرمان کی قرآن ہی تصویر ہے

انجیل اور تورات بھی اس نے اتاری ہیں مگر
نقش ہے رب کا جہاں قرآن ہی تفسیر ہے

پیت بھی اور پریت بھی، بے چین دل کا میت بھی
اور سب دلوں میں آس کی قرآن ہی تنویر ہے

نصابِ عشق کا پہلا مضمون، منزل و مسافرت کی گرد کو روشن ستارہ کرنے کا اِذن عطا کرنے چلا ہے جو وارداتِ قلبی کی دف نعت سناتا ہُوا بیدار ہوتا ہے؛ ذرا خواہش اور ادراک کا حُسن ملاحظہ ہو:

ان پر درود بھیجنا احسان بھی نہیں
اپنی دعا کا اور تو سامان بھی نہیں

طیبہ میں اوڑھ لوں میں درودوں کی اوڑھنی
بے تاب دل کا اور تو ارمان بھی نہیں

عشقِ نبی سے پائی میرے دل نے روشنی
صلِ علی سے آگے تو وجدان بھی نہیں

نصابِ عشق کا اگلا مضمون، معرفت و ادراک کی الجھی گتھی کو سلجھانے کی ترتیب کر دیتا ہے:

کربل والوں کے دم سے ہے، ہم کت پیارا ماتم
اپنے دکھوں میں اس جیون کا، بس ہے سہارا ماتم

زندگی کی حقیقت، محبت سے جُڑی ہے اور محبت کا نصاب رشتوں کی ابجد سے تشکیل پاتا ہے۔ تشکیلی عناصر کی گتھی میں ہر رشتہ، قلب و روح کی صورت گری کا ایک بہانہ ہوتا ہے جو محبت کی زندگی کا حسن سنوارتا دکھائی دیتا ہے۔ محبتوں کا یہی حسن، نصابِ عشق کی پہلی تختی پر اوکرے، پکے کرنے کی مشق سکھاتا ہے۔ نجمہ شاہین رشتوں کی محبت سے جُڑی وہ زندہ حقیقت ہے جو نصابِ عشق کا سبق پڑھنے کا یارا رکھتی ہے۔ رشتوں کی محبت کا سلیقہ، شاعری کا سلیقہ بن کر آتا ہے؛ کہتی ہے:

دنیا کا سہارا نہ محبت کا سہارا
مجھ کو ہے مرے بابا کی شفقت کا سہارا

ہر ایک دلاسہ ہے دکھاوے کا یہاں پر
بابا کی محبت ہے حقیقت کا سہارا

ماں باپ کی صورت میں ترا روپ ملا ہے
قائم رہے مولا یہ رفاقت کا سہارا

اے مرے رب تو مجھے بخش ستارے میرے
پھول آنگن کے مرے راج دلارے میرے

یہ مرے چاند، یہ سورج، یہی دنیا میری
عمر، حمزہ سے مکمل یہ شمارے میرے

کشٹ، گیان کی پہلی سیڑھی جب کہ انتخاب، کشٹ کی پہلی منزل ہے۔ انتخاب کا معاملہ جہاں اَدا، اطاع اور دُعا سے مشروط ہے وہاں عطاء سے بھی جُڑا ہُوا ہے۔ عشق جنوں کی مسافرت میں آئینہء حیرت پر ابھرنے والے مبہم نقوش میں رنگ اُترنے کا منظر جس آنکھ پر منکشف ہوتا ہے، اُسی آنکھ کا منظر''''، کی شاعری میں نمایاں دکھائی دیتا ہے؛ جبھی تو کہا:

پھر کار گاہِ عشق میں لایا گیا مجھے
پھر زندگی کا خواب دکھایا گیا مجھے

حیرت زدہ ہے آنکھ اور حیراں ہے زندگی
آئینہ خانے میں جو بلایا گیا مجھے

ہنستی ہے میری آنکھ تو روتا ہے میرا دل
سوزوالم کے گیت میں گایا گیا مجھے

کھلنے لگ ہیں زخم گلابوں کے رنگ میں
رنگِ خزاں میں ایسے سجایا گیا مجھے

عشق و وفا کے ساتھ ہی اک ہجرِ نا تمام
کیسے خمیر غم سے بنایا گیا مجھے

اذنِ سفر ملا تھا یوں شب کی سفیر کو
جگنو میں ماہتاب دکھایا گیا مجھے

ہونے لگے ہیں آس کے سارے چراغ گل
شاہین تیرگی میں بسایا گیا مجھے

کارگاہٗ عشق میں ادراک کی منزل کا حاصل جس اظہاریے کی روح ٹھہرا، اُس کیف کی صورت کیا ہوگی۔ یہ عشق کا نہیں، جنونِ عشق کا معاملہ ہے اور کیفِ جنوں کی صورت بےچینی و بےقراری کے ساتھ ساتھ قلب و جاں کا کشٹ مانگتی ہے۔ اب یہاں جو خود سے بےخود ہونے کا یارا رکھے، وہی کشٹ و ادراک کی بےچینی میں اُترے۔ نجمہ شاہین نے ''میرا صاحب سائیں، عشق ہے تُو'' سے پرے روشن دیوں کی سمت سنبھالی تو مغلوب محبتوں کی فاتح اکلوتی محبت کی شدّت کا احساس ساتھ رہا، یہاں تک کہ فیض کی صورت بنتی گئی اور ''میرا صاحب سائیں، عشق ہے تُو'' کی تفہیم کی منزل کا مرحلہ درپیش ہُوا۔ بےشک! یہ سب کرم اور فیض کے معاملے ہیں جو جدا جدا ہو سکتے ہیں؛ جبھی تو کہا:

یہ جو عشق مسلک کے لوگ ہیں، انھیں رمز سارے سکھا پیا!
یہ جنون عشق کی داستان، انھیں حرف حرف سنا پیا!

مرے چارہ گر، میں ہوں دربدر، میں تو تھک گئی، ہے عجب سفر
مری بےنشاں سی ہیں منزلیں، مجھے راستہ بھی دکھا پیا!

نہ حدود میں، نہ قیود میں، مرا دل ترے وجود میں
یہ سجود کا حسیں پیرہن میر ی روح پر تو سجا پیا!

میں فقیر ہوں، میں حقیر ہوں۔ کسی خواب کی نہ اسیر ہوں
میں عزیز ہوں تو تجھے ہی بس، سو عزیز تر ہی بنا پیا!

یہ جو آرزوؤں کا دیس ہے، یہ جو خاک خاک سا بھیس ہے
جو ازل ابد کا یہ بھید ہے، اسے بھید ہی میں بتا پیا!

یہ قدم قدم پہ بشارتیں، یہ نظر نظر میں زیارتیں
یہ بصارتیں، یہ بجھارتیں، مرے شہرِ دل کو دکھا پیا!

یہ جو میرے من میں ہے روشنی، یہی زندگی، یہی بندگی
مری فکر میں ترے ذکر میں جو چراغ ہیں ہو جلا پیا!

نجمہ شاہیؔن نے جس دم ''میرا صاحب سائیں، عشق ہے تُو'' کی تفہیم کا کشٹ کاٹنے کا فیصلہ لیا ہوگا، یقیناً اُس دم اِس منزل کی راہ میں حائل صعوبتوں کا ادراک بھی پیش نظر رہا ہوگا جبھی تو ایک الگ رنگ دکھائی دیتا ہے جو لفظ اپنے سچے اور سُچے معانی، گواہی دینے حاضر ہوتے ہیں۔ ''میرا صاحب سائیں، عشق ہے تُو''، نجمہ شاہیؔن کے عشقِ جنوں کی کتھا ہے جو اِس راہ کے مسافروں کے لیے نصاب کا درجہ رکھتی ہے۔

ذہن و دل پر دستک دینے والی شاعرہ

اسحاق ساجد جرمنی

نجمہ شاہین ان چند شاعرات میں سے ہیں جنھوں نے اپنے لیے مقامِ اعتبار پیدا کیا ہے۔ نجمہ شاہین کا مجموعہ کلام ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میرے سامنے ہے۔ خوبصورت کتاب بڑا اسائز اور ٹائٹل بھی خوبصورت۔

یہ مجموعہ ایک ایسی شاعرہ کا ہے، جو اپنی عوام اور پوری انسانیت کے لیے جس انداز اور کمٹمنٹ کے ساتھ سوچتی ہیں اور اس کے ساتھ جس خوبصورتی کے ساتھ اپنی تشویش کو جمالیاتی پیکر میں ڈھالیتی ہیں وہ ایک اچھی شاعرہ کی لازمی شرط ہے، وہ کمٹمنٹ جو جمالیاتی تجربہ نہ بن سکے اچھی شاعری کے زمرہ میں نہیں آتا، اسے شاعری کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے۔ نجمہ شاہین کی بعض نظموں میں فیضؔ جیسی تمثال سازی رغبت نظر آتی ہے اور میرا خیال ہے نجمہ شاہین کلاسیکی شاعری سے متاثر ہیں۔ نجمہ شاہین کے یہاں اظہار کی تازگی شعوری کاوش کے بجائے فطری عطیہ کے طور پر دکھائی دیتی ہے آپ کی شاعری میں جذبات کا اظہار ہیجان انگیز طور پر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے جذبات اس قدر تمثیلی انداز میں پیش کرتی ہیں کہ اس کے جذبہ کو سراہنے کے لیے جمالیاتی فضا تیار ہو جاتی ہے۔ مقام مسرت کہ نجمہ شاہین ایک جدید اردو شاعرہ ہیں۔ نجمہ شاہین کی نظموں میں بیانِ تازگی کی ایک قوسِ قزح ہے۔ اتنی اچھی ہلکے ہلکے پیروں سے چلتی نظموں کی یہ شاعرہ اپنے پیچھے ایک بہت بڑا سماجی شعور بھی رکھتی ہیں۔ آپ اپنے وقت کی آواز سے بے بہرہ بھی نہیں، وہ ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھی ہیں یہ بات ان کی نظمیں بتا رہی ہیں اور وہ جانتی ہیں۔ جیسے کہ ان کے کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ وقت صحراؤں کی طرح کروٹ لیتا ہے، رات کی

رات کون سا ٹیلہ اپنی جگہ بدل لے گا، گویا آپ ایک مثبت احساس اور توجہ سے اشعار کہتی ہیں۔

نجمہ شاہین شاعرہ بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی، گویا آپ دل کے معاملات کو لفظوں اور پھر نبض پہ ہاتھ رکھ کر بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ شاعر کیوں کہ اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہوتا اور اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے، اس لیے نجمہ شاہین کی شاعری میں اس کے عہد کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔

نجمہ شاہین کی شاعری میں کہیں خوابوں میں زندہ رہنے والی باتیں میں نے محسوس نہیں کیں۔ مگر کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسان کو بیداری کے مقابلے میں زیادہ شاداب اور تروتازہ بنا دیتے ہیں اور اس کی تمناؤں کو اس قدر مستحکم کر دیتے ہیں کہ عالمِ بیداری پر عالم خواب کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ آپ کی پوری شاعری میں کہیں مایوسی کی بات نظر نہیں آتی بلکہ اُمید پہ قائم ہے۔ میں نے آپ کی کسی غزل میں محسوس نہیں کیا کہ نجمہ شاہین ارادے باندھتی ہیں اور پھر ذہنی کشمکش میں انہیں خود ہی توڑتی ہوں۔ دل کے موسموں کو محض بناوٹی بہاروں سے نجمہ شاہین منسوب نہیں کرتیں نہ وہ ان موسموں کو رقصِ بہاراں یا کیف و سرور کی محفل میں تعبیر کر کے خوش ہوتی ہیں۔ بلکہ فکری اعتبار سے وہ ان سرخ پھلوں کو کھلانا چاہتی ہیں۔ جہاں شاخوں سے گرنے والے پتے بھی سبز ہی رہیں۔ وہ ایک خوشحال زندگی کا تصور زوال پزیری کے باوجود اور یہ رجائیت ہی نجمہ شاہی کو اپنے عہد کی اس نئی نسل سے بلند کر دیتی ہے۔ نجمہ شاہین کے اشعار میں ندرت کے ساتھ ساتھ اثر پزیری کی کیفیت بھی محسوس کی جاسکتی ہے اور سرخوشی وغم انگیزی بھی آپ نے پوری شاعری کے ذریعے جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ اپنے اندر احساس کی ایک ایسی دنیا رکھتا ہے جو باشعور قاری کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گا اور انہیں زدہ رکھے گی۔ میں یہ بات بلا خوفِ تردید سے کہہ سکتا ہوں کہ نجمہ شاہین عظیم شاعرہ تو ہیں ہی عظیم انسان بھی ہیں۔

اور شام ٹھہر گئی

اجنبی شہر کی اجنبی شام میں

زندگی ڈھل گئی ملکیتی شام میں

آخری بار آیا تھا، ملنے کوئی

ہجر تجھ کو ملا، وصل کی شام میں

یہ اشعار ڈاکٹر نجمہ شاہی کھوسہ کے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کی جھوک چکا چوند شہروں سے دور ایک صحرائی بستی میں آباد کر رکھی ہے اور اپنے جذبہ واحساس کے ایسے پیکر مصور کر رہی ہیں جو صرف دور افتادہ مضافات کے تخلیق کاروں کی باطن میں پروش پاتے ہیں اور جب شعر کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان پر مضامین غیب سے اتر رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ''اور شام ہوگئی'' میں ان کی زندگی کا استعارہ بن گئی ہے۔ بشریٰ رحمٰن کو اس لہر کا رنگ حنائی اور آہنگ غنائی محسوس ہوا اور انہوں نے شاعرہ کو مشورہ دیا کہ ''دل کے لہو میں قلم ڈبو کے نشتر کی طرح چلاتی ہو کہ یہی تمہارا سنگھار ہے اور یہی تمہارا پیار ہے۔'' میں نے ''اور شام ٹھہر گئی'' کی غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو محسوس ہوا کہ نجمہ شاہین نے زمانہ بشریٰ رحمٰن کے سیاست گزیدہ مشورے پر صرف اتنا عمل کیا ہے کہ قلم کو دل کے لہو میں ڈبو لیا ہے لیکن اسے نشتر کی طرح چلنے کی اجازت نہیں دی اور انسانی دکھ سے آگہی کا احساس پیدا کیا اور درد کی وہ کہانی بیان کی جو سرائیکی وسیب کی عورت کا مقدر ہے۔ ملتان کے معروف شاعر رضی الدین رضی نے درست لکھا کہ ''اس کتاب (اور شام ٹھہر گئی) میں ہمیں ان کے ذاتی دکھ اجتماعی دکھوں سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے اور ان کی غزلوں اور نظموں میں ہمیں ایک خاص اداسی دکھائی دیتی ہے جو قاری کو اپنے حصار میں لیتی ہے۔'' ''ایک سوال''، ''محبت ایک ضرورت ہے''، ''آدھا بسکٹ''، ''سوال کر کے کیا ملا؟'' اور ''موسم ہیں بس چار'' جیسی نظموں میں نجمہ شاہین کا باطن نئے زاویوں سے سامنے آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزل کی لخت لخت کیفیت ایک حزن مسلسل میں تبدیل ہوگئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ''اور شام ٹھہر گئی'' کو اہل نظر پسند کریں گے۔ یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز نے اپنے روایتی حسن اور سلیقے سے شائع کی ہے۔

تانیثی شعری حسّیت کی علمبردار شاعرہ

مظفر احمد مظفر (لندن)

* آرٹ اور شاعری * کا براہ راست تعلق وجدان سے ہوتا ہے۔ اور وجدان/ Conscience میں تخصیصِ صنف نہیں پائی جاتی۔ رب کائنات نے اپنے عطیاتِ معتبر کی تقسیم وترسیل میں تخصیص/ Customization سے بالاتر ہوکر مردوزن کو عطا کیا ہے۔

ہماری آٹھ سو سالہ مشرقی شعری محاذ آرائیوں پر مردشعراء کا ہی تسلط رہا۔ اس دور میں خوش قسمتی سے دو ایک خواتین شاعرات میں سب سے پہلے جو نام سامنے آئے، وہ شہزادی زیب النساء مخفی ہیں۔ جو شہنشاہ اورنگ زیبؒ عالمگیر کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ عربی اور فارسی زبانوں کے ساتھ فارسی شاعری کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن افسوس ان کا دیوان دستیاب نہیں ہے۔ شعر گوئی کے سلسلے میں دوسرا نام بیگم کا آتا ہے، جو شاعر میر تقی میرؔ کی صاحب زادی تھیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ والد محترم کی شفقت اور گھر میں شاعرانہ ذوق کے سبب ان کی کشتِ ذہن کی آبیاری ہوئی ہوگی۔
شعر دیکھیں۔

برسوں خمِ گیسو میں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے ہمیں مار تو رکھا

بیسویں صدی میں یہ رجحان مزید پروان چڑھا امتہ الرو ?ف، نجمہ تصدق، سعیدہ جہاں مخفی، رفیعہ بانو مضمر وغیرہ نسائی لب ولہجے میں اظہار کرنے والی اولین

شاعرات ہیں، جن کے بدولت جلد ہی تانیثی حسّیت کی علم بردار شاعرات کا ایک پورا جہان آگہی مرتب ہوگیا۔

ازاں بعد تقسیم ہند تک گویا نسائی جذبات و احساسات/ Feminine Emotions کو ثانوی حیثیت دی جاتی رہی تذکرہ نگاروں نے خواتین اور انکے افکار و نظریات کو بہ نظر تعمق/ In terms of meditation نہیں دیکھا اور نہ ہی انہیں مستند اور سنجیدہ فکر شعراء کے ہم مرتبہ سمجھا گیا۔ اگرچہ اسی دور میں خواتین شاعرات اپنے احساسات و نظریات کو جزوی طور پر ہی سہی شعری ونثری قالب میں ڈھالنا شروع کر چکیں تھیں۔ اور اپنے مخصوص نسائی نقطہ ہائے نظر کو معاشرے کے سامنے رکھنے کا آغاز کر چکیں تھیں۔

تقسیم ہند کے بعد خواتین شاعرات کے خیالات سماجی، معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی اور اخلاقی سطح پر اثر انداز ہونے لگے۔ ذرائع ابلاغ نے اس اقدام کو خوش آئند سمجھتے ہوئے انکا خیر مقدم کیا اور یوں معاشرہ میں نئی اور خوشگوار مثبت تبدیلی نے عوام الناس کو نئے اور مسحور کن نسائی لب ولہجہ سے متعارف کروایا اور اسکی افادیت اور سحر انگیز جاذبیت سے پردہ اٹھتے ہی مخصوص نسائی لہجے کی گونج نے کانوں میں رس گھولنا شروع کر دیا تھا۔

یوں مردوں کی اجارہ داری جاتی رہی اور خصوصا" بساط ادب پر مردانہ فوقیت کو خواتین نے تسلیم کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا شدید مگر غیر محسوس انداز سے احساس دلایا اور سبھی غزلیہ مروجہ موضوعات پر اپنی باری چلی اور اکثر مقامات ہر مرد پا پیادوں کو تاریخ ساز مات دے کر اپنی خود اعتمادی کو دو چند کیا اور کہیں کہیں تو اپنی خداداد ادبی صلاحیتوں اور فطری نفاست کی بدولت میدان ہی مار دیا۔ الغرض یوں خواتین کے ادبی معرکوں کی گونج، خود اعتمادی اور رشحات پر ناقدین وتذکرہ نگاروں نے خوب قلم اٹھایا اور سیر حاصل مضامین اور مقدمے لکھے اور انکی تخلیقات کو درخور ستائش سمجھنے لگے۔

ہمارے دور میں جن شاعرات کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ انکے تانیثی نقطہء نظر کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ انمیں ادا جعفری، پروین شاکر، زہرا نگاہ، کشور ناہید،

فہمیدہ ریاض، ممتاز مرزا، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، جمیلہ بانو، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، وحیدہ نسیم ،مسعود حیات ،بیگم ممتاز مرزا،بسمل صابری،حمیرا رحمان، جمیلہ بانو گیتا گیتا، نیر جہاں نیر،نور جہاں ثروت،کشور آراء شبنم،گلنار آفریں،رشیدہ عیاں، ذکیہ سلطانہ نیر،ملکہ نسیم ،سیدہ شان معراج،نسیم نگہت، حسنی سرور، عفت زریں،نسرین نقاش، نزہت صدیقی، ترنم کانپوری، یاسمین حمید،نوشی گیلانی، پروین فنا اور بہت سے نام اس کے علاوہ ہیں ان کے علاوہ دیگر بہت سی شاعرات ہیں جنہوں نے نسائی شاعری کو بام عروج تک پہنچایا۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم روایتوں کی فصیل گرانا آسان نہیں ہوتا۔ مدت دراز سے محبوس اور بے بس بنا کر رکھی جانے والی یہ حساس حاشیائی مخلوق تبھی اپنا جائز حق وصول کر پائی جب وہ اپنی رائے اور کلفتِ خاطر کو قوت گویائی عطا کر پائی۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہوا جب وہ آگے بڑھ کر خارجی حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکی بیسویں صدی کے اواخر میں ڈیرہ غازی خان پاکستان سے اٹھنے والی ایک توانا اور پر تاثیر آواز جو جدید دور کی باہمت اور عالمگیر شہرت یافتہ شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نام سے شہرت حاصل کر چکی ہے آپ کو اوائل عمری سے ہی ان تلخ اور ہوش ربا حقائق کا علم ہو چکا تھا۔ اپنے قبیلے کی رسم و رواج علاقائی سماجی اور معاشرتی قیود انکی نگاہ سے اوجھل نہیں تھیں باایں ہمہ آپ نے میڈیکل کالج کے دور سے ہی اپنی باقاعدہ شاعری کا آغاز کر کے اپنے بعد آنے والی شاعرات کے لئے نہ صرف راستہ ہموار کیا ہے۔ بلکہ انکے لئے نشان منزل بھی بنی ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شعری کائنات میں عمق بھی ہے اور سطحیت بھی دراصل اظہار کے باب میں شاعرہ نے کلام میں سلاست اور سادہ پن پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اور سادگی میں پرکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔اور یوں کلام پُر تاثیر بھی ہوگیا ہے اور دو آتشہ بھی خیال کو خوشنما الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنی شگفتہ بیانی سے عطر آگیں کر دیا ہے اور یوں لفظ پر کیف ہو گئے ہیں۔مضمون آفرینی زبان و بیان کی پاکیزگی عاشقانہ اور سفلی جذبات کے ساتھ ساتھ کلام میں پاسِ ناموسِ عشق بھی پایا جاتا نیز سنجیدہ اور

متین اخلاقیات کے نکات بھی ملتے ہیں۔

کلام کی فنی، فکری، اخلاقی و سماجی نیز دیگر موضوعاتی خصوصیات آپ کی غزل نگاری کی انفرادی حیثیت کا تعین کرتی ہیں مطلقاً روایاتی انداز فکری و موضوعات کی شرح اور خاص کر عناصر ترکیبی اور اسلوب کی سنجیدگی لائق تحسین ہے۔

جذبات کی تپش کلام کی معنویت تہہ داری اپنی جگہ متاثر کن ہے زبان و بیاں کے ساتھ ساتھ لغات و محاورہ پر بھی آپکی گرفت دیکھی جا سکتی ہے۔فی زمانہ اثر جوش اور ہیجان پر ور شاعری کی نسبت مابعد الطبیعاتی شاعری کا رجحان جڑ پکڑ رہا ہے ایسے میں فطرت اور رومان کی طرف رجحان اور معنی آفریں کلام کا ہونا غنیمت ہے میرے نزدیک اس جواہر پارے پر جتنی داد بھی دی جائے کم ہوگی۔

میرے نزدیک یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ کسی حسین کلام کی ایمائیت اشاریت اور اعجاز بیانی سے انکار کیا جائے جہاں خیالات کے آئینوں میں تفکرات اور تجلیات کی دلفریب تتلیاں رقص کناں ہوں اور پردہ ءسوز و ساز بوجہ سرمستی و سرشاری مرتعش ہونے لگے۔افکار کی تازگی جو کسی Idealogy کی بے معنی قید کو جز و لازمی نہ سمجھتی ہو لائق صد داد ہوتی ہے یہ تفہیم آفرینی اور تازگیِ نہالِ سخن سزاوار ہزار ہا تحسین و مبارک باد ہے۔

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین صاحبہ اسی اعتماد و یقین اور تلاش سے محوِ سفر ادب رہیں تو جلد اپنی انفرادیت کی منزل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ رب ذوالجلال انکا یہ مجموعہ کلام "میرا صاحب سائیں، عشق ہے تو" انکی نئی کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا دے تمام تر نیک تمنائیں اور دعائیں۔

''شاعری نجمہ شاہین کی زندگی ہے''

حسن عباسی (لاہور)

میں نے کہیں پڑھا تھا ''تخلیق کار کو اپنی تخلیق کے لیے جو پانی درکار ہوتا ہے اس کے لیے افسانہ نویس اپنے گھر کے اندر نلکا لگاتا ہے۔ ناول نگار وہ پانی دریا سے بھر کر لاتا ہے جبکہ شاعر بادلوں کا انتظار کرتا ہے''

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری پڑھنے کے بعد میں یہی کہوں گا اسے اپنی تخلیق کے لیے جو پانی درکار تھا وہ اس نے اپنی آنکھوں سے حاصل کیا ہے۔ مصرعہ مصرعہ لفظوں کے ساتھ اپنے آنسو بھی پروئے ہیں۔ اس لیے نامعلوم سی اداسی نے چڑیلوں کی طرح اس کی غزلوں اور نظموں میں اپنے گھونسلے بنا لیے ہیں۔ اک عمر کی رفاقت کے بعد خود نجمہ بھی اب اس اداسی سے مانوس ہو چکی ہے اور اسی فضا میں رہنا چاہتی ہے جس سے اس کی تخلیق کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ دریا کے کنارے رہنے والی لڑکیوں کی آنکھوں اور لہروں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ گھر کے کنارے بہنے والا دریا اچانک آنکھوں سے بہنے لگتا ہے۔ زندگی میں سیلاب آتے ہیں تو دل کی بنجر زمینوں کو زرخیز اور شاداب کر جاتے ہیں۔ یہی زرخیزی اور شادابی نجمہ شاہین کی شخصیت اور شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ شعری مجموعوں کے بیک ٹائٹلز پر جو نجمہ شاہین کی تصاویر ہیں ان کو دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ اسے کوئی دکھ بھی رہا ہوگا اور اس کی شاعری پڑھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ خوشیوں سے کبھی آشنا بھی رہی ہوگی۔ ان ذات میں دکھ چھپانے کا یہ ہنر دنیا کی ہر لڑکی جانتی ہے۔ اگر اس کی آنکھیں اس کا ساتھ دیں۔ میرا نہیں خیال کہ تخلیق کے لمحوں میں نجمہ کی آنکھیں اس سے وفا کرتی ہوں گی ورنہ ایسی شبنم جو

پھولوں کی پتیوں پر ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی غزلوں اور نظموں پر نظر نہ آتی۔

نجمہ کی شاعری گاؤں کے میلے میں پہلی بار کھلونوں کی دکانیں دیکھنے والی بچی کی طرح سادہ ہے۔ وہی حیرت غزلوں میں ملتی ہے، وہی تجسس نظموں میں نظر آتا ہے۔ نجمہ شاہین جس دل پذیر سرائیکی لہجہ میں اُردو بولتی ہے وہی دل پذیر لہجہ اس کی شاعری کا بھی خاصہ ہے۔ اس کی شاعری مکمل سچ اور مکمل سادگی کا مظہر ہے۔ اس میں جھوٹ کی آمیزش زیرو فیصد ہے۔ کوئی دورخی نظر نہیں آتی جس طرح عموماً لوگوں کی شاعری ان کی زندگی سے الگ تھلگ کوئی چیز نظر آتی ہے نجمہ شاہین کے ہاں ایسا بالکل نہیں ہے۔

نجمہ کو اس کی شاعری میں با آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ملاقات کی جا سکتی ہے۔ اسے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ نجمہ کی شاعری میں اداسی کے رنگوں سے جو پینٹنگ ہمیں دکھائی دیتی ہے اس کی غزلوں اور نظموں پر نظر نہ آتی۔

اس میں اس کے خال وخد واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ زندگی اور شاعری اس کے نزدیک دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ وہ شاعری کی فضا میں ہی اپنے روز وشب بسر کرتی ہے۔ اس نے ایک سلجھی ہوئی گھریلو عورت کی طرح اپنی زندگی کی تمام یادوں کو شاعری کی الماری میں سلیقے سے رکھا ہوا ہے۔

نجمہ کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ابھی تک اپنے اردگرد کے ماحول، موسموں، راستوں اور چیزوں سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ ناہموار راستوں پر چلنے کا ہنر تو سیکھا ہے لیکن انہیں قبول نہیں کیا ہے۔ وہ جیسا منظر نامہ اپنے اندر باہر دیکھنا چاہتی تھی وہ اسے نظر نہیں آ رہا۔ اس لیے اس نے شاعری میں پناہ لے رکھی ہے۔

شاعری نجمہ شاہین کی زندگی ہے اور نجمہ شاہین کی زندگی اس کی شاعری ہے۔

چند اشعار نذر قارئین۔

یہ نیا پھول ہے اور یہ خوشبو نئی
یہ نئی شام ہے اور نیا درد ہے

زخم کیسا ہے بھرتا نہیں ہے کبھی
درد ہوتا نہیں ہے یہ کیا درد ہے

ہم تو گھٹ گھٹ کے اک روز مر جائیں گے
اس گھٹن میں اگر آنکھ بھی چپ رہی

کہیں یہ گرد کہیں پر ہوا بناتی ہوں
میں خود کو اب تو بس اپنے سوا بناتی ہوں

بکھر گئے تھے کسی نام کے حروف کہیں
اب ان کو جوڑ کے اک آئینہ بناتی ہوں

اُجالتا ہے یہ تاریکیاں مرے دل کی
تمہاری یاد کو ہر پل دیا بناتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین اوران کی شاعری کیلئے ڈھیروں دعائیں۔

آگہی کی جنگ۔ نجمہ شاہین کے سنگ۔

ڈاکٹر معین قریشی۔کراچی

pathos, pangs of separation, craving of the lover and betrayal of the beloved. With the increase in education and the resultant intellectual awareness. Some poets have also occasionally dealt with political, social, economic and moral issues in their verses, Hence, it is the diction that makes the real difference. Saifuddin Saif rightly emphasized:

Saif andaz-e-bayan
rang badal daita hai
Warna dunya main koi
baat nai baat naheen

NSK's 'ghazals' speak of her keen observation, vast study, rich experiences and, above all, deep insight into the human nature. Taken together, these qualities have made her poetry a treat for the connoisseurs of literature and discerning readers alike. 'Tark-e-ta'aluq' (forsaking of ties with one's sweetheart) is, for example, a run-of-the mill subject of 'ghazal.' Everyone from the classical masters to the modern-day poets has tried his imagination on it. Just see this heart-rending

couplet of NSK:

Jab se kisi se
tark-e-mulaqat ho gai
Aansoo giray kuch aise
key barsat ho gai

Ghazal without love is just inconceivable. Some poets have used it as a source of mental pleasure while others did so only to adore their lines. NSK has taken love to the highest pedestal conceivable as she says:

Mome kar daita hai Shaheen
yeh paththar dil ko
Ishq insan ko ma'bood
bana daita hai

In the excruciating moments of "Hijr" (separation), most poets raise poignant voices of agony. NSK exercises self-restraint in expressing woes of separation. Her description of "Hijr" touches the 'strings of her readers' hearts:

Hijr main bhi yeh meri sans agar baqi hai
Is ka matlab hai mohabbat main asar baqi hai

The book contains a number of verses which give a moving account of "gham" (grief), e.g.

Chand aansoo jo taire gham main baha daitay hain
Khushk sehra ko bhi gulzar bana daity hain

As an enlightened and concerned citizen of Pakistan. NSK is not unmindful of the grim conditions prevailing in the country. A number of verses give a vivid picture of Halat-e-Hazira (Current

Affairs) like:

Kirnon ki bheek mangti hai
khalq-e-sheher kya
Din ho gaya hai
zulmat-e-zindan ki tarah

Good poetry casts a kind of spell; it captures the minds of the reader and flourishes there. To qualify this test, however, the poet should not

Book: Mein Aakhain Band Rakhtee Hun
(I keep my eyes shut)

Written by: Dr. Najma Shaheen Khosa

Published by: Khazina-e-ilm-o-Adab, Urdu Bazaar, Lahore

Pages: 308

Price: Rs. 300 (hard-bound with dust cover)

Shaiwa banaye rakhna

Khwab (dream) is NSK's favourite subject indeed, dreams are the touchstones of our character. They determine our destination - if not the destiny. Thomas Jefferson contended, "I like the dreams of the future better than the history of the past." The poetry of NSK is replete with verses in which the concept of dreams has been projected in variegated perspective, e.g.

Thay jin ke dam se
yeh khab roshan
Woh log khabon main
mar rahay hein

Despite marked improvement in the volume as well as quality of Urdu poetry in the last few

decades, many people still look on today's poetry as something 'not for us.' They regard it as bookish, too highly concerntrated, erotic and profuse in cliche-ridden terms besides far-fetched ideas. NSK's poetry is free from such flaws. She talks to her reader from an equal wave-length rendering her verses all the more appealing. In the following couplet, she denounces self-centredness which is a curse of the modern world:

Har aik apni zaat ke hisar main aseer tha
Keh khud faraibion main hi har aik maujzan mila

Despite all the doom and gloom around, in the mirror of her poetry, NSK emerges as an optimist. A general atmosphere of hope dominates her thoughts to the extent that we find a poem also on this subject. An example from a ghazal:

Who jo manoos si aahat
hai sunaee daigee
Isi ummeed pe ab khud
ko jagati hun main

She goads the youngsters into action:

Munhasir hoti hai hunya ki taraqqi un par
Jo sada nit nai eijad kiya kartay hai

Going through the this couplet,
I was reminded of Iqbal who exhorted:

Jo aalam-e-ijad main hai sahib-e-eijad
Har daur main karta hai tawaf us ka zamana

The poems embodies in the book are very insightful. Their satirical style provides much food for

thought. In one of the poems entitled "Mairee Narasi" (My inaccessibility), it appears that NSK has voiced the feelings of an ordinary Pakistani woman in the curreنt scenario. The title poem Main Aakhain Band Rakhti hun depicts stark realities of life which have landed the poetess in an utter state of helplessness. By any yardstick, these are first-rate poems and fully involve readers' attention.

The language of the book is persuasive and communicative conveying both the content and the sentiment with brevity and conviction. She has used certain classical phrases (kooe janan, tashna labi, abr-e-naisan, dasht-e-junoon, sokhta jan, aashufta sari, aabla pace, chak gareeban, etc.) side by side with modern semantics such as gul-rut, harf-e-hali, asasa, baikhab saleebain, mash'al-e-anjum, lauh-e-dil, etc. The production is chaste and commendable. The composing, lay-out, paper, printing, binding, etc. are all impeccable. For an Urdu publication, this is rather unusual and worthy of emulation. Leafing through this book, one thinks of Shakespeare who underlined the importance of poetry in these memorable words: There is pleasure in poetic pains which only poets know.

میں آپے رانجھا ہوئی

پروفیسر حماد خان (نیویارک)

چار کتابوں کی مصنفہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا نام ہمارے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے تجربہ کار ڈاکٹر ہونے کے علاوہ نجمہ شاہین کھوسہ ایک سوشل ورکر اور بہترین شاعرہ بھی ہیں وہ ایک خلیق وشفیق انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخلص دوست بھی ہیں ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری کی بات کی جائے تو عرض ہے کہ ایک بات ہے جو ان کے کسی بھی قاری کو چونکا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ اردو زبان کے روایتی مراکز سے کٹ کر ڈیرہ غازی خان ایسے شہر میں رہتی ہیں اور شعر گوئی میں نام کما رہی ہیں ان کی شعر گوئی ہم سب کو یہ باور کراتی ہے کہ شعر گوئی کا ہنر زمینی خطوں سے الگ ہے، بس اللہ جسے دیدے۔ڈاکٹر صاحبہ نے مختلف النوع بحروں میں طبع آزمائشیاں کی ہیں اور اپنی پسند اور ناپسند، تجربات اور مشاہدات سے مربوط بیانات کو کامیابی کے ساتھ غزلیاتی پیراہن پہنائے ہیں۔

دور حاضر میں قدیم اور جدید کا اتنا متوازن اور بھرپور امتزاج ڈاکٹر صاحبہ کے سوا شاید ہی ان کی عمر کی کسی شاعرہ میں موجود ہو۔سرائیکی سپیکنگ ہو کر اردو میں اشعار کہنے کا عمل ناممکن تو نہیں لیکن ایک آزمائش کن امتحان ضرور ہے جس میں ڈاکٹر صاحبہ کامیاب وسرخرو ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری دراصل ماضی کی صوفیانہ رواداری کو نئی دھڑکنوں میں سمونے کا نام ہے۔ گویا ان کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے۔اصناف شاعری میں اگرچہ نظمیں بھی کہی ہیں مگر غزل ان کی محبوب صنف لگتی ہے ان کی غزل پڑھنے کے لطیف تجربہ

کے علاوہ اگر آپ کو ان کی غزل خود ان کی زبانی سننے کا حسن اتفاق ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بس وہ غزل سناتی رہیں اور ہم سنتے رہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ خوش شکل، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش مشق اردو کی شعری روایات سے واقف ایسی شاعرہ ہیں جو غزل کو مزاج شناس ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے رموز ونکات کو برتنے کا قرینہ بھی جانتی ہیں۔نئے نئے موضوعات کو منظوم کرنا ڈاکٹر صاحبہ کی تازہ گوئی کا ثبوت ہے ڈاکٹر صاحبہ کی نئی حالیہ تخلیق پر اس دعا کے ساتھ مبارک باد کہ اللہ سائیں میری اس وسیب زادی کو صحت، عزت، شہرت، اور خوشحالی سے ہمکنار رکھے اور یہ آسمان ادب پر درخشندہ ستارہ بن کر چمکیں۔

دبستانِ ادب کی شہزادی

ملک فداالرحمٰن

ڈیرہ غازی خان پاکستان کی اکائی کا مضبوط ستون ہے۔ جہاں پاکستان کے چاروں صوبوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس دور افتادہ ضلع کے لوگوں کا جتنا ادبی شغف ہے وہ پاکستان کے کسی بھی ضلع کے لوگوں میں کم ہی ملے گا۔ یہاں کے لوگ انتہائی ذہین اور ادب شناس ہیں۔ لیکن یہاں کی ثقافت نے عورت کی آزادی کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اور ان کی صلاحیتوں بلکہ سوچ کو ہی سلب کر رکھا ہے۔ اگر صرف پندرہ بیس سال پیچھے دیکھا جائے تو عورت بازار جا کر اپنی پسند سے کپڑے نہیں خرید سکتی تھی۔ اگر کہیں آنا جانا پڑے تو ٹوپی والے برقعے کے ساتھ وہ باہر نکل سکتی تھی۔ اس میں بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ جس ٹانگے میں خواتین نے سفر کرنا ہوتا اس کو چادریں تان کر چاروں طرف سے ڈھانپ دیا جاتا۔

ایسے حالات میں کسی بھی لڑکی کا گھر سے باہر نکلنا اور ڈاکٹری جیسا پیشہ اختیار کرنا اور پھر شاعری کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ شاعری ویسے بھی خواتین کے لئے ہمارے معاشرے میں معیوب سمجھی جاتی ہے۔ اور پھر شاعرہ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش شکل بھی ہو تو اس کی شاعری کو معیوب نہیں ''نعوذ باللہ'' گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود پھر کچھ خواتین نے معاشرے کی اس سوچ سے بغاوت اختیار کر لی۔ جو شاعرات بھی تھیں اور خوبصورت بھی تھیں اور ان کو پاکستان میں لازوال عزت سے بھی نوازا گیا۔ جن میں ادا جعفری، پروین شاکر اور بشریٰ اعجاز سمیت کچھ اور نام بھلیئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف بڑے شہروں تک محدود تھا۔ ڈیرہ غازی خان سے 30 کلومیٹر دور قبائلی علاقے کی

بستی جندانی جیسی جگہ کی رہنے والی خوبصورت لڑکی کے لئے بغاوت کر کے ڈاکٹری کے شعبے میں جانا اور پھر شاعری کرنا بھی اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا فرہاد کے لئے دودھ کی نہر کھودنا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے والدین کو اپنی محنت اور اپنے مثالی کردار سے اعتماد میں لے کر یہ مشکل مرحلے طے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈیرہ غازی خان کے شعراء میں محسن نقوی کے بعد سب سے زیادہ شہرت ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے حصے میں آئی۔ بڑے بڑے اخبارات کے ادبی صفحات کی زینت ان دونوں شاعروں کا کلام ہی بنتا ہے۔

یہاں میں یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹری اور شاعری دو متضاد چیزیں ہیں۔ ڈاکٹری کا شعبہ بہت ہی زیادہ حاضر دماغی اور انگریزی ادویات کو ذہن میں رکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جبکہ شاعری مسلسل اردو لفظوں اور خیالوں میں کھوئے رہنے کے ساتھ ان کو خوبصورت لڑیوں میں پرونے کا نام ہے۔ دونوں شعبوں کے ساتھ اپنی خداداد صلاحیتوں سے بیک وقت ایک جیسا انصاف کرنے والی شاید ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ پاکستان کی واحد خاتون ہیں جن کو اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے مخصوص فضل و کرم سے ان خاص صلاحیتوں سے رکھا ہے۔ اور ان کا شمار پاکستان کی تاریخ ساز خواتین میں ہوتا ہے۔ بستی جندانی کی چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر اپنی نانی کی انگلی پکڑ کر سفر کرنے والی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ آج دبستانِ ادب (ڈیرہ غازی خان) کی شہزادی کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔

ڈاکٹری اور شاعری کے علاوہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جو سب سے بڑا اہم کام کر رہی ہیں اس کا یہاں ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ وہ خواتین کے حقوق کے لئے ایسے معاشرے میں رہ کر کام کر رہی ہیں جو عورت کو قطعاً وہ مقام نہیں دیتا جس کی ماں، بہن، بیٹی یا بیوی حقدار ہوتی ہے۔ اپنی بہن، بیٹیوں سے اجازت تو درکنار پوچھے بغیر بھیڑ بکریوں کی طرح کسی کے پلے باندھ دیا جاتا ہے۔ کسی بھی لڑکی کو زندگی کا ساتھی سمجھنے کے بجائے زرخرید غلام سے بھی نچلا درجہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین ان خواتین کی آواز اور مظلوم کی للکار بن کر بھی شبانہ روز محنت کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بیک وقت ایک فرض شناس ڈاکٹر، خوبصورت شاعرہ، پُراعتماد بیٹی، وفادار بیوی، دوراندیش اور ذمہ دار ماں، خواتین کے حقوق کی علم بردار ہیں اور ان ساری خوبیوں سے اللہ قسمت والوں کو ہی نوازتا ہے۔

''پھول سے بچھڑی خوشبو''، ''اور میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، ''اور شام ٹھہر گئی'' کے بعد ''پھول، خوشبو اور تارا'' کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ساری کتابوں کے مطالعے کے بعد شاعرہ کی جو شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ بات کر کے پھولوں کی خوشبو کی طرح لوگوں کے ذہنوں میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ سخت سے سخت بات کہنے اور منوانے کے لئے بھی محبت کا دامن نہیں چھوڑتیں۔ وہ خواتین کے حقوق پر بات کرتے وقت محبت سے یہ مٹھاس بھرا اور خوشبودار پیغام دیتی ہیں کہ بچیوں کو تعلیم دلاؤ۔

اہلِ ادب ان کی ان کوششوں اور کاوشوں کو سلام پیش کرتے ہوئے خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور ادبی دنیا میں اس خوبصورت اضافے کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ ''دبستانِ ادب کی شہزادی'' یہ ادبی سفر بغیر کسی رکاوٹ کے طے کرتی چلی جائیں۔ آمین۔

نجمہ شاہین کی شاعری کے لئے ہدیۂ تبریک

ڈاکٹر منوّر احمد کنڈے، انگلینڈ

خزینۂ علم و ادب لاہور کے زیرِ اہتمام شائع شدہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ صاحبہ کا مجموعہ، کلام ثانی ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں' تین صد سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ دنیائے سخنوری میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جن میں انتساب کو بھی منظوم کیا گیا ہے۔ نجمہ شاہین کی یہ تصنیف بھی انہیں میں سے ایک ہے:

اسے کہو میں اس کے ذکر میں رہوں نہ رہوں
وہ ہے مرا حرفِ طلب، میرا انتساب پڑھ لے

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کا گراں کتابی رنگ روپ اور اس میں موجود معیار نظم دونوں سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یعنی حُسنِ ظاہری سے بھی اور بیان باطنی سے بھی دورانِ مطالعہ حظ اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ سخنوری کے گلہائے حقیقت کی مہک پیہم دل و دماغ کو معطر کرتی، غزل میں خیالات کی پختگی اور نظم میں موضوعات کے تنوع کی موجودگی تخلیقات کو مزید زور آور بنا رہی ہیں:

تلخیاں اور بے بسی ویرانیاں
چار جانب ہیں عجب حیرانیاں
اے موجِ صبا اسے کہنا
اب کوئی نہیں
جو اس کی راہ تکتا ہے!

ہر حقیقت پسند شاعر محبوبِ حقیقی کو رنگِ مجاز میں دیکھنے کا آرزومند رہتا ہے اور یہی خواہش اس کی شاعری کو معتبر تر و پُر اثر کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔

نجمہ شاہین کھوسہ فرماتی ہیں:

کاش کوئی تو ایسا لمحہ ہو
جس میں تُو مجھ کو حاصل ہو

ڈاکٹری کے مہان پیشے سے منسلک نجمہ شاہین یقیناً ایک مصروف انسان کا نام ہے جنہیں نصیب سے چشمِ بینا اور اشکِ سلامتی کے ہمراہ قلبِ پُرسوز و محبت حاصل ہے۔ وہ اپنے آنسوؤں کے ذریعہ اپنے ہمعصر انسانوں کی لغزشوں کی آسانیوں کے لیے یوں دعا گو ہیں:

میں جی بھر کے روؤں میں آنسو پروؤں
میں حال اپنا رو رو کے اُن ﷺ کو سناؤں

اے خدا تو محتسب ہے مجھ پہ اک احسان کر
بھول کر لغزش مری یہ زندگی آسان کر

پاکیزگی کردار کو سلام۔ ان کی شاعری پر اس مختصر گفتگو کے بعد بطور ہدیہ، تبریک ذیل میں ایک توشیحی نظم ڈاکٹر نجمہ شاہین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

ڈاک ٹ ر۔ ن ج م ہ۔ ش اہ ی ن
منوّر احمد کنڈے، ٹیلفورڈ انگلینڈ

ڈ۔ ڈگر احساس کی کُھل جائے تو آگے قدم رکھوّں
پھر اس کے بعد میں منزل کی سمتوں کا بھرم رکھوّں

ا۔ ادب کی آبیاری فکر و فن کی آبیاری ہے
حقیقت میں یہ گلزار سخن کی آبیاری ہے

ک۔ کرشماتِ سخن کے جلوے دیکھے بند آنکھوں سے
کئی خوابوں کے ہم نے چہرے دیکھے بند آنکھوں سے

ٹ۔ ٹھہر اے جذبۂ دل یہ سخن کی ارجمندی ہے
نظر کے روبرو اب فکرِ شاہیں کی بلندی ہے

ر۔ رسائی ہے کہاں تک کون بتلائے تصور کی
حدیں آخر کہاں تک کون سمجھائے تصور کی

ن۔ نئے احساس کی حامل، نئے ادراک کی حامل
ہیں ایسی شاعرہ، قدموں میں جس کے ہے نئی منزل

ج۔ جبینِ وقت پر مہتاب کی صورت منور ہے
ترے اندر چمکتا اور دمکتا جو سخن ور ہے

م۔ محبت کے جہاں کو روشنی بخشی ہے شاہیں نے
غزل ہو کر غزل کو زندگی بخشی ہے شاہیں نے

ہ۔ ہماری او رتمہاری زندگی کا ماحصل ''فن'' ہے
کہانی فن، فسانہ فن ہے، احساسِ غزل فن ہے

ش۔ شعورِ ذات کا اظہار ہے یہ شاعری کیا ہے
حسیں جذبات کا اظہار ہے یہ شاعری کیا ہے

ا۔ ادب میں با ادب ہونے سے اونچا نام ہوتا ہے
جو سچے کام کرتے ہیں تو سچا نام ہوتا ہے

ہ۔ ہزاروں خواہشیں مٹتی ہیں تب اک شعر ہوتا ہے
بھلا اتنی بھی آسانی سے کب اک شعر ہوتا ہے

ی۔ یہ لفظوں کے جواہر ہیں، لٹاتی جارہی ہو تم
سخن کی خوب فیاضی دکھاتی جا رہی ہو تم

ن۔ نجم تقدیر کا نجمہ رہے گا ہر گھڑی روشن
دعا ہے یہ منوّر کی رہے تابندہ تیرا فن

آفاقیت کی جانب رواں دواں

(ڈاکٹر محبوب عالم لاہور)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ڈیرہ غازی خان کی شاعرات میں ایک خوبصورت اور معطر اضافہ۔ پہلا مجموعہ کلام 2007ء اور دوسرا ضخیم اور دیدۂ زیب مجموعہ کلام 2010ء میں شائع ہوا جس میں حمد و نعت کے علاوہ 83 نظمیں اور 75 کے قریب غزلیں شامل ہیں جو مواد کے اعتبار سے وہ مجموعوں کے برابر ہے جن کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ان کی شاعری دراصل ''کرب لا حاصلی'' اور ''شہر امکان'' سے جڑی ایک نئی اُٹھان کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی ہے۔

جس نفاست سے انہوں نے اپنی کتاب بجھوائی وہ ان کی شاعری سے جھلکتی ہے اور جو متانت ان کے چہرے سے عیاں ہے وہ اوّل تا آخر ان کی غزلوں اور نظموں کے ساتھ رہتی ہے۔ کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے تیشۂ فکر کی ایک ہی ضرب سے سماج کی کھوکھلی دیواروں کو زمین بوس کر دیں گی مگر جوش میں بھی ہوش کا دامن تھامے رکھتی ہیں اور کھوکھلے نعروں کی بجائے اثر انگیز بات کہہ کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ان کا یہ روّیہ انہیں ہمعصر شاعرات میں ممتاز کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری ندرت فکر میں لپٹی ہوئی ہے جبکہ جذبوں کی شدت لا حاصلی اور احساس رائیگانی میں بھی اطمینان کی کیفیت قاری کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتی ہے۔ ان کی نظمیں خصوصاً ''پاگل لڑکیاں'' اور ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' اس مجموعے کی پیشانی پر موسم سرما کی تیز دُھوپ کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ ان کا شعری سفر ''دشت مقبولیت'' سے منزل ''فکر و ادراک'' کی طرف رواں دواں

ہے۔ گو وسیبی ہیں مگر حیرت انگیز طور پر ان کی شاعری اور ''لفظیات'' پر مقامی ''ثقافت'' کے اثرات کہیں محسوس نہیں ہوتے یوں وہ مقامی ''حدود و قیود'' سے نکل کر ''آفاقیت'' کی طرف چل پڑی ہیں۔ قرنبیق سخن سے کشید کردہ عطر حاضر ہے۔

ہجر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو
زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے

تم ستم گر ہو نہ گھبراؤ مری حالت پر
زخم سہنے کا ابھی مجھ میں ہنر باقی ہے

متفرق اشعار:

میری تمام اُمیدیں اسی سے وابستہ
وہ جس کا شغل ہے احباب کو داغ دینا

کڑکتی دُھوپ بھی اس کو جلا نہیں سکتی
وہ نو نہال جو برگد کے سائبان میں ہے

لمس تیرے ہاتھوں کا جب میسر ہو مجھے
پھر مری طبیعت بھی کیوں نہ ہو روانی میں

شاہیؔن یہ بھی تشنہ لبوں میں بانٹ دو
تھوڑی سی مئے پڑی ہے جو تیرے ایاغ میں

وہ بھی دن تھے کہ نگاہوں میں دھنک رہتی تھی
اب تو گھیرے ہوئے رہتی ہے سیاہ رات ہمیں

بند آنکھوں میں جگنو تھے اُمید کے
وہ بھی رستوں میں بجھتا دُھواں ہو گئے

تھے جن کے دم سے یہ خواب روشن
وہ لوگ خوابوں میں مرے رہے ہیں

ہم نہ کریں گے کسی طور وفا کو رُسوا
ہم نہ بھولیں گے تجھے ہم کو بھلانے والے

موم کر دیتا ہے شاہین یہ پتھر دل کو
عشق انسان کو معبود بنا دیتا ہے

نجمہ شاہین کھوسہ آفاقیت کی جانب رواں دواں

سرمد سلیم

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جو کسی تعارف اور شہرت کی قطعاً محتاج نہیں، مستقبل مزاج، باوقار سنجیدہ شخصیت اور ایک آفاقی شاعرہ، جن کا شمار ڈیرہ غازی خان ہی نہیں بلکہ پاکستان کا نمایاں شعرہ اور شاعرات میں ہوتا ہے، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جو ڈیرہ غازی خان کی پہچان تو ہیں ہی مگر اسکے ولاوہ انھیں عالمی سطح پر پاکستان کی نمائندگی کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ایک اوسط عرصے پر محیط ان کا کامیاب شعری سفر ان کے بھرپور فنی وفکری صلاحیتوں کے حامل ہونے کا ثبوت ہے، جس میں وہ مستقبل مزاجی، محنت، لگن اور جستجو کے دم پر اپنی نئی خوبصورت تخلیق منظر عام پر لے آئی ہیں جو لائق صد تحسین ہے۔ "پھول خوشبو اور تارہ "ڈاکٹر صاحبہ کی چوتھی کاوش ہے، اس سے قبل جو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے تین مجموعے آئے تھے مجھے ان کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں مالا، شدت اشتیاق اور انتظار کے بعد ان کی شہ پارہ تخلیق "پھول خوشبو اور تارہ" دسترس میں آئی" مگر تشنگی باقی رہی "۔ پھول خوشبو اور تارہ میں وہ تمام موضوعات اور مسائل بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں جو ہمارے تین منفی امتیاز برتنے والے معاشرے میں ایک عورت کو درپیش ہوتے ہیں، کسی حبس زدہ ماحول میں ایک محبوس روح، کرب ہجرت اور درد کے لامتناہی سلسلے، اک خلش اک گھٹن، معاشرہ کی تسبیح اور فرسودہ روایات میں الجھی زندگی کی ڈوڑ۔

ان کی شاعری میں عشق ومحبت کے جذبات اور غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ ہجر وفراق کا مختلف کیفیات میں اظہار، حسرت وصال یار، جلتے

بجھتے آس امید کے دیے تو کہیں آنکھوں میں چبھتی ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں وہ تمام موضوعات وہ تمام پہلو موجود ہیں جو ایک حساس انسان کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا اسلوب روایت وجدت سے مزین، سادہ عام فہم اور خوبصورت الفاظ کا پیرہن، مرصع مترنم شعریت اور معنویت سے بھرپور لمبی بحور کی غزلیں اور نظموں کی جدت انکے اسلوب کی خاصیت ہیں۔ ان کے کلام میں ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں مشکل پسندی بلکل نہیں، شعر فوراً ہی قاری یاور سامع کے ذہن و قلب میں اتر جاتا ہے جس سے قاری اور سامع بلا تامل شعر کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔

نسائی جذبوں کی ترجمان شاعرہ کا یہ اعجاز ہے کہ اپنے فن میں معراج کی بدولت ان کی شاعری قیاس آرائی کے بجائے حقائق کے قریب ترین اور حالات وواقعات کی مکمل عکاس ہے۔

میں اشک آنکھوں کے پی رہی ہوں
میں وار سہ سہ کے جی رہی ہوں

دعا کرو بس رہے ابد تک
مری یہ آہ و فغاں سلامت

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، استعارے، کنائے تشبہات اور تلیحات کے استعمال کا فن بخوبی جانتی ہیں، ان کی اکثر کتابوں کے نام بھی استعاراتی ہیں، میں انھیں استعاراتی شاعرہ کا خطاب دینا پسند کروں گا، وہ اپنے مدعا، اپنی بات اور اپنے اظہار کے لیئے استعاروں کا استعمال کر کے کمال مہارت کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ جاتی ہیں مثلاً:

چلتے چلتے وصل اچانک ہجر کی شام میں ڈھل جاتا ہے
تم کیا جانو کیا ہوتا ہے بات سے نکلی بات کا چکھ

انسان اپنی زندگی کسی نہ کسی مقصد، خواہشات کی تکمیل اور وابستہ امیدوں کے

سہارے بسر کرتا ہے، ان تمام جملہ عناصر کے حصول کا مقصد ذہنی و قلبی سکون ہوتا ہے۔ اگر انسان کو مقصد حیات حاصل ہو جائے، خواہش پوری ہو جائیں، خوابوں کو تعبیر مل جائے تو انسان کی درمیان زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔ بے پناہ مسرت کا احساس ہوتا ہے، ذہنی و قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ تمام رعنائیاں، رنگینیاں اور خوشیاں اچانک چھن جائیں تو زندگی بے نور اور پھیکی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ یہی کیفیت اگر عشق اور محبت میں ہو یعنی اگر حاصل مقصد چھن جائے، وصال یار فراق یار میں بدل جائے، خشیوں کی جگہ شقی القلب غم لے لیں تو یاس و نا امیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا جاتے ہیں۔ انسان آسمان کی رفعتوں سے زمین کے پاتال میں جا کرتا ہے، کائنات بے رنگ اور دل کی دنیا کسی اجڑے ہوئے چمن کی طرح لگتی ہے۔ زندگی کے لمحات بے کیف لگنے لگتے ہیں اور انسان کو اپنی ہستی بے معنی اور اپنی ذلت کی بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ یہ اس طرح کے حلات کس کے حلات کس طرح سے اثر پذیر ہوئے آئے دیکھتے ہیں:

دل کو ذرا قرار تھا وہ بھی نہیں رہا
آنکھوں کو انتظار تھا وہ بھی نہیں رہا

وہ ساتھ تھا تو ساتھ میں میری بھی ذات تھی
میرا کہیں شمار تھا وہ بھی نہیں رہا

اس سے ہوئے جدا تو پھر خود کو بھی کھو دیا
خود پر جو اعتبار تھا وہ بھی نہیں رہا

شاعر چونکہ معاشرہ کا حساس طبقہ ہوتا ہے اسی لیے ایک شاعر کا بنیادی ذریعہ اظہار شاعری ہی ہوتا ہے، شاعر حلات و واقعات کی عکاسی، اپنے مشاہدات و تجربات کا اظہار با آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ شعر کی صورت میں بہتر طور پر کر سکتا ہے اور اپنے

محسوسات و جذبات کی ترجمانی بھی شعر کی صورت میں کرنا پسند کرتا ہے۔ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعر اپنی شاعری میں نا صرف اپنی مسرت و شادمانی، کرب اور دکھ کا اظہار فرماتے ہیں بلکہ اسے مزاحمت اور شکار کے ساتھ ساتھ مختلف کیفکات میں بطور ہتھیار بھی استعمال کرتے ہیں مگر کہیں کہیں یہ فن بھی کارگر ثابت نہیں ہوتا مثلاً ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا ایک شعر دیکھیے:

کل سوچا تھا شعر میں تجھ سے سارے شکوے کر ڈالوں گی
آج غزل کہنے بیٹھی تو کیوں اتنی دشواری سائیں

بعض اوقات ہماری زندگی میں ہمارے معاشرے یا اپنوں کی طرف سے اس طرح کے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ ہم ہر جگہ خود کو محبوس تصور کرتے ہیں۔ ہماری شخصی آزادی سلب کر لی جاتی ہے، سانسوں تک پہرے بیٹھا دیے جاتے ہیں، ہم اپنے خیر خواہوں کے بیچ بھی خوف اور گھٹن کی زندگی جیتے ہیں۔ اس طرح کے کرب کا اظہار ایک شاعرہ کتنی خوبصورتی کے ساتھ کر سکتی ہوگی جس نے اپنی زندگی کو دشت سے تشبیہ دی ہو، اور جس کا زاد سفر بہتے اشک اور آہیں ہوں:

دشت میں زادِسفر اتنا ہی تھا میرے لیئے
اشک تھے اور ساتھ تھا بس، میری آہوں کا حصار

سانس لینے سے بھی اکثر روک دیتے ہیں ہمیں
جان لیوا ہو چلا ہے خیرخواہوں کا حصار

کہتے ہیں کہ انسان کے اندر کا موسم اچھا اور خوشگوار ہو تو باہر کے موسم اچھا اور مناظر بھی بھلے لگتے ہیں۔ ہر طرف رنگینی اور عنائی نظر آتی ہے، مسرت و شادمانی کے خوشگوار اثرات انسان کے مزاج، بول چال، روحانی اور جسمانی صحت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اور دیکھنے والا با آسانی ہماری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر

انسان یاس وغم کی کیفیت میں ہوتو اس کے منفی اور ناخوشگوار اثرات بھی ہمارے مزاج اور صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب انسان دکھوں اور مصائب میں گھرا ہوتو آنکھوں میں ہزاروں سوالات کے ساتھ چہرے پر مایوسی، شب کے اندھیرے کی طرح پھیل جاتی ہے اور چشم تر کوں ہرسمت پیاس کا صحرا دکھائی دیتا ہے:

میرے عارض جس سے دمکے تھے کبھی
ایک دن وہ آرزو بھی مر گئی

ہر طرف اک پیاس کا صحرا تھا بس
جس طرف میری چشم تر گئی

دکھ سے نڈھال ہو کے جب روتی ہیں بیٹیاں
پھر ان کے لیکھ دیکھ کے ہنستی ہے زندگی

جرم بس یہ تھا کہ منزل کی تعین کر لیا
پھر سدا رہنا پڑا ہم کو سفر کے درمیان

میں اس مختصر سے مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں بھرپور فکری تنوع اور شعوری بلیدگی ہے۔ ان کی شاعری میں شعری محاسن بڑی عمدگی کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور وسعت معانی کے لحاظ سے ان کا کلام کسی تجزیے کا محتاج نہیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بلاشبہ ایک آفاقی شاعرہ ہیں، ان کی شاعری میں روایتی اور جدید تمام موضوعات کمال مہارت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور ان کی اس فنی پختگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے اس شعر پر میں اپنی تحریر کا اختتام کروں گا جو کہ اس

مضمون کا حاصل ہے اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے کامل شاعرہ ہونے کی دلیل ہے:

جب میرا ہر ایک دکھ میرا ہنر ہو جائے گا
زندگی کا یہ سفر آسان تر ہو جائے گا

عشق کی لو ایک نہ ایک دن جلا دی گی مجھے
پھر میرا ہر ایک دکھ مثلِ قمر ہو جائے گا

پھول، خوشبو اور تارہ کی شاعرہ

جسارت خیالی

نجمہ شاہین کھوسہ ایسی خوش نصیب شاعرہ ہیں ، جو کم وقت میں شہرت کی بلندیوں کو چھو کر صف اول کی شاعرات میں شمار ہونے لگی ہیں ۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے تو ڈاکٹر ہیں، لیکن روایتی نہیں ، بلکہ فرض شناسی ، دیانت داری اور رحم دلی کی پیکر ہیں ۔ وہ دکھ کے ماروں سے ہمدردی کرنا اور حاجت مندوں کی خدمت کرنا اپنا مقصد حیات سمجھتی ہیں ۔ ان کے لطیف احساسات اور فکر کی پاکیزگی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، کہ وہ نماز عشاء کے بعد مصلیٰ پر بیٹھ کر اپنے بے ساختہ احساسات کو اشعار کی تسبیح میں پروتی ہیں، اس وقت ان کے چار شعری مجموعے پھول سے بچھڑی خوشبو، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں ، اور شام ٹھہر گئی کے بعد پھول، خوشبو اور تارہ چھپ کر پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں شرف قبولیت پا چکے ہیں، ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایم ۔ اے اور ایم ۔ فل اُردو سطح کے مقالے بھی ہو چکے ہیں ۔ اب اُن پر لکھنو یونیورسٹی انڈیا میں ایم فل کا تھیسز ہو رہا ہے ۔ وہ جنوبی پنجاب کی پہلی شاعرہ ہیں جو عالمی اُردو کانفرنس ''ترکی'' میں شرکت کا اعزاز بھی حاصل کر چکی ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ نامور اہل قلم نے نجمہ شاہین کھوسہ کی لطافت آمیز اور فکر انگیز شاعری کی دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ ''ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے محبت کی شاعرہ تو رضی الدین افق نے اُن کی شاعری کو ہجر اور بلندی کا استعارہ کہا ہے ۔ شہناز مزمل نے خوشبو کا جھونکا، ملک فدا الرحمٰن نے ادب کی شہزادی اور شبیر ناقد نے عشق و لغت کی شاعرہ

کہا ہے ۔ بشریٰ اعجاز کے بقول اُن کی شاعری میں یہ محبت ہجر کے گاڑھے شیرے میں ڈوبی ہوئی ہے'' ۔

بشریٰ رحمٰن نے پھول، خوشبو اور تارہ کے حوالے سے یوں کہتی ہیں ۔ پھول خود اُن کی ذات ہے ۔ خوشبو اُن کے افکار ہیں اور تارہ تقدیر کا استعارہ ہے ۔ جو تقدیر ازلوں لکھی ہوئی ملتی ہے'' ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ تدبیر سے ہی تقدیر نکھرتی ہے ۔ خیر! ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ کو تاریخی حقائق کا مکمل ادراک ہے ، کیوں کہ زرعی انقلاب کے بعد مردوں کا معاشرہ نہ صرف سامنے آیا تھا، بلکہ انہوں نے مذہب کا سہارا لے کر عورتوں کو تمام سماجی حقوق سے محروم کر دیا تھا، اس حوالے سے یونانی، مصری، بابلی، رومی، ہندی اور عربی معاشروں نے عورتوں کو محض جنسی کھلونا سمجھا، لیکن پیغمبرؐ انقلاب نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا لباس کہہ کر سماج میں توازن قائم کیا آپؐ کے بعد مذہبی اجارہ داروں نے مردوں کی حاکمیت کو مستحکم کرنے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی ۔

موجودہ عہد بھی مردوں کی خود غرض ، ہوس پرستی ، ستم گری ، دھوکا دہی اور بے رعنائی کا غماز ہے ۔ اس بھیانک تناظر میں نجمہ شاہین کھوسہ اپنے وجود کا نہ صرف احساس دلاتی ہیں، بلکہ محبت کی خوشبو سے کائنات کو مہکا بھی رہی ہیں، کیونکہ بقول اقبال ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ'' ۔

وہ دراصل اپنا دردِ دروں بیان کر کے دنیا بھر کی عورتوں کے مصائب اور مسائل کی بات کرتی ہیں وہ ان تمام سازشی ہتھکنڈوں کو نا کام بنانا چاہتی ہیں جن کی وجہ سے عورتیں صدیوں سے پابہء زنجیر ہیں ۔ اس لیے وہ اپنی شاعری کے ذریعے ان کا سماجی شعور جگانا چاہتی ہیں تاکہ مردوں کے سفاک رویوں سے نجات ملے، وطن عزیز میں جس کی بھیانک تصویر دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ تین شعر دیکھئے:

اِذن جینے کا مجھے سب نے دیا تھا ایسے
جس طرح دیتے ہیں خیرات نہ پوچھو میں

وہ بنتِ حوا کو گو نظر سے گرا رہے ہیں
مگر وہ کہتی ہے رفعتوں میں تمہیں ملوں گی

نینوں میں نیر پروتی ہیں یہ پائل چوڑیاں اور مہندی
جیون کے ساز پہ روتی ہیں یہ پائل، چوڑیاں اور مہندی

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری دُکھوں، غموں اور محرومیوں سے عبارت ہے انہیں دشمنوں کے بجائے اپنوں کے سرد رویوں کا دُکھ دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے وہ ہجر و وصال کی جلتی بجھتی خواہشوں اور مانگ کے جگمگاتے زخموں کو دولتِ عشق سمجھتی ہیں کیونکہ وہ عشق و محبت کے اسرار ورموز سے نہ صرف واقف ہیں، بلکہ ان کے عشق میں سچائی اور پاکیزگی ہے، اس لیے وہ موجودہ عہد کی ہیر بھی ہیں اور سسی بھی، انہوں نے اپنی شاعری میں عشق، ہجر اور اشک جیسے الفاظ تواتر کے ساتھ استعمال کیے ہیں، جو ان کی دکھ بھری داخلی کیفیتوں کے غماز ہیں، اور منفرد لب ولہجہ کی پہچان بھی، نجمہ شاہین کھوسہ اپنے سر پر ہجر کی چادر اوڑھے، یادوں کے مرہم سے زخمی رُوح کو جوڑتی نظر آتی ہیں وہ عشق کے رستے پر زخموں کا شمار کیے بغیر ہر اک ستم خندہ پیشانی سے برداشت کر کے سفر زندگی پر رواں ہیں۔
چند اشعار دیکھئے:

اشکوں کو دریا کر ڈالا پھر دریا کو بحر کیا
عشق نے آنکھ کو بخشا ہے اک ہجر بھری برسات کا دُکھ

دشت میں زادِ سفر اتنا ہی تھا میرے لیے
اشک تھے اور ساتھ تھا بس میری آہوں کا حصار

جو میری مانگ میں کچھ زخم جگمگاتے ہیں
کسی کے عشق میں مجھ کو ملی یہ دولت ہے

جب سے وفا بیوپار ہوئی جس دن عشق کی ہار ہوئی
اس دن سے ہی سر پر ہجر کی چادر اوڑھتی ہوں

پھول کھلیں یا بادل برسیں، ساون رت کو ہم تو ترسیں
جو قسمیں اور وعدے تھے سب وقت کیساتھ وہ ٹوٹ گئے

اپنے من کو آگ لگائی اور پھر اس کی راکھ اُڑائی
یوں ہی جلتے بجھتے شاہین ساری عمر گزاری سائیں

نجمہ شاہین کھوسہ جیسی محبت میں قسمت کی دیوی کو قدم قدم پر ٹھوکریں ملیں، غم حالات کی چلچلاتی دھوپ نے جھلسا دیا، نفرت کے تیروں سے روح زخمی ہوئی، پھر بھی ان کی زبان پر اس بیوفا اور بے اعتنا کا نام ہے۔

بھلے سنگ دل بھلے بیوفا مرا چارہ گر تو وہی ہے بس
جو گریز پا ہے ابھی تلک مجھے جان جاں تو ملے وہی

نجمہ شاہین کھوسہ جب شعور کی آنکھ سے اپنے اردگرد کثیف ماحول اور دنیا میں ہونے والے خواب چکاں حالات و واقعات کو دیکھتی ہیں تو عالمی استعماری قوتوں اور ان کے ایجنٹوں کی مذمت کرتی ہیں جنہوں نے زندگی کش نظام دے کر اپنے مفادات کے کشکول بڑھتے ہیں انہیں یہ بھی دکھ ہے کہ ہر قدم پر وحشتوں کے پہرے اور خوف وہراس کی فضا ہے دہشت گردی سے ہر سو لاشوں کے انبار نظر آتے ہیں مکاں سلامت ہیں اور نہ مکیں، رہبروں نے بھی رہزنوں کا روپ دھار لیا ہے تاریخ عالم تاریخ اسلما اور تاریخ پاکستنا کے اوراق چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہے ہیں۔

نہ کوئی بستی یہاں سلامت نہ اس میں مکاں سلامت
یہی بہت ہے ہر ایک چہرے پہ بس ہے اشکِ رواں سلامت

حاکم سے کیا پوچھیں ہم جو حال بھی ہے مخلوق کا اب
تپتا سورج جان سکا کب کہر میں لپٹی رات کا دکھ

ہم نے شاہیں اس دھرتی پر ایک ہی کھیل تو بس دیکھا ہے
رہبر رہزن بن کر آئے اور رہرو کو لوٹ گئے

نجمہ شاہین کھوسہ ایسے سماج کی خواہش رکھتی ہیں کہ جہاں نفرتوں کی سب دیوار یں گرا دی جائیں تا کہ محبتوں کا چلن عام ہو، اعلیٰ وارفع اخلاقی اقدار کے ذہنوں سے فرض گونج اٹھے تا کہ سسکتی انسانیت کو سکھ کا سانس نصیب ہو۔ نجمہ شاہین کھوسہ تصوف کے سائے میں روح کی تازگی کے ساماں کر کے بے پایاں فرحت وراحت محسوس کرتی ہیں:

مجھ کو مرے وجود میں بس تو ہی تو ملا
ایسے تیری مہک سے سنواری گئی ہوں میں

یہ حقیقت ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ لحہ موجود کی زیرک شاعرہ ہیں ان کا مطالعہ حیات وسیع اور مشاہدہ کائنات عمیق ہے ان کی شاعری میں سوز و گداز بھی ہے کرب تنہائی میں جذبہ اخود اعتمادی اور عزم وحوصلہ بھی احتجاج بھی ہے لیکن تہذیبی شائستگی کے دائرے میں ان کی شاعری رواں بحور میں ہے جس میں تغزل بھی ہے موسیقیت ، نغمگی ، تازگی اور شگفتگی بھی ، قافیہ اور ردیف کا باہمی ربط بھی ہے جو حُسن شعر کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ ان کا شستہ اسلوب سادہ مگر پُر درد ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ۔۔۔عشق والفت کی شاعرہ:

شبیر ناقد تونسہ شریف

عشق والفت کے جذبے اقلیمِ سخن کی جان ہوا کرتے ہیں اگر چہ جدید ادبی عصری رویئوں نے انہیں مسخ کرنے کی کوشش کی جنہیں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اجدت پسندوں کی تمام تر کاوشوں کے باوجود غزل سے رومان کے وجود کو ختم نہ کیا جا سکا یہ جذبے تمام شعراء شاعرات کے ہاں کم یا زیادہ پائے جاتے ہیں ہم نے جب ڈاکٹر نجمہ شاہین کے دوسرے شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند کرتی ہوں'' کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو ہمیں عشق والفت کے احساسات وفور کے ساتھ نظر آئے مجمعہ ہذا اپریل 2010ء میں منظر عام پر آیا ان کا اوّلین شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' بھی قارئین شعر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے آج ہم اُن کے دوسرے شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند کرتی ہوں'' کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ عشق والفت کے حوالے سے کریں گے اگر چہ انہوں نے بھر پور قسم کی نظمیں بھی کہیں ہیں لیکن اُن کی غزل اُن کی نظم سے کہیں آگے ہے اُن کی غزل میں تغزل بھر پور انداز میں پایا جاتا ہے غزل کا اسلوب انتہائی شستہ، سادہ اور رواں ہے جاذبیت جس کا وصفِ خاص ہے۔

عشق حقیقی کے حوالے صوفیا کے ہاں وہ نظریے پائے جاتے ہیں وہ مکتب فکر ہیں جن کی تصوف سے وابستہ لوگ پیروی کرتے ہیں جنہیں ''ہمہ اوست'' اور ہمہ از اوست'' کا نام دیا جاتا ہے جن کے اصطلاحی مفاہیم یہ ہیں کہ سب کچھ خدا ہے اور ہر چیز اُس سے نسبت رکھتی ہے یا اس کا پرتو ہے ڈاکٹر نجمہ شاہین کے ہاں یہ دونوں نظریے پائے جاتے ہیں اُن کی حمد شاعری کے تین اشعار میں انہیں افکار کا رنگ پورے کروفر سے پایا جاتا ہے۔

؎ جہاں جہاں گئی نظر، وہاں وہاں ملا ہے تو
ہر اک جگہ ، ہر اک نگر خدا ہے تو

ہیں رنگ و نور چار سو ترا وجود کو بہ کو
چمن چمن دمن دمن جمال دلر با ہے تو

ہر ایک بحر و بر میں تو وجودِ خیر و شر میں تو
ہر ایک سمت جلوہ گر، جہاں میں اے خدا ہے تو

عالم ہجراں کرب اور سوز و گداز سے عبارت ہوا کرتا ہے عشق کے لیے یہ کیفیت کسی قیامت سے کم نہیں ہوتی ہوش وحواس مفقود ہو جاتے ہیں انسان کو اپنی خبر تک نہیں ہوتی یہ عشق کی پُر آشوب کیفیت ہوتی ہے ایک عالم جنون ہوتا ہے یہ صورتِ حال اجنبی اور انجان بنا دیتی ہے یہی کرب اُن کے ہاں ملاحظہ کرتے ہیں۔

ہجر کی وحشت نے دل کو کر دیا رنجور اب
بھولتی جاتی ہیں اب صورتیں دیکھی ہوئی

رجائیت آمیز شاعری اس دور پرآشوب میں ایک ٹانک کا درجہ رکھتی ہے جس کے باعث زندگی کی رعنائی اور توانائی بحال ہے اور معمول کے ساتھ پورے جوش وجذبے سے گزر رہی ہے ہجر کی پُر اذیت وحشت میں بھی دامن امید تھامے رکھنا امید افزا ہے اسی تناظر میں اُن کی غزل کا ایک شعر دیکھتے ہیں:

؎ ہجر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

ہم سب ایک عہدِ بے حسی میں زندہ ہیں جہاں نفسا نفسی کا عالم ہے جہاں اخلاقی اقدار پامال ہو رہی ہیں خلوص والفت ناپید ہے بقول راقم الحروف۔

کیا خبر کس دیس میں ہم آ گئے؟
پیار عنقا ہے جہاں نفرت فزوں

ہر انسان اپنی ذات کے خول میں مقید ہے اور خود اسیری کی زندگی بسر کر رہا ہے حصار ذات نے انسان کو بہت ہی خود فریبیوں میں مبتلا کر دیا ہے اور ہر کوئی اپنی ذات میں مگن ہے۔اسی حوالے کا حامل اُن کی غزل کا ایک شعر لائق التفاق ہے۔

ہر ایک اپنی ذات کے حصار میں اسیر تھا
کہ خود فریبیوں میں ہی ہر ایک موجزن ملا

حصولِ محبت کی اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اُس معیار پر لے جائے جہاں پہنچ کر انسان محبت کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے استحقاق جتا سکتا ہے پہلے خود کو وفاؤں کا خوگر کرنا ہوگا پھر انسان کی سوچ یہ ہوگی کہ میرا محبوب بھی میری طرح وفا کا استعارہ ہو جب اُسے ایسی ہستی نہیں ملے گی تو پھر وہ مجبور بیاں ہو جائے گا یہی تاثر اُنکے ہاں کچھ یوں پایا جاتا ہے:

؎ ہم لوگ محبت سے بتا کس کو پکاریں؟
دنیا میں کوئی ہم سا ، ہمارا نہیں ملتا

عام طور پر یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ عشق وہ ہے جو انسان کو مجنوں اور دیوانہ بنا دے جو اس باختہ کر کے مخبوط الحواس بنا دے اور انسان مجذوب بن جائے یہ عشق کے حوالے سے ایک منفی ایک عنبر ہے ایک خوشبو ہے جو تن من کو مہکائے رکھتی ہے جیسے اقبال نے کہا تھا۔

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب وشوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا فکر و فن

محبوب حسن اور احساس حسن کو مرقع ہوتا ہے یہی سبب ہے وہ محبّ سے وفا کرنا لازمی نہیں گردانتا لیکن محبّ پل پل اُس کی یادیں دل میں بسائے پھرتا ہے عشق کا روگ بھی عجیب وغریب ہے جو تغیرِ حال کا باعث بنتا ہے اگر عشق کامیاب ہو جائے تو صحرا کو گلزار بنانے پر قادر ہے اگر ہزیمت سے دوچار ہو تو پھر گلزار کو صحرا میں ڈھال دیتا ہے عشق کے اندر

ایسی خصوصیت ہے کہ یہ انسانی روح کو جلا بخشتا ہے عشق کی مثال ایک چراغ کی مانند ہے جو تیرگی اور شبِ ظلمت کے راج کو ختم کرتا ہے اس حوالے سے اُن کی غزل کے چار اشعار ہدیۂ قارئین ہیں:

وہ آواز ، وہ لہجہ اس کے خال و خد
کس کی یاد میں من مہکائے پھرتی ہوں

جو مجھ کو پہنچان نہ پایا آج تلک
دل میں اُس کی یاد بسائے پھرتی ہوں

عشق کا روگ بھی روگ عجیب سا ہوتا ہے
صحرا کو گلزار بنائے پھرتی ہوں

شاہیںؔ اس سے روشن میری روح بھی ہے
میں جو ایک چراغ جلائے پھرتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہینؔ کی شاعری سے قاری کو ایک خوشگوار اور لطیف احساس ہوتا ہے آج کے پُرآشوب عہد میں جہاں آس اور امید کی شمعیں گل ہو چکی ہیں اس بھیانک صورتِ حال میں بھی رجائی جذبوں کی پاسداری یقیناً خوش آئند اور مستحسن اقدام ہے جس سے زندگی کو نیا ولولہ، نیا حوصلہ اور نیا جوش و جذبہ عطا ہوتا ہے اُن کے ہاں یہ فکری تلازمے بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں وہ درسِ امید دے رہی ہیں اور رجا کی شمعیں روشن کر رہی ہیں وہ ذاتی حوالے سے بات کر کے اجتماعی تاثر پیدا کرتی ہیں اس طرح ذات سے لے کر کائنات تک کا سفر جاری رہتا ہے اُن کی غزل کا ایک رجائیت آمیز شعر آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

؎ میں اپنے آنگن کو دے رہی ہوں نئے اُجالے
وہ میری راہوں میں پھول گلیاں بچھا رہا ہے

ان کے کلام میں عشق والفت کا جذبہ اپنے خاص روپ میں موجزن ہے جہاں غم کی ہلکی سی آنچ ہوتی ہے وہاں امید افزاء مکانات بھی موجود ہوتے ہیں وہ اپنے شعری احساسات میں وفا کے اعلیٰ وارفع مقام پر دکھائی دیتی ہیں۔ محبت میں محبوب پر اندھا اعتماد کیا جاتا ہے اُن کی ہر غلط بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ یہ معاملہ خرد کو نہیں ہے بلکہ عشق وجنوں کا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

؎ وفا میں اب یہ ہنر اختیار کرنا ہے
وہ سچ کہے نہ کہے اعتبار کرنا ہے

وہ بھی اپنے محبوب کی ہر بات کا یقین کرتی ہیں اور اسے من وعن تسلیم کرتی ہیں ان کی غزل کے اسی شعر میں اُن کی وفا کا رنگ دیکھتے ہیں۔

؎ بات جو نہیں سُنتا اُس سے بات کرتی ہوں
اس پہ ہے یقیں مجھ کو جو گمان جیسا ہے

اُن کے ہاں کہیں کہیں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ لیکن غمِ جاناں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود رہتا ہے اور اسے فوقیت حاصل رہتی ہے اسی حوالے سے اُن کی غزل کا مطلع لائق توجہ ہے۔

؎ دن تو اپنے غمِ دوراں میں گزر جاتے ہیں
شام ہوتے ہی ترے غم میں بکھر جاتے ہیں

ان کے ہاں رومان کے سارے رنگ پائے جاتے ہیں جن میں کیفیاتِ دل بھی ہیں اور وارداتِ دل بھی۔ عشق و عاشقی کے تمام رنگ موجود ہیں ان کے کلام کے مطالعے کے بعد قاری ایک لطیف اور خوشگوار احساس میں کھو جاتا ہے ان کے ہاں مجاز معتبر، مستقل اور تندرست وتوانا حوالے کے طور پر پایا جاتا ہے ان کا کلام دل زدوں کے لیے ایک سامانِ

دل بستگی ہے ان کے ہاں معاملہ بندی بھی ہے اور منظر نگاری بھی پائی جاتی ہے اُن کے ہاں وصل کے قصّے بھی ہیں اور ہجر کے افسانے بھی ہیں عمومی محبتوں کا فقدان بھی ماضی کی دلکشی بھی ہے اور حال کا وجدان بھی ہے کہیں وہ خوش وخرم نظر آتی ہیں تو کہیں شکوہ کناں ہیں اس سلسلہ کی آخری کڑی کے طور پر اُن کی غزل کا ایک دل گداز شعر آپ کی نظر ہے۔

؎ وہ قربت کی باتیں، وہ مہکی سی راتیں کہاں کھو گئیں ہیں؟
محبت کی پونی کہاں جا کے کاتیں دعا رو رہی ہے؟

مشمولہ توضیحات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کا کلام فکری وفنی اعتبار سے لائق اعتنا وصد ستائش ہے اسلوبیاتی جاذبیت اُن کے کلام میں اور دلکشی بنا رہی ہے ان کے ہاں کہیں کہیں نسائی احساسات وخیالات بھی پائے جاتے ہیں اگر رومانی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ساحر لدھیانوی، اختر شیرانی، احمد فراز اور ابوالحسن ظہور احمد فاتح کی صف میں کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ان کے کلام میں بہت سے روشن امکانات موجود ہیں جو اُن کے بہتر ادبی مستقبل کی بشارت دے سکتے ہیں۔

متفرق اشعار:

میری تمام اُمیدیں اسی سے وابستہ
وہ جس کا شغل ہے احباب کو داغ دینا

کڑکتی دُھوپ بھی اس کو جلا نہیں سکتی
وہ نونہال جو برگد کے سائبان میں ہے

لمس تیرے ہاتھوں کا جب میسر ہو مجھے
پھر مری طبیعت بھی کیوں نہ ہو روانی میں

شاہیؔن یہ بھی تشنہ لبوں میں بانٹ دو
تھوڑی سی مئے پڑی ہے جو تیرے ایاغ میں

وہ بھی دن تھے کہ نگاہوں میں دھنک رہتی تھی
اب تو گھیرے ہوئے رہتی ہے سیاہ رات ہمیں

بند آنکھوں میں جگنو تھے اُمید کے
وہ بھی رستوں میں بجھتا دُھواں ہو گئے

تھے جن کے دم سے یہ خواب روشن
وہ لوگ خوابوں میں مرے رہے ہیں

ہم نہ کریں گے کسی طور وفا کو رُسوا
ہم نہ بھولیں گے تجھے ہم کو بھلانے والے

موم کر دیتا ہے شاہین یہ پتھر دل کو
عشق انسان کو معبود بنا دیتا ہے

مصرعوں کے دروبست میں ایک حسنِ التزام ہے اسلوب میں ایک چاشنی اور شیرینی موجود ہے۔ غم کے ساتھ ساتھ خوشی کا ایک خوشگوار احساس بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے جس کے باعث غم کی شدت کم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تصور محبوب ایک مرکزی تلازمے کے طور پر ابھرا ہے محبوب کے بغیر وہ ہستی کو ہستی نہیں گردانتی محبوب کے بغیر خوشی کا تصور ناپید ہے اُن کے رجا کا عالم یہ ہے کہ اُنہیں عالمِ ہجراں میں بھی ایک دلکشی کا پہلو دکھائی دیتا ہے اُن

کے نزدیک ذکرِ یار کے بغیر شاعری نہیں ہوتی انہیں خیالات کے حامل اُن کی غزل کے چار اشعار آپ کے ذوق لطیف کی تسکین کے لیے زیب قرطاس ہیں۔

؎ تم سے گر دوستی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

تم تبسم ہو میرے ہونٹوں کا
بن تمہارے ہنسی نہیں ہوتی

وحشتِ ہجر گر نہ مل پائے
زیست میں دلکشی نہیں ہوتی

ذکر اُس کا اگر نہ شاہیؔن
ہم سے پھر شاعری نہیں ہوتی

اُن کے اسلوب کی سادگی ہی اُن کے کلام کا حسن ہے انہوں نے نسبتاً رواں دواں بحور میں لکھا ہے جن میں ایک خاص آہنگ اور موسقیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اُن کے نزدیک محبتِ غم دوراں کو بھلانے کا حسیں طریقہ ہے وہ اہل دل ہیں اُن کا تعلق دل کی دنیا سے ہے وہ زندہ دلی سے زندگی گزارنا چاہتی ہیں بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح ؎ زندگی زندہ دلی سے جو گزاری ہم نے موت بھی دے کے ہمیں جامِ بقا گزرے گی۔

کوہ سلیمان کی ملکہ صبا

دلبر مولائی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، کھوسہ قبیلے کی سب کاسٹ جندانی کو آج سے ماضی کی طرف اگر دیکھا جائے تو مردانہ تعلیم خال خال ہی نظر آئے گی حالانکہ ضلع راجن پور اور ضلع ڈی جی خان میں یہ سب کاسٹ ہزاروں بینک ووٹ کی مالک ہے خواتین کی تعلیمی۔ پوزیشن کیا ہوگی؟۔۔میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔۔البتہ میں معجزے اور کرامت پر یقین رکھتا ہوں،، کیا ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

وہی تنہائی ، وہی عالم ، وہی آنسو ، وہی غم
بے حسی کے عالم میں ہُو کا منظر طاری ہے

روزنامہ جنگ، نوائے وقت، خبریں اور نیا دور میں شاعری اور مضامین کا چھپنا ان کی ادبی مقبولیت کی دلیل ہے۔ ان کی مربوط آزاد نظمیں اور ہیرے جڑے الفاظ جواں جذبوں کے خوبصورت ترجمان ہیں۔

سچائی عشق عہد گذشتہ کا باب ٹھہرا
اظہارِ محبت اب دیوانگی ہو گئی

تیرے نام کی خاطر چھوڑ دی دنیا
سب کہیں شاہیؔن خودسر ہے جاناں

ڈاکٹر صاحبہ بلوچ ہیں کھوسہ قبیلہ کی روایت کی پاسداری کرنا خوب جانتی ہیں اور

ساتھ ہی رب تعالیٰ سے دل بیدار کے موسم کی تبدیلی کی دعا بھی مانگتی رہتی ہیں۔

کچھ شوق ترک تعلق تھا اس کو کچھ انا پرست تھے ہم بھی
اسی لیے درمیان آ گیا ہے کاروانِ اغیار کا موسم

اَےَ بارگاہ ایزدی تجھے واسطہ در محبو ب کا
سکوں دے کر بدل دے میرے دل بیدار کا موسم

سردار جان محمد خان جندانی کھوسہ کو کتنا سلام کریں کتنی عظمتیں بخشیں جنہوں نے اپنی جاہلانہ روایات کو پس پشت ڈال کر بڑی لگن سے اپنی بچی کی تعلیم کی طرف توجہ دی، اس کی خاطر دیہات اور بستی جندانی سے شہر کی طرف ہجرت کی، بھرپور تعلیم دلوا کر ایک عظیم ڈاکٹر ایک مخلص مسیحا بخشیش کر دی۔ آج جان ہسپتال ڈی جی خان روتے لوگوں کو خوشیاں عطا کر رہی ہے۔ ایسے والدین کو تمغے ملنے چاہئیں جو اپنی اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر ملک وملت کی بہترین، خدمت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور سردار غلام فرید خان کھوسہ جیسے شوہر قابل قدر ہیں جنہوں نے بلند خیالی اور روشن خیالی کو اہمیت دی ہے اور فرسودہ رسم و روایات سے نفرت کی ہے۔ چراغوں کو ہمیشہ روشن کیا ہے، بجھنے نہیں دیا اور اندھے مقلدین کی مذمت کی ہے۔

؎ لوگ ان کو ڈراتے ہیں بجھے چراغوں کے نام سے
جو اندھی الجھتی بجلیاں زیست میں سجائے پھرتے ہیں

۵ دسمبر ۱۹۷۱ء ڈاکٹر صاحبہ کا جنم دن ہے۔ ۱۹۹۶ء سے نہ صرف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی ہیں بلکہ سرپرستی کر رہی ہیں، ذہن اور جفاکش تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کا مشن ہے اور خصوصاً خواتین کے مسائل اور مصائب کے خاتمے کے لیے ہر وقت کمر بستہ ہیں، تاریخ سے عبرت لے کر حال میں کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ حضرت زینبؑ اور حضرت فاطمۃ الزہراءؑ ان کی آئیڈیل ہستیاں ہیں۔ ظلمت شب سے نالاں یہ ڈاکٹر صاحبہ صبح امید کا خواب دیکھ رہی ہیں، دور حاضر میں عورت اور وہ بھی ضلع ڈیرہ غازی خان کی جو کر

بناک حالات سے گزر رہی ہے ان کی نمائندگی کے لیے ڈاکٹر صاحبہ کے اشعار دیکھئے۔

دنیا نے کیسے مجھے نیلام کیا
ناحق میرے خوابوں کو بد نام کیا

آگہی کے سبھی خواب مجھ سے چھپائے گئے
شہر کی مقتل میں میرے خواب لٹائے گئے

ان کی مادری زبان بلوچی ہے، اردو قومی زبان ہے، سرائیکی سے خاص محبت ہے ، سرائیکی اشعار دیکھئے:

میڈے دل دا حاکم اے حال سُنا
کیا حال تھیندے پردیس اتے

جڈاں عید برات دا چندر ڈسے
جگ جوڑے جوڑ ٹھیا رکھدے

اوں مونجھے دل دی کیا عید تھیوے
جیندا چن وسدے پردیس اتے

کہتی ہیں کہ ''اجڑے لوگوں کی داستان زیست نہیں پوچھی جاتی بلکہ ان کی وفا کو تولا جاتا ہے۔ بہر حال دور حاضر منافقت کا دور ہے اگر اس کی جگہ حقیقی عشق اور خلوص آجائے تو آگ آج بھی گلستان بن سکتی ہے۔'' رومانی جذبات، قومی فکر و احساس اور خوبصورت حرفوں کا خزانہ رکھنے والی یہ شاعرہ جب فن شاعری کی طرف توجہ دے سکے گی تو ڈاکٹر موصوفہ ڈیرہ غازی خان کی پروین شاکر کہلائے گی۔

پھول سے بچھڑی خوشبو میں لہجے اور شعور کا رچاؤ

فرید ساجد

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق ڈی جی خان سے ہے وہ یہاں مسیحائی کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ان کی نثری نظموں کا شعری مجموعہ ’’پھول سے بچھڑی خوشبو‘‘ گزشتہ دنوں منظر عام پر آیا۔ ڈیرہ غازیخان میں صنف نازک کی شاعری پر مبنی کتاب کی اشاعت اہم پیش رفت ہے۔ کتاب کا نام ’’پھول سے بچھڑی خوشبو‘‘ جو کہ استحصال کا ایک سنجیدہ استعارہ ہے اس نام میں ہزاروں کرب چھپے ہوئے ہیں جو کہ کتاب کے گہرے مطالعہ سے آہستہ آہستہ کھلنے شروع ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں میں محبت وشعور نمایاں ہوتا ہے۔ شاعری چونکہ ایک مسلسل تخلیقی عمل کا نام ہے اسے وقت کے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے۔ ’’پھول سے بچھڑی خوشبو‘‘ کی شاعری پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف بدلتے ہوئے انداز کی جھلک بھی نظر آتی ہے دوسرا اس میں موجود نظموں کے موضوعات روایت سے منسلک بھی ہیں نورجدا بھی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی بعض نظموں میں حادثاتی منظر جھلکتے نظر آتے ہیں جن سے تخلیق کار گریز نہیں کرسکتا۔ نظم ’’تو تو کبھی بھی میرا نہ تھا‘‘ کا ادراک بھند وشعور ہیں انتساب سے کم نہیں۔

کہاں زمین کہاں آسماں
جب طوفان نے حشر ڈھایا
کہ وہ میری اپنی سانسیں تھیں

میری اپنی صدائیں تھیں
جو گرداب بن کے لوٹی تھیں
تو تو کبھی بھی پاس نہ تھا
تو تو کبھی بھی میرا نہ تھا

شعر کہنا دراصل جذبے کے ساتھ ساتھ فکر کا بھی تقاضا کرتا ہے اور پھر وہ قدم آگے بڑھ کر اس فکر اور خیال کو وزن کی بھٹی میں تپانے کا نام شاعیر ہے۔ یہ فن ریاضت اور جذبوں کا خراج مانگتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کا یہ پہلا نثری نظموں کا مجموعہ ہے مگر اس کا رچا ہوا شعور اور لہجہ اولیت سے آگے کی منزل کا پتہ دیتا ہے جس میں موجود نظمیں مختلف پہلوؤں سے عبارت ہیں۔ درحقیقت لہجے کا یہ نیا پن شاعر کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہ عمر رواں کچھ ایسے تو نہ تھی
خواب تتلیاں پھول اور پنچھی
بہاروں کی مہکار کے
وہ چند بیتے لمحے
امید وآس کے کچھ ٹمٹماتے جگنو
نینوں میں جوت جگاتے تھے
ہم بھی ہنستے تھے ہم بھی گاتے تھے
ہمارے اک اک آنسو پر
تسلیوں کے خزانے
کچھ لوگ لٹاتے تھے
ہم ہنساتے تھے تو ساتھ ہمارے
ہنستے تھے زمانے
چند بیتی راتیں روشن روشن

حنائی رنگ، غنائی آہنگ

بشریٰ رحمٰن لاہور

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری کا رنگ حنائی ہے۔ حنا ہمیشہ دو رنگوں کا امتزاج ہوتی ہے۔ حیادار سبز رُتوں کے اندر جذبوں کا سرخ رنگ بھینی بھینی خوشبو دیتا ہے تو غنائی سُر بیدار ہونے لگتے ہیں۔ جو سہاگ کی گت پہ ملن کے گیت چھیڑ دیتے ہیں اور وراگ کے موسم میں ہجر کی کافیاں سناتے ہیں۔ یہ رنگ سب کو ہتھیلی کو سرخی عطا کرتا ہے مگر مقدر کی لکیروں پر کبھی حاوی نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی حنا کے رنگ کے اندر غنائیت کی جو ادا پنہاں ہے۔۔ وہ کسی اور رنگ میں نہیں ہے۔

حسنِ اتفاق ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین مسیحائی کی ڈگر پر نکلی ہے۔ یہ ڈگر تھی تو مشکل مگر اس کے اندر انسانیت کے لئے وقار اور پیار کا انمول خزینہ تھا۔ قدرت نے ویسے بھی عورت کے ذمے کوئی نہ کوئی مسیحائی لگا رکھی ہے۔ وہ ماں کی صورت میں ہو، بہن، بیٹی یا بیوی کی شکل میں ہو۔ اُس کا وجود، اُس کا دَم درود اور اُس کا مقصود انسانی زنجیر میں بندھے ہوئے رشتوں کو بڑھاوا دینا اور دوام بخشنا ہوتا ہے۔ اس لئے تقدیر نے نجمہ کے ہاتھ میں قلم کے ساتھ نشتر بھی پکڑا دیا۔ ایک طرف حنائی ہنر عطا کر دیا تو دوسری طرف مسیحائی کی ادا بھی بخش دی۔۔ غنائی لہجہ اُس کو شاعری نے دیا۔

قلم اور نشتر کا بڑا قدیم رشتہ ہے۔ کبھی نشتر سب دکھوں کی دوا بن جاتا ہے اور کبھی قلم درد کا اندمال بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین دونوں سے بہت خوبصورت کام لے رہی ہے۔ شعوری طور پر وہ انسانیت کی خدمت کر رہی ہے اور لاشعوری طور پر وہ محبت کی خوش رنگ

کلیاں چُن کر ان کی مالا پرو رہی ہے۔ اس لئے اس کی شاعری خوشبوؤں کی پھوہار لگتی ہے۔ ہجر، فراق، انتظار، رَت جگے، اضطراب، بے کلی، آس، امید سب محبت کے قبیلے میں شامل ہیں۔ محبت دل کی وہ اداسی ہے جو زندہ رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔ جو دنوں کو شاموں سے ملا کر رکھتی ہے۔۔ جو رات کو دیئے کی طرح جلاتی ہے۔ کبھی کبھی ادراک کے کسی طاقچے میں کوئی شام ٹھہر جاتی ہے۔۔ اور پھر ہر شام اُس پر سے نثار ہوتے ہوئے گذرتی ہے۔

یہ ہجر کا راستہ ہے جس پر میں تنہا تنہا سی چل رہی ہوں
بس اُسکی یادوں کی دھول ہے اور مَیں قطرہ قطرہ پگھل رہی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری کی دوسری خوبی اُس کا شیریں لب ولہجہ ہے۔ اُس کی مٹھاس ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ کی دھرتی کے اندر ویسے بھی بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ نجمہ جب بات کرتی ہے تو اس کے لہجے کی شیرینی ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے اور جب شعر کہتی ہے تو کلبلاتے، تڑپتے، مچلتے اور سسکتے جذبوں کے اوپر شہد کا چھڑکاؤ کرتی جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے لئے سکھ اور سکون کی خیرات مانگنے نکلی ہے۔۔ وہ چاہتی ہے کسی آنکھ میں آنسو نہ ہوں، کوئی مانگ نہ اُجڑے۔۔ کوئی دل نہ ٹوٹے۔۔ نظامِ ہستی میں بلندی پستی، اونچ نیچ نہ ہو۔

یہ دیس جس میں ہے نفرتوں کا ہی راج ہر سُو
محبتوں کی ہو راجدھانی تو نیند آئے

اور

شاہین دورِ جبر میں جینا محال ہے
کب تک ہمارا ساتھ نبھائے گی اے وفا

نجمہ کی شاعری دلِ زندہ کی شاعری ہے۔ حساس جذبوں سے لدی پندی۔ صحراؤں کی منہ زور ہواؤں نے اس کی پرورش کی ہے اور ریت کے ذروں نے اسے چمکنا سکھایا ہے۔ میں تو اس خوبصورت شاعرہ سے یہی کہوں گی کہ دل کے لہو میں قلم ڈبو کے نشتر کی طرح چلاتی رہو۔۔ یہی تمہارا سنگھار ہے اور یہی تمہارا پیار ہے۔

روح کی شاعری

بشریٰ رحمٰن لاہور

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی چوتھی تخلیق منظر عام پر لائی ہیں:

پھول خوشبو اور تارہ ......
پھول ان کی اپنی ذات ہے
خوشبو ان کے افکار ہیں اور
تارہ تقدیر کا استعارہ ہے

تقدیر جو ازلوں سے لکھی ہوئی ملتی ہے اور تدبیر جو ہمیشہ اس سے الجھتی ہی رہتی ہے......
پھول کتنا بھی دل آویز کیوں نہ ہو......اپنی خوشبو پر اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا......
نجمہ خوشبو کی طرح ایک بے چین سی روح ہے۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تقدیر کا رانجھا کیسے راضی ہوگا۔شعر سنانے سے یا نشتر چلانے سے......

کبھی وہ آس کا گیت گاتی ہے۔کبھی نراش کی دھن بجاتی ہے۔کبھی اشکوں کے موتیوں سے ملن مالا پروتی ہے......کبھی جدائی کے کرب کو شعروں کا سوز عطا کرتی ہے۔

کس کو خبر کہ کون کہاں ہم کلام ہے؟
کس کو خبر کہ کس کی رفاقت میں کون ہے؟

آنکھوں میں آج تک بھلا کس کا قیام ہے؟
دن رات ایک جیسی عبادت میں کون ہے؟

اس کے دل کی سرخ زمین پر، کسی بے رنگ لمحے کے گزر جانے کے انمٹ نقوش ثبت ہیں جنہیں مٹانے کیلئے وہ ہوا کی طرح باؤلی بن کے گرتے پتوں کی زبان میں باتیں کرنے لگتی ہے۔تب وہ نقش اور بھی ابھرنے لگتے ہیں۔

اسکی شاعری روح کی شاعری ہے
ایک جہان نا دیدہ کی شاعری ہے

ایک دبی دبی فغاں ہے۔ایک خاموش دھواں ہے۔

دنیا کی اونچ نیچ...... ناہمواریاں...... ناقدریاں...... انسانیت بیزاریاں اسے تڑپاتی ہیں اتنا سناٹا تھا میری روح میں میں تو اپنے آپ سے بھی ڈر گئی کہنے کا سلیقہ اسے قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔سہنے کا کمال اس نے ماحول کی گھٹن سے سیکھا ہے۔شدت احساس اس کی میراث ہے اور رسم وفا کا اسے پاس ہے۔ وہ جب دنیا میں عدم مساوات ،بے حسی کے معاملات اور اخلاقی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ دیکھتی ہے تو وہ سنیاس لینا چاہتی ہے۔ جوگ میں عمر بسر کرنا چاہتی ہے تو سارے جہاں کے روگ اس کے آگے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو جاتے ہیں...... اور کہتے ہیں کانٹے چنتے رہنا بھی گلشن آرائی کا ایک چلن ہے......پھر وہ کرب ذات سے کرب کائنات میں الجھ جاتی ہے۔

معصوم بچے کی طرح ایک کلبلاتی خواہش کو سینے کے اندر تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے اور ماحول کے کانٹے چننے لگتی ہے...... یہی لگن اس کے عشق کی انتہا ہے۔اور یہی چبھن اسے ایک دن منزل کا پتہ دے گی ابھی اسے ادراک وعرفان کی منزلوں میں دور تک صدا دینی ہے۔

ابھی اسے بہت کچھ کہنا ہے
گو اسکی منزل دور ہے مگر لا حاصل نہیں

عمر بھر کے جس سفر کو رائیگاں کہتے ہو تم
اک نہ اک دن دیکھنا کار جہاں ہو جائے گا

خوشبو کا جھونکا، نجمہ شاہین کھوسہ

ڈاکٹر شہناز مزمل لاہور

تارے کی طرح دمکتی خوشبو کی طرح مہکتی اور پھولوں کی طرح شگفتہ نجمہ شاہین کھوسہ جس سے میں کبھی ملی نہیں۔ اخبارات اور رسائل کے ذریعے اُس سے ملاقات رہی اور وہ دل کے اندر اُترتی چلی گئی۔ اُس کے ذات کے مصروں نے مجھے محصور کرلیا اور اس کی شاعری روح کے تاروں کو چھیڑتی رہی۔ جانے کیا تھا جو دل اس سے ملنے پر مجبور ہوگیا۔ ویسے میں خود کم ہی کسی سے ملتی ہوں اور کم گو بھی ہوں۔ مگر نجمہ شاہین کی شخصیت اور شاعری مجھے اچھی لگی۔ ایک دفعہ علم ہوا کہ وہ عمرانہ مشتاق کے ہاں آرہی ہے۔ عمرانہ نے مجھے بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ میں نے ایک اور جگہ جانا تھا مگر میں وہاں جا پہنچی انتظار کے دوران ایک اور دانشور خوبصورت خاتون زینت آفاق سے ملاقات ہوئی جو میری سوچوں کے عین مطابق تھیں مگر یہ کیا؟ میری واپسی کا وقت آ گیا مگر نجمہ شاہین بوجوہ وہاں نہ پہنچ سکیں اور میں اُس سے ملنے کی حسرت لئے واپس آ گئی۔ اپنے خلوص کی ایک نشانی عمرانہ کے سپرد کرآئی تھی۔ کچھ عرصے بعد نجمہ کا شکریے کا فون آیا اور اُس سے بھی لمبی گفتگو کر کے مزہ آیا۔ اُسکے محبت بھرے لہجے اور خلوص نے بے حد متاثر کیا اور میں نے حسب عادت اُسے بیٹی کہا اور یوں ٹیلی فونک گفتگو کا سلسلہ چل نکلا اُس نے اپنی زیر اشاعت کتاب کا مسودہ مجھے رائے کے لئے بھجوایا۔ پھول خوشبو اور تارہ سامنے رکھے میں منظر غائر میں اسکا جائزہ لے رہی ہوں نجمہ کی غزلیں اور نظمیں میرے سامنے ہیں۔ غزل کا فن دو مصرعوں کے کوزے میں دریا کو بند کر دینے کا فن ہے۔ صرف دو مصرعوں میں ایک پورا مضمون ہی شاعر بیان کرسکتا ہے جسے غزل گوئی

کے فن میں مہارت حاصل ہو۔ مرد حضرات گو ابھی تک وادی شعر وسخن میں خواتین کی شمولیت کو دل سے تسلیم نہیں کرتے اور اچھی شاعرات کی انفرادیت کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اب تک بہت سی شاعرات وہ ادبی مقام حاصل نہیں کر سکیں جو ان کا حق اور حصہ ہے۔ نجمہ کھوسہ بھی بلاشبہ وہ خاتون ہیں جو اپنی شاعری کا علم اُٹھائے اس طرح بیکراں میں نہ صرف شامل ہوگئی ہیں بلکہ اپنے آپ کو منوا بھی لیا ہے۔ دھیمے اور پر تاثیر لہجے کی یہ شاعرہ غم جاناں، غم دوراں کا تذکرہ کرتی نظر آتی ہیں۔ ناامیدی اور یاس کی بجائے آس اور امید کی کرن ان کی شاعری میں پھوٹتی نظر آتی ہے اور بہت سے سوالات ابھی تک دل میں پوشیدہ ہیں۔

جولبوں پر ہیں یہی سن لو یہی کافی ہیں
دل میں ہیں جو بھی سوالات نہ پوچھو میا!

میا اور سائیں جیسے استعارے نجمہ کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اصل میں یہ استعارے ان کی پناگاہ ہیں۔ وادی شعر وسخن میں پا بجولاں سفر کرنے والی نجمہ چشم تر لئے صحرائے درد کی تپش کو کم کرنے کی کوشش میں مصرف نظر آتی ہیں۔ یہاں جو آرزوئیں ان کو لائی ہیں وہ وہ بے مہری زمانہ سے مرگئی ہیں اور ایک سناٹا ان کی روح میں درآیا ہے۔

اتنا سناٹا تھا میری روح میں
میں تو اپنے آپ سے ہی ڈر گئی

لیکن دردوں کے طفیل جو ان کو نعمتوں کے ثمر حاصل ہوئے ہیں وہ ان کو رکنے نہیں دیتے۔ ان کے عجز کا خانہ اُس کی کبریائی سے جڑا ہے وہ اُسی کے نگاہ کرم کی منتظر ہیں۔

مجھے اس کی اب بھی ہے جستجو، پڑھوں رات دن اسے باوضو
مری آنکھ سے جو نہاں ہے اب، مجھے راز داں تو ملے وہی

شاید یہی میری اور اُسکی سانجھی سوچ ہے جو مجھے اُس سے ملنے پر مجبور کرتی رہی۔

میرا اور اُسکا محور خیال ایک ہے۔ وہ ہی ذات حقیقی اپنا عشق ہے اور اُسی کا عشق اس کائنات میں ہمیں دوڑائے لئے جا رہا ہے میں بھی کہہ اٹھی ہوں۔

عاشق جو اپنے عشق الٰہی میں مست ہے
کب جانتا وہ راز دان بودو ھست ہے

لمبی بحر کی خوبصورت غزلیں ان کے کلام کا حسن ہیں۔

وہ حسن باہوں میں مر گیا ہے تو عشق راہوں میں کھو گیا ہے
یقین کی منزل تو کھو چکی ہوں مگر ابھی ہے گماں

میں نے اسکا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

مجھے راستوں کی خبر نہ تھی اڑی خاک میرے وجود کی
میں تلاش کرتی ہوئی تجھے ترے لامکاں سے گزر گئی

یقیں و گماں کے بھی عجیب سلسلے ہیں اور یہ سب سلسلے عشق کے سلسلے سے جڑے ہوئے ہیں شاید یہی ذہنی ہم آہنگی مجھے نجمہ سے ملنے پر مجبور کرتی رہی نجمہ کی خوبصورت بڑی بحر کی غزل اور خوبصورت شعر۔

پگھل چکا ہے وجود سارا سلگ رہی ہے ہماری ہستی
چراغ جاں کب کا بجھ گیا ہے مگر ابھی تک دھواں سلامت

اللہ نہ کرے کہ کبھی کسی کو غم ہجراں کا سامنا کرنا پڑے مگر انسان اپنے رب سے دور آ کر بھی کرب محسوس کرتا ہے اور یہ کرب بھی میرا اور نجمہ کا سانجھا ہے

درد و چھوڑا تو کیا جانے، من مندر کو تو کب مانے
دل کی دھڑکن کب پہچانے تو جذبوں سے عاری سائیں

غزلوں کی ح نغمگی اور سروں سے آراستہ نظمیں بھی نجمہ کی اس کتاب کا حصہ ہے۔

عجیب ہوتی ہے یہ محبت
مجھے جانا ہے جاناں کی طرف

دھشت گردی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ''نظم''

مگر میں کیسے پرسہ دوں
تو میں تقدیر سے پوچھوں

اور اس قبیل کی دیگر نظمیں نجمہ کی شاعری میں رنگ بھرتی نظر آتی ہے۔تمہاری شاعری پڑھ کر مجھے تم سے کیوں ملنا ہے اس سوال کا جواب مل گیا ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہاری شاعری میں پایا تھا۔

تمہارے بارے میں بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں مگر وقت کی کمی کی وجہ سے صرف اتنا کہوں گی۔ کہ ''پھول خوشبو اور تارہ'' نے مجھے تمہاری ذات سے روشناس کروایا ہے۔ بے شک تم بھی بین الاقوامی ادب میں رونما ہونے والی نئ شعری تحریکات سے آگاہ ہو۔ تمہارے خیال کا کینوس وسیع ہے۔فکری گہرائی کے ساتھ پختگی بھی ہے۔ جو تمہیں تمہارے ہم عصر شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔ وادی شعر و سخن ایک کانٹوں بھری وادی ہے جس میں کانٹے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی آبلہ پا آئے اور اُن کی پیاس بجھائے، تم اب ان کانٹوں کی پیاس بجھانے کا کتنا حوصلہ رکھتی ہو اور کب تک اس وادی پر خار میں سفر کر سکتی ہو یہ تو وقت بتائے گا۔مگر تمہاری شاعری میں موجود توانائی تمہیں مائل بہ سفر رکھے گی اور قارئین کو اچھی شاعری پڑھنے کو ملتی رہے گی۔ بہت سی نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ اس نئی کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ میں بانہیں پھیلائے اپنی بیٹی سے ملنے کی منتظر ہوں۔

اے کہ تو عکسِ نو بہار

سعیدہ افضل، کراچی

جب میں نجمہ شاہین کھوسہ سے پہلی بار ملی تو معلوم نہ تھا کہ پُھول جیسی یہ نازک سی شاعرہ اتنی توانا اور بھرپور شخصیت کی مالک ہوگی۔

پہلی ملاقات اُسکے کلینک جان سرجیکل ہسپتال میں ہوئی تو سوچا تھا کہ نجمہ ایک معروف ڈاکٹر ہے اور اسکا وقت بہت قیمتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس، پندرہ منٹ بات ہوسکے گی۔مگر اُس روز ہی جب اُس نے مجھے ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کا مسودہ دکھایا تو اُسے پڑھ کر میری آنکھیں کُھل گئیں۔

اس قدر مشکل پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود کتنی یکسوئی کے ساتھ اُس نے اپنے جذبوں کو بہت باوقار طریقے سے مرصع مصرعوں کی صورت میں قلمبند کیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ خوش رنگ پُھول جیسی ہنستی مسکراتی نرم ونازک یہ پری چہرہ کرب واضطراب سے بھرے کتنے رت جگوں کا بوجھ اپنی پلکوں پر لئے بیٹھی ہے۔

یہ تو ثابت ہے تخلیق کے لئے اضطراب کو جھیلنا شرط اولین ہے اور ان اضطراب بھرے رت جگوں کو جھیلنے کا حوصلہ اللہ تعالیٰ صرف اپنے اُن بندوں کو عطا کرتا ہے جن کو وہ ہنر کی میراث بخشنا چاہتا ہے۔

پھر تو باتیں ہوتیں گئیں اور وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔

نجمہ تم اتنی مصروفیت میں کیسے شاعری کا جوکھم سر لیتی ہو؟ میں نے سوال کیا......

جواب ملا......آپا......بس لکھ لیتی ہوں کوشش نہیں کرتی اشعار خود بخود ذہن میں آتے ہیں اور

آپ کو یہ جان کر......شاید حیرت ہو کہ میں عشاء کی نماز ختم کر لینے کے بعد بھی مصلے پر بیٹھی رہتی ہوں پھر سوچیں آتی جاتی ہیں اور میں انکو اشعار کی صورت لکھتی جاتی ہوں۔

کبھی آدھی رات تک......کبھی صبح تک......تب مجھے لگا جیسے......اس کو اپنی ذات کی تلاش کے ساتھ ساتھ اُس منعیم کی تلاش ہے۔ جو اسکی بے قرار روح کو سکون اور طمانیت کی دولت بخش دے۔ پھر تو مجاز اک بہانہ ہوا......کہ

بقول علامہ اقبال......

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اصل بات تو ہے صداقت مطلق کی تلاش......

یہ اضطراب یہ درد اور یہ بے چینی......؟ جلد ہی پھر اسکا شعری مجموعہ......''اور شام ٹھہر گئی'' منظر عام پر آ گیا......تو اسکی کہی ہوئی بات کا حسن اور بھی نکھر کر سامنے آیا۔ مجھ کو اسکی شاعری میں اُسکی اپنی خوبصورت شخصیت کی مکمل شبیہ دکھائی دی۔ اسکے اندر کی چہکتی مہکتی جذبات کی دنیا......اُسکی سلگتی سوچوں کا الاؤ......ہجر کے درد اور وصال کی مہکاریں......یہ خزانے جو اُسکے متوازن ذہن کا اثاثہ تھے وہی اسکی شاعری کی اساس بنے......غزلیں......نظمیں گیت اور رت جگے بے شک......اُس نے اپنی اِس ریاضت کو عبادت کا درجہ دے دیا ہے۔

اس سے بڑھ کر میری وفا کا کوئی نہیں گواہ
غزلیں نظمیں......سجدے آنسو اور اک شبِ سیاہ

کسی کے فن کو پرکھنا آسان بات نہیں مگر کسی کی شخصیت کے بارے کچھ کہنا اور زیادہ مشکل امر ہے۔ نجمہ بڑی خوش قسمت ہے کہ اس کو قلم کا ہنر ودیعت ہوا......وہ کتابی نہیں ایک پیدائشی شاعرہ ہے اور یہ وصف اُسے خالق کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ سچ کہنے کا حوصلہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے اور سچے فنکار کو سچ کا زہر سقراط کی طرح پینا پڑتا ہے۔ نجمہ شاہین کے اشعار پڑھ کر اور اس سے ملکر ایک جیسا احساس ہوتا ہے کہ سچ اُسکی شاعری ہے اور سچ ہی

اُسکی شخصیت کا خاصہ ہے۔

وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ایک کامیاب ڈاکٹر بھی ہے اُسکے کلینک میں جو معصوم بچے پہلی سانس لیتے ہیں وہ انکی امانت دار ہوتی ہے۔ اپنے پیشے کے لحاظ سے بھی اُسکا ہنر قابل قدر و ستائش ہے کیونکہ جب کوئی معصوم وجود اس دنیا میں آتا ہے تو رب عظیم اپنی تخلیق کردہ کائنات میں خوشیاں بانٹ رہا ہوتا ہے۔

جس دم وہ ان ننھے منے معصوموں کو سلامتی کی ساتھ اُن کی ماؤں کی گود کے سپرد کرتی ہے تو بقول نجمہ...... اُس کا دل، روح اپنے خالق کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اُسکی زندگی میں اکثریت سے ایسے لمحات آتے رہتے ہیں کہ عدم سے وجود میں نئی زندگی جب آتی ہے تو بے اختیار دل کی گہرائیوں سے یہ آواز آتی ہے۔

''اے رب العرش عظیم تُو بے شک بیکراں عظمت و طاقت والا ہے''

واقعی، انسان نے خالق کو اُسکی بیکراں عظمت وقدرت سے ہی پہچانا ہے۔

وہ کہتی ہے......

''ہم ڈاکٹر لوگ دن رات...... زندگی اور موت کے کھیل میں...... معجزے ہوتے دیکھتے ہیں۔ کبھی مرنے والا مرتے مرتے جی اُٹھتا ہے اور کبھی اچھا بھلا...... جیتا جاگتا انسان پلک جھپکتے اس دنیا سے معدوم ہو جاتا ہے تب ہمارے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے...... بتا نہیں سکتی...... بے شک ایک ڈاکٹر اُس وقت خدا سے بہت نزدیک ہو جاتا ہے۔''

نجمہ شاہین کھوسہ پھول سی خوش رنگ اور تتلیوں جیسی نرم و نازک سہی مگر فولاد جیسی مضبوط "Will Power" بھی رکھتی ہے جو انسان کو اسکی منزل تک لے جاتی ہے۔ اپنی تمام تر نزاکت کے باوجود وہ راہ میں تھک کر بیٹھ جانے والی مسافر نہیں کیونکہ اسکو اپنے سفر سے عشق ہے اور وہ سچ کی تلاش میں سرگرداں ہے...... اور سچ تو یہ ہے کہ اسکی شخصیت میں اسکی شاعری اور اُسکی شاعری میں اُسکی شخصیت کے سب ہی رنگ ملتے جلتے ہیں مگر ان رنگوں میں اُسکا اپنا رنگ...... سب سے جدا ہے...... نجمہ شاہین کو سمجھنے کے لئے اسکی شاعری کو سمجھنا

ضروری ہے...... تحریر ہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ادیب کی شخصیت کے بہت سے پوشیدہ پہلو خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ صد شکر کہ وہ جو کہنا چاہتی ہے اُسے برملا کہنے کی جرات رکھتی ہے۔ میری نظر میں وہ ایک جراتمند لڑکی ہے مگر اُسکے اپنے الفاظ میں وہ یوں رقم طراز ہے......

''کیا شاعری وہ سب کچھ کہہ سکتی ہے۔ جو کہا جانا چاہئے......؟ ان سنگلاخ درد کے پہاڑوں سے گزرتی اپنی ناتواں جان پر تندو تیز ہواؤں کے طوفان برداشت کرتی کرب کی ان مسلسل راتوں کی کہانی...... یہ بے یقینی اور مایوسی کے دُھول میں اٹی ہوئی بے خواب راتوں کی کہانی...... یہ رت جگوں کے عذاب، اندھی راتوں کی کہانی......؟''

گویا کہ اس کے اندر کے دردوالم اور کرب و اضطراب قوت اظہار سے بڑھ کر ہیں شاعری کے وسعت داماں بھی تنگ پڑ جاتے ہیں۔ تبھی......

''وہ اپنی ذات کی تنہائی اور دکھ کے لامحدود صحرا میں اکیلے پن کا سفر طے کرتے ہوئے سوچتی ہے،، اس اُجاڑ سفر میں اُسکا ساتھ کون دے۔ سوائے اپنے دکھ اور تنہائی کے۔''

اُسے کسی ہمدرد غمگسار چارہ گر کی تلاش ہے؟ یا پھر...... اُسکے سلگتے جذبے...... تپتے آنسو...... ہجر و فراق کی ریاضت اور تمنائے وصال کی عبادت؟ انجانے کتنے رت جگے ابھی اور اُسکے منتظر ہیں اور نجانے کتنی ریاضت اور عبادت کی ضرورت ہے کیونکہ یہ سفر ابھی جاری ہے......

''گئی رُتوں سے یادوں کے چراغ جلا کر جذبوں کی محفلیں سجانے اور محفلوں سے گلاب اُگانے کا...... استعارہ......؟''

''اپنے بے ربط و بے ترتیب بہہ جانے والے آنسوؤں سے ان گلابوں کو سراب کرنے اور ان سرابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے روشنیوں سے سیاہی بنا کر اپنے لفظوں کو شاعری کی صورت صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کا جوکھم''

شاعری کے اس سفر میں وہ دھیمے دھیمے لہجہ میں بولنے والی نرم خو، جس کی شخصیت

میں قرینہ......طریقہ......سلیقہ اور حسن توازن بہ درجہ اتم موجود ہے اور یہی اوصاف اسکی شاعری میں ہنرمندی کے ہیں...... میں اسکی شاعری کو اسکی شخصیت سے جُدا نہیں دیکھتی مگر بطور ایک ماں، ایک باوفا بیوی اُسکے انداز دلکش مشرقی روایات سے مزین ہیں جہاں وہ باحیا ......نرم خو ذمہ دار اور بالحاظ ہے وہاں وہ نرم دل بھی ہے۔ ایک روز اس نے باتوں باتوں میں بتایا'' آپا......ایک صحافی صاحب جو نامور اخبار سے وابستہ ہیں انہوں نے مجھے فون کر کے انٹرویو کے لئے ٹائم مانگا اور ساتھ ہی اپنی ایک عزیزہ کی شادی کے لئے امداد بھی مانگ لی۔ کسی کی بچی کی رخصتی میں مدد کرنا نیکی ہے یہ سوچ کر میں نے ان کو دس ہزار روپے بھجوا دیئے۔ مگر انٹرویو کا عندیہ نہیں دیا......آج پھر ان صاحب کا فون آیا ہے اور انٹرویو کے ساتھ ساتھ مزید رقم کا مطالبہ کیا ہے......ان حضرات سے کیسے جان چھڑاؤں؟ میں نے کہا نجمہ......اگر کہو تو میں ان کے باس کو بتاؤں اُسکی نوکری چلی جائے گی۔

کسی کی نوکری جاتی ہے تو نہ کہیئے گا......آپا میں کسی کو بیروزگار نہیں کرنا چاہتی شاید بال بچے دار ہو......اچھا چھوڑ یئے......میں اب اُسکا فون ہی نہ اُٹھاؤں گی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شخصیت کا یہ پہلو بہت سوں کی نظروں سے اوجھل ہوگا مگر مجھے معلوم ہے وہ وسیع دل رکھتی ہے سخی ہے اور معاف کرنا بھی جانتی ہے۔ وہ چپکے چپکے ضرورت مندوں کی مدد کرنے کی قائل ہے لہٰذا بہت سوں کی دعائیں اُسکے ساتھ ہیں۔ نیکی کا اجر دونوں جہانوں میں ملتا ہے یقیناً اُسکو اس دنیا میں بھی کامیابیاں اور پذیرائی ملے گی کیونکہ خلق خدا جس سے محبت کرتی ہے؛ خالق کی اس بندے پر خاص نظر ہوتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ نجمہ شاہین کی چوتھی تخلیق ''پھول خوشبو اور تارہ'' کتابی صورت میں آ گئی ہے۔ اس نے بہت کم وقت میں شہرت کی منزلیں طے کر لی ہیں جبکہ اس سفر میں ایک عمر لگ جاتی ہے۔ مجھ کو اس بات کی بھی خوشی ہے کہ وہ اب بھی اپنی کامیابیوں سے مطمئن نہیں ہے۔ ارتقا کے سفر میں اطمینان جمود کو جنم دیتا ہے اور مطمئن نہ ہونا ہی زیادہ کامیاب ہونے کی نشانی ہے۔ نجمہ! اللہ کرے زور قلم اور زیادہ......کہ اس حبس زدہ موسم میں عکس نو بہار ہو تم......

عورت اور عورت ہے

بشریٰ اعجاز لاہور

پھول، خوشبو اور تارہ کا مسودہ میرے ہاتھ میں ہے...... جسے دیکھتے ہوئے سنسکرت کے رومانی شاعر امارو کی نظم یاد آ رہی ہے......

جس کا عنوان......عورت اور عورت ہے......!
ابھی تھوری دیر ہوئی کہ وہ مجھے سدا کے لئے چھوڑ گیا
لیکن میں ہمت سے کام لوں گی
اور کوئی بھی میری ناامیدی کو دیکھ نہ پائے گا
میں مسکراتی ہوں
میں تو مسکرا رہی ہوں
تمہاری مسکراہٹ میں ویسی ہی اداسی ہے
جیسی اس صبح میں
جو کسی آتش زدہ گاؤں پر نمودار ہوئی ہو......

مجھے ڈاکٹر نجمہ کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی اداسی دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا......مگر پھول خوشبو اور تارہ کے مسودے کو دیکھتے ہوئے نجانے کیوں مجھے اس پر عورت اور عورت کا گمان گزرتا رہا......یعنی عورت کا عورت سے مکالمہ......!

عورت بھی وہ جو ڈاکٹر ہے، ماں ہے، فرماں بردار بیٹی اور بیوی ہے، مگر اس کی ذات کے کچھ حصے شاید ان تمام حیثیتوں کے درمیان ان بوجھے......ان کہے رہ گئے ہیں

ہم عورتوں کے ساتھ اکثر یہی ہوتا ہے بظاہر مکمل...... اندر سے ٹوٹی اور بکھری ہوئیں......کسی پرانے درخت کی جڑوں کی طرح درد کی زمین میں دور دور تک پھیلی ہوئیں......

کسی حل نہ ہو سکنے والے معمے کی طرح ان بوجھی......، پرانی حویلیوں کے دالانوں کے پیچھے دبکی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں جیسی......جن میں دن کو بھی اندھیرا ہی چھایا رہتا ہے......

سورج کی ایک بھولی بھٹکی کرن بھی نہیں جاگتی جن کے اندھے اندھیروں میں......

لہٰذا دن میں بھی چراغ جلائے بغیر وہاں سے کچھ ڈھونڈ نکالنا ممکن نہیں ہوتا...... یہی وجہ......اس نے شاعری کا چراغ جلالیا......اور ذات کی تاریک کوٹھڑی میں جا گھسی......

ابھی تک لوٹی نہیں......وہیں کھڑی کہہ رہی ہے......

جرم بس یہ تھا کہ منزل کا تعین کر لیا
پھر سدا رہنا پڑا ہم کو سفر کے درمیاں

اس سفر کی ابتدا کیسے ہوئی؟ بظاہر

ایک ڈائری سے جس میں چھپ چھپ کر وہ تمام ایسی باتیں لکھتی رہی......جو کسی سے کہہ نہ سکتی تھی......کسی کو سنا نہ سکتی تھی......

بھول جانے والی باتیں......اور بھول کر بھی یاد رہ جانے والی باتیں......! وہ باتیں جو راتوں کی تنہائیوں میں چاند کی اداسی کے کاغذ پر سرگوشیوں کی صورت لکھی جاتی ہیں......اور پھر ان سرگوشیوں کو دل کے پلو سے باندھ لیا جاتا ہے......احتیاط سے......

حفاظت سے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے......! پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا......

ڈائیری اسکی باقاعدہ راز دان بن گئی......بعد میں جب اس راز سے پردہ اٹھا تو......

انکشاف کی طرح......اسکی پہلی کتاب پھول سے بچھڑی خوشبو......سب کیسامنے آئی......بالکل ایسے ہی جیسے آج سے بیس برس پہلے میں نے ڈائیری میں سفرِ حج کے تاثرات رقم کئے تھے تو...... مجھ پر اک انکشاف کی طرح سفر نامۂ حج عرضِ حال اترا

تھا......اور مجھے......دفعتاً ادراک ہوا تھا......کہ میری ذات کے بہت سے ان کہے حصوں میں سے یہ صرف ایک حصہ تھا......اور یہ کہ ابھی زات کی تاریک کوٹھڑیوں میں انگنت چراغ جلنے کے منتظر ہیں......جو بعد میں آہستہ آہستہ جلتے چلے گئے......!

ایسے ہی جیسے......ڈاکٹر نجمہ کی ذات کی تاریک کوٹھڑی میں رکھا ہوا...... یہ چوتھا چراغ......جسکے متعلق خود ڈاکٹر نجمہ کہتی ہیں......اگر میں مصروف ڈاکٹر نہ ہوتی تو شاید اب تک میری پندرہ بیس کتابیں آ چکی ہوتیں......!

میں ڈاکٹر نجمہ کی اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں......کہ اپنی پروفیشنل لائف میں جس dedication سے وہ کام کرتی ہے۔

اور اپنی توانائی، اور توجہ جس طرح اپنے مریضوں پر پوری پوری نچھاور کر دیتی ہے۔اس کے بعد شاعری کو وقت دینا اور پوری دیانت داری سے اپنی ذات کی دریافت کے سفر پر روانہ ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ایسا وہی کر سکتے ہیں.جنہیں لگن لگی ہوتی ہے لگن خود کو بوجھنے کی......اپنا بوجھا ہوا..سلیقے سے زمانے کے سامنے پیش کرنے کی اور پورے وقار کے ساتھ......اپنے لکھے ہوئے ہر لفظ کو اون کرنے کی چاہے زمانہ کچھ بھی کہے کچھ بھی کرے......اور یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب کوئی تخلیق کار پوری سچائی سے خود کو بیان کرتا ہے اور اس ضمن میں کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتا......!

میں پہلی دفعہ جب ڈاکٹر نجمہ سے ملی تو یہ وصف میں نے اسکی ذات میں نمایاں دیکھا اس نے نہایت دھیمے لہجے میں پوری سچائی سے بتایا......اس کا تعلق جس قبیلے سے ہے......وہاں دور دور تک شاعر تو کیا ڈاکٹر بھی کوئی نہیں......!اور یہ کہ اس قبیلے کی

لڑکیاں آنکھیں بند رکھتی ہیں......!
انہیں آنکھیں کھولنے کی اجازت نہیں......
انکی زندگیوں کے فیصلے دالانوں اور حجروں میں بیٹھ کر گھر کے مرد کیا کرتے ہیں......
انہیں صرف اطلاع دی جاتی ہے......

اوراس اطلاع کے ہمراہ یہ ہدایت ایک وارننگ کی طرح نتھی ہوتی ہے......

کہ سرخ جوڑا پہن کر ڈولی چڑھنا تو جاتے ہوئے اپنے قدموں کے نشان مٹاتی جانا......!

سو اس نے بھی ایسا ہی کیا......ڈولی چڑھی تو مڑکر پیچھے کبھی نہ دیکھا......

سفر مسلسل سفر......قیام کہیں نہیں......

اس سفر میں اسکی روح پر کیا گزری، اس کے دل نے کیا کچھ سہا......

اور ایک حساس انسان ہونے کی وجہ سے زندگی کا مشاہدہ کیسا رہا......

اسکی شاعری یہ سب کچھ تو نہیں بتاتی البتہ......اتنا ضرور کہتی ہے......

کہ اک ہمہ وقت اداسی اور تنہائی اس کے ہمراہ رہی......جس سے اس کا ہمیشہ مکالمہ رہا......اس وقت بھی جب وہ شب کی آخری ساعتوں میں خود سے ہم کلام ہوئی اور اسوقت بھی...... جب کسی بھیڑ بکری نما عورت کی ڈوبتی نبضوں کو بحال کرنے میں اسکی مسیحائی نے اپنی پوری قوت لگا دی......اس وقت بھی جب وہ اپنی پہلی نظم......ملاقات آخری لکھتے ہوئے، درد کی اک اچھوتی واردات سے گزر رہی تھی......اور اس وقت بھی...... جب عمر اور حمزہ نے اس کی گود میں آکر اسے ماں بننے کی آسودگی سے ہم کنار کیا تھا......کہ ہر آسودہ اور ناآسودہ جزبے کا تعلق انسان کی جزباتی دنیا سے ہے......اور

ایک سچے تخلیق کار کی جزباتی دنیا کم وبیش ایسی ہی ہوتی ہے ...... ہمہ وقت زیروزبری......جس کا کسی ایسی کیفیت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں......جس میں ٹھہراؤ ہو......

اور آرام جیسا کوئی احساس ہو......

ہمہ وقتی اضطراب اور بے چینی، جس کا اظہار ڈاکٹر نجمہ کی شاعری ہے......حالانکہ بظاہر اس کی ذات میں ٹھہراؤ بھی ہے......اور آرام بھی......مگر زیریں سطح پر دبا دبا احتجاج، چھپی چھپی بغاوت......صاف دکھائی دیتی ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر نجمہ نے نہایت عقلمندی سے اس احتجاج، اس بغاوت کو سات پردوں میں چھپایا ہوا ہے مگر اسکی شاعری اس کا چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہے......

اور وہ کہتی ہے۔

سانس لینے سے بھی اکثر روک دیتے ہیں ہمیں
جان لیوا ہو چلا ہے خیر خواہوں کا حصار

اور

دشمنوں سے تو مجھے خوف نہیں تھا لیکن
رہ میں اپنوں کی مگر گھات، نہ پوچھو میاں

وہ محبت کی شاعر ہے۔

ہر شاعر محبت کا شاعر ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ محبت جنسِ مخالف کی ہو۔

مخلوقِ خدا کی......یا پھر خود خدا کی......

کہ شاعر کی تخلیقی کائنات میں نفرت کی کوئی جگہ ہی نہیں......

وہ محبت کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ یہ محبت تمام مضامین میں اسکی ہم رکاب ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ کی شاعری میں یہ محبت ہجر کے گاڑھے شیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اسی لئے ٹپ ٹپ ٹپکتی ہے......پورے پکے ہوئے آم کی طرح......

آدھے ادھورے آنسو کی طرح......

اس موتی کی طرح

جسے سیپ کسی بے اختیاری لمحے میں سمندر سے اچانک اگل دیتی ہے......!

میں نے اس کی شاعری میں جا بجا یہ کیفیت محسوس کی ہے۔ جس کی آنچ میں کبھی وہ شعر پرورہی ہے اور کبھی نظم بن رہی ہے۔

یہی کیفیت سچی شاعری کا جوہر ہے۔ جسکے بغیر نہ تخلیق مکمل ہوتی ہے، نہ تخلیق کار......ڈاکٹر نجمہ جس عمدگی سے اس کیفیت کو اپنی شاعری میں سمو رہی ہیے۔ اسے دیکھتے ہوئے اس کے شعری سفر کی کامیابی کی امید روشن لگنے لگتی ہے۔ میری دعا ہے وہ اس سفر میں

اس مقام پر پہنچ جائے۔ جہاں پہنچ کر منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔اور مسافر تمام تر تھکن کے باوجود سرشاری جیسی کیفیت میں یہ کہہ اٹھتا ہے۔

نہیں ملوں گی کسی بھی وصل آشنا سفر میں
میں ہجر موسم کی شدتوں میں تمہیں ملوں گی

اب بتائیں ایسے شعر کہنے والی شاعرہ کی شاعری پر مجھے عورت اور عورت کا گمان کیسے نہ گزرے......اور اس کی مسکراہٹ اس مسکراہٹ سے مشابہ کیونکر نہ لگے......جو کسی آتش زدہ گاؤں پر اچانک نمودار ہوتی ہے! ہو جزبے، ہر اظہار میں نمایاں ہے..وہ ہے اس کا عورت ہونا......

سچے جذبوں کی شاعرہ

. تغرید محمد البیومی مصر الازہر یونیورسٹی

نجمہ شاہین چونکہ ایک حساس پاکستانی شاعرہ ہیں، اس لیے وہ ہمیں نظموں کے ذریعے پاکستانی ثقافت اور تہذیب سے متعارف کراتی ہیں جو ہمیں رومانس کے سمندر میں غرق کر دیتی ہیں۔شاہینؔ کی شاعری ان کے مخصوص طرزِ احساس کا وہ آئینہ ہے وہ زبان و بیان کے حوالے سے بلا شبہ نوجوان نسل کا نمائندہ شاعرہ ہے ۔ نجمہ صاحبہ میری نوجوان دوست ہیں اور علم وادب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں ان کا مجموعہ کلام میں سچے جذبوں کی شاعری کی ہے ,ہر نوجوان کی طرح ان کے اس اولیں مجموعے کا مزاج رومانوی ہے ,اس تخلیقی رویہ نے ان کے الفاظ کو داخلی حسن سے آراستہ کیا ہے:

ترے فراق میں جیے ترے فراق میں مرے
چلو یہ خواب ہی سہی ، وصال کا گماں ملے

الم کی شام آ گئی ، لو میرے نام آ گئی
چراغ لے کے راہ میں اے کاش مہرباں ملے

یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ انتخاب کرنے والے کے پیشِ نظر سب سے پہلا اصول اس کی ذاتی پسند کا ہوتا ہے اور میں خود بھی دس سال تقریباً تک یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ذاتی پسند کو اس معاملے میں بہت دخل ہے

نجمہ صاحبہ بہت سیدھا سادھا بھولا بھالا اور لاابالی قسم کا انسان ہے۔اس کی سادگی

اور طبعی معصومیت اس کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔

نجمہ شاہین چونکہ ایک حساس پاکستانی شاعرہ ہیں، اس لیے وہ ہمیں نظموں کے ذریعے پاکستانی ثقافت اور تہذیب سے متعارف کراتی ہیں جو ہمیں رومانس کے سمندر میں غرق کر دیتی ہیں۔ شاہین کی شاعری ان کے مخصوص طرزِ احساس کا وہ آئینہ ہے وہ زبان و بیان کے حوالے سے بلا شبہ نوجوان نسل کا نمائندہ شاعرہ ہے . نجمہ صاحبہ میری نوجوان دوست ہیں اور علم و ادب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں ان کا مجموعہ کلام میں سچے جذبوں کی شاعری کی ہے , ہر نوجوان کی طرح ان کے اس اولیں مجموعے کا مزاج رومانوی ہے , اس تخلیقی رویہ نے ان کے الفاظ کو داخلی حسن سے آراستہ کیا ہے:

نرے فراق میں جیئے ترے فراق میں مرے
چلو یہ خواب ہی سہی ، وصال کا گماں ملے

الم کی شام آ گئی ، لو میرے نام آ گئی
چراغ لے کے راہ میں اے کاش مہرباں ملے

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہیں کا یہ تازہ ترین شعری مجموعہ اچھے اور باذوق قارئین کو مایوس نہیں کرے گا، اور میرے خیال میں نجمہ شاہیں ایک بہترین شاعرہ ہیں اور میرے دل کی صداقت احساس اور خلوص اظہار اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں اور میرا خیال ہے شاعری کے لئے فقط خصوصیات کا ہونا ہی لازمی ہے۔

شاعروں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

نجمہ شاہین عشق کی مفسر

وفا یزدان تہران ایران

ڈاکٹر نجمہ شاہین اور میری نگاہیں پہلی دفعہ ملیں، اسی وقت سے ہماری پکی دوستی بنی، ایسا کہ ہم بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات سے بخوبی آشنا ہیں۔ ہمارا ملن شاعری کے ذریعے سے ہی ہوئی۔ استنبول میں بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی اک رات مشاعرہ میں ان کی شاعری سن لی، عشق پر جیسا انہوں نے نظم "عجیب ہوتی ہے یہ محبت" سنائی، میں کافی متأثر ہوئی اور اپنا تاثر ان کو اظہار کیا۔ ہمارا رابطہ ہوتا رہا، ان کی شاعری پڑھتی سنتی آئی۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ان کا یک اور مجموعہ منظر عام پر آ رہا ہے اور اس سے بڑھ کر خوشی اس بات کا ہے کہ میرا تاثر بھی اس مجموعے میں شامل ہو رہا ہے۔

جیسا ہر فن پارہ اپنے تخلیق کار کی شخصیت، سوچ اور مجموعی طور پہ ان کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے پھر فن پارہ کی جانچ پڑتال میں اس کے صاحب تخلیق کے سوانحی حالات کی پرکھ ضروری ہے البتہ اس میں غیر جانبدارانہ احساسات و خیالات سے پرہیز کرنا بھی اولیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس مختصر تحریر میں نجمہ شاہین کی شاعری خاص طور پہ اس مجموعے کے بارے میں اپنے خیالات کو بروئے کاغذ لاتی ہوں۔

نجمہ شاہیں کے اس مجموعے میں دو چار ایسی غزلیات اور نظمیں ملتی ہیں جو مذہبی اور معاشرتی پہلو رکھتی ہیں، مگر ان کی شاعری میں عشق کا جذبہ مرکزیت رکھتا ہے، کہیں کہیں یہ عشق مامتا کی حیثیت کرتا ہے کہیں نجی وجود کے کونے سے اٹھ کر الفاظ میں پھیل جاتا

ہے بہرحال نجمہ شاہین کے یہاں عشق کی قداست ہوتی ہے جو ازل سے ابد تک، ابد سے ازل تک دنیا میں چھایا ہوا ہے۔ جب وہ عشق کی بات کرتی ہیں، کائنات ان کے ساتھ ہم نوا ہوتی ہے۔ نجمہ شاہین کی شاعری کو ایسے جھروکے گھیرے ہوتے ہیں جن سے عشق کی روشنی پڑتی ہوتی ہے اور ہر لفظ کی گہرائی تک جا بستی ہے۔ اس لیے ہم بھول جاتے کہ کوئی شاعرہ ہم سے ہم کلام ہو کر اپنے جذبات کا بیان کر رہی ہوتی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ عشق کی تفسیر ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ وہ عشق جو انوکھے گوہر کی طرح گنجینہ میں چھپا ہوا ہے جو خوش قسمت لوگوں کو مل جاتا ہے اور پھر ان کی روح و جان کو تراشتا ہے اور ان کو معنویت سے ہمکنار کرتا ہے۔ نجمہ شاہین کی شاعری میں یہی عشق بولتا جا رہا ہے، یہ عشق کبھی جس دل میں بسے ہوتا ہے تو اس کو امید کا دامن چھوڑنے نہیں دیتا، وہ ہجر کی رت میں بھی مہکتے ہوتا ہے، احساس میں سجے ہوئے رنگ کے بغیر کسی رنگ کو ملوث ہونے نہیں دیتا۔

دعائیں ساری، وفائیں ساری تمہاری ہی نام کر چکے ہم
سنیں گے اب کس سے ہم محبت کی داستان، تم چلے گئے ہو

اس پورے مجموعے میں عشق مسلسل سفر پر جاری ہے اور اپنے مسافر کو ساتھ چلے لے آتا ہے آگے کی طرف اور ہر موڑ میں رکاوٹوں سے پوری طاقت کے ساتھ لڑتا دکھائی دیتا ہے، شاعرہ تھکی بھی ہوتی ہو مگر عشق تھکا نہیں ہوتا اور وہ اپنے اعجاز کا مظاہرہ کرتا ہوتا ہے۔

میں اس طرح سے ہوں آزاد اپنی دنیا میں
کہ جیسے کوئی پرندہ آشیاں میں رہتا ہے

نجمہ شاہین خلا کا محسوس بھی کریں مگر اپنی قدر کو کھونے نہیں دیتی ہیں کیونکہ وہ ایک پرخلوص عشق سے بھرپور ہے اور وہ عشق کی امانتدار ہیں اور یہ امانتداری ہر کوئی اٹھا نہیں سکتا۔

پھول، تتلی، جگنو، تارہ کی شاعرہ

ڈاکٹر راشدہ قاضی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ حسن صورت و سیرت کے اعتبار سے ایک شاندار اور باوقار خاتون ہیں۔ میں ان کی شاعری کی زیریں سطح پر محسوس ہونے والا کرب اور دکھ کی دھیمی آنچ مجھے ہمیشہ اداس کر دیتی ہے۔ قیمتیں ملبوس اور متوازن میک اپ کے ساتھ مسکراتا چہرہ مجھے کئی نا آسودہ جذبوں کا عکاس لگا۔ بظاہر بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ مگر دل ہے کہ مانتا نہیں، کہ ان مہکتے پھولوں کے پیچھے کہیں ایک آنچ ہے، جو اس دلربا کو جھلسا رہی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے، کہ ان کا درد میرے پہلو . میں دل بن کر دھڑکتا ہے۔ نجمہ کی شاعری کی حساس بچی کبھی جگنو اور کبھی تارے کی آرزو کرتی ہے۔ مگر سب سراب ثابت ہوتا ہے۔ یہ پھولوں اور تتلیوں جیسی نازک خاتون آبگینہ ذات کو بچانے کی آرزو میں اپنا نسائی غرور جب پارہ پارہ ہوتے دیکھتی ہے، تو کبھی ٹوٹے دل کی فریاد نظم بنتی ہے اور کبھی غزل، اور درد حد سے گذر جائے تو اپنے لیرکتیر جذبوں کی شیرازہ بندی کر کے اپنے سچے سائیں کو آواز دیتی ھیں۔ مگر ان کے آنگن کھلنے والے پھول کبھی حمزہ بن کر ان کو ڈھارس دیتے ہیں، اور کبھی وہ عمر کے ساتھ چلنا سیکھ لیتی ہیں۔ ان کے وجود کی کرنیں جب لوگوں کی آنکھں کو چندھیا دیتی ہیں . تو لوگ دبی دبی زبان میں اپنی نا آسودہ خواہشات کے سبب لرزتی انگلیاں دانتوں تلے دبتے ہیں۔ کہ ان کے پاس بچوں کا مضبوط حصار اور شوہر نام کی چھت ھے۔ میاں بیوی کے اس کے رشتے میں عجیب سی کشمکش ہوا کرتی ہے۔ شوہر اپنی مردانگی کی وجہ سے ذہین عورت کو بہت کم برداشت کرتا ہے۔ ایسے میں ذہین عورت کو کئی بار جینا اور کئی بار مرنا

پڑتا ہے۔اگر یہ رشتہ برقرار ہے تو یقیناً اس میں بڑے سمجھوتے ہوئے ہوں گے۔ایسے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو بے اختیار داد دینے کو دل کرتا ہے۔کیوں نکہ انہوں نے رشتوں کا تقدس اور بھرم ہمیشہ قائم رکھا۔زمیندار گھرانوں کی بے جوڑ شادیاں عموماً عورت کے لئے طوق بن جاتی ہیں۔اور پھر مرد کے نام کی چھتری کا سہارا لے کر وعورت لحہ لحہ جیتی اور لحہ لحہ مرتی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے کتنے سمجھوتے کیئے۔مگر ان کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی۔ان کی حسین مسکراہٹ کے پیچھے نہ جانے کتنے غم دم توڑتے رہتے ہیں، اور وہ فیض کی ایک نظم کا مصرع بن جاتی ہیں۔ چلو پھر سے مسکرائیں۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ سے آرزو رکھتی ہوں، کہ وہ ذات کا دکھ کائنات کے دکھ کو ساتھ ملا کر فیض حاصل کرتی رہیں گی۔وہ سچے سائیں سے لو لگا ہی چکی ہیں۔تو دکھوں کا پروردگار یہ عہد ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔اور وہ یونہی پرورش لوح و قلم کرتی رہیں گے۔اور ذات و کائنات پر جو دکھ بیت رہے ہیں۔انہیں کاغذ اور قلم کے ساتھ دل پر رقم کرتی رہیں گی۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے لیے بہت سا پیار اور باوقار زندگی کے لیے بہت سی دعائیں۔

وسیب کی خوشبو، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

ڈاکٹر شاہینہ نجیب کھوسہ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ سے ملیں تو رنگ نظر میں اور خوشبو ہوا میں پھیل جاتی ہے۔ نازک جذبات اور خوبصورت احساسات کو لطف انداز اور مؤثر پیرائے میں بیان کرنے والی خوبصورت شاعرہ۔جس کو دیکھ کر پڑھ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ خود زیادہ خوبصورت ہے یا اس کی تحریریں!!!یقیناً دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

نجمہ سے میری شناسائی مدتوں سے ہے یہ شناسائی دوستی میں کب بدلی اِس بارے میں مَیں خود بھی نہیں جانتی۔بَس میں اتنا جانتی ہوں کہ نجمہ دوستوں کی وہ دوست ہے جو دوستی کی بنیاد محبت اور خیر خواہی پر رکھتی ہے۔

خوبصورت تو وہ ہے ہی مگر وہ ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت بھی ہے۔مردوں جیسی ماں، پیشہ وارانہ قابلیت کی حامل مسیحا، درد دِل رکھنے والی سوشل ورکر اور بلند پایہ لکھاری ۔ڈی جی خان میں اس کیا آنچل تلے چلنے والے آنچل تنظیم، جان سرجیکل ہسپتال اور بہت سی سماجی سرگرمیاں میرے اس دعویٰ کی گواہ ہیں۔

اس کی شاعری میں جو بات مجھے مبہوت کر دیتی ہے وہ سچے اور پیارے نسوانی جذبات کی وہ روانی ہے جو مشکل اور بھاری بھرکم الفاظ سے مزین نہ ہونے کے باوجود سادگی میں بھی اتنی مؤثر ہے کہ سیدھی دِل کو چھو لیتی ہے۔وہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کی طرح ہواؤں میں تحلیل نہیں ہوئی بلکہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کے مصداق مراقبے کی مشقت جھیل کر، معرفت کے راز پا کر، خود سے اور رب سے شناسا ہو کر ایک وجدانی کیفیت

میں داخل ہوگئی ''اور شام ٹھہر گئی'' دم بھر کو شام میں رُک کر وہ آگے بڑھ گئی اور ایک نئے انداز میں ''پھول، خوشبو اور تارہ'' کی صورت ظہور پذیر ہوئی۔ مگر کہاں صاحبو! ابھی بھی وقتِ قیام نہ تھا شاید وقت سجود تھا اور وہ ''میرا صاحب سائیں عشق ہے تو'' کا جھومر ماتھے پہ سجا بیٹھی، عشقِ حقیقی کے اس جھومر نے اس کے اندر اور باہر کو دلہن کی طرح سجا دیا۔

مجھے خوشی ہے کہ محبتوں اور خوشبو کے سفر کی مسافر نجمہ شاہین نے ہجر و وصال کو اپنا مستقل ٹھکانہ نہیں بنایا۔ مسافر سفر میں ہی اچھا لگتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ! تم بہت اچھی لگتی ہو، نظر کو خوب جچتی ہو دِل کو بھی بھلی لگتی ہو۔ یوں بھی مسافر کو جلدی منزل مِل جائے تو سفر رُک جاتا ہے۔ فن تھم جاتا ہے۔ اللہ نے جنہیں اونچی منزلوں تک پہنچایا ہو انہیں منزلوں سے دور کر دیتا ہے یا منزل کو ان سے دور۔ اور پھر منزل کو سفر میں ہی پوشیدہ کر دیتا ہے۔ نجمہ منزل سے دور ہو کر بھی منزل آشنا ہے۔ یہ مولا کا خاص کرم ہے اس پر کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے۔ نجمہ منزلوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے اور مکاں سے لامکاں ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو بخت آور ہو بھاگ بھری ہو نجمہ شاہین! سنگلاخ پہاڑوں کے سخت پتھروں میں کھِلا ہوا نازک اور خوبصورت پھول ہو جسے دیکھ کر انسان بے ساختہ کہہ اُٹھے۔ سبحان اللہ۔

مختصر یہ کہ محسن نقوی کی طرح ڈی جی خان کی پہچان ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ میری دعا ہے کہ زندگی نجمہ کو وہ سب دے جو نجمہ چاہے یا زندگی اسے جو بھی دے وہ نجمہ کی چاہت بن جائے۔ (آمین)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری اور نارسائی کے دکھ

پروفیسر بشریٰ قریشی

سنگلاخ پہاڑوں سے جڑا یہ شہر ڈیرہ غازی خان جس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین اسی دھرتی کی بیٹی ہے جہاں کبھی عورتوں کی منڈی لگا کرتی تھی۔ اگرچہ آج یہ بیوپار ظاہراً بند کر دیا گیا ہے مگر یہ بازار، یہ منڈیاں آج بھی سجتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب عورت کو جانور سمجھ کر خرید و فروخت کی جاتی تھی اور آج اس کی روح اور فکر کا سودا کیا جاتا ہے۔ اس نام نہاد تہذیب یافتہ معاشرے میں جہاں بیٹی ہونا جرم ہے، جہاں روایات کے سلاسل نے صنفِ نازک کے نرم و کومل جذبوں کو بری طرح جکڑ رکھا ہے وہاں اپنی سوچ کے مطابق راہیں متعین کرنا اور ان پر چلتے چلے جانا ڈاکٹر نجمہ جیسی جری بیٹیوں کا جہاد ہے کیونکہ اگر ایسے میں کوئی اس جبر و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے تو اس کی آواز ایسے ہوتی ہے جیسے کسی گونجدار چیخ کو گلے میں دبا دیا جائے۔ نجمہ نے بھی یہ صدا بلند کی تو محض سسکی ہی نکل سکی، وہ کہتی ہے:

میں ہنسنا بھول گئی ہوں
ان دکھ کی بھول بھلیوں میں
خوشی کے پل کہاں ٹھہرتے ہیں
سناٹا، وحشت، بدنصیبی
زندگی کی دھوپ دھوپ مسافت میں
سائبان تو رخ بدلتے ہیں

سائبانوں کے رخ بدلنے کا یہ درد اندر ہی اندر پی جانا اور اس دکھ کو لفظوں کی توانائی دے کر کبھی ''پھول سے بچھڑی خوشبو''، کبھی ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' اور ''کبھی دیئے کی لو'' کا نام دینا یقیناً قابل ستائش ہے۔

نجمہ کی شاعری خالصتاً اس لڑکی کی کتھا سناتی ہے جو اپنے قافلے سے بچھڑی کرلاتی کونج کی طرح زندگی کے رخ بدلتے دریاؤں کے ویران کناروں پر گھومتی پھرتی ہے اور اپنا آپ تلاش کرتی ہے۔ کبھی بند سیپ میں، کبھی دریا کی اتھاہ گہرائی میں اور کبھی ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں جو دریا کی موجوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ جب اس کی تلاش مکمل نہیں ہوتی تو نارسائی کا دکھ لفظ بن کر اس کے وجدان پر اترنے لگتا ہے، وہ کہتی ہیں۔

میں کیسے کروں بیاں اپنی نارسائی
عورت ہونے کی کیا میں نے سزا پائی
میں جو بیٹی، بہن اور ماں کا روپ ہوں
جو سچ پوچھو تو گود سے گور تک
ان رشتوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور
خود کے لیے کڑی دھوپ ہوں
میرے جنم نے میری ماں کو سوچوں میں الجھایا

اپنی ماں کی الجھی سوچیں انہوں نے معاشرے میں ایک باوقار مقام حاصل کر کے سلجھایا اور لوگوں کو یہ بات بتا دی کہ وہ اپنی ماں کے لیے ہی نسیمِ سحر نہیں بلکہ دلوں کو تسخیر کرنے کا ملکہ بھی رکھتی ہیں۔

ظاہری جمال اور باطنی حسن کا ملاپ جب بھی ہوتا ہے تو دنیا کو صدیوں یاد رہتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ کی شخصیت اور فن اسی وصال کا مظہر ہیں وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دوسرے لوگوں کے لیے مثالی بن جاتے ہیں۔ چاہیے وہ وصل کی گھڑیاں ہوں یا ہجر کے لمحات، ہجر کے لمحوں میں تنہائی کے دکھ کو محسوس کر کے اپنے اندر اتارنے والے یہ لوگ زندگی

کے جس شعبہ میں قدم رکھتے ہیں اپنے پورے قد اور وقار سے کھڑے ہوتے ہیں۔ چاہے ان کے اندر جدائی کا غم ناسور بنا ہو یا تنہائی کا آسیب ان پر حاوی ہو وہ کسی بات سے نہیں گھبراتے۔ نجمہ کی شخصیت ایسے لوگوں میں سے ایک ہے۔ وہ کہتی ہے۔

زندگی کا قافلہ، دشتِ پتاں میں ہے رواں
سربسر جوشِ نمو، میں اور میری زندگی

موسمِ ہجراں سے ہے شاہینؔ اس دل کی بہار
چشمِ تر کی آبرو میں اور میری زندگی

وہ وقت کے اشہب پر سوار ترقی کی ساری منازل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر اپنے حساس دل کو جذبوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ انہیں مصروفیت کا سیلِ رواں محض مٹی کا پتلا نہیں بنا سکا۔ ان کی سوچیں بنجر نہیں، ان کی فکر اپنے تمام دکھوں سے لڑتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ وہ یہ بھی مانتی ہیں کہ:

وادیوں میں دل کی اب خاموش سی اک شام ہے
دشت میں کھو ہی گئیں وہ شدتیں مہکی ہوئیں

لیکن اگلے ہی لمحے وہ اس کیفیت کو پیچھے چھوڑ کر تسکین کی تلاش میں اس پڑاؤ سے آگے نکل جاتی ہیں۔ اسی بات نے ان کے سخن کو ٹھہرے پانی کی بجائے ایک مترنم، بہتا جھرنا بنا دیا۔

میں اکثر سوچتی تھی کہ بدن سے روح تک کی مسیحائی کے جس دشتِ بیکراں میں ڈاکٹر نجمہ شاہین نے قدم رکھا ہے کیا وہ اس کے ساتھ انصاف کر پائیں گی۔ لیکن دوسرے مطبوعہ شعری مجموعے ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' اور تیسرے زیرِ طبع شعری مجموعے ''دیئے کی لو'' نے میری سوچ کی یکسر نفی کر دی اور یہ واضح کر دیا کہ کٹھن راستے کے سفر کے لیے محض جذبے، جنون، جوش اور ولولے کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے پاس موجود ہے اور انہیں

اس بات کا ادراک بھی ہے۔ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

گلہ نہیں ہے جو ابر نیساں بغیر بر سے گزر گیا ہے
میں اپنے اشکوں کی آبجو سے گلاب صحرا میں بو رہی ہوں

اپنے اشکوں سے صحرا میں گلاب بوتی یہ بولتی آنکھیں جذبوں کی ساری کہانی بے دھڑک سناتی چلی جاتی ہیں اور ان کی یہ کہانی سننے والا ہر شخص سحر زدہ رہ جاتا ہے۔وہ اپنے عہد کے سارے دکھ، ہجر و وصال کی ساری کلفتیں اور ناقدری کے سبھی احساس سمیٹے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہےاورزیادکتعاں بھی:

ابھی تو پینا ہے زندگی کو یہ زہر کا جامِ آتشیں بھی
کہ ریزہ ریزہ وجود میرا بکھر بکھر کے سنبھل رہا ہے

بولتی آنکھوں والی شاعرہ

بشریٰ قریشی

نجمہ شاہین۔ بولتی آنکھوں والی اس لڑکی نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کالے روہ کی بنجر اور پتھریلی زمین پر اُگنے والے یہ پودا ایک تناور درخت بنے گا اور اپنی شاخیں کوسوں دور تک پھیلا لے گا۔طب اور ادب کے میدان میں نمایاں مقام بنانے والی ڈاکٹر نجمہ شاہین ہمارے علاقے کی وہ خوش قسمت تخلیق کار ہے جسے محسن نقوی کے بعد ادب اور ادب شناس لوگوں کی دنیا میں بے انتہا پذیرائی ملی اور کیوں نہ ملتی اس نے اپنے پہلے شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' سے ''اور شام ٹھہر گئی'' تک شعری پختگی کا سفر بہت جلد طے کیا۔

آج کی جدید دنیا جو باکمال لوگوں سے بھری ہوئی ہے میں اپنا آپ منوانا اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنا ناقابل تسخیر مقام بنانا ان کی قابلیت کا مبین ثبوت ہے۔ میں مارکیٹ میں اس کا پہلا شعری مجموعہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ طب کی دنیا سے تعلق رکھنے والی یہ خاتون سراپا غزل تو ہے ہی غزل گو بھی ہوگئی۔ یہی نہیں شاعری کے افق پر طلوع ہونے والے اس نئے ستارے کے متعلق مختلف چہ میگوئیاں بھی سننے کو ملیں بلکہ ایک دن شہر کے کچھ لوگوں کے ساتھ تبصرے میں میں بھی شامل ہوگئی کہ ان اشعار کا خالق کوئی اور ہی ہے لیکن ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' شاعرہ کے دوسرے شعری مجموعے نے میری آنکھیں کھول دیں کہ یہ تخلیق کا سونا اس کی اپنی روح سے ہی پھوٹا ہے۔تیسرے مجموعے اور ''شام ٹھہر گئی'' نے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ نجمہ واقعی باکمال شاعرہ ہے جو خونِ جگر سے لفظوں کو سینچنے کا فن جانتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر مری وفا کا کوئی نہیں گواہ
غزلیں، نظمیں، سجدے آنسو اور شبِ سیاہ

ایک حساس اور کرب سے گزرنے والے انسان کی طرح وہ شاعری میں نہ صرف اپنے بلکہ دنیا کے دکھوں کو بھی محسوس کرتی ہے۔اسی لیے وہ کہتی ہے۔

درد میرا بیاں ان سے کب ہوسکا
شعر خاموش تھے شاعری چپ رہی

انسان کی زندگی ان گنت چیزوں سے عبارت ہے۔زیست کی راہ پہ چلتے ہوئے ناپسندیدہ اور ناگزیر رشتوں کو چھوڑتے اپناتے رہتے ہیں۔جسطرح پھول کے بغیر خوشبو کا وجود کا تصور بے معنی ہے۔اسی طرح دکھوں کے سوز کے بغیر خوشی کا ساز بے مزا ہوتا ہے۔ وقت اور حضرتِ آدم ازل سے ایک دوسرے کے حبیب ورقیب رہے ہیں۔نجمہ اس رفاقت اور رقابت کو بخوبی نبھاتی نظر آتی ہیں۔وہ کہتی ہیں:

کہیں پہ تارے کہیں پر ہیں آس کے جگنو
خزاں میں بھی میں گلوں کی فضا بناتی ہوں

اپنے ماحول اور اپنی سخت چٹانوں جیسی روایات میں راستہ بنانے کے لیے اس نے بغاوت نہیں بلکہ ایک مثبت راستہ اختیار کیا اور بلوچ قبیلے کی ایک بستی سے نکل کر ترقی کی وہ منازل طے کیں جو شہر میں بسنے والوں کے نصیب میں کم ہی آتی ہیں۔وہ اپنے علاقے سے آ تو گئی لیکن اپنی بستی کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پہ سنبھل سنبھل کے چلنے کا ہنر ساتھ لائی۔ وقت کے پتھریلے اور اونچے نیچے راستے اس کے پائے استطاعت میں لرزش نہ لا سکے۔یہی وجہ ہے اُس کی بولتی آنکھوں میں حیا کی شوخی ہے۔وہ آج بھی معصوم سوچوں کے اسی جلو میں زندہ ہے جہاں اُسے اپنے بابا کے خواب کی تعبیر بننا تھا۔چاہے اس تعبیر کے حصول کے لیے اسے اپنا معصوم بچپن اور تتلیوں کے سنگ اڑان بھرتی خوبصورت جوانی کے ایام کو محنت کی بھٹی میں جھونکنا پڑا۔وہ اپنے مقام کو حاصل کر کے رہی۔لیکن اپنے اندر سانس

لیتی اور اٹکھیلیاں کرتی زندگی کی تلخی اور خوبصورتی کو نظر انداز نہ کر سکی اور ایک حادثے نے اسے محسوسات کی حسین اور سنگین دنیا سے جوڑ دیا۔

زمانے بھر کی یہ تلخیاں ہیں جو میرے لہجے میں آ بسی ہیں میں اپنے شعروں میں دھیرے دھیرے یہ زہر مایہ اگل رہی ہوں۔

اگر محسوسات اور جنون کا یہ تعلق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا گیا تو یقیناً زندگی کا کوئی دوسرا اندھا موڑ نجمہ کی سجدہ ریز جبین روشن کر جائے گا اور پھر طب وشعر کی دنیا کے لوگ اُسے معرفت کے حوالے سے لکھا اور جانا کریں گے۔کیونکہ وہ عشق حقیقی کی پیاس اور طلب رکھتی ہے۔

میں عشق تیرے میں ڈھل ہی جاؤں، ہر اک رہ پر سنبھل ہی جاؤں
کرے میری روح رقص جس پر، مجھے وہ سر اور تال دے تو

نجمہ شاہین کھوسہ کی خوبصورت اور فکر انگیز شاعری

اعتبار ساجد جرمنی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایم بی بی ایس، ڈاکٹر کا تعلق ڈیرہ غازی خان جیسے مردم خیز خطے سے ہے، یہ علاقہ اپنے بہادروں، فنکاروں اور تخلیق کاروں کی دولت سے مالا مال ہے، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی اسی علاقے کی قابل فخر بیٹی ہیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر اور تخلیقی حوالے سے تین خوبصورت کتابوں ''پھول سے بچھڑی خوشبو''، ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' اور تازہ ترین شعری مجموعہ اور شام ٹھہر گئی کی شاعرہ ہیں ملک بھر کے مستند نقادوں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے ان کے فن کو نہ صرف تحریری طور پر سراہا ہے بلکہ ادبی حلقوں میں ان کی شاعری کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ پروردگار نے انہیں اچھی صورت، اچھی سیرت اور اخلاق حسنہ سے نوازا ہے۔ اپنے والد گرامی کی یاد میں جو ہسپتال انہوں نے لگن چاہت اور انتہائی محبت سے بنایا ہے اس سے نہ صرف علاقے کی عوام فیض یاب ہو رہے ہیں، بلکہ دور دراز کے دیہاتوں اور قصبوں کے عوام کی ایک بھاری اکثریت بھی اس سے استفادہ کرتی ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کا نام نہایت عزت و تکریم سے لیا جاتا ہے، اکادمی ادبیات، لاہور نے رائیٹر، کلب کے تعاون سے ان کی کتاب اور شام ٹھہر گئی کی جو تعارفی تقریب منعقد کی اس میں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے خاندانی تعلیمی اور ادبی پس منظر کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور نہایت سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنے ادبی اور سماجی سفر کی داستان بیان کی۔ بقول امجد اسلام امجد ڈیرہ غازی خان جیسے نسبتاً دور دراز کے علاقے میں رہنے والی شاعرہ نہ صرف ملک بھر کے ادبی افق پر شاعری کی ایک نئی

اور خوبصورت آواز بن کر ابھری ہے بلکہ اس کے اشعار نے واضح کر دیا ہے کہ بڑا ادب صرف بڑے شہروں میں پرورش نہیں پاتا۔ یہ وہ بول ہے جو چھوڑے بڑے شہروں پر یکساں برستا ہے فرق صرف یہ ہے کہ کہیں زمین بنجر رہ جاتی ہے کہیں اتنا میٹر واگ آتا ہے خود بخود ایک خوبصورت باغ وجود میں آجاتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری ذات حیات اور کائنات کے بے شمار مسائل کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کرتی ہے اور شام ٹھہر گئی، کی غزلیں اور نظمیں اس کا زندہ ثبوت ہیں مثلاً جب وہ کہتی ہے۔

کہیں پہ گرد کہیں پر ہوا بتاتی ہوں
میں خود کو اب تو بس اپنے سوا بتاتی ہوں

کہیں یہ تارے کہیں پر ہیں آس کے جگنو
خزاں میں بھی ہیں گلوں کی فضا بناتی ہوں

بکھر گئے تھے کسی نام کے حروف کہیں
اب ان کو جوڑ کر اک آئینہ بناتی ہوں

یہ طے ہے اس کو اگر لوٹ کر نہیں آتا تو کس لیے میں دعا گو عصا بناتی ہوں اجالتا ہے یہ تاریکیاں مرے دل کی تمہاری یاد کو ہر پل دیا بناتی ہوں جب اپنے اشک چھپاتی ہوں مسکراہٹ سے تو اپنے درد کو اپنی دوا بناتی ہوں تراش کر کسی پتھر کے ایک پیکر کو کمال عشق سے اس کو خدا بناتی ہوں کہ خواب میں رہے تا دیر گفتگو تجھ سے ذرا سے بات کو میں واقعہ بناتی ہوں۔
سنا تھا میں نے جو شاہین ایک لمحے کو

اس ایک لمحے کو اپنی صدا بناتی ہوں
مجھے جب بھی وہ گلیاں اور وہ رستہ یاد آتا ہے

کوئی دھندلا سا منظر ہے جو اجلا یاد آتا ہے
تری قربت کی خوشبو کا وہ جھونکا یاد آتا ہے

کہا تم تو جدائی کا وہ منظر بھول بیٹھے ہو
خلا میں دیکھ کر مجھ سے وہ بولا ''یاد آتا ہے''

خزاں رت ہے مگر مجھ کو خیالوں کے تسلسل میں
محبت کے گلابوں کا وہ سپنا یاد آتا ہے

کسی کے دکھ بھرے لمحے میں جب کوئی بلکتا ہے
حقیقت میں اسے ہر زخم اپنا یاد آتا ہے

مسلسل ریت پر چلنا وفا کی ریت ٹھہری ہے
تیری دہلیز تک پھیلا وہ صحرا یاد آتا ہے

وہ لمحہ جو گزرتے موسموں میں ساتھ ٹھہرا ہے
مجھے خود بھی نہیں معلوم کتنا یاد آتا ہے

کبھی جب ہجر کی آہٹ سی دل آنگن میں آتی ہے
بہت اپنائیت سے بس وہ اپنا یاد آتا ہے

ترا ہی عکس اترا ہے مری نظموں میں غزلوں میں
وہ لہجہ تیری چاہت کا وہ چہرہ یادآتا ہے

ہمارا نام لکھا تھا کبھی جو ریت پر اس نے
کبھی جب یاد آئے تو وہ دریار یاد آتا ہے

مرے آنگن میں جب بھی شام کے سائے اترتے ہیں
مجھے شاہین محبت کا ہی سایہ یاد آتا ہے

ایک سوال؟

دیکھ مسیحا میرے لب پر کب سے ایک سوال
کیسے چھینوں میں اپنی آنکھ سے میں
اس غم کی چھال
ایک پرندہ قید میں ہے اک مدت سے بے حال
اندر ہجر کا موسم ہے اور باہر وصل کا جال
جنم جنم کے بچھڑے چل کر ایک نکالیں فال
کتنے موسم باقی ہیں اور کتنے ماہ وسال
کتنے آنسو تیرے ہیں اور کتنے میرے دیکھ
اور کہاں تک پھیلا ہے یہ دکھ کا اک جنجال
دور تلک تاریکی میں اک درد بھرا ہے راگ
اور اس راگ نے چھینے مجھ سے جیون کے سر تال
اک چڑیا کرلاتی تھی بس تنہا پنجرے بیچ
اور باہر کوئی پھول اٹھائے پوچھ رہا تھا حال
ہجر کی تاریکی خوشیوں پر روز کرے اب وار
آج مسیحا لے کر آ جا کرنوں کی تو ڈھال
دکھ یہ کیسا جس سے میری آنکھیں اب ویران

اور ویرانی میں گزرے ہیں بس یہ ہجر کے سال

اپنی اس آخری غزل کے مطلع میں جب وہ کہتی ہیں کہ:

میں خود کو اب تو بس اپنے سوا بناتی ہوں تو اس ماسوا کی

جستجو ان کی شاعرانہ انفرادیت کا اظہار کرتی ہے اور اس بھرپور قوت اظہار کا بھی جو خود کو اپنے سوا بنانے کے عمل میں پوری طرح کارفرما ہے بلا شبہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کی خوبصورت اور فکر انگیز شاعری ایک کٹھن زدہ ماحول میں ہوا کے تازہ، خشک اور خوشبو دار جھونکے کی مانند ہے اور یقیناً یہ ہر لحاظ سے سراہے جانے کے لائق ہے۔

روایتی جبر شاعرات کی ترقی میں بڑی رکاوٹ ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ تخلیقی شعور کی عکاس ہونے کے علاوہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں۔ میں شروع سے اس بات سے اختلاف کرتا ہوں کہ شاعروں کو زنانہ اور مردانہ خانوں میں تقسیم کرنے والے وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ خواتین شاعری نہیں کرسکتیں وہ حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔ جس وقت اردو شاعری میں فیض، فراز کا ڈنکا بج رہا تھا اس زمانے میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور ادا جعفری کی شاعری بھی بڑی توجہ سے پڑھی جا رہی تھی۔ وقت گزرتا تھا فیض اور فراز کی فہرست میں امجد اسلام امجد، قتیل شفائی، ابن انشاء جیسے شعراء شامل ہو گئے تو دوسری جانب پروین شاکر، نوشی گیلانی اور دیگر شاعرات نے اردو شاعری میں جگہ بنانی شروع کر دی۔ نوشی گیلانی کے آغاز سفر میں اگرچہ بہت آسانی رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نوشی گیلانی کی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مشکلات کا سامنا پروین شاکر کو بھی کرنا پڑا لیکن عین جوانی کی موت نے انہیں بہت سے معاملات سے محفوظ کر لیا۔ البتہ نوشی گیلانی کا تذکرہ اس لیے تفصیل سے آ گیا ہے کہ یہاں کی خواتین پڑھنے لکھنے کے باوجود روایتی جبر کا شکار ہیں وہ جبر گھر سے لے کر گھر تک اور گھر سے باہر ہر جانب ان کا استقبال کرتا ہے۔ یہاں کی عورت زخم سہتی تو ہے لیکن بغاوت نہیں کرتی۔ جنوبی پنجاب کی عورت کے پاؤں زخمی ہیں لیکن اس کا سفر جاری ہے۔ میرے وسیب کی عورت روایتی مرد کے جبر کا شکار تو ہو رہی ہے۔ لیکن وہ جبر کے بارے میں آواز بلند

نہیں کرسکتی۔ یہ جبر کا ماحول ہمیں اپنے علاقے میں ہر جگہ ملتا ہے لیکن جب میں لغاری، گیلانی، خاکوانی، مزاری، کھوسہ، قریشی خاندان کی کسی خاتون کو علم و ادب کے ساتھ وابستہ دیکھتا ہوں تو میرے دل سے ان کی سلامتی کے لیے بے ساختہ دعا نکلتی ہے۔ اسی طرح جب میرے ہاتھوں میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا پہلا شعری اثاثہ آیا تو مجھے یوں لگا کہ ڈیرہ غازی خان کی سنگلاخ زمینوں میں ایک لیڈی ڈاکٹر اپنے نازک ہاتھوں سے گلاب کے پودوں کی آبیاری کر رہی ہے۔ اس شعری مجموعے کا نام ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' تھا۔ لیکن اس کے ہر صفحہ پر خوشبو اشعار کی صورت میں اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دوسرا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا تو وہ بے ساختہ کتاب کے انتساب میں کہہ رہی تھی۔

اسے کہو جب بھی وہ میری تصور دیکھے
میری آنکھوں میں چھپے گرداب پڑھ لے

اسے کہو میں اس کے ذکر میں رہوں نہ رہوں
وہ ہے میرا حرف طلب میرا انتساب پڑھ لے

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کی شاعری میں وہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ موجود نہیں تھی جو پہلے مجموعہ کلام میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دوسرے شعری مجموعے میں بتا دیا کہ وہ اب شاعری کے میدان میں نیا جنم لے رہی ہے۔ سو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنے دوسرے شعری مجموعے میں اپنے گرد و پیش کے علاوہ ان لوگوں سے بھی مکالمہ کرتی نظر آتی ہے۔ جن سے عام زندگی میں بات کرنا بھی مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کہتی ہیں۔ خلوص چاہت موت سب اس گونگے، چہرے، اندھے لاحاصل عشق میں رائیگاں ہیں اور جب کبھی شعور پہ منکشف بھی ہو تو تب بھی عشق اندھا بہرہ ہے۔ عشق کو تو بس ایک پیکر چاہنے والے کے لیے۔ اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ پیکر کیا ہے اس کا طلب گار ہے بھی یا نہیں۔ اس کا سارا سروکار اسی پیکر سے ہے اور جب وقت کا دیو اس سے وہ پیکر چھین لے تو عشق کا انجام صرف گور رہ جاتا ہے

۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس پس منظر میں جب شاعری کرتی ہین تو ان کی ہر غزل میں نیا رنگ ترنگ دکھائی دیتا ہے۔محبت کے معانی کو نئے مطالب عطا کرتی ہیں اور کہہ اٹھتی ہیں۔

کسی کو میں اب تک خدا لکھ رہی ہوں
میں مجرم نہیں پر سزا لکھ رہی ہوں

میں ہوں ہیر اپنی وفا میں ابھی تک
سو رانجھے کی خود کو صدا لکھ رہی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں رنگ اور پھول نمایاں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نظموں میں روزمرہ کے مسائل کے علاوہ رسم ورواج قدر اور کائنات کے دکھوں کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ تخلیقی شعور کی عکاس ہونے کے علاوہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں جس نے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کر دیا ہے وہ اپنی شاعری میں اردگرد میں پھیلی ہوئی سچائیوں اور بدصورتیوں کو موضوع بناتی ہے۔جس سے اس کی شاعری میں زیادہ دردانگیزی اور زیادہ تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ وہ خود پر وار ہونے والے سالحات کو آسانی سے قلم بند کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اسلوب میں نسائی جذبات کے ساتھ روزمرہ کے مسائل پر بات بھی احسن طریقے سے کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ بظاہر انکھیں بند رکھتی ہیں لیکن بند آنکھوں سے وہ کچھ دیکھ لیتی ہیں جو ہم لوگ کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی پرواز آسمانوں کی طرف جا رہی ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ ان کی شاعری کے رنگ ہمیں قوس قزح میں جلد دکھائی دیں گے۔

لطیف جذبوں کی شاعرہ، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

محمد حسنین کامران

اردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہی خواتین کی شاعری کے نقوش ملتے ہیں لیکن یہ نقوش اتنے مدھم اور دھندلے ہیں کہ وہ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں کوئی نمایاں اور دیرپا اثر نہ چھوڑ سکے اور تاریخ کے اوراق میں کہیں گم ہو جاتے ہیں۔خواتین شاعرات نے آنے والے دور میں شاعری کو جاری رکھا اور کئی بڑے نام سامنے آئے اس قبیل میں ایک مقبول نام داکٹر نجمہ شاہین کا بھی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے پر اعتماد لہجہ نے مردوں کی بالا دستی والے اس معاشرے میں عورت کے وجود اور اس کے حقوق کا احساس دلایا ہے۔ان کی شاعری سے یہ دعویٰ غلط نہیں کہ انھوں نے نہ صرف شاعرات کی دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا بلکہ خوبصورت، دلکش اور مسحور کن لب ولہجہ کی حامل شاعرہ بھی ثابت ہوئیں جن کی شاعری کے کینوس پر بکھرے ہوئے قوس قزح کے متعدد رنگوں نے شاعری کی دنیا میں بہار بکھیر دی۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں جو بات اہمیت کی حامل ہیں کے ان کی شاعری میں احساس، درد بھی ہے اور امید بھی۔ان کی شاعری صنفِ غزل اور صنفِ نظم دونوں پر محیط ہے اگرچہ غزل میں طبع آزمائی زیادہ ہوئی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین نے شاعری کی دونوں بڑی صنف کو خوب نبھایا ہے اور اپنے سچے جذبات اور احساسات کے توسط سے اپنے پڑھنے والوں کے دل جیت لیئے ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری دراصل احساس کی شاعری ہے جس میں فکر و جذبہ پھولوں سے خوشبو کی وابستگی کی طرح لطیف انداز میں ہم " آہنگ ہو کر" باطنی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔اُن کے کمال فن

میں یہ بھی شامل ہے کہ اُن کے تصوّرات میں امید اور خوشی کے کئی پیکرِحسن جمال اور کمال لے کر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین معنوی تازگی سے بھرپور شاعری کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے جذبات اور خیالات سے اپنے کلام کو نہ صرف کُندن بنا دیا ہے بلکہ عقیدت اور محبت کے نئے نئے جذبات و تصوّرات میں ڈھلی شاعری پیش کی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں تمام تراکیب کے اختیار اور استعمال کرنے کا فن خوب نظر آتا ہے جو کہ اُن کے علمی اور فنّی معیارِ حُسن کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے کلام میں جن بحروں کا استعمال کیا ہے اُن کا آہنگ نہ صرف ان کی رواں طبیعت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ کبھی دھیمے اور کبھی گھن گرج والے انداز سے سامنے آتی ہیں جو کہ پڑھنے والے کے وجود میں جذب ہو کر میٹھی کیفیت جگاتا ہے تو کبھی نیند سے بیدار کرنے کے لیے بجلیاں چمکاتا ہے اور کبھی بے قراری کو اس حد تک بڑھا دیتا ہے کہ پڑھنے والا بے سکونی اور وجد میں آ جائے۔ اگرچہ ڈاکٹر نجمہ شاہین نے اپنے فن وکمال کا بہترین مظاہرہ کیا ہے تاہم وہ اپنے تخلیقی اور فنی عمل میں خود کو ابھی بھی ادھورا ہی سمجھتی ہیں اسی لیے وہ آرزوئے فکر فن میں سرگرداں رہتی ہیں۔ جذبات اور احساسات کے اظہار میں جرات اور جوش کے ساتھ ساتھ نگاہ کی کشادگی، فکر کی بلندی اور عشق کی تڑپ لیے قافلہ ہنر وفکر میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین اور ان کے مجموعات شاعری:

پنجاب کے دورافتادہ علاقہ ڈیرہ غازیخان کے سنگلاخ چٹانوں جہاں قبائلی نظام ہے وہاں سے کسی لڑکی کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور ساتھ میں شاعری کرنا کوئی عام بات نہیں۔ اپنے فیملی کی سپورٹ کی وجہ سے نازک سی خوبصورت سی شاعرہ نجمہ شاہین نے 1995 میں ایم بی بی ایس کیا اور عملی زندگی میں بطور ڈاکٹر سرکاری جاب کی لیکن جلد سرکاری نوکری کو خیر باد کہا اور اپنا ہسپتال قائم کیا جہاں وہ آج بھی پریکٹس کرتی ہیں۔ شاعری کا شوق زمانہ طالب علمی سے ہی تھا اور اس دوران ان کی شاعری ادبی رسالوں و اخبارات کے ادبی صفحوں پر اہتمام کے ساتھ شائع ہوتی رہی ڈاکتر نجمہ شاہین نے پہلی طبع آزمائی نظم میں کی ان کی

پہلی نظم "ملاقات آخری" 1996 میں کالج کے میگزین میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا پہلا شاعری کا مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو" اپنے نام کی طرح منفرد شاعری کی کتاب ہے یہ کتاب 2007 میں منظر عام پر آئی اور مقبول عام ہوگئی۔

اسی طرح دوسری کتاب "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں 2010" اس کے بعد "اور شام ٹھہر گئی" 2013 جبکہ چوتھا مجموعہ شاعری "پھول خوشبو اور تارہ" سال 2016 میں منظر عام پر آئی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کا ایک ناول بھی زیرِ طبع ہے جو کہ جلد منظر عام پر آئے گا اس ناول کا نام" گردسفر" ہے۔

جنوبی پنجاب اور ڈیرہ غازیخان میں خواتین کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ڈاکٹر واحد شاعرہ ہیں جن کی چار کتابیں منظر عام پر آئیں۔

جنوبی پنجاب اور خواتین کی شاعری:

علاقے کی خواتین کی شاعری پر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے اپنے خیالات ہیں۔

بحیثیت مجموعی جنوبی پنجاب کی خواتین اپنی شاعری کے ذریعے ایک خوبصورت معاشرے کی تشکیل میں اپنا بنیادی کردار ادا کر رہی ہیں۔ ظلم، جبر اور ناانصافیوں کے خلاف ان کی توانا آواز صرف خواتین کو ہی نہیں معاشرے کے ہر طبقے کو حوصلہ دے رہی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ "دبی ہوئی سسکیاں اب چیخ بن کر سامنے آ رہی ہیں" اور دنیا کو ان کے مسائل کی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ صدیوں سے زندانوں میں پڑے غلام اب زنجیریں توڑ رہے ہیں۔ سرائیکی وسیب کی یہ خواتین اردو شاعری میں ایک نئے اسلوب کو جنم دے رہی ہیں ایک ایسا اسلوب جو ان کی پہچان بن رہا ہے اور جس کے ذریعے ان کی شاعری دور ہی سے نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہمیں ناآسودہ خواہشیں، لہولہان پاؤں، ریزہ ریزہ خواب اور چلچلاتی دھوپ میں بے سمت سفر تو دکھائی دیتا ہے لیکن ان کی شاعری کی ایک اپنی سمت ہے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کہتی ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ اس خطہ کی خواتین کی شاعری کا یہ سفر کبھی رائیگاں

نہیں جائے گا۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں اشاعت و طباعت کوئی زیادہ آسان نہیں، جہاں محفلوں اور مشاعروں کا ماحول بھی خواتین کیلئے موزوں نہیں اور جہاں قدم قدم پر انہیں گھریلو، سماجی و معاشرتی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس ماحول میں بھی اگر کچھ خواتین نے اپنے آپ کو منوالیا ہے تو ہمیں ان کی تعظیم کرنی چاہیے اور انہیں سلام پیش کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین نے درست کہا کہ معاشرتی طور پر ہمیں ایسی باہمت خواتین کی تعظیم کرنی چاہیے اور انہیں سلام پیش کرنا چاہیے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ فن اور شخصیت پر ایک تحریر

محمد حسنین کامران

عصر حاضر کی نامور شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جن کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے اپنے پہلے شاعری کے مجموعہ کے بعد ہی وہ ڈیرہ غازی خان سے باہر ملک بھر اور دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی اُردو ادب پڑھا اور شاعری سنی اور پڑھی جاتی ہے ان حلقوں میں وہ مقبول ہوگئیں جنہوں نے بہت کم عرصہ میں اپنی پہچان بنالی۔ خاتون شاعرہ کا نام اا ج مقبول عام ہوکر عوامی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا ماضی میں جب کبھی نام آتا تھا تو یہ کہا جاتا تھا ڈیرہ غازی خان کی شاعرہ، اب ان ڈیرہ غازی خان کا جب بھی نام لیا جاتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کا شہر۔ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری ان کا نام اب ہمارے شہر کی پہچان بن گیا۔ادبی حلقوں میں کبھی محسن نقوی ڈیرہ غازیخان کی پہچان تھے اور اب ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ایک مباسفر طے کیا جس میں وہ اپنے زمانہ طالب علمی سے لیکر مقبول شاعرہ ت کی زندگی کے بارے میں کہتی ہیں کہ وہ ڈیرہ غازی خان جیسے دوافتادہ پسماندہ ضلع کی ایک ایسی بستی میں بلوچ فیملی میں پلی بڑھی جہاں کی عورت بہت سے مسائل میں جکڑی ہوئی ہے۔ معاشرتی طور پر یہاں کی عورت کے پاوں رسم ورواج، خودساختہ قوانین، ثقافتی پابندیوں کی زنجیر میں بندھی ہے۔مگر انہوں نے یہ کٹھن مرحلہ اپنے شوق، لگن جستجو اور محنت سے دیکھتے ہی دیکھتے طے کرلیا۔کامیاب ڈاکٹر اور معروف شاعرہ دونوں شعبوں میں کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلیمی آغاز ڈیرہ غازی خان کے گورنمنٹ ہائی سکول سے

شروع ہوااور ایف ایس سی کرنے کے بعد نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کی تعلیم حاصل کی۔ ان کو شاعری کا شوق تو بچپن ہی سے تھا مگر اس میں شدت اس وقت آ گئی جب وہ ایک حادثہ کا شکار ہو کر بیڈ ریسٹ پر آ گئیں۔ اس وقت وہ معروف شاعرہ کو پڑھنے اور اپنی شاعری کو نکھارنے کے حوالے سے مشق سخن کو جاری رکھے ہوئے تھیں۔ ان دنوں ان کی شاعری کا ایک نمونہ:

میری مقتل کو جس دن سجایا گیا
بے بسی کو سہیلی بنایا گیا
ایک شہنائی کی دھن پہ جس روز اک
ماتمی گیت مجھ کو سنایا گیا
ایسے لمحوں میں، میں نے تڑپتے ہوئے
آسماں کو پکارا مدد کے لئے جب
میں نے دیکھا فلک کے ستارے سبھی
میری حالت پہ بس مسکراتے رہے
چاند ہنستا رہا بس مجھے دیکھ کر
رات گزری تو سورج ابھرنے لگا
مجھ کو سورج سے اتنی سی امید تھی
گر یہ میری مدد کو نہ آیا تو پھر
یہ مری بے بسی پہ ہنسے گا نہیں
یہ مگر کیا ہوا
روشنی کی علامت یہ سورج جو ہے
میری تاریکیوں کو بڑھانے لگا
مجھ پہ ہنسنے لگا، مسکرانے لگا

پھر زمیں کو مدد کے لیے میں نے آواز دی
اس سے فریاد کی
اے زمیں قبر جتنی جگہ چاہیے
ایک حوا کی بیٹی ہے، فریاد ہے اسکی
بس مدد چاہیے، ہاں مدد چاہیے
مجھ کو معلوم تھا، یہ زمیں ماں ہے، مجھ کو نہ ٹھکرائے گی
یہ مگر کیا ہوا وہ بھی ہنسنے لگی
میں نے تھک ہار کر پھر پکارا اسے
وہ جو منسوب تھا
وہ جو محبوب تھا
جس کی خاطر یہ جیون زمانے میں اب اتنا معتوب تھا
یہ مگر کیا ہوا وہ بھی ہنسنے لگا
ہر طرف قہقہے ہر طرف قہقہے، ہر طرف قہقہے
پھول لاتا تھا میرے لیے جو کبھی
اس گھڑی اس کے ہاتھوں میں بھی سنگ تھا
یہ مرا انت ہے
یہ مرا انت تھا

بہت کم شعراء اور خاص طور پر خواتین شاعرات کے حصے میں یہ آیا کہ ان کی شاعری بھی پسند کی جائے اور بطور شاعرہ وہ مقبول ہوں۔ ایک شخصیت کے طور پر معروف ہوں، سیرت اور صورت میں وہ خوبصورت تو ہیں ہی ان کی شاعری بھی کمال فن کے عروج پر ہے۔ آج ہر کوئی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کرتا، ان کے گیت، غزلیں، نظمیں گنگناتا نظر آتا ہے۔ آج کے دور میں جہاں سوشل میڈیا کا عروج ہے، وہاں بھی ڈاکٹر صاحبہ کا راج ہے۔ سوشل میڈیا کے

تمام ٹول میں وہ چھائی ہوئی ہیں۔فیس بک ہو یا ٹویٹر، یا اور رابطے کی کوئی ویب سائٹ، اخبارات ہوں یا ٹی وی چینلز ہو ہر جگہ ڈاکٹر صاحبہ کے فن اور ان کی شخصیت کی بات ہوتی ہے۔ انہیں تقاریب میں مدعو کیا جاتا ہے وہ مہمان خصوصی صاحب صدارت ہوتی ہیں۔

جس میں آپ کا اخلاق و کردار واقع قابل تعریف ہے کیونکہ شہرت اور دولت پانے وای جتنی بھی ادبی خواتین میں بڑے نام ہیں ان کے کہی نہ کہی سیکنڈل ضرور بنے یا بنائے گئے جو کہ کردار اور اخلاق کے حوالے سے تھے مگر آپ کو دیکھتے ہی پاکیزہ رشتوں کا خیال آنے لگتا ہے جیسے کہ کوئی آپ کو اپنی بیٹی اور بہن جیسا سمجھتا ہے، آپ واقع قابل تعریف ہیں۔آپ کی اب تک جتنی بھی کتابیں منظر عام ہو چکی ہیں جس میں 'پھول سے بچھڑی خوشبو' پہلی کتاب ہے جو ادیبوں، شاعروں اور قارئین نے آپ کو دیکھنے کے بعد اسے سچ مانا واقعی کہ پھول سے خوشبو بچھڑ چکی ہے کیونکہ خوشبو نے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو دیکھ کر اپنا بسیرا ڈاکٹر نجمہ میں کر دیا ہے اور پھول خوشبو سے خالی ہے۔جبکہ دوسری کتاب میں آپ کو پہلے سے زیادہ پذیرائی ملی جس کا نام ہے 'میں آنکھیں بند رکھتی ہوں' قارئین کا کہنا ہے وہ واقعی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اتنی معصوم اور بھولی بھالی ہیں جس کی آنکھوں میں صرف پیار ہی پیار ہے اور محبت ہے تو وہ محبت چھوڑ کر نفرت، برائی، جھوٹ، فریب، دہشت گردی سے بھری معاشرے کو نہیں دیکھ سکتی۔اس لیے اتنی پیاری خوبصورت آنکھوں کو بند رکھتی ہیں تا کہ وہ صرف محبت اور پیار کے حسین خواب ہی دیکھتی رہے۔جبکہ ان کی تیسری کتاب 'اور شام ٹھہر گئی' وہ قارئین میں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے کونے کونے سے اس کو بے حد پسند کیا گیا کہ قارئین کو جلد سے جلد آپ کی چوتھی کتاب کا بے حد انتظار ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جو کہ خوبصورت بھی ہیں اور خوب سیرت بھی۔نرم و ملائم بھی ہیں اور چٹان کی طرح سخت بھی۔اس نے چٹان جیسی سختیاں سہہ کر یہ خوبصورت زندگی حاصل کی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ یہ خوبصورت زندگی اپنے تمام دوستوں اور دشمنوں کو بھی دے۔وہ پیارے اور محبت دینا چاہتی ہے۔وہ ادب کی نئے تہذیب جنم دے رہی ہے جس کا مطلب امن اور مقصد پیار ہے وہ اپنی محرومیوں کے بل

بوتے پر سب کو خوشیاں دینا چاہتی ہے وہ دنیا میں نفرت کو ختم کر کے سب کو اپنی مرضی سے جینے کا حق دینا چاہتی ہے وہ اپنی نئی نظم میں پیغام دیتی ہے۔

اجاڑ رات ہے، تنہائی ہے قیامت ہے
وہ سامنے ہے کہ جذبوں میں اتنی شدت ہے

کہ اس کے لفظ پڑھے تو مجھے کچھ ایسا لگا
زبان غیر میں لکھی ہوئی عبارت ہے

جو میری مانگ میں کچھ زخم جگمگاتے ہیں
کسی کے عاشق میں مجھ کو ملی یہ دولت ہے

میں اپنے آپ کو بھی بھول ہی چکی ہوں اب
کسی کی یاد کی مجھ پر بڑی عنایت ہے

ہوا کے سنگ اسے دور تک ہی جانا ہے
کو پھول سے بھلا خوبشو کی کیا رفاقت ہے

یہ جلتی ریت تری یاد کی بچھی ہے اور
میں پوچھتی ہوں کہ کتنی ابھی مسافت ہے؟

مجھے جو دیکھ رہے ہو تم ایسے حیرت سے
خود اپنے آپ پہ مجھ کو بھی اتنی حیرت ہے

ہے کرب جو مری تخلیق میں اسے سمجھ
یہ شاعری مرا اظہار ہے، عبادت ہے

میں زخم سہہ کے بھی شاہین مسکراتی ہوں
کہ درد دل کو چھپانا تو میری عادت ہے

آپ جنوبی پنجاب میں سب سے کم وقت میں سب سے زیادہ شہرت پانے والی شاعرہ بن چکی ہیں۔ سابقہ ادوار میں جب پروین شاکر اور دوسری بڑی شاعرات نے شہرت کی بلندی کو چھوا تب میڈیا بہت محدود تھا صرف ایک قومی ٹیلی ویژن پروگرام میں آ جاتا اور دو تین بار اخبار میں چھپ جاتا تو شہرت اس کو حاصل ہونے لگتی مگر آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ آپ کو شہرت حاصل کرنے کیلئے کئی ہزار گناہ زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے ایک آدھ چینل پر کئی پروگرام کرنے کے بعد بھی آپ شہرت حاصل نہیں کر سکتے مگر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی قسمت نے آپ کو اس دور کی مشہور ترین شاعرہ بنا دیا اس میں بے حد محنت اور شرافت کا بہت عمل دخل ہے۔ اب آپ کی چوتھی کتاب بہت جلد آپ کے پڑھنے والوں کیلئے مارکیٹ میں آ رہی ہے جس کی ایک غزل بطور تحفہ ہماری ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ سے پیار کرنے والوں کی طرف سے چھاپی جا رہی ہے۔

آئینہ تھا، میں تھی اور اس کی نگاہوں کا حصار
اس رعایا کو ملا یوں بادشاہوں کا حصار

دہشت میں زادِ اتنا ہی تھا میرے لئے
اشک تھے اور ساتھ تھا بس میری آہوں کا حصار

کیا کریں ہم کو تو بڑھنے ہی نہیں دیتا کہیں
گم شدہ منزل اور کچھ الجھی راہوں کا حصار

سانس لینے سے بھی اکثر روک دیتے ہیں ہمیں
جان لیوا ہو چلا ہے خیر خواہوں کا حصار

اس لئے تو کاروانِ دل بھی بھٹکا نہیں
اک جبیں عشق ہے اور سجدہ گاہوں کا حصار

خود خدا تاریکیوں میں رہ دکھلائے ہمیں
خود خدا ہنستا ہے شاہیںؔ بے گناہوں کا حصار

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، توانا لہجے کی شاعرہ

قاسم سہانی

سرزمین ڈیرہ غازی خان جس طرح قدرتی معدنیات سے مالا مال ہے اسی طرح ادب کے حوالے سے بھی اپنی الگ پہنچان رکھتی ہے۔مگر افسوس یہاں پر بھی تخت لہور کے ہمنو او ڈیرے راج کرتے ہیں غریب لوگ دو وقت کی روٹی روزی کے لیے پہاڑوں میں پتھر توڑتے جان کی بازی ہار جاتے ہیں کوئی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے کراچی، دوبئی، سعودی عرب محنت مزدوری کے سلسلے میں چلا جاتا ہے۔کسی کو بہن کے جہیز کی فکر کھائے جا رہی ہے بیرون ملک سے جب بھائیوں اور بیٹوں کی لاشیں واپس لوٹتی ہیں تو ماؤں بہنوں کی آہیں عرش ہلا دیتی ہیں مگر ان تخت لہور کے ہم نواہ ڈیروں کو تخت لہور کی سجاوٹ سے فرصت کہاں جوان غریبوں کی آہیں اور سسکیاں سنیں جب ظلم کی انتہا ہوتی ہے تو پھر یہاں کا قلم کار اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستاں اپنے قلم سے رقم کرتا ہے۔ڈیرہ غازی خان میں بہت سے ادبی حوالے ہیں جن میں احمد خان طارق، عاشق خان بزدار، محسن نقوی جاوید، احسن سرور خان کربلائی وغیرہ اس وقت اردو ادب میں نمایاں نام ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا ہے۔نجمہ روایتی شاعری کرتی ہے اگر وہ حالات کو مدنظر رکھ کر محسن نقوی مرحوم کی طرح اردو سرائیکی میں جدید خیالات سے آراستہ شاعری کرئے تو وہ تاریخ ساز شاعرہ بن سکتی ہے اس وقت نجمہ کی تین کتابیں عوام میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں پھول سے بچھڑی خوشبو، آنکھیں بند رکھتی ہیں، اور شام ٹھہر گئی نجمہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہے وہ اپنے وسیب کے غریب اور نادار لوگوں کے لیے مسیحا کے طور پر کام کرتی اپنے پیشے سے جنون کی حد تک اس کو لگاؤ ہے پھر

بھی ادب سے والہانہ محبت کرتی ہے شاعری اس کے خون میں رچی ہوء ہے اس لیے ادبی محفلوں میں بھی بھرپور شرکت کرتی ہے اپنا خوبصورت کلام سنا کر لوگوں سے داد سمیٹتی ہے ڈیرہ قبائلی علاقے سے منسلک شہر ہے یہاں پر کسی عورت کا ادبی محفلوں جا کر شرکت کرنا بھی کرشمہ ہے۔نجمہ نے اپنے حقوق کے لیے بھرپور جنگ لڑ کر فتح یاب ہوئی ہے یہاں کے وڈیروں کو بتا دیا کہ اگر ارادے مضبوط ہوں تو کامیابی قدم چومتی ہے نجمہ کی شاعری میں روانی پائی جاتی ہے وہ اپنے اندر کا سچ بیان کرتی ہے سادہ آسان الفاظ کا استعمال ان کی شاعری کو چار چاند لگا دیتا ہے پروین شاکر مرحومہ کی طرح ان کی زیادہ تر نظموں کا عنوان لڑکیاں ہیں گذشتہ دنوں ناصر پبلشرز کے فرنٹ پر نجمہ شاہین کی بک آنکھیں بند رکھتی ہوں دیکھی مطالعہ کیا تو پتہ چلا لوگوں میں خوشیاں بانٹنے والی اندر سے کتنا ٹوٹ چکی ہے دل کے زخم چھپانے کے لیے ہر وقت ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے پھرتی ہے مگر دیکھنے والے کو شب ہجراں کا طویل سلسلہ ان کی آنکھوں میں نظر آ جاتا ہے کبھی تو نجمہ زندگی سے بہت مایوس نظر آتی ہے زندگی کو قبر کا نام دیتی ہے جس پر بظاہر تو لوگ پھول نچھاور کرتے ہیں اندر کا کرب تو قبر سے پوچھو تنہائی چار سو اندھیرا کھانے کو آتا ہے ان مسائل ک باوجود بھی نجمہ ناامید نہیں ہے اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتی ہے محبت مر نہیں سکتی نجمہ کا دل عشق خدا اور عشق رسول ﷺ سے جگمگا رہا ہے ان کا حمدیہ اور نعتیہ شعر دیکھیں،

کہیں ہے تو بلال میں کہیں کسی جمال میں
نہ ہو کسی کا گر کوئی اسے بھی پالتا ہے تو

مدینے کو جاؤں مدینے کو جاؤں
عقیدت کی ساری میں رسمیں نبھاؤں

وطن عزیز کو نا جانے کس کی نظر لگ گئی ہے اس خون آلودہ پاک سرزمین کو دیکھ کر نجمہ کہاں خاموش رہ سکتی ہے۔

موسم بہار بھی عجب تجھے وطن ملا
گلی گلی میں رچی ہوئی ہے بس خون کی مہک

جب کوئی جان سے پیارا جدا ہو جائے تو راتوں کو پھولوں کے بست درد ناک اذیت دیتے ہیں۔

شب ہجراں کی ظلمت ہی مقدر بن گی ء اپنا
دل بیدار دیتا ہے ہمیں یہ درد تنہائی
جس کی خاطر اپنوں سے ناطے توڑے جائیں
وہ بھی زخم دینے لگے آہ تو نکلتی ہے
جس کے خیال نے کیا جدا سب سے مجھے
زخمی کر گیا ہے وہ آشنا مجھے

وصی شاہ نے کہا تھا کہ محبت مر نہیں سکتی نجمہ نے اسی بات کو اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔

ہجر میں بھی اگر میری سانس باقی
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

نجمہ کبھی کبھی ہجر میں ایسے ادب جاتی ہے کہ میر کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

جانے کو ان تھا جو سانس کھینچ لے گیا
جانے کون تھا جو دے گیا زندگی کو قبر

ہے کون جس کے وجود سے سلامت مری خوشی
ایسا کیا ہے اس میں جس کی خاطر روئی ہوں عمر بھر

اور شام ٹھہر گئی

حسنین ساحر

''اور شام ٹھہر گئی'' ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا حال ہی میں منظر عام پر آنے والا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو حمد، نعت، غزلوں، نظموں اور گیتوں پر مشتمل رنگا رنگ خیالات وجذبات کا مرقع ہے ڈاکٹر نجمہ شاہین کی غزل سچے اور کھرے جذبات کی عکاس ہے چونکہ ان کی غزل معروضی حالات کا صاف شفاف آئینہ ہے اس لیے اس کے بین السطور خود اپنی زندگی اور معاشرتی اقدار کی سچی اور منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔ وہ شعر کے باب میں '' کا تا اور لے بھاگی'' کی قائل نہیں بلکہ ان کا عمل سہج پکے سو میٹھا ہو پر ہے۔ وہ شعر نہایت غور وفکر، مشاہدے اور ذاتی تجربے کے زیر اثر نہایت سوچ سمجھ کر کہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار دھنک رنگوں کی طرح اپنی رنگینی ورعنائی اور تاب وتوانائی کی بدولت دلوں میں بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیتے ہیں۔ حقیقت تحریر یہ ہے کہ ان کا کلام ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کی زندہ مثال ہے۔

اس سے بڑھ کر میری وفا کا کوئی نہیں گواہ
غزلیں، نظمیں، سجدے، آنسو اور اک شب سیاہ
کیسے ہوا اور کب ہوا کچھ خبر نہیں تھی دل کو تو
ایک محبت جا سوئی تھی وحشت میں ویرانی میں
پھر عشق کے بازار میں نیلام ہوا کیوں؟
اے عشق بتا تیا یہ انجام ہوا کیوں؟
اے عشق بتا تیرا یہ انجام ہوا کیوں؟

شہرِ نگاراں محفلِ یاراں بھول گئے سب دل والے
دور زمانہ دیکھ کے ہم نے خود کو خود سمجھایا ہے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری ایک ایسی آواز ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی غزا ایک سبک روندی کی مانند زندگی کے رہگزاروں میں قدم قدم پر لالہ وگل کھلاتی ہوئی رواں دواں نظر آتی ہے ان کی شاعری میں اپنے اطراف بکھری ہوئی زندگی اور خلقِ خدا اور ان کے دکھوں، امیدوں، آرزؤں کا بیان بہت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ نظر آتا ہے ان کے اشعار کی تاثر آفرینی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ کسی ایسی فنکارہ کی سوچ کے عکاس ہیں جس نے زندگی اور اس کے متعلقات کو نہایت زیرکی سے دیکھا ہے اور پھر اپنے تاثرات کو دوسروں کے سامنے آئینے کی صورت رکھا ہے ان کے کلام میں صرف نسائی جذبات ہی نہیں بلکہ معاشرتی نا اسودگیوں کا تذکرہ بھی ہے انسانی تمناؤں کے مدفن بھی ہیں اور حریتِ فکر کے پہلو بھی ہیں۔

کرے اگر خواب مہربانی تو نیند آئے
تجھے کبھی آنکھ سے جو پانی تو نیند آئے

یہ دیس جس میں ہے نفرتوں کا ہی راج ہر سو
محبتوں کی ہو راجدھانی تو نیند آئے

بس یہاں پر شور ہے اور سسکیاں ہیں چار سو
یہ جہاں لگتا ہے دہشت کا ہی گھر ہو جائے گا

ہاتھ پر جس کے لہو تھا بے گناہوں کا یہاں
شہر میں وہ شخص ہی تو صاحبِ دستار ہے

سو بنیاں ڈوب رہی ہیں ابھی دریاؤں میں
اور مہینوال نہیں موج کی للکار کے ساتھ

غزلوں کے ساتھ جب ان کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی نظموں کے مضمون یعنی خٰال کی اہمیت، جذبے کی شدت اور اندازِ بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ''اور شام ٹھہر گئی'' میں شامل نظمیں موضوعاتی اور فکری لحاظ سے منفرد ہیں۔

ان کی نظمیں ''یہ مرا انت ہے'' ایک سوال، یہ عشق بستی بسانے والو، محبتوں کا یہ طور سینا، گر ہم کو تم جھٹلاؤ گے، بکتے دیکھا جہاں، سہارا ماں ہے، اس بیان کی دلیل ہیں ڈاکٹر نجمہ شاہین نے پوری سچائی سے نسائی جذبات کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے وہ عورت کی باطنی کیفیات کے زیر و بم کو صداقتوں کے حوالے کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ وہ ایسی عورت کی جھلک پیش کرتی ہیں جو عشق میں پا کباڑی کی روا بوڑھے اپنا سماجی سفر جاری رکھے ہوئے ہے ڈاکٹر نجمہ شاہین کا کلام پے در پے شکست کی جرامتوں کے ملال اک قصہ ہے جس میں سنگدل معاشرے کی بے حسی اور جبر کا تذکرہ ہے جس میں حوا کی بیٹی کی مظلومیت اور عدم تحفظ کی کہانی ہے ان کے ہاں شعر میں جذباتی نا اصودگی اور سلگتے ارمان عورت کی نفسیات کے پراسرار نہاں خانوں کی مکمل تصویریں ملتی ہیں۔

اے زمیں قبر جتنی جگہ چاہیئے
ایک حوا کی بیٹی کی فریاد ہے
بس مدد چاہیئے ہاں مدد چاہیئے
مجھ کو معلوم تھا یہ زمیں ماں ہے مجھ کو نہ ٹھکرائے گی
یہ مگر کیا ہوا وہ بھی ہنسنے لگی (یہ مرا انت ہے)

دکھ کے لمحوں میں میرا ایک سہارا ماں ہے
میں اگر ڈوبتی کشتی ہوں کنارہ ماں ہے

تپتے صحراؤں میں کس طرح بھٹک سکتی ہوں
مجھ کو جو راہ دکھائے وہ ستارہ ماں ہے

''دسمبر'' بھی محبت کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ بھیگی صبحیں، اداس شامیں، تنہا راتیں، ہجر وفراق، یادِ ماضی اور افسردگی دسمبر کے مزاج کا خاصہ ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری پر بھی اس ''دسمبری مزاج'' کا گہرا اثر ہے۔

مہینہ ہجر کا جب بھی میرے آنگن میں آتا ہے
اداسی کے ہر اک منظر کو وہ موجود پاتا ہے
نگاہوں کو جھکا کر بس دسمبر لوٹ جاتا ہے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کے ہاں ''سادگی میں پرکاری'' کا عمل نظر آتا ہے۔ ''اور شام ٹھہر گئی'' میں ایک بھی نظم ایسی نہیں جو تجریدی ہو اور قاری کے سر کے اوپر سے گزر جانے والی ہو ۔ان کے استعارے بڑے واضح اور خیال ابلاغ کی بھرپور صلاحیت لیے ہوئے ہیں۔ انہیں اس بات کا ادراک ہے۔ کہ ایک اچھا نظم کو لفظوں سے مصوری کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ نجمہ شاہین کی شاعری میں موضوعات قدرے بولتے نظر آتے ہیں ہزاروں، جہتیں اور بے شمار حقیقتیں ایسی ہیں جو تخلیق کار کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور لکھنے والا اپنے جوہر کے مطابق لکھ دیتا ہے معروف ادبی شخصیات نے ان کی ادبی وتخلیقی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں آج کل کی بیشتر خواتین شعراء کے مقابلے میں ایک مخصوص بے باکی کی بجائے ایک قسم کا Restraint پایا جاتا ہے بات کو نہ کہتے ہوئے بھی کہہ جانے کا یہ رنگ خوشنما بھی ہے اور دلکشا بھی'' (امجد اسلام امجد)

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری کا رنگ حنائی ہے، حنا ہمیشہ دو رنگوں کا امتزاج ہوتی ہے۔ حیا وار سبز رتوں کے اندر جذبوں کا سرخ رنگ بھینی

بھینی خوشبو دیتا ہے تو غنائی سر بیدار ہونے لگتے ہیں جو سہاگ کی گت پہ طن کے گیت چھیڑ دیتے ہیں اور وراگ کے موسم میں ہجر کی کافیاں سناتے ہیں۔'' (بشریٰ رحمٰن)

خوبصورت، سچا اور اچھا خیال خواہ کسی شکل میں کسی صنف میں بیان کیا جائے، وہ پڑھنے یا سننے والے پر گہرا اثر ضرور چھوڑتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین پختہ عزم کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں اور شعری افق پر پوری توانائی کے ساتھ جگمگا رہی ہیں۔ کسی فنکار کا فن یا تخلیق کار کی تخلیقی علاقائی حدود وقیود سے ماورا ہوتی ہے

۵۸۔ تحقیقی مقالہ جات

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت اور فن پر اب تک آٹھ تھیسز ہو چکے ہیں اور چار تھیسز ہو رہے ہیں اسکے علاوہ شاعری پر دو میوزک البم بھی بن چکے ہیں۔ جن میں سے تین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔۔۔

1۔ شخصیت اور شاعری پر ایم فل کا تھیسز فیڈرل یونیورسٹی اسلام آباد سے ہو چکا ہے۔
2۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ایم اے کا تھیسز ہو چکا ہے
3۔ زکریا یونیورسٹی ملتان سے ایم اے کا تھیسز ہو چکا ہے
4۔ نواز شریف یونیورسٹی ملتان سے ایم اے کا تھیسز ہو چکا ہے
5۔ غازی خان یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان سے ماریہ امبر نے ایم اے کا تھیسز کیا ہے
6۔ غازی خان یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان سے مریم نے ایم اے کا تھیسز کیا ہے
7۔ فیصل آباد یونیورسٹی سے ایم فل اور ایم اے کے تھیسز ہو رہے ہیں۔۔
8۔ مصر میں الازہر یونیورسٹی میں تیسرے شعری مجموعہ ،،اور شام ٹھہر گئی،، کا مکمل ترجمہ کیا گیا ہے۔
9۔ مصر میں چوتھے شعری مجموعہ ،، پھول خوشبو اور تارہ پر ایم فل کا تھیسز جاری ہے
10۔ انڈیا میں زیر نگرانی پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام لکھنؤ یونیورسٹی محترمہ شاہدہ پروین فن اور شخصیت پر پی ایچ ڈی کا تھیسز کر رہی ہیں۔
11۔ غازی خان یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان سے پرنیم اصغر نے بی ایس کا تھیسز کیا ہے۔
12۔ ان کے کلام پر دو میوزک البم بھی بن چکے ہیں۔ جن میں سے ایک علی میوزک پروڈکشن والوں نے پاکستان اور ہائی ٹیک کمپنی یو کے نے لندن میں ریلیز کی ہے۔ جس میں نامور گلوکاروں انور رفیع، حنا نصراللہ، صائمہ جہاں اور شانی انور نے پرفارم کیا۔۔ اس کے علاوہ نامور گلوکاروں نے پاکستان اور انڈیا میں انکے کلام کو گایا جن میں ساجد حسن، شمیم خالق، نے پرفارم کیا۔

جو تھیسز اس کتاب میں شامل ہیں:

1۔ عبدالشکور ۔فیڈرل یونیورسٹی اسلام آباد
2۔ رضیہ نور۔۔نواز شریف یونیورسٹی ملتان
3۔ ماریہ امبر۔۔غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازیخان

تحقیقی مقالہ

مقالہ نگار

عبدالشکور

(فیڈرل یونیورسٹی اسلام آباد)

اظہارِ تشکر

خدائے بزرگ و برتر کی حمد وثناء اور لاکھوں کروڑوں درود وسلام حضور نبی کریم ﷺ پر کہ جن کا ذکر باعث خیر وبرکت ہے۔ا؟ تعالیٰ کی مہربانی اور رحمتوں کے باعث میں آج ایم فل اردو کا مقالہ مکمل کرنے کے قابل ہوئی۔ تحقیق ایک محنت طلب کام ہے جس کے لیے پرسکون ماحول، مناسب وسائل اور ذرائع اور پختہ عزم و ہمت کی ضرورت ہوتی ہے میں نے جب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس بات کی خوشی تھی کہ آج تک میں نے کبھی کسی کالج یا یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لے کر تعلیم حاصل نہ کی تھی۔

مجھے یہ موقع ایم فل اردو میں آ کر ملا تو میری خوشی بھی دیدنی تھی۔شعبہ اردو کے جن اساتذہ کو صرف دور سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا آج وہ سب میرے روبرو تھے اور مجھے ان سے کسب فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔شعبہء اردو کے تمام اساتذہ سے مجھے کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ جب میرے ایم فل اردو کے مقالہ کی بات چلی تو میری نگران ڈاکٹر عذرا لیاقت مجھے جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان کی مشہور شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر عذرا لیاقت کی زیر سرپرستی اس موضوع پر کام کرنے کی رضامندی ظاہر کر دی اور میرا موضوع ''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' طے پایا۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق بلوچ قبیلہ سے ہے۔ دوران تحقیق ان کے جو شعری مجموعے میرے شامل حال رہے ان میں ''پھول سے بچھڑی خوشبو''، ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، ''اور شام ٹھہر گئی'' اور پھول خوشبو اور تارہ'' ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ڈیرہ غازی

خان کا ایک خوش نما ادبی چہرہ ہیں۔ وہ ایک قابل ڈاکٹر، شاعرہ اور ڈیرہ غازی خان کی ادبی تنظیم ''آنچل'' کی IMP کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ کی ادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ دوران تحقیق ڈاکٹر صاحبہ نے ہر طرح سے میری راہنمائی کی۔ ڈاکٹر صاحبہ سے ذاتی طور پر مجھے اپنی مصروفیات میں سے میرے لیے وقت نکالا۔ اس تعاون اور محبت و شفقت کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔ میں اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر عذرا لیاقت صاحبہ کی بھی انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے ہر مرحلہ پر میری راہنمائی فرمائی اور مجھے اپنی زیر نگرانی ایم فل اردو کا مقالہ لکھنے کے لیے منتخب کیا۔ یہ ان کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی کا نتیجہ ہے کہ میں اپنا مقالہ بروقت مکمل کر سکی۔ تحقیق کے لیے درکار کتابوں کے لیے انہوں نے میری راہنمائی فرمائی۔ کبھی مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی۔ ہمیشہ میری بات کو توجہ سے سنا اور جہاں راہنمائی کی ضرورت پیش آئی میری مدد فرمائی۔ ا؟ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے (آمین!)

اس کے علاوہ میں سربراہ شعبہ اردو پروفیسر یاسمین صاحبہ اور اپنی دیگر اساتذہ ڈاکٹر شگفتہ حسین، ڈاکٹر عصمت ناز اور ڈاکٹر شاہدہ رسول کی بھی تہ دل سے ممنون ہوں۔ جن دوستوں نے اس مقالے کے لیے مواد کی تلاش میں میری مدد فرمائی ان کی بھی بے حد ممنون ہوں جن میں محترمہ سدرہ غوث صاحبہ جنہوں نے میری قدم قدم پر حوصلہ افزائی کی۔ میری بہن فرزانہ علی جنہوں نے میری ہمت بندھائی اور دوران تحقیق مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

محمد ندیم جو ہر وقت میرے اس کام کو پایہ تکمیل کو پہنچانے میں کوشاں رہے اس کے لیے خواہ کسی لائبریری جانا ہو یا کمپوزر کے پاس وہ ہمہ وقت تیار رہتے۔ ا؟ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی عمر دراز فرمائے (آمین!)۔ میں اپنی ان مہربان دوستوں کی بھی مشکور ہوں جن کی دعاؤں نے مجھے یہ حوصلہ بخشا کہ میں اپنے ایم۔فل اردو کے مقالہ

کو مکمل کرنے کی قابل ہوئی جن میں نگہت آراء، سعدیہ رحیم، معصومہ بتول، اور رافعہ طارق شامل ہیں۔ میں تہہ دل سے ان سب کی احسان مند ہوں کیونکہ اگر ان سب کی راہنمائی اور محبت میرے شامل حال نہ ہوتی تو میں اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر تھی۔

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

خلاصہ:

عہد موجود کی جدید اردو شاعری کو تخلیقی ذہن اور منفرد مشق سخن سے سرفراز کرنے کیلئے آج کے نو جوان شعرا بڑا کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر شعری ادب کو نئے سماجی، ذہنی اور ثقافتی علم سے روشناس کروا رہے ہیں۔ نجمہ شاہین کھوسہ ان نوجوان شعری اذہان میں سے ایک ہیں وہ پیشہ کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے شاعری نے ان کے ساتھ ہی جنم لیا ہے۔ شاعرانہ عمل سے گزرنے کیلئے انہیں کسی سخت مشق سے نہیں گزرنا پڑتا وہ اس سہولت کے ساتھ شاعرانہ عمل سے گزرتی ہیں کہ لفظ ذہن میں آتے جاتے ہیں اور وہ ان کو شاعری میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ تحقیقی مقالہ بعنوان ''نجمہ شاہین کھوسہ کا شعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول کا تعلق شاعرہ کی سوانح عمری سے ہے وہ ایک جانی پہچانی اور تجربہ کار ڈاکٹر اور شاعرہ ہیں اب تک ان کی شاعری کی چار کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی شاعری کی چار کتب یہ ہیں۔

1. پھول سے بچھڑی خوشبو
2. میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
3. اور شام ٹھہر گئی
4. پھول اور خوشبو اور تارا

شاعری کی چاروں کتب زیادہ تر نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے آزاد نظم، نظم معریٰ اور چند نثری نظمیں بھی لکھیں ہیں۔

باب دوم جدید اردو شاعری کی روایت سے متعلق ہے باب دوم دو اجزاء پر مشتمل ہے جزو اول جدید اردو کی نظم کی روایت پر مشتمل ہے اور جزو دوئم جدید اردو غزل کی روایت پر مشتمل ہے۔ جدید اردو نظم اور غزل کی روایت ان شعرا کی طویل داستان ہے جنھوں نے نئی شاعری کے جنم سے اکیسویں صدی تک اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اس باب کا تعلق ان شعراء سے بھی ہے جنھوں نے اردو شاعری میں نظم کی مختلف اصناف اور ہیئتوں کو متعارف کرایا ہے۔ یہاں اس شاعرانہ روایت کا مختصراً بیان ہے پاکستان اور جنوبی پنجاب کے شعرا کا مختصر بیان بھی اس باب میں مذکور ہے۔ جدید ادب کے ادبی تناظر میں نجمہ شاہین کھوسہ کے مقام اور شاعرانہ قد وقامت کا تعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

باب سوم میں نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں کا تجزیہ شاعری کی چاروں کتب سے لی گئی مثالوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کی نظمیں زیادہ تر عشق ومحبت، ہجر، تصوف، غم جاناں اور غم دوراں سے متعلق ہیں۔

باب چہارم ان کی غزل کی شاعری کے متعلق ہے یہ باب ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی چاروں کتب کی غزلوں کے فنکارانہ اور تجزیاتی مطالعہ سے متعلق ہے۔ محبت، جدائی کے غم، تصوف، محبوب کی یاد، ان کی غزلوں کے اہم موضوعات ہیں۔

باب پنجم محاکمہ کا ہے۔ تمام تحقیقی مقالے کے دوران زیر بحث موضوعات کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔

•"Dr. Najma Shaheen Khosa ke shairi ka Tehqiqi-o-Tanqidi Jaiza"

Supervisor: Dr. Azra Liaqat

Abstract

To enrich the poetry of the present age with their creative intellect and unique practice in poetry, the young poets of today are making great contribution. They are making contemporary poetic literature aware of new social, intellectual and cultural knowledge. Najma Shaheen Khosa is one of such young poetic minds of Dera Ghazi Khan. She is a doctor by profession. It seems as if poetry is born with her. She does not involve in the poetic process by doing any hard practice. She involves in the art of poetry with so much convenience. That the words come into mind and she transforms them into verses.

The research work with the title "Doctor Najma Shaheen Khosa ke Shairi ka Tehqiqi-o-Tanqidi Jaiza" has been divided Into five chapters. First chapter deals with the biography of the poetess. She is recognized as an experienced Doctor and poetess. Her four books of poetry have come to the fore front up till now.

Her four books of poetry are "Phool se Bichri Khushboo", "Main Aankhen Band Rakhti Hoon", "Aur Sham Thaher Gai" and "Phool, Khushboo Aur Tara" all the four books of poetry mostly contain

poems and Ghazals.

She has tried on writing Free Verse, Blank Verse and few prose poems.

Chapter two is about tradition of modern Urdu poetry. Chapters two consists of two parts. Part 1 is consisted of tradition of new poem and part two is about the tradition of new Ghazal.

Tradition of the Moderns poem and Ghazal is a long story of those poets who have played their role from the inception of new poetry to the 21st century modern poetry. The chapter also deals with those poets who have introduced different genres and forms of verse into Urdu poetry. Here is a short description of this poetic tradition. A brief description of the poets of Pakistan and particularly south Punjab has also been given in this chapter. An effort has also been done to determine the place and poetic stature of Najma Shaheen Khosa in the literary perspective of modern age.

In chapter 3, Analysis of the poems of Najma Shaheen Khosa has been done with the examples from all the four books of poetry. Her poems mostly deal with the topics of Love, Separation, Mysticism Sorrow of the beloved and sorrows of the age.

Chapter four, deals with her poetry of Ghazal. This chapter is an artificial and Analytical study of Ghazals of all the four books of Dr. Najma Shaheen Khosa. Love, Sorrow of separation, mysticism, memory of the beloved are the major topics of her Ghazals.

Fifth chapter is of conclusion. An effort has been made to draw the results on the basis of topics under discussion throughout the research work.

باب اوّل

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (سوانح اور شخصیت)

ا۔خاندانی پس منظر

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق ضلع ڈیرہ غازی خان کے نواحی گاؤں ''جندانی والا'' سے ہے (ا)۔آپ کے آباؤ اجداد یہاں عرصہ دراز سے مقامی اور سکونتی چلے آ رہے تھے۔وہ صدیوں سے اس علاقے میں آباد تھے۔آپ کا تعلق ڈیرہ غازی خان کی بلوچ قوم کی ایک شاخ ''کھوسہ بلوچ'' سے ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دادا ''پیر بخش کھوسہ'' اپنے علاقے کی جدی پشتی زمین دار تھے۔اہلِ علاقہ میں ان کا شمار ایک اہم شخصیت کے طور پر ہوتا ہے۔کھوسہ بلوچ خاندان پاکستان کی سیاست میں بھی بہت فعال رہا ہے۔اس خاندان کے افراد مختلف سرکاری اعلیٰ عہدوں پر بھی کام کر رہے ہیں۔

پیر بخش کھوسہ کے سات بچے تھے جن میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔گاؤں کے رواج کے مطابق بیٹیوں کو ہمیشہ تعلیم سے دور رکھا گیا۔جبکہ تین بیٹے تعلیم یافتہ ہیں۔ایک بیٹے کو آپ کے دادا نے اپنے ساتھ کاشت کاری میں شامل رکھا جس کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے والد کا نام ''جان محمد کھوسہ'' ہے۔جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ایک تایا اسکول ٹیچر ہیں جبکہ دوسرے تایا اور آپ کے والد اپنی زمینوں کی کاشت کے ساتھ ساتھ دیگر کاروبار بھی کرتے رہے ہیں۔

آپ کے والد جان محمد کھوسہ کا بھائیوں میں آخری نمبر ہے۔وہ ایک پڑھے لکھے،

باشعور اور علم دوست انسان ہیں۔ان کی علم دوستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے گاؤں میں سرکاری اسکول نہیں تھا اور گاؤں کے طلبہ و طالبات کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوسرے گاؤں جانا پڑتا تھا۔ڈاکٹر نجمہ شاہین اپنے والد صاحب کے حوالے سے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

> ''آپ نے جب ہوش سنبھالا تو سرکاری اسکول کی کمی کو دور کرنے کے لیے آپ کے والد نے اپنی ذاتی زمین وقف کر کے حکومتِ پنجاب کے محکمہ تعلیم سے اسکول کی منظوری لی۔یہ اسکول آج بھی ''گورنمنٹ پرائمری سکول تکیانی'' کے نام سے موجود ہے جو بستی جندانی میں واقع ہے۔اب تک یہاں سے ہزاروں طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔'' (۲)

آپ کے والد جان محمد کھوسہ کے چار بچے ہیں جو دو بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہیں۔بہن بھائیوں کے نام بل ترتیب محمد سلیم کھوسہ، خلیل احمد کھوسہ سلمیٰ شاہین کھوسہ اور نجمہ شاہین کھوسہ ہیں۔آپ کی والدہ امیر بیگم پٹھان خاندان سے ہیں۔آپ کے بڑے بھائی محمد سلیم کھوسہ ایڈووکیٹ اور چھوٹے بھائی خلیل احمد کھوسہ ایم ایس سی سول انجینئرنگ پاس ہیں۔

آپ کے والد کاشت کاری کے علاوہ کراچی میں ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتے تھے اور بعد میں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔کچھ عرصہ قبل کراچی سے ڈیرہ غازی خاں اپنے شہر میں واپس آ گئے اور اپنے ہی شہر میں ٹریول ایجنسی کھول لی۔یہ ایجنسی ''عرب ٹریول ایجنسی'' کے نام سے مشہور ہے اور ڈیرہ غازی خاں اور گرد و نواح کے لوگوں کے لیے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ڈیرہ غازی خاں کے میئر کے والد، آپ کے والد کے دوست تھے وہ بھی اس کمپنی میں شراکت دار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔آپ کے والد جان محمد کھوسہ ایک زیرک اور مسائل و واقعات کو سمجھنے والے انسان ہیں اور اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کی غرض سے شہر لے

آئے۔انھوں نے حتی لامکان کوشش کی کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ جائے۔اس مقصد میں وہ کامیاب ہوئے،ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ایک بیٹا وکیل (محمد سلیم کھوسہ) اور ایک انجینئر (خلیل احمد کھوسہ) ہے۔ایک بیٹی ڈاکٹر اور دوسری ایک سلمیٰ شاہین کھوسہ ایم ایس سی ''سیاسیات'' ہے،اور گھریلو خاتون ہے۔غرض یہ کہ ان کا خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی تربیت کا حامل ہے۔

۲۔پیدائش اور بچپن

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ پانچ دسمبر 1973ء کو ڈیرہ غازی خاں کی نواحی بستی ''جندانی والا'' میں پیدا ہوئیں۔آپ اپنے والد کی تیسری اولاد ہیں۔آپ کے دو بھائی محمد سلیم کھوسہ، خلیل احمد کھوسہ اور ایک بہن سلمیٰ شاہین کھوسہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔

ڈیرہ غازی خاں کے وڈیرہ شاہی نظام میں بچیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔آپ کے والد ایک پڑھے لکھے اور سمجھ دار انسان ہیں۔انھوں نے محسوس کیا کہ تعلیم حاصل کرنا بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کا بھی برابر کا حق ہے۔اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی دونوں بیٹیوں کو ڈیرہ غازی خاں شہر میں بھیج دیا۔ڈیرہ غازی خاں شہر میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ننھیال تھے۔بیٹیوں کا بچپن میں والدین اور بہن بھائیوں سے دور ہونا کسی قربانی سے کم نہیں ہوتا۔شاید اس قربانی کا اثر ہے کہ آج ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ پڑھ لکھ کر اپنی ایک منفرد اور جداگانہ پہچان بنا چکی ہیں۔اپنی تعلیم اور پیشے کی بدولت انھوں نے اپنا جو مقام بنایا ہے وہ نہ صرف معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے بلکہ ان کے خاندان کی عزت کا سبب بھی بنا ہے۔اپنی پیدائش اور بچپن کے بارے میں ایک انٹر ویو میں کہتی ہیں:

> ''میں ۵ دسمبر 1973ء کو ڈیرہ غازی خاں کی نواحی بستی ''جندانی والا'' میں پیدا ہوئی۔میرا بچپن بہت سنجیدہ گزرا۔مجھے یاد نہیں کہ کبھی کھیل کود میں بھی وقت گزرا ہو۔بس اتنا یاد ہے کہ میرا میری کزنوں سے یہ مقابلہ رہتا تھا کہ کام کس نے زیادہ کیا ہے۔میرے والد کا نام جان محمد کھوسہ اور امی کا نام امیر بیگم ہے۔یہ والدین کی تربیت اور قربانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم چاروں بہن بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اچھے اچھے عہدوں پر موجود ہیں۔''(۳)

۳۔تعلیم و تربیت

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی ابتدائی تعلیم کے حصول کے لیے گورنمنٹ پرائمری اسکول'' جندانی والا''تحصیل و ضلع ڈیرہ غازی خاں میں داخلہ لیا۔ابھی آپ تیسری جماعت میں تھیں کہ آپ کے والدین نے دونوں بہنوں کو ننھیال بھیج دیا۔آپ کا ننھیال ڈیرہ غازی خاں شہر میں تھا اس لیے شہر میں تعلیم و تربیت کا بہتر طریقے سے ہونا یقینی تھا۔پرائمری پاس کرنے کے بعد جب آپ نے ہائی اسکول میں داخلہ لیا تو آپ کے والدین بھی شہر میں منتقل ہو گئے۔آپ نے میٹرک کا امتحان شہر کے بہترین سرکاری ادارے گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر۲ سے 1988ء میں پاس کیا۔اس کے بعد آپ نے گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین ڈیرہ غازی خاں سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔اسکول اور کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی آپ پیش پیش رہتی تھیں۔اسکول و کالج میں ہم نصابی سرگرمیوں کی بدولت اعزازات اور انعامات بھی حاصل کیے۔ہائی اسکول میں آج بھی آپ کا نام پرنسپل آفس میں چسپاں ایک بورڈ پر موجود ہے۔تعلیم کے زمانہ میں آپ کو اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا جس سے آپ ایک ہونہار طالبہ کے طور پر جلوہ گر ہوئیں اور اپنی محنت کے بل بوتے پر اساتذہ کی نظر میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی تھیں۔

میڈیکل کے شعبہ سے ایف ایس سی کرنے کے بعد آپ نے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں MBBS میں داخلہ لیا اور 1995-96ء میں میڈیکل کا امتحان پاس کر کے کالج میں ہی گائنی کالوجسٹ کے طور پر میڈیسن میں ہاؤس جاب مکمل کی۔ہاؤس جاب کے مکمل ہونے کے فوراً بعد ہی ملازمت ہوگئی۔

۴۔ملازمت کی تفصیل

ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد جنوری 1997ء میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال ڈیرہ غازی خاں میں بطور میڈیکل آفیسر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔میڈیکل کی ملازمت کے پس منظر میں نجمہ شاہین کھوسہ کی محنتِ شاقہ اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ان کے والد کی قربانیوں اور نگرانی کی جھلک واضح تھی۔والدین کی اچھی تربیت اور تعلیم میں دلچسپی کی بدولت آپ اس مقام پر فائز ہوئیں۔اس مقام تک ان کے گاؤں کی کوئی لڑکی نہیں پہنچ سکی۔یہ اعزاز صرف ڈاکٹر نجمہ شاہین کو حاصل ہے۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ نے شہر میں ایک پرائیویٹ ہسپتال بھی کھول لیا جو ''جان سرجیکل ہسپتال'' کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ہسپتال کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر آپ کے لیے اپنی ملازمت جاری رکھنا مشکل ہو گیا تو آٹھ سال کی ملازمت کے بعد اپنی نوکری سے استعفیٰ دے کر اپنی ساری توجہ پرائیویٹ ہسپتال پر مرکوز کر لی۔آج ڈیرہ غازی خاں کے ان بہترین ہسپتالوں میں ان کا شمار ہوتا ہے جن میں ہر بیماری کا علاج ایک ہی چھت کے نیچے ہوتا ہے۔اپنی ملازمت، استعفیٰ اور نجی ہسپتال کے حوالے سے وہ ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

> ''ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی 1997ء جنوری کو میں نے ڈیرہ غازی خاں DHQ سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔دو ماہ بعد شادی ہوئی تو فوراً ہی پرائیویٹ کلینک بھی شروع کر دیا جو آج ڈیرہ غازی خاں میں ''جان سرجیکل ہسپتال'' کے نام سے کام کر رہا ہے۔میں نے گورنمنٹ جاب سے ۸ سال ملازمت کرنے کے بعد استعفیٰ دے دیا اور ساری توجہ اپنے پرائیویٹ ہسپتال پر دی۔الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے بھرپور کامیابی دی۔''(۴)

۵۔شادی اور اولاد

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شادی گیارہ اپریل 1997ء کو اُن کی اپنی برادری میں

ہوئی۔اُن کے خاوند غلام فرید کھوسہ اُن کے پھوپھی زاد ہیں۔شادی قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ڈیرہ غازی خاں کے مضافات میں آج بھی مختلف برادریوں میں وڈیرہ شاہی نظام رائج ہے۔سب لوگ اپنے رشتے اپنی اپنی برادری میں کرتے چلے آ رہے ہیں۔لوگ اپنی بیٹیوں کا رشتہ غیر خاندان میں دینا توہین سمجھتے ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کے شوہر غلام فرید کھوسہ ایک تعلیم یافتہ انسان ہیں۔الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی ایس کیا ہے اور ایک سیمنٹ فیکٹری میں بطور انجینئر ملازمت کرتے ہیں۔وہ کھوسہ برادری میں ایک اہم فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے والدین اور آباؤاجداد جدی پشتی زمین دار ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دو بیٹے ہیں۔آج کل حمزہ فرید کھوسہ سول انجینئرنگ کے سلسلے میں امریکہ میں زیرِ تعلیم ہیں جبکہ محمد عمر فرید یونی ورسٹی آف انٹرنیشنل سکول آف میڈیسن، کرغستان (I.U.K) سے M.B.B.S کر رہے ہیں۔میاں بیوی کے پڑھے لکھے اور ملازمت پیشہ ہونے کے سبب ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت بھی احسن طریقے سے ہو رہی ہے۔

۶۔شاعری کا آغاز

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری کا آغاز 1996ء سے کیا۔آغاز میں ڈائری لکھتی تھیں۔ڈائری لکھنے کے شوق نے انھیں شاعری کی طرف راغب کیا جو کہ مستند شاعرہ کے روپ میں جلوہ گر ہوئیں۔اپنی شاعری کے آغاز کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''دن بھر کے کاموں کے بعد کوئی کتاب پڑھنا یا ڈائری لکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔یوں سمجھیں ڈائری میری سہیلی بن چکی تھی۔آہستہ آہستہ ڈائری میں لکھے لفظ شاعری کی صورت اختیار کر گئے۔یوں تو میں 1996ء سے لکھ رہی ہوں بلکہ اس سے بھی پہلے میری چھوٹی موٹی کاوش نشتر میڈیکل کے ادبی میگزین کا حصہ بنتی تھیں۔لیکن میں اپنی پہلی نظم 1996ء میں لکھی ہوئی ''ملاقات آخری'' کو قرار دیتی ہوں۔''(۵)

لکھنے لکھانے کے سلسلے کو دس سال کا عرصہ مکمل ہونے کے باوجود بھی آپ کا کوئی

شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہ آ سکا۔ 2007ء میں کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے سفر پر جارہی تھیں کہ راستے میں حادثے کا شکار ہوگئیں۔ دو ماہ بسترِ مرگ پر پڑے رہنے کی وجہ سے بہت مضمحل ہوگئیں۔ اپنی مصروف ترین زندگی کو دو ماہ تک اکیلے ایک بستر پر گزارنا آپ کے لیے بہت کٹھن تھا لیکن اس عرصے میں اپنی سابقہ لکھی ہوئی تحریریں اور ڈائریوں کی ورق گردانی کے نتیجے میں شاعری ترتیب دی۔ اپنے علاقے کے ایک سرائیکی شاعر ''محمد رمضان طالب'' کی کوششوں اور فرمائش کی بدولت آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' جولائی 2007ء میں شائع ہوا اور اب تک آپ کی چار کتب ''پھول سے بچھڑی خوشبو''، ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، ''اور شام ٹھہر گئی'' اور'' پھول، خوشبو اور تارہ'' شائع ہو چکی ہیں۔ جبکہ ایک ناول اور ایک شعری مجموعہ ابھی زیرِ ترتیب ہیں۔ امید ہے کہ مستقبل قریب میں نہ صرف متذکرہ بالا کتب شائع ہوں گی بلکہ دیگر تخلیقات کی آمد بھی ہو سکتی ہے۔

۷۔ تصانیف

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی اب تک چار کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں جو بالترتیب پھول سے بچھڑی خوشبو، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں، اور شام ٹھہر گئی، پھول خوشبو اور تارہ، ہیں شاعری میں غزل اور نظم لکھتی ہیں۔ ان کی شاعری میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے ملے جلے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ دیگر کئی منفرد موضوعات بھی ان کی شاعری میں موجود ہیں، جنھیں وقتاً فوقتاً پیش کیا جائے گا اور مکمل تفصیل آئندہ صفحات میں دی جائے گی۔ ذیل میں ان کی تصانیف کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے جس میں ان کی چار مطبوعہ کتب پر تبصرہ اور تعارف پیش کیا جائے گا۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

i۔ پھول سے بچھڑی خوشبو

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا پہلا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' جولائی 2007ء میں فرید ادبی سنگت کے تعاون سے شائع ہوا۔ ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ انتساب کی عبارت ''میرے پیارے دوستوں اور

اپنوں کے نام جو میرا آغاز بھی ہیں اور انجام بھی'' کے الفاظ پر مشتمل ہے حیرت کی بات ہے کہ موصوفہ نے اپنے پہلے شعری مجموعہ میں کسی شاعر یا ادیب کی رائے شامل نہیں کی۔ شاعرہ کو اپنی شاعری اور ذات پر اتنا اعتماد ہے کہ اسے کسی کی گواہی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ حالانکہ دورِ حاضر میں شاید ہی کسی کا پہلا شعری مجموعہ ہوگا جو کسی کی رائے کے بغیر شائع ہوا ہو۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے'' کچھ باتیں کچھ یادیں'' کے عنوان سے ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل خود ہی کتاب کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پھول سے بچھڑی خوشبو بچھڑی محبتوں کی راکھ ہے یا خوشبو، یقین اور بے یقینی کی ایک کیفیت، ٹوٹے اور بکھرے خوابوں کا عکس، بکھرے خواب جو زندگی کے لمحے لمحے پر محیط ہو جائیں۔ جو عہدِ فردا اور عہدِ رفتہ کے درمیان ایک پل بن جائیں۔ نہ ٹوٹنے والی زنجیر کی مانند جو ہر لمحے کو اپنے اندر جکڑ لے۔'' (۶)

اس طرح مجموعے کی اشاعت کے بارے میں کہتی ہیں:

> ''اس کتاب کی اشاعت میں کبھی نہ کرواتی اگر میرے والدین اور گھر والوں کا تعاون نہ ہوتا اور میرے مہربان استاد حاجی محمد رمضان طالب صاحب کا اگر تعاون نہ ہوتا۔ میں ان لفظوں کی اشاعت کے حق میں نہ تھی، جو میری سوچوں اور جذبوں کا عکس ہیں مگر ایک بہت بڑے حادثے نے اس کو منظر پر لانے میں مدد کی۔ جب ان لوگوں کو پرکھنے کا موقع ملا کہ جو ذہن و دل میں ہمیشہ سے اپنے بنا کر رکھے تھے۔ تب اندازہ ہوا کہ اس دنیا میں جذبوں کی قدر نہیں سب ضرورتوں میں چھپا ہے اور شاید ہم بھی کبھی ضرورت تھے۔'' (۷)

پھول سے بچھڑی خوشبو میں شاعرہ نے غزل اور نظم کی صورت میں اپنے تجرباتِ زندگی کو پیش کیا ہے اولین شعری مجموعہ ہونے کی بدولت کچھ نظمیں بحور سے جدا جدا بھی لگتی

ہیں۔اگر انھیں نثری نظمیں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔مثال کے طور پر پس ورق پر دیے گئے دو اشعار کو موزوں کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن شعر بے وزن ہیں، چند اشعار دیکھیں:

اجڑے ہوئے لوگوں سے نہ پوچھ داستانِ زیست
راہِ وفا ویراں راستوں کی دھول بن گئے

سچائی عشق کیا ڈھونڈتی ہے تو اس زمانے میں
وہ اور وقت تھا جب انگارے پھول بن گئے

مندرجہ بالا اشعار میں صرف قافیہ ردیف ملانے کی کوشش کی گئی ہے اور ترتیبِ الفاظ اور بحر کو جاری رکھنا شاعرہ سے مشکل ہو گیا ہے۔''پھول سے بچھڑی خوشبو'' میں آزاد نظمیں، پابند نظمیں، نثری نظمیں اور چند غزلیں شامل ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس میں مشقِ سخن ناپختہ نظر آتی ہے تاہم جذبات اور خیالات کا بہاؤ بہر حال ہر جگہ موجود ہے۔نظموں میں اپنے بچپن اور ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔غزلیں کلاسیکی اور جدید اصولوں کے تحت ہیں جو مجموعے کی خوبصورتی کا سبب ہیں۔ایک غزل کے چند اشعار دیکھیں:

کوئی تو ہے مکیں اور کوئی تو ہے بسا ہوا
جو دل میں ایک درد ہے دبا ہوا چھپا ہوا

بدلتے موسموں میں گر بھلا دیا مجھے تو کیا
مرا تو شعر ہے تمھاری یاد میں ڈھلا ہوا

رگوں میں خون کی طرح ہے گرچہ تو رچا ہوا
میں ساحلوں پہ اس کا نام لکھ رہی ہوں اس لئے

x x x x x x x x x x

کہ جانتی ہوں میرا لفظ لفظ ہے مٹا ہوا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیں نظموں کے مقابلے میں عمدہ ہیں اگرچہ انھیں نظمیں کہنا پسند ہے لیکن میرے خیال میں غزل گوئی پر ان کی گرفت خوب ہے۔کتاب کی اشاعت کے بارے میں عاصی صحرائی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہتی ہیں:

''سرائیکی کے ایک بزرگ شاعر چاچا رمضان طالب ایک دن میری عیادت کو آئے۔انھوں نے ضد کی کہ میری شاعری کے حصے کو ایک کتاب کی صورت میں آنا چاہیے۔میں نے اپنی اس کتاب کا نام اپنی ایک نظم ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' سے لیا۔یوں ایک ڈاکٹر ایک شاعرہ کے روپ میں سامنے آئی۔''(10)

یوں ڈیرہ غازی خاں جیسے دور دراز خطے میں بیٹھ کر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی اردو شاعری کا آغاز مجموعہ ہٰذا سے کیا۔اس کتاب میں وہ نووارد ہیں لیکن تھک ہار کر بیٹھنے کی بجائے انھوں نے اپنا شعری سفر جاری رکھا اور آج ان کی متعدد کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کو علمی و ادبی حلقوں نے خوش آمدید کہا۔ڈیرہ غازی خاں میں پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے اس کی باقاعدہ تقریبِ رونمائی کروائی جو علمی و ادبی حلقوں میں شاعرہ کی پہچان بنی۔یہ پہلا قدم شاعرہ کے لئے اہم موڑ ثابت ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تخلیقات آنا شروع ہو گئیں۔

ii۔ میں آنکھیں بند رکھتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دوسرا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کے زیرِ عنوان سے ہے جو خزینۂ علم و ادب لاہور کے اہتمام سے اپریل 2010ء کو منظرِ عام پر آیا۔دو سو آٹھ صفحات پر اس کتاب کا مختصر دیباچہ شاعرہ نے خود تحریر کیا ہے۔ٹائٹل کے پہلے فلیپ پر سعد اللہ شاہ کی رائے تحریر ہے جبکہ پس ورق کے اندرونی حصہ پر شاعرہ کی غزل درج

ہے۔ اس کے علاوہ پس ورق پر بھی ایک غزل کے تین اشعار تحریر ہیں۔ سعد اللہ شاہ نجمہ شاہین کی شاعری اور فن پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جبکہ اولین شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' قارئین کی رسائی اور پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ کا شمار ان ڈاکٹرز میں ہوتا ہے جو اپنے شعبے سے جنون کی حد تک عشق کرتے ہیں اور انسانیت کی خدمت کے لیے ہمہ تن مصروف کار رہتے ہیں۔ شاعری تخلیق کار کی جبلت کا وہ پہلو ہے جو کسی بھی مصروفیت، دباؤ یا رکاوٹ کے باوجود پنہاں نہیں رہ سکتا۔ اسے اظہار پانا ہی ہوتا ہے کہ فطرت اس انکشاف کی منتظر رہتی ہے۔ بہر حال میں انھیں ان کے شعری مجموعے ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' پر مبارک دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ ایسے ہی دھان گیان کی منزلیں طے کرتی رہیں گی۔''(۱۱)

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کا انتساب منظوم صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے شاعرہ نے اپنے بچپن کی یادوں اور بچھڑے ساتھی کے لیے ایک پیغام بھیجا ہے اور اپنے محبوب کو تاکید کی ہے کہ وہ کتاب کا انتساب ضرور پڑھے۔ انتساب ملاحظہ ہو:

اسے کہو جب بھی وہ میری تصویر دیکھے
میری آنکھوں میں چھپے گرداب پڑھ لے

مرے بے رنگ ہونٹوں کی خموش زباں کو سمجھے
اور میری رویدہ پیشانی مانندِ کتاب پڑھ لے

میرے اوراق میں بکھرے ہوئے لفظوں کو سمیٹے
گردشِ دوراں سے جو ملے وہ عذاب پڑھ لے

میرے شب و روز کا محور ہے اس کا ہجر و فراق
دشتِ جنوں میں جو پائے ہیں وہ عتاب پڑھ لے

اسے کہو کہ میری روح کے کرب کو بھی سوچے
ظلمتِ دوراں نے جو کیے برباد میرے وہ خواب پڑھ لے

اسے کہو میں اس کے ذکر میں رہوں نہ رہوں
وہ ہے میرا حرف طلب، میرا انتساب پڑھ لے

مجموعہ ہٰذا پہلی کتاب سے مماثلت رکھتا ہے کیونکہ اس کتاب میں بھی حمد، نعت اور دعا کے علاوہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں لیکن یہاں اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ نظموں اور غزلوں کے لیے الگ الگ گوشے ترتیب دیے گئے ہیں جن سے نظموں اور غزلوں کی تعداد کا تعین با آسانی کیا جا سکتا ہے۔ منظوم انتساب کو داد و تحسین دیتے ہوئے برطانیہ میں مقیم معروف شاعر منور احمد کنڈے رقم طراز ہیں:

''خزینۂ علم و ادب لاہور کے زیرِ اہتمام شائع شدہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا مجموعہ کلامِ ثانی ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' تین صد سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ دنیائے سخن وری میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جس میں انتساب کو بھی منظوم کیا گیا ہے۔ نجمہ شاہین کی یہ کتاب بھی انھی میں سے ایک ہے۔ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کا گراں کتابی رنگ و روپ اور اس میں موجود معیارِ نظم دونوں سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی حسنِ ظاہری سے بھی اور بیانِ باطنی سے بھی دورانِ مطالعہ حظ اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ سخن وری کے گلہائے حقیقت کی مہکِ پیہم دل و دماغ کو معطر کرتی غزل میں خیالات کی پختگی اور نظم میں موضوعات کے تنوع کی موجودگی تخلیقات کو مزید زورآور بنا رہی ہیں۔''(31)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے پہلے شعری مجموعے اور اس کتاب کا موازنہ کیا جائے تو ان میں فکر وفن دونوں حوالے سے بہت فرق نظر آتا ہے۔ کتاب ہٰذا میں ان کا فن کھل کر سامنے آیا ہے اور فکری حوالے سے بہت سے نئے مضامین بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو ان کی قابلیت اور مشقِ سخن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پروفیسر بشریٰ اعجاز ان کے فکر وفن کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''نجمہ شاہین کھوسہ نے یہ کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ بنجر اور پتھریلی زمین پر اُگنے والا یہ پودا ایک تناور درخت بن جائے گا اور اپنی شاخیں کوسوں دور تک پھیلائے گا۔ طب اور ادب کے میدان میں نمایاں مقام پانے والی ڈاکٹر نجمہ شاہین ہمارے علاقے کی وہ خوش قسمت تخلیق کار ہے جسے محسن نقوی کے بعد ادب اور ادب شناس لوگوں کی دنیا میں بے انتہا پذیرائی ملی اور کیوں نہ ملتی اس نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' سے ''اور شام ٹھہر گئی'' تک شعری پختگی کا سفر بہت جلد طے کیا ہے۔''(14)

مجموعی طور پر اس مجموعے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک پختہ شاعرہ کے روپ میں سامنے آئی ہیں۔ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کتاب میں فکر وفن کا مظاہرہ عمدہ انداز میں کیا گیا ہے۔ خیالات کی پختگی، فن کی بلندی اور پیکر تراشی میں یہ مجموعہ پہلے مجموعے سے قدرے مختلف اور بہتر ہے۔ ذیل میں ان کے تیسرے شعری مجموعہ اور شام ٹھہر گئی کا تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

iii۔ اور شام ٹھہر گئی

''اور شام ٹھہر گئی'' ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جسے 2013ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کیا ہے۔ انتساب کی عبارت یوں ہے:

> ''امی ابو اور عمر حمزہ کے نام جو میرے جیون کا بہانہ ہیں اور ان دکھوں کے نام جو سرمایہءحیات ہیں۔''(15)

انتساب سے پہلے صفحہ پر مصنفہ کے دو اشعار تحریر ہیں جو ان کی پختہ شاعری کی گواہی دے رہے ہیں۔ اشعار یوں ہیں:

اجنبی شہر کی اجنبی شام میں
زندگی ڈھل گئی ملگجی شام میں

آخری بار آیا تھا ملنے کوئی
ہجر مجھ کو ملا وصل کی شام میں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کتنی اہم ہے اس کا جواب کتاب میں موجود چند نامور شعراء و ادبا کے دیباچے ہیں۔ کتاب مذکورہ پر اظہارِ خیال کرنے والے شعراء و ادباء بالترتیب امجد اسلام امجد، بشریٰ رحمٰن، شاکر حسین شاکر، رضی الدین رضی، قمر رضا شہزاد، اور جاوید احسن ہیں جنھوں نے موصوفہ کی شاعری خصوصاً ''اور شام ٹھہر گئی'' پر تفصیلی تبصرے کیے ہیں۔

مجموعہ ہٰذا میں حمد، نعت اور سلام کے بعد نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ مصنفہ غزل اور نظم دونوں پر طبع آزمائی کرتی ہیں لیکن کتاب ہٰذا میں تین نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔ شاعرہ کے پہلے دو شعری مجموعے اظہارِ خیال یا آراء سے خالی ہیں جبکہ مجموعہ ہٰذا شاعرہ نے ملک کے نامور شعراء وادباء سے مضامین لکھوائے جو ان کے فن کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ کتاب ہٰذا میں غزلیں اور نظمیں کمال کی ہیں جو شاعرہ کے فنی وفکری عروج کی مثال ہیں۔ حسنین ساحر اس کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اور شام ٹھہر گئی'' ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا حال ہی میں منظر عام پر آنے والا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو حمد، نعت، غزلوں اور گیتوں پر مشتمل رنگا رنگ خیالات کا عکاس ہے۔ چونکہ ان کی غزل معروضی حالات کا صاف

شفاف آئینہ ہے اس لیے اس کے بین السطور خود اپنی زندگی اور معاشرتی اقدار کی سچی اور منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔'' (17)

اور شام ٹھہر گئی کے موضوعات محبت، ہجر و فراق، وصال کی خواہش، دیہاتی زندگی سے عقیدت، غمِ دوراں کی تڑپ اور دیگر موضوعات ہیں۔ فنی حوالے سے دیکھا جائے تو شاعرہ نے سوائے چند نثری نظموں کے شاعری کے کمال دکھائے ہیں۔ تیسرے مجموعے تک آتے آتے موصوفہ کے فن میں پختگی اور نکھار نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کے بارے میں شاعرہ خود لکھتی ہیں:

''پھول سے بچھڑی خوشبو اور میں آنکھیں بند رکھتی ہوں کے بعد سوچا تھا کہ شاید سفر کٹ گیا ہے مگر یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ تنہائیوں، محرومیوں، محبتوں اور جدائیوں کے دکھ کہیں انت ہی نہیں ٹھہرتا ان کا۔ ایسی آفتیں جو اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید، یاس، دکھ، سکھ، ہنسی، آنسو، آرزو، خلش اور کسک بانٹتی ہیں جو دل کی دنیا کو غم کے اندھیروں کے باوجود روشن و منور کرتی ہیں۔'' (18)

ایک سو چھہتر صفحات پر پھیلی شاعری میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ کہیں کہیں گیت نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ غزلوں میں ذاتی واردات جبکہ نظموں میں خارجیت نمایاں ہے۔ گیت نگاری میں جسم کی پکار کا عنصر نمایاں ہے۔ نامور شاعر اور نقاد امجد اسلام امجد اس مجموعے کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اُن کی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت اور ماحول کے مخصوص حوالے کم و بیش ٹھیک ٹھاک ہیں البتہ جہاں تک ہنر کا معاملہ ہے اس میں ابھی انھیں مزید محنت کی ضرورت ہے کہ شاعری کسی مخصوص وزن اور بحر میں الفاظ کو پرونے کا نام ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق موضوع کی مناسبت سے بہترین الفاظ کے چناؤ سے بھی ہے۔'' (19)

امجد اسلام امجد کے علاوہ بشریٰ رحمٰن، قمر رضا شہزاد، رضی الدین رضی اور شاکر

حسین شاکر نے بھی اس مجموعے کے فکر و فن کی کھل کر داد دی ہے۔ متذکرہ بالا شعراء اپنے مخصوص فن کی بدولت ادبی حلقوں میں نام کما چکے ہیں۔ ''حنائی رنگ غنائی آہنگ'' کے عنوان سے لکھے گئے دیباچے میں بشریٰ رحمٰن رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی دوسری خوبی اس کا شیریں لب و لہجہ ہے، اس کی مٹھاس ہے۔ خواجہ غلام فرید کی دھرتی کے اندر ویسے بھی بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ نجمہ جب بات کرتی ہے تو اس کے لہجے کی شیرینی ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے اور جب شعر کہتی ہے تو کلبلاتے، تڑپتے، مچلتے اور سلگتے جذبوں کے اوپر شہد کا چھڑکاو؟ کرتی جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے لیے سکھ اور سکون کی خیرات مانگنے نکلی ہے۔ وہ چاہتی ہے کسی ا؟ نکھ میں ا؟نسو نہ ہوں، کوئی مانگ نہ اجڑے، کوئی دل نہ ٹوٹے۔ نظامِ ہستی میں بلندی، پستی، اونچ نیچ نہ ہو۔'' (20)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری میں عشق کے تقدس کو پامال نہیں ہونے دیا۔ وہ پاکیزگیٔ عشق کا بہت پاس رکھتی ہیں۔ یہ بات ان کی غزلوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ وہ عشق کے بحرِ بیکراں سے گزر کر شاعری کی راہ پر پہنچی ہیں اس لیے عشق و محبت کے بے لاگ تبصرے ان کے اشعار میں ملتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں:

سب سرحدیں پھلانگ کر عقل و شعور کی
راہِ وفا میں خود سے بھی انجان ہو گئی

جس نے مجھے عطا کیا یہ خامشی کا گیت
اس کی صدا ہی اب مری پہچان ہو گئی (21)

یوں تو دنیا کے لیے ہم نے بہت کچھ پالیا
بعد اس کے تھا اگر کچھ تو بس بیکار تھا

ایک چاہت کب تلک لڑتی وہاں شاہین بس
جس طرف بھی دیکھئے اک مصر کا بازار تھا (۲۲)

پھر مصر کے بازار میں نیلام ہوا کیوں
اے عشق بتا تیرا یہ انجام ہوا کیوں

اے عشق فلک پر تجھے لکھا جو خدا نے
پھر تیرا مقدر بھلا ابہام ہوا کیوں

جو تیری محبت کو سمجھ ہی نہیں پایا
شاہین یہ دل اس کے بھلا نام ہوا کیوں (23)

اب تو وحشت ہی ٹپکتی ہے ہر اک منظر سے
سوزِ ہجراں کی تپش سے ہیں سلگتی آنکھیں (24)

درد کی شدت اور بڑھی تھی شہرِ وفا کی شاموں میں
اور ویرانی بیٹھ گئی تھی ان اکھیوں کے پانی میں (25)

عشق ومحبت کی سچائی کے یہ حسیں ولولے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری خصوصاً غزل میں جا بجا نظرا? تے ہیں جن کی تفصیل ا? ئندہ ابواب میں پیش کی جائے گی۔ ملتان کی دھرتی کے نامور شاعر رضی الدین رضی نجمہ شاہین کھوسہ کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ا? ج ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ تین شعری مجموعوں کی خالق ہیں۔ ان کی پہلی کتاب '' پھول سے بچھڑی خوشبو '' اور دوسری '' میں ا? نکھیں بند رکھتی

ہوں'' کے نام سے منظرِ عام پر ا? ئیں۔ ہر مرتبہ ہمیں وہ ا? گے کا سفر طے کرتی دکھائی دیں۔ وہ استانی جس نے ان کی ڈائری میں غزلیں دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا تھا اب کہاں اور کس حال میں ہوگی؟ یہ تو کسی کو معلوم نہیں لیکن ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اب ڈیرہ غازی خاں میں ہی نہیں اپنے پورے وسیب کی پہچان بن چکی ہیں۔ ایک مسیحا کی حیثیت سے بھی اور ایک شاعرہ کے طور پر بھی۔ وہ دن رات مسیحا بن کر خواتین کے زخموں پر مرہم رکھتی ہیں۔ ان کے دکھ سنتی ہیں اور ان دکھوں کا مداوا بھی کرتی ہیں۔ پھر انھی دکھوں کو قرطاس پر منتقل کر دیتی ہیں ان کی شاعری عورت کے دکھوں کی کہانی ہے۔'' (26)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نظموں میں چھوٹے چھوٹے موضوعات منتخب کر کے انھیں لفظوں کے پیرائے میں خوبصورت انداز سے پیش کر دیا ہے۔ تیسرے شعری مجموعے تک آتے آتے ان کا فن مکمل ہوگیا ہے۔ اب وہ فکر کی رعنائیاں بکھیرتی بلندیوں کے سفر طے کرنے لگی ہیں۔ ان کے فکر وفن کی تفصیل آئندہ ابواب میں آئے گی۔ ذیل میں ان چوتھے شعری مجموعے کی تفصیل ملاحظہ ہو:

iv۔ پھول، خوشبو اور تارا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے جنھیں ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔ ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شعر وادب کے ساتھ دلی طور پر وابستہ ہیں۔ ''پھول، خوشبو اور تارا ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو 2016ء □ کو الحمد پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں نظموں کی نسبت غزلیں زیادہ ہیں۔ مجموعہ ہٰذا مصنفہ کے فکر وفن کی پختگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ غزلوں میں کلاسیکیت اور جدت کا اامتزاج موجود ہے۔ مجموعے کے آخر میں پذیرائی کے عنوان سے ملکی وبین الاقوامی شعراء وادباء نے موصوفہ کے فن کی کھل کر داد دی ہے۔ شاعرہ نے ''سوچ کا

سفر'' کے عنوان سے خود بھی دیباچہ تحریر کیا ہے۔ دیباچے کے علاوہ کتاب ہٰذا کا انتساب بھی قارئین کی توجہ کا مرکز ہے۔ بلکہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ہر کتاب کا انتساب بہت لاجواب ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے انتساب کی عبارت یوں ہے:

''اپنوں اور غیروں کے ان زخموں کے نام جو جلا بخشتے ہیں اور قلم کی سیاہی بن کر لفظوں کی صورت کاغذ پر اترتے ہیں اور شاعری بنتے ہیں اور اس واحد لاشریک کے نام جس کا عشق ہی اصل عشق ہے، سچا اور کھرا عشق۔''(27)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا عشق پردہ مجاز سے ہوتا ہوا اب عشقِ حقیقی یعنی عشقِ الٰہی تک جا پہنچا ہے۔ اب ان کی شاعری بھی آفاقیت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

مجموعہ ہٰذا کے فلیپ پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور بشریٰ رحمٰن کی آراء درج ہیں جو شاملِ کتاب دیباچوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جبکہ پس ورق پر شاعرہ کی نثری نظم بعنوان ''عجیب ہوتی ہے یہ محبت'' موجود ہے جس کے بائیں طرف مصنفہ کی خوبصورت تصویر آویزاں ہے(۲۸)۔

مجموعے کے آغاز میں حمد، نعت اور سلام لکھے گئے ہیں جو غزل کی ہیئت میں ہیں۔ حمد، نعت اور سلام میں جہاں فکر کے تمام تقاضے پورے ہو رہے ہیں وہاں شاعرہ کے غزلیہ مزاج کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار دیکھیں:

مری اجڑی لمبی رات سئیں
کب بدلیں گے حالات سئیں

مرا عشق ہی مذہبِ مسلک ہے
اور عشق ہے تیری ذات سئیں (29)

ہمیں پھر سے عطا ہو سرفرازی یا رسول اللہؐ
جواں جذبوں میں ہو روحِ حجازی یا رسول اللہؐ

ہمیں گھیرا ہوا ہے دشمنوں نے چار جانب سے
کہاں ہیں ملتِ بیضا کے غازی یا رسول اللہؐ (30)

بنامِ شاہِ شہیداں، سلام کیا لکھوں
حقیر لفظ ہیں مدحِ امام کیا لکھوں

دہک رہے ہیں ہر اک سمت دھوپ کے شعلے
مسافرانِ وفا کا قیام کیا لکھوں

مجموعہ ہٰذا کا بنیادی موضوع ''عشق'' ہے جس میں ضروری طور پر ہجر و فراق، رنج والم، وصال کی خواہش، حسین یادیں اور انسانی ہمدردی وغیرہ کے موضوعات غزلوں میں موجود ہیں جبکہ نظموں میں شاعرہ نے اپنی پرانی یادوں کو پیش کیا ہے۔ اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات، قصے اور حکایتیں پیش کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند اپنے مضمون ''محبت کی شاعرہ'' میں موصوفہ کی نظم گوئی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان کی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی کچھ نظمیں یقیناً بڑی نظمیں ہیں جنہیں سراہا جانا چاہیے۔ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے اس میں صوفیانہ عشق کی آسماں بدست بلندی سے لے کر تعشق اور ہوس کی تحت السرا تک شعراء نے طبع آزمائی کی ہے نجمہ شاہین کی نظموں میں یہ جذبہ ان دو بے نہایت حدود کے درمیان اس سطحِ مرتفع پر قائم ہے۔ جسے ہم ''من و تو'' کا علاقہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس ''من و تو'' میں ''من'' تو یقیناً شاعرہ کا واحد متکلم ہے۔ وہ خود ہے یا اس کی انا ہے لیکن ''تو'' محبوب بھی ہو سکتا ہے، دوست بھی ہو سکتا ہے، نامہرباں آسماں بھی ہو سکتا ہے اور ظالم حاکم بھی۔''(32)

مجموعہ ہٰذا ''پھول، خوشبو اور تارا'' کی اہمیت اور مقام کے حوالے سے بشریٰ رحمٰن

کا نظریہ ہے کہ:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی چوتھی تخلیق منظر عام پر لائی ہیں۔ پھول، خوشبو اور تارا میں پھول ان کی اپنی ذات ہے، خوشبو ان کے افکار ہیں اور تارہ تقدیر کا استعارہ ہے۔ تقدیر جو ازل سے لکھی ہوئی ملتی ہے اور تدبیر جو ہمیشہ اس سے الجھتی ہی رہتی ہے۔ پھول کتنا ہی دل آویز کیوں نہ ہو اپنی خوشبو پر اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ نجمہ خوشبو کی طرح ایک بے چین سی روح ہے، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تقدیر کا رانجھا کیسے راضی ہو گا۔ شعر سنانے سے یا نشتر چلانے سے۔'' (۳۳)

ایک بختوں والے کا قصہ، مجھے جانا ہے جاناں کی طرف، اجنبی مسافر کے نام، عید حیران ہے، اسے عید مبارک کہتی ہوں، تمھارا ابھی یقیں ٹوٹے اور ''وہ کہتے ہیں ہمیں لکھو'' جیسی نظموں میں شاعرہ کے عشقیہ جذبات عود کر سامنے آئے ہیں۔ اس لیے غزلوں کے ساتھ ساتھ اب شاعرہ نظموں میں بھی اس مقام پر پہنچ چکی ہیں جہاں اعلیٰ نظم گو شعراء کی بستی ہے۔ اس کے علاوہ غزلوں میں بھی محبت کے جذبات و واقعات پیش کیے گئے ہیں جو موصوفہ کی سچائی کے عکاس ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار بطور مثالیں ملاحظہ ہوں:

جرم بس یہ تھا کہ منزل کا تعین کر لیا
پھر سدا رہنا پڑا ہم کو سفر کے درمیاں

پھول، کلیاں، خوشبوئیں، مہکے ہوئے وہ راستے
خواب ہو کر رہ گئے ہیں بام و در کے درمیاں (34)

جو میری مانگ میں کچھ زخم جگمگاتے ہیں
کسی کے عشق میں مجھ کو ملی یہ دولت ہے (35)

زمیں ملے کہیں ہمیں، کہیں تو آسماں ملے
دکھوں کی دھوپ میں شجر کوئی تو مہرباں ملے

ترے فراق میں جیسے ترے فراق میں مرے
چلو یہ خواب ہی سہی وصال کا گماں ملے (36)

مندرجہ بالا اشعار میں عشق کی سچائی اور فن پر مکمل گرفت بخوبی عیاں ہو جاتی ہے۔ رضی الدین رضی ''ہجر اور بلندی کا استعارہ'' کے عنوان سے مجموعہ ہذا میں شامل اپنے لکھے ہوئے دیباچے میں کہتے ہیں:

''پھول، خوشبو اور تارا ہجر کا استعارہ ہے۔ ہجر جو زندگی بھی ہے اور موت بھی، ہجر جو روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، ہجر جو بے سکون بھی کرتا ہے اور اطمینان بھی بخشتا ہے۔ یہی بندگی ہے اور زندگی ہے۔ یہی تشنگی ہے اور یہی آسودگی، یہی خواب ہے اور یہی سراب، یہی حقیقت ہے اور یہی گماں اور جب ہجر آپ کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے تو پھر حقیقت اور گماں کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور ہجر ہی آپ کی پہچان بن جاتا ہے۔ جیسے نجمہ شاہین کھوسہ کی پہچان بن گیا ہے'' (37)

بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری ایک مستند اور منجھی ہوئی شاعرہ کی شاعری ہے۔ ان کے آخری مجموعے کی اشاعت کے بعد انھیں پاکستان کی صفِ اول کی شاعرات کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس مجموعے میں فکر و فن سے عاری کوئی ایک مصرعہ بھی موجود نہیں ہے، جس سے اس کے فکر و فن پر اعتراض کیا جا سکے۔

۸۔ اعزازات، مشاغل اور دیگر ادبی خدمات

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک ہمہ جہت شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ شاعری کے علاوہ بھی وہ کسی نہ کسی صورت میں ادب کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ آپ کو مختلف اوقات میں ادبی

حلقوں اور ادب نواز شخصیات نے اعزازات وانعامات سے نوازا ہے۔اس کے علاوہ آپ اپنی مصروف میڈیکل کی زندگی میں بھی ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔

اعزازات اور ایوارڈز میں اب تک آپ کو درشن میگزین ایوارڈ، خوشبو رائٹرز ایوارڈ، بے نظیر بھٹو ایوارڈ اور حسنِ کارکردگی ایوارڈ ملے ہیں۔اس کے علاوہ اکادمی ادبیات ملتان میں آپ ایڈوائزری کمیٹی کی ممبر بھی ہیں۔اکادمی ادبیات ملتان کی ہر اہم تقریب میں آپ کی شرکت یقینی ہوتی ہے۔خواتین کے حوالے سے بھی آپ کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔آپ جنوبی پنجاب خواتین ونگ قومی یک جہتی اور بین المذاہب ہم آہنگی کی چیئر پرسن ہیں اور عرصہ دراز سے خواتین کی خدمت کرتی چلی آرہی ہیں(38)۔

ڈیرہ غازی خاں کی مشہورِ زمانہ سماجی وادبی تنظیم جو خواتین کی بہبود کے لیے ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس تنظیم کی صدر ہیں۔یہ تنظیم آنچل کے نام سے خواتین کی پہلی تنظیم ہے جو ابھی سرگرمِ عمل ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہمیشہ یتیم بچوں اور بیواؤں کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔آپ کی بدولت بہت سے گھر روشن ہوئے ہیں۔یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ڈیرہ غازی خاں میں ادبی وسماجی تقاریب منعقد کروانا بھی موصوفہ کا ذوق ہے۔الغرض ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنے پرائیویٹ ہسپتال کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ادب کو ہمیشہ وقت دیتی ہیں اور جب ادب کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جائے تو اپنی نیند کو ادب پر قربان کر دیتی ہیں(39)۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی زندگی کے ارتقائی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے رضی الدین رضی لکھتے ہیں:

''وہ بچی نجمہ شاہین کھوسہ جب پیدا ہوئی تو اس کے والد نے اس کا نام نجمہ شاہین رکھا تھا۔یہ نام بلندی کی علامت ہے،''نجمہ'' ایک چمکتا ستارہ اور''شاہین'' جو بہت بلندی پر پرواز کرتا ہے۔اس کے والد جان محمد کھوسہ نے یہ نام ممکن ہے لاشعوری طور پر ہی رکھا ہو لیکن آج نجمہ شاہین واقعی

بلندی پر ہیں اور اس مقام تک پہنچنے میں بنیادی کردار ان کے والد کا ہی ہے کہ اس معاشرے میں کسی بھی عورت کو عملی زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ سہارا شادی سے پہلے اس کا باپ اور بھائی، شادی کے بعد اس کا شوہر بنتا ہے جن خواتین کو یہ سہارا میسر نہ ہو ان میں کتنی ہی صلاحیت کیوں نہ ہو وہ پرواز نہیں کر سکتی۔نجمہ شاہین کو شادی سے پہلے اپنے والد جان محمد کھوسہ اور شادی کے بعد اپنے شوہر غلام فرید کھوسہ کا سہارا میسر آیا تو ان کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں دور ہو گئیں۔''(40)

باب اول کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو اس میں راقم نے نہ صرف تحقیقی شخصیت کی سوانح اور شخصیت کا احاطہ کیا ہے بلکہ ان کی کتب کا سرسری جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا آغاز، ملازمت کی تفصیل، خاندانی پس منظر، گھریلو حالات اور ان کے آبائی شہر ڈیرہ غازی خان کی جغرافیائی اور سماجی ماحول کا احاطہ بھی کیا ہے۔قارئین کی سہولت کے لیے اس شہر کے رسوم و رواج اور اہمیت و افادیت بھی بیان کی گئی ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ باب نہ صرف ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے تعارف پر مبنی ہے بلکہ اس میں دیگر معلومات بھی دی گئی ہیں۔اس حوالے سے یہ باب باقی تمام ابواب سے منفرد ہے کیوں کہ باقی ابواب میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جبکہ اس باب کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی سوانح اور شخصیت کے حوالے سے ممکنہ تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔دستیاب مواد میں سے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ ہے کہ کسی قسم کی کوئی معلومات پیش ہونے سے رہ نہ جائیں۔آئندہ باب میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظم گوئی کی تفصیل پیش ہے۔

باب دوم:

نجمہ شاہین کھوسہ بحیثیت نظم گو

ا۔اُردو نظم کا آغاز وارتقاء

غزل کے مقابلے میں نظم کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے تاہم آج نظم بھی اپنی عمر کے اڑھائی سو سال مکمل کرنے کو ہے۔ نظم کا سفر نظیر اکبر آبادی سے شروع ہوا تو دورِ آغاز سے ہی نظم کو ایک عوامی شاعری کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ نظیر نے ہزاروں کی تعداد میں نظمیں تخلیق کیں۔ ان کے دور میں نظم کو پذیرائی تو نہ ملی لیکن عہدِ سرسید میں ان کی نظموں کو زندہ کیا گیا اور اردو نظم کی تاریخ مستند ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں جو شخص اردو شاعری کو امراء کے دیوان خانوں، اعلیٰ مجلسوں اور ادبی خواص کے حلقوں سے نکال کر لوک معاشرت کے زندہ منظرنامہ میں لے آیا وہ نظیر ہی تھا جو آگرہ کا نیا آباد کار تھا۔ نظیر کی تخلیقی قوت نے اردو شاعری کے اس روایتی قلعہ پر ضرب لگائی جو فارسی شاعری کی روایات پر کھڑا تھا اور جہاں غزل، مثنوی اور قصیدے جیسی اصناف سے ہٹ کر کسی دوسری صنف کے پنپنے کے امکانات نظر نہ آئے تھے۔ جہاں زندگی اور کائنات کو مظاہر کی صورتوں میں نہیں بلکہ محسوسات یا تاثرات کی سطح پر شاعری کا موضوع بنایا تھا۔''(۱)

نظیر آکبر آبادی کی وفات کے بعد عہدِ سرسید میں جدید ادب کا آغاز ہوا تو نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوا جس میں حالی؟، شبلی؟، آزاد؟ اور اکبر؟ پیش پیش تھے۔ نظیر

?اکبر آبادی نے شاعری میں عوامی انداز اختیار کیا جس کی اختراع اکبرالہٰ آبادی نے فرنگی تہذیب پر طنز کر کے پیش کی تھی۔ آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''نظم کی دنیا اردو غزل سے ہٹی نہیں ہے۔ اس میں حالی؟، شبلی؟، آزاد؟ کے بعد اسمٰعیل میرٹھی، اکبرالہٰ آبادی، چکبست، اقبال، سلیم، سرور جہاں آبادی، شوق قدوائی اور بے نظیر شاہ کے نام ممتاز ہیں۔ ان کے یہاں ایک نیا ذہن ایک نیا احساس اور ایک نیا جذبہ ملتا ہے۔''(۲)

اردو نظم کا آغاز تو نظیر اکبر آبادی نے کیا تھا لیکن اس کی روایت کو پختہ کرنے میں آزاد اور حالی کا ہاتھ ہے۔ رہی سہی کسر اکبرالہٰ آبادی نے پوری کر دی۔ حالی؟ نے ملی نظمیں اور آزاد نے فطری نظمیں لکھیں اور اکبرالہٰ آبادی نے فرنگی تہذیب پر طنز کر کے نظم گوئی کو غزل کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیا۔ عہدِ حالی کے بعد اردو نظم مستحکم ہو کر بہت سے قدآور شعراء کی دلچسپی کا باعث بن گئی۔

رفتہ رفتہ نظم میں وسعت آتی گئی جس میں موضوعاتی اور ہیئتی نظموں کے الگ الگ میدان مقرر ہو گئے۔ موضوعاتی نظموں میں حمد، نعت، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، ریختی، واسوخت اور گیت نگاری پر تو پہلے ہی طبع آزمائی جاری تھی۔ جبکہ ہیئت کے حوالے سے رباعی، قطعہ، مسمط، ترکیب بند، مستزاد، پابند نظمیں، آزاد نظمیں

اور معریٰ نظموں کا آغاز ہوا جس کی بدولت نظم گوئی کی روایت مزید مستحکم ہو گئی۔ موضوعاتی اور ہیئتی نظموں کو جدید نظم میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ جدید نظم کا میدان اپنی الگ پہچان بنا چکا تھا۔ تاہم آغاز میں موضوعاتی اور ہیئتی نظموں کا جو رواج تھا اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''شاعری میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں۔ خیال یا موضوع، ہیئت یا فارم اس لحاظ سے اصنافِ نظم کا جائزہ دو حیثیتوں سے لیا جا سکتا ہے۔ ایک تو موضوع کے لحاظ سے اور دوسرے ہیئت کے اعتبار سے۔ مگر یہ لحاظ

موضوع اور بہ لحاظ ہیئت شاعری کی جتنی بھی اقسام ہیں، 'نظمِ جدید' ان میں سے کسی کی ذیل میں بھی نہیں آتی۔ وہ اپنی حیثیت اور نوعیت میں جملہ اصنافِ شعر میں جدا اور منفرد ہے۔''(۳)

پابند اور آزاد نظموں کے درمیان واضح فرق یہ ہے کہ عہدِ سرسید کے بعد پابند نظموں کا دور شروع ہوا جو 1940ء تک تواتر کے ساتھ چلتا رہا۔ اس دوران آزاد نظموں کا وجود تک نہ تھا۔ اس دور میں جن شعراء نے پابند نظموں پر خامہ فرسائی کی ان میں آزاد، حالی، شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہٰ آبادی، شوق قدوائی، علامہ اقبال، سیماب اکبر آبادی، پنڈت چکبست، فانی بدایونی، اسرار الحق مجاز لکھنوی، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری اور فیض احمد فیض کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان شعراء کی اکثریت نے غزل کے میدان سے منہ موڑ کر پابند نظم کی طرف پیش قدمی کی جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی (۴)۔

آزاد نظم کا باقاعدہ آغاز 1940ء میں ہوا جس کا سہرا تصدق حسین خالد، میرا جی، ن۔م راشد اور مجید امجد کے سر ہے۔ علامہ اقبال نے پابند نظموں کا کثیر سرمایہ جب اردو ادب میں شامل کیا تو آنے والے شعراء کے لیے پابند نظموں کا دروازہ تقریباً تقریباً ختم ہی کر دیا۔ جب متذکرہ بالا شعراء نے پابند نظموں کا دروازہ بند پایا تو انھوں نے آزاد نظموں میں پناہ ڈھونڈنا چاہی۔ جس کا آغاز تصدق حسین خالد نے کیا۔ بعد میں جب ن۔م راشد اور میرا جی بھی آزاد نظم کی طرف آ گئے تو قیامِ پاکستان کے بعد جدید شعراء کی کثیر تعداد اس میں کود پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بار پھر آزاد نظم کا میدان سج گیا۔ ڈاکٹر انور سدید آزاد نظم کے حوالے سے میرا جی کی نظم گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرا جی کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے غیر ملکی شعراء کے مطالعے اور ترجمے سے جدید شاعری کے اصول وضع کیے اور جب حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ ہوئے تو نئے شعراء کی ادبی تربیت میں ان

اصولوں کو حسن و خوبی سے استعمال کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ یورپ کی بیش تر ادبی تحریکیں مثلاً علامت نگاری، تاثریت، سرئیلزم وغیرہ میرا جی کی وساطت سے ہی اردو نظم میں داخل ہوئیں اور ان کے بیش تر نمونے میرا جی نے ہی فراہم کیے۔''(۵)

آزاد نظم گو شعراء نے محسوس کیا کہ قافیہ ردیف کی قید سے آزاد ہونے کی کوئی ترکیب بنانی چاہیے۔ ان کا موَقف تھا کہ قافیہ ردیف کی پابندی سے شاعر کا ذہن ندرتِ افکار کی بجائے قافیہ ردیف کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جس سے وہ اپنا مدعا بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ جب تصدق حسین خالد نے تنگ نائے غزل سے نکلنے کا تجربہ کیا تو شعراء کی کثیر تعداد نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے آزاد نظم میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''آزاد نظم لکھنے والوں کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ اچھی اور نئی شاعری کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ روایت نے قافیہ و ردیف کو غیر ضروری اہمیت دی ہے۔ جس سے اکثر شاعر کا ذہن اپنے معنی کو بھول کر قافیے کی منازبات میں گم ہو جاتا ہے۔''(۶)

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان میں آزاد اور پابند نظموں کا سلسلہ شروع ہوا اس دوران نظمِ معریٰ بھی لکھی جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ طویل ہوا تو نثری نظم کا ڈرامہ بھی سامنے آ گیا۔ البتہ آزاد نظم نے اردو ادب میں اپنے آپ کو منوا لیا۔ اب غزل گو شعراء کی کثیر تعداد آزاد نظمیں لکھ رہی ہے۔

آزادی کے بعد اردو ادب نے نئی کروٹ بدلی اور نئی شاعری وجود میں آئی۔ اس لیے پاکستان بننے کے بعد کی شاعری کو ہم نئی شاعری سے موسوم کرتے ہیں۔ غزل اور نظم آپس میں معرکہ آراء رہیں لیکن غزل اپنا مقام برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ تاہم آزاد نظم بھی اردو ادب کے لیے اہم صنف کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ نئی نظم کے شعراء

کے مختلف رجحانات تھے جن کی نشان دہی کرتے ہوئے پروفیسر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''نئی نظم کا شاعر بے باک ہے اور جنسی معاملات کو بے جھجک اپنی نظموں میں پیش کرتا ہے۔ اس پر عریانی، فحاشی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ اپنے دفاع میں یہ کہتا ہے کہ اس کا آرٹ سنیما گرافی اور فوٹو گرافی کا آرٹ ہے۔ جب زندگی کی غلاظتوں سے اس کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ان سے کس طرح منہ موڑ سکتا ہے۔ یہ غلاظتیں اس کے مزاج میں برہمی پیدا کرتی ہیں اور اس پر تلخی، جھنجھلاہٹ کا الزام لگتا ہے۔ سماج کی ناہمواریاں اسے طنز کا سہارا لینے پر مجبور کرتی ہیں۔'' (۷)

1980ء کے بعد نئی نظم کے حوالے سے جن جن شعراء نے کام کیا ان کی تعداد سیکڑوں میں ہے ان کی فہرست مرتب کرتے کرتے صفحے کالے ہو جائیں گے۔ تاہم ابنِ انشا، افتخار جالب، کشور ناہید، وحید اختر، ثروت حسین، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، سلیم الرحمٰن، جیلانی کامران، سلیم احمد، ضیاء ▯ جالندھری، انجم رومانی، مختار صدیقی، وزیر آغا، شہزاد احمد، ظفر اقبال، عرش صدیقی، عمیق حنفی وغیرہ نظم کے بہترین شعراء ▯ تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق شاعری کے اس گروہ سے ہے جو 1990ء ▯ کے بعد ادبی افق پر نمودار ہوا۔ موصوفہ بنیادی طور پر غزل گو شاعرہ ہیں تاہم انھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جہاں تک فنی گفت کی بات ہے تو نظم میں انھیں کمال حاصل ہے جبکہ غزل کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ تاہم اصناف کے حوالے سے وہ بیک وقت غزل اور نظم کی شاعرہ ہیں۔ ذیل میں ان کی نظم گوئی کی مکمل تفصیل، موضوعات، فکر اور فن کی خوبیاں پیش ہیں۔

۲۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بحیثیت نظم گو

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا پہلا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' ہے جس میں

غزلوں کی نسبت نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ پہلا شعری مجموعہ ہونے کی بدولت اس میں فنی خامیاں تو جا بجا موجود ہیں لیکن نظموں میں مضامین و موضوعات کا بہاؤ خوب نظر آتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف نظمیں لکھی ہیں بلکہ حمد، نعت، منقبت اور سلام بھی پیش کیے ہیں جن کے تفصیل آخری باب میں موجود ہے۔ اس باب میں صرف ان کی نظم گوئی اور مجموعہ ہٰذا میں جو مختلف النوع موضوعات پر نظمیں کہی گئی ہیں، ان تمام خصوصیات کی تفصیل ذیل کے صفحات میں مندرج ہے۔

۳۔ پھول سے بچھڑی خوشبو کی نظمیں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے شعری مجموعے ''پھول سے بچھڑی خوشبو' کے آغاز میں پانچ نظمیں ہیں جن کے بعد چند غزلوں کو شاملِ مجموعہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح آگے چل کر فہرست میں کبھی نظمیں اور کبھی غزلیں نظر آتی ہیں۔ نظموں کے زیادہ تر موضوعات ناکام محبت اور ہجر کی کیفیت کے متعلق ہیں۔ مثلاً پہلی پانچ نظمیں بالترتیب ''میری شاعری''،'' دعائے بے اثر''،'' کون بچھڑے ہوؤں کو ملائے''،''تو میرا حرفِ دعا'' اور'' ملاقات آخری'' محبوب کی جدائی اور محبت میں ناکامی جیسے جذبات لیے ہوئے ہیں۔ نظم'' میری شاعری'' سے چند مصرعے ملاحظہ ہوں جن میں جدائی کے کرب ناک لمحات کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اے میرے سخن ناآشنا دوست
یہ جو میرے شعر ہیں
تیرے دیے ہوئے ہجر کا تحفہ
یہ جو میری غزلیں ہیں
تیری بخشی ہوئی عنایتیں ہیں
کیسے فراموش کر دوں میں
تیری یادوں کا وہ نرم خو جھونکا
کہ جب اس شہرِ نامہرباں میں

تیرے خوشبو سے نرم لہجے نے
مجھے کچھ خواب دیے ہیں
کچھ رت جگوں کے عذاب دیے ہیں (۸)

مندرجہ بالا مصرعوں میں شاعرہ نے بظاہر اپنی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے لیکن در پردہ محبوب کے ان رویوں کی نشان دہی کی ہے جو شاعرہ کو ہمیشہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ نظم مذکورہ بحر سے بے بہرہ ہے لیکن شاعرہ کے جذبات کی عکاسی خوب کرتی ہے۔اس سے اگلی نظم ''ملاقات آخری'' ہے جو موضوع اور فکر کے حوالے سے بہتر نظم ہے۔اس میں شاعرہ نے اپنے محبوب کی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے جسے وہ آخری ملاقات کہتی ہیں۔ چند مصرعے دیکھیں:

مجھ کو رہے گی یاد وہ ملاقات ا؟ خری
ہونٹوں پہ رہ گئی تھی کوئی بات ا؟ خری
ا؟ نکھوں کے دشت میں تھے نگینے سجے ہوئے
چاہت کی جس طرح سے ہو سوغات ا؟ خری
ٹھہرا ہوا سا دن تھا اور گہری اداس شام
دل کے نگر میں چھائی تھی
جذبوں کی وہ نمی
بھولوں گی کس طرح سے میں
لمحات ا؟ خری (۹)

مذکورہ بالا نظم میں بھی شاعرہ نے اپنا ذاتی دکھ اور محبت میں ناکامی کا تجربہ بیان کیا ہے۔ یہ نظم بہت طویل ہے اور اپنے انجام تک ہجر کی کیفیت کا سحر ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی۔

''پھول سے بچھڑی خوشبو'' میں پہلی پانچ نظموں کے بعد چھ غزلیں پیش کی گئی ہیں جبکہ ان چھ غزلوں کے بعد مزید چھ نظموں کا التزام کیا گیا ہے۔ یہ نظمیں بالترتیب، ناسور،

پھول سے بچھڑی خوشبو، آفتاب لمحہ، سوال، کھو گئے یہ راستے اور تُو تو کبھی میرا نہ تھا کے عنوانات سے ہیں۔ ان نظموں میں بھی ہجر کی کیفیت نمایاں ہے۔ حالانکہ ہجر و فراق کا موضوع غزل میں بخوبی بیان کیا جا سکتا تھا لیکن شاعرہ نے محبوب کی جدائی کو مختلف حوالوں سے دیکھا اور اس کیفیت کو اپنے اوپر اس طرح طاری کیا وہ اس کا مستقل موضوع بن گیا۔ گویا اس کتاب میں ان کی نظموں کا غالب موضوع عشق میں ناکامی، تڑپ اور ہجر کی کیفت ہے۔ نظم ''ناسور'' کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

اے دل میرے آمل بیٹھیں
آ قصہ چھیڑ پرانا تو
آ خواب سناؤں میں تجھ کو
جو چار دنوں کا قصہ ہے
جو جیون باب کا حصہ ہے
آ اس ناسور کی بات کریں
جو روح کے اندر اتر گیا
جو تجھ کو چاٹ کے رہ گیا (10)

اکیلے پن اور تنہائی کا منظر نظم ''تُو تو کبھی میرا نہ تھا'' میں کھل کر سامنے آیا ہے۔ ان نظم میں شاعرہ نے ہجر و فراق کو نظم کے عنوان میں ہی ظاہر کر دیا ہے۔ اس نظم کے ایک بند میں شاعرہ، ہجر و فراق کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

اے دوست، اے ہمدم
نہ جانے کیسے، مجھ سے بھول ہوئی
جانے یہ میں نے کیوں سوچ لیا
کہ دشتِ محبت میں بھٹکتے ہیں ہم
دو سائے اک دوجے کے ہمقدم

مگر نہ سوچ پائی میں سودائی
کہاں زمیں، کہاں آسماں
کہاں دھوپ کہاں سائباں
جب طوفاں نے حشر ڈھایا
میں نے خود کو تنہا پایا(۱۱)

''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کی ابتدائی ۱۲ نظموں پر غور کریں تو یہ صرف اور صرف ہجر وفراق میں ڈوب کر لکھی گئی ہیں۔ یہ تمام آزاد نظمیں ہیں لیکن فنی طور پر بہت کمزور ہیں۔البتہ فکری حوالے سے خیال کی رعنائیاں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔شاعری میں عشقیہ جذبات اور عشق کے عمل دخل کے بارے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''محبت کے بغیر شعر کچھ بھی نہیں ہے ورنہ شعر صرف لفظوں کے ہیر پھیر تک محدود ہو جاتا ہے۔اس میں کوئی تاثیر نہیں رہتی۔محبت عشق کی بنیاد ہے۔محبت جب ہر تفریق کو ختم کر دے اور انسانوں کا مزاج بن جائے تو عشق کہلاتی ہے۔عشق واحدانیت ہے، خدا ہے۔''(12)

''پھول سے بچھڑی خوشبو'' میں تقریباً ساٹھ سے زائد نظمیں ہیں جن میں جگہ جگہ محبوب سے جدائی، ہجر کی پکار، محبت میں ناکامی، عہدِ ماضی کی یاد، پرانی یادوں کے سہارے زندگی گزارنا جیسے جذبات کی عکاسی ملتی ہے لیکن کہیں کہیں دنیا سے اکتاہٹ اور محبوب کو نظر انداز کر کے بے نیازی دکھانے کی مثالیں بھی ملتی ہیں تاہم مجموعی طور پر کتاب ہٰذا کی نظموں کا موضوع ہجر وفراق ہے جو تمام نظموں میں عود کر سامنے آتا ہے۔''اب رفیق کون'' میں شاعرہ دنیا سے تنگ آ کر اپنے ماضی کو بھولنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔چند مصرعے دیکھیں:

کون تم؟ کون ہم؟
اب کچھ بھی ہم کو یاد نہیں

سارے رشتے بھول گئے
اب جینا اپنی ضرورت ہے
کہ جینا فرضِ حقیقت ہے
راہ میں بکھرے لوگوں کی
کب کوئی شناخت ہے(13)

اس طرح کی صورت حال نظم ''اپنے اپنے غموں کا مداوا کریں'' میں بھی نظر آتی ہے۔پہلے مجموعے کی تمام نظموں میں ایسی صورت حال کم نظر آتی ہے تاہم جب شاعرہ دنیا جہاں سے مایوس ہو جاتی ہیں تو سب کچھ بھول جانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔چند اشعار دیکھیں:

وہ غم جو ہمارے جسموں کو چیرتے ہوئے
ہماری روح کے اندر اتر گئے ہیں

ہماری آنکھوں سے روشنیوں کو چھین کر
ہمیں سدا کے لیے نابینا کر گئے ہیں

چلو انھی غموں سے ہم اپنی روحوں کو شاد کر لیں
ہم اپنے اپنے غموں کو یوں برباد کر لیں

دشتِ دل کو اِنہی سے آباد کر لیں

x x x x x x x x x

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے شعری مجموعے''پھول سے بچھڑی خوشبو'' میں ان کی ابتدائی شاعری شامل ہے جو فنی اعتبار سے بہت کمزور ہے۔نظموں کے جتنے حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں ان میں فنی محاسن کو دیکھتے ہوئے بہت مایوسی ہوتی ہے،لیکن ان کی نظموں کا

بنیادی موضوع ہجر وفراق کی شدید تڑپ ہے جس میں موصوفہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ آئندہ سطور میں ان کے دوسرے شعری مجموعے ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں شامل نظموں کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ اس کتاب میں نظمیں زیدہ جبکہ غزلوں کی تعداد کم ہے، تفصیل کے لیے آئندہ صفحات ملاحظہ کریں

۴۔ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کی نظمیں

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں 85 نظمیں شامل ہیں جن میں ہیئت کے مختلف تجربات کیے گئے ہیں۔ پچھلے مجموعے کی تمام نظمیں صرف ہجر وفراق کے پس منظر میں تخلیق کی گئی تھیں لیکن ان نظموں میں شاعرہ نے کائنات کے مختلف رنگوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ فطرت کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ انھوں نے دیہات کے رسم و رواج، اپنے ذاتی حالات، چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات نگاری اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ تاہم تمام شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ نے عشق میں ڈوب کر شاعری تخلیق کی ہے۔ اس مجموعے میں نظموں اور غزلوں کی یکساں تعداد سے یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ کون سی صنف دوسری سے منفرد ہے۔ باب ہٰذا نظم کے حوالے سے ہے اس لیے اس میں نظم گوئی کی خصوصیات پر بحث کی جائے گی۔ مجموعہ ہٰذا کے دیباچے میں لکھتی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ خود لکھتی ہیں:

> ''خلوص، چاہت، مروت، وفا سب اس گونگے اور بہرے عشق میں رائیگاں ہیں۔ اور جب کبھی شعور پہ منکشف بھی تو تب بھی عشق اندھا بہرہ ہے۔ عشق کو تو بس ایک پیکر چاہیے پوجنے کے لیے اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ پیکر کیسا ہے۔ اس کا طلب گار بھی ہے یا نہیں۔ اسے تو سارا سروکار اسی پیکر سے ہے اور جب وقت کا دیو اس سے وہ پیکر چھین لے تو عشق کا انجام صرف گور رہ جاتا ہے کہ اسے بھلا اس پیکر کے بغیر بقاء کیسے ملے۔''(15)

میں آنکھیں بند رکھتی ہوں کی پہلی نظم کے عنوان کو کتاب کے نام کا عنوان دیا گیا ہے جس سے شاعرہ کی فنی پختگی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ایک بند دیکھیں:

میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
جب اس کی یادوں کے جھروکوں میں
میں خیالوں کا ریشم بنتی ہوں
اور وہ ریشم کھل کے بکھرتا ہے
میری تخلیق بکھرنے لگتی ہے
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں (16)

مندرجہ بالا مصرعوں میں شاعرہ اب چھوٹی چھوٹی مشکلوں سے بے نیاز نظر آتی ہیں۔ انھیں عشق کی مشکلات سے ڈرنے کی بجائے مقابلہ کرنا آ گیا ہے۔ اس لیے دوسرے مجموعے میں وہ کسی اور روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ مشاہیرِ اردو اور فلاسفہ نے عشق کو آکاس بیل سے تشبیہ دی ہے۔ کسی نے اس پر قوموں کی تباہی کا الزام لگایا ہے تو کسی نے گھروں کی بربادی کا، ڈاکٹر نجمہ شاہین نے بھی ''آکاس بیل'' کے زیرِ عنوان نظم لکھ کر اپنے عشقیہ جذبات و کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

کبھی بچے تھے تو سنتے تھے
آکاس بیل تناور درخت کو جکڑ لے تو
اس کی طاقت، اس کے حسن کو
اپنی بانہیں پھیلا کر ختم کر دیتی ہے
تب پہروں بیٹھ کے سوچا کرتے تھے
آکاس بیل ہوتی ہے کیا؟
جب عشق ہجر کے دکھ نے
من کے تناور شجر کو گھیرا تو، تب، معلوم ہوا

آ کاس بیل ہوتی کیا ہے

آ کاس بیل کے معنی کیا ہیں (17)

مندرجہ بالا نظم ''آ کاس بیل'' میں شاعرہ عشق میں ڈوبی داستانِ حیات سناتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دوسرے شعری مجموعے میں محبوب کی یاد اور ہجر کی کیفیت کو مثبت معنوں میں دکھایا گیا ہے۔ قوتِ برداشت، صبر اور حسین یادوں کے سہارے جینے کا ہنر موصوفہ کو اس مجموعے میں آ گیا ہے۔ ان کا فن بھی یہاں بالغ نظر ہے۔ فنی پختگی میں انھوں نے کمال دکھایا ہے۔ اس لیے دوسرے شعری مجموعے کی غزلیں اور نظمیں دونوں لاجواب ہیں۔ فکری وفنی عوامل دونوں میں یکساں ہیں۔ اس مجموعے میں چند نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے نظم ''آخری ملاقات کا منظر'' بہت عمدہ ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظم گوئی کے حوالے سے نامور شاعر رضی الدین رضی لکھتے ہیں:

''آج نجمہ شاہین کھوسہ تین شعری مجموعوں کی خالق ہیں ان کی پہلی کتاب ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' اور دوسری ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہیں۔ اسی طرح وہ ہر کتاب میں ہمیں آگے کا سفر کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی حیثیت ایک مسیحا اور شاعرہ کے طور پر رہے۔ وہ دن رات مسیحا بن کر خواتین کے زخموں پر مرہم رکھتی ہے ان کے دکھ سنتی ہیں اور ان دکھوں کا مداوا بھی کرتی ہیں۔ پھر ان کی شاعری عورت کے دکھ کی کہانی ہے وہ عورت جس کے قدموں تلے جنت ضرور ہے لیکن اس تنگ نظر معاشرے کا مرد اسے اپنے پاؤں کی جوتی سمجھنے میں فخر محسوس کرتا وہ عورت جیسے تیزاب پھینک کر قتل کیا جاتا ہے۔ جسے مرد کی غیرت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے اور جیسے قرا?ن کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اب ان تمام خواتین کی آواز ہیں'' (18)

رضی الدین رضی کی رائے اس لے مستند ہے کہ جن مسائل کی طرف انھوں نے نشان دہی کی

ہے وہ نجمہ شاہین کی شاعری میں بخوبی موجود ہیں۔ اور واقعی نجمہ شاہین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسی ہی مثال ان کی نظم ''ردالی'' میں نظر آتی ہے۔ ''ردالی'' ایک ہندو لڑکی کا کردار ہے جو ہمیشہ دوسروں کے لیے قربان ہوتی رہتی ہے۔ لوگ اسے تکالیف پہنچانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ شاعرہ نے ردالی میں اپنا دکھ محسوس کیا ہے۔ اور عورتوں کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے ردالی کا سہارا لیا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ کریں:

میں ردالی! اپنے ہی غموں پہ رونے والی! اک لڑکی

گردشِ دوراں نبھاتی ہے

اوروں کا غم اپنا غم بناتی ہے

خود کو یوں روتا دکھاتی ہے

سوچتی ہوں! میں کیسی ردالی!

اپنے غم کی محفل سجانے والی

یا اوروں کا دکھ بٹانے والی (19)

عورتوں کے مسائل کے حوالے سے ایک نظم ''دوسری عورت'' کے عنوان سے ہے جس میں شاعرہ نے عورتوں کے دکھوں کی ترجمانی کی ہے۔ خواتین کس طرح صدمات برداشت کرتی ہیں اور کس طرح اپنا آپ تباہ کر دیتی ہیں۔ اپنی بد نصیبی کو مقدر سمجھ کر ساری زندگی اس میں گزار دیتی ہیں۔ ہمارے دیہات کی تقریباً ہر خاتون کے ساتھ اس طرح کے معاملات کا اکثر وبیشتر سامنا رہتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ کریں:

وہ ایک خواب تھی

پہلو بہ پہلو ثواب تھی

کیوں اپنی ذات کی اذیت بن گئی

اپنی ہستی کھو کر وقت کی صورت بن گئی

وہ کیوں دوسری عورت بن گئی (20)

''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں کچھ نظمیں ''تصوف'' کے موضوع پر بھی تخلیق کی گئی ہیں۔ حمد و نعت کے علاوہ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں شاعرہ نے دنیاوی مسائل اور مجازی عشق سے تنگ آ کر عشقِ حقیقی کی طرف قدم رکھا ہے۔ اس حوالے سے ان کی ایک نظم ''مجھے فرائضِ محبت سے آزاد کر دے'' ہے جو ایک طویل نظم ہے اور پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شاعرہ نے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست کلام کیا ہے۔ ابتدائی بند ملاحظہ ہو:

مرے مالک، مرے خالق
سربسجود ہوں معبود مرے
اپنے سجدہ ریز کو آج شاد کر دے
مرا دل اپنی معبودیت سے آباد کر دے
دنیا کی محبت سے مجھ کو آزاد کر دے (21)

نظم مذکورہ بالا کا ایک ایک مصرعہ شاعرہ کے اس عشق کی ترجمانی کرتا ہے جسے ہم عشقِ حقیقی کا نام دیتے ہیں۔ نظم میں بہت سے مواقع پر شاعرہ فنا فی اللہ کی کیفیت میں مستغرق نظر آتی ہیں۔ جوں جوں شاعرہ کا ادبی سفر پروان چڑھتا گیا وہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف پیش قدمی کرتی گئیں۔ اس طرح ان کی یہ نظم عشقِ حقیقی کے موضوع کے حوالے سے لازوال نظم ہے۔

عشقِ حقیقی کے حوالے سے ایک اور نظم جو ''مرے دل کی بنجر زمین کا خدا ہوا مہمان'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں شاعرہ نے بین السطور ''خدا سے عشق'' کے حوالے سے بات کی ہے۔ شاعرہ نے بات کا آغاز عشقِ مجازی سے کیا ہے لیکن وہ عشقِ حقیقی تک پہنچ گئی ہیں۔ اور اپنے عشق کی پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے خدا سے محبت کا ثبوت دیا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

میرے درد کو جس نے دوا کیا

مجھے غم سے جس نے رہا کیا
میرے دل کی بنجر دھرتی پر
مرے ربّ نے احسان کیا
ہر مشکل کو آسان کیا
ہر منزل کو آسان کیا
اب اس دل کے گھر میں کوئی اور مہمان نہیں
ربّ نے خود کو مہربان کیا
خود کو میرے بنجر دل کا مہمان کیا
اب ربّ کو میں نے مہمان کیا (۲۲)

خدا سے مکالموں کے حوالے سے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اس مجموعے میں متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اس لیے اس مجموعے کے بعد وہ عشقِ حقیقی کے حوالے سے اپنی نظموں میں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں۔ ایک اور نظم ''خود میرا معبود بن'' کے عنوان سے ہے جس میں شاعرہ نے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے مسائل پیش کیے ہیں اور خدا کو اپنا غم خوار سمجھتے ہوئے اپنے دکھوں کے مداوے کی دعا کی ہے، ملاحظہ ہو:

میرے خدا، مرے محسن، مرے تخلیق کار
تیری دنیا کے مکینوں نے
نفرت کے، حقارت کے جو داغ
میرے ماتھے پہ سجائے ہیں
ان کو تُو ہی مٹا دے (23)

تصوف کے سلسلے میں شاعرہ کی دیگر نظموں میں ''اے مصروفِ یزداں''، ''دیدارِ کعبہ''، ''بارش''، ''کیوں''، ''ابھی نہ جا مرے چارہ گر'' اور ''اب کوئی نہیں'' بہت عمدہ ہیں۔ جبکہ عورتوں کے مسائل کی نشان دہی کرتی ہوئی متعدد نظمیں اور بھی ہیں جن میں خواتین کے

مجموعی دکھوں کی نشان دہی اور ان کے حل کے لیے کوشش کی گئی ہیں۔ ان نظموں میں اہم ترین ''وقتِ مرگ''، ''دلِ بے خبر''، ''میری نارسائی''، ''گردِ سفر''، ''ردا رو رہی ہے''، ''بے وفائی''، ''دکھ میرا انجوگ''، ''مزار''، ''اب کوئی نہیں'' اور ''آخری خواہش'' ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو اس مجموعے کی نظموں میں تین بڑے موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں جو مجموعے میں سرفہرست ہیں۔ پہلا موضوع شاعرہ کی ذاتی زندگی کے دکھ اور فراق میں بے سکونی کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا بڑا موضوع عشقِ حقیقی ہے جس میں شاعرہ نے دنیا سے تنگ آ کر خدا کے حضور سجدہ ریزی کی ہے۔ یعنی انھوں نے عشقِ مجازی سے فرار اور عشقِ حقیقی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ تیسرا موضوع ''عورت کا دکھ'' ہے۔ شاعرہ کا آبائی وطن ڈیرہ غازی خاں کا مضافاتی علاقہ ہے اس لیے دیہات کی عورتوں کو درپیش مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے بھی شاعرہ نے نظموں کا سہارا لیا ہے۔ اس حوالے سے یہ مجموعہ پچھلے مجموعے سے بہت اہم ہے اور فنی طور پر بھی دونوں شعری مجموعوں میں بہت فرق نظر آتا ہے۔ آئندہ سطور میں مصنفہ کے تیسرے شعری مجموعے'' اور شام ٹھہر گئی'' کی نظموں کا اسلوب اور موضوعات کے حوالے سے بحث کی گئی جائے گی۔ یہ مجموعہ بھی غزلوں کے حوالے سے کافی ضخیم ہے، تفصیل ملاحظہ ہو:

۵۔ ''اور شام ٹھہر گئی'' کی نظمیں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تیسرا شعری مجموعہ'' اور شام ٹھہر گئی'' ادارہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور نے 2013ء کو شائع کیا (42)۔ اس مجموعے کی نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مجموعی طور اس کتاب کو غزلوں کی کتاب کہا جائے گا لیکن اس میں وقفے وقفے کے ساتھ نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس مجموعے میں شامل نظموں کی تعداد 26 ہے جن میں مختلف النوع موضوعات پیش کیے گئے ہیں۔ حمد کے بعد پہلی نظم ''اے خدا اے خدا'' کے عنوان سے ہے جس میں شاعرہ نے خانہ کعبہ کے طواف کا منظر بیان کیا ہے۔ دیدارِ کعبہ کے بعد شاعرہ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ اسے شہرِ مکہ میں ہی موت آجائے

لیکن اگر موت نہ بھی آئے تو سرزمینِ عرب میں سکونت کی خواہش کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے اس نظم میں حمدیہ انداز بھی ملتا ہے اور کہیں کہیں نعتیہ لہجہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو:

اے خدا میں تہی دست آئی یہاں
پھر بھی سب کچھ مجھے آج یوں مل گیا
میں دکھی تھی یہاں پر سکوں مل گیا
واسطہ ہے تجھے تیرے محبوب کا
چاہے زندہ رہوں، چاہے مر جاؤں میں
اس جہاں میں نہ اب لوٹ کر جاؤں میں (۲۵)

تیسرے شعری مجموعے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی محبت میں پختگی نظر آتی ہے۔ اب وہ ہر بات سنجیدگی سے کہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی گئی ان کے فن میں بھی پختگی آتی گئی۔ اس مجموعے میں شاعرہ کی محبت کا ایک رُخ سامنے آیا ہے جو ان کی اپنی والدہ سے محبت اور پیار ہے۔ انھوں نے تین نظمیں ماں کی محبت میں اس مجموعے میں شامل کی ہیں۔ وہ انھیں ماں کی محبت کا لازوال تحفہ سمجھتی ہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت کے وقت وہ خود بھی دو بچوں کی ماں بن چکی تھیں اس لیے ماں کی محبت کے حوالے سے ان کے اپنے اندر کا مامتا کا جذبہ بھی بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم ''سہارا ماں ہے'' سے دو اشعار دیکھیں:

دکھ کے لمحوں میں مرا ایک سہارا ماں ہے
میں اگر ڈوبتی کشتی ہوں تو کنارا ماں ہے

اسکے قدموں میں جو جنت ہے تو مطلب یہ ہے
آسمانوں سے جسے رب نے اتارا ماں ہے (26)

اسی طرح ایک اور نظم ’ماں اک ایسی ہستی ہے‘ سے چند اشعار دیکھیں:

ابر کی صورت میرے سر پر
ایک دعا سی رہتی ہے
میری اپنی ذات بھی اس کی
خوشبو سے ہی مہکی ہے
میرا ہر اک دکھ جو سمجھے
بس وہ ماں کی ہستی ہے (27)

مجموعہ ہٰذا میں تین نثری نظمیں بھی شامل ہیں جو بالترتیب بکتے دیکھا، میں بجھنے لگی ہوں اور زندگی اب نہ اور آزما مجھے ہیں۔ ان میں خیالات کا بہاؤ تو ضرور ہے لیکن نثری نظمیں ہونے کی بدولت کسی قانون قاعدے کے مطابق نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ دسمبر کے حوالے دو نظمیں لکھی گئی ہیں۔ دسمبر کا موضوع ہمارا کلاسیکی روایت سے چلا آ رہا ہے اس لیے موصوفہ نے بھی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے دسمبر کے حوالے سے نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم ’’دسمبر لوٹ جاتا ہے‘‘ کے عنوان سے ہے جس میں شاعرہ لکھتی ہیں:

مہینہ ہجر کا جب بھی مرے آنگن میں آتا ہے
اداسی کے ہر اک منظر کو وہ موجود پاتا ہے

نگاہوں کو جھکا کر بس دسمبر لوٹ جاتا ہے
مرا دل رُک سا جاتا ہے (۲۸)

دسمبر کے مہینے کو اکثر شعراء □ نے بے درد، ظالم، ہجر زدہ اور تکلیف دہ استعمال کیا ہے۔ اس لیے موصوفہ نے بھی روایت کا سہارا لے کر دسمبر پر چوٹ کی ہے۔ سال کا آخری مہینہ ہونے کی بدولت یہ مہینہ اکثر و بیشتر شعراء □ و ادباء □ کی زد میں رہا ہے۔ ’’اور شام ٹھہر گئی‘‘ کی آخری نظم ’’یہ مرا انت ہے‘‘ بڑے معرکے کی نظم ہے۔ اس نظم میں

ڈاکٹر نجمہ شاہین نے کائنات کی بے ثباتی اور انسان کی ازلی تنہائی کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ’’انت‘‘ سے مراد شاعرہ نے انجام یا انتہا لیا ہے۔ شاعرہ نے اپنی بے بسی اور تنہائی کی منظر کشی کرتے ہوئے اپنے نازک جذبات کو زیب قرطاس کیا ہے۔ چند مصرعے دیکھیں:

میرے مقتل کو جس دن سجایا گیا
بے بسی کو سہیلی بنایا گیا

ایک شہنائی کی دھن پہ جس روز اک
ماتمی گیت مجھ کو سنایا گیا

ایسے لمحوں میں، میں نے تڑپتے ہوئے
ا ?سماں کو پکارا مدد کے لیے

میں نے دیکھا فلک کے ستارے سبھی
میری حالت پہ بس مسکراتے رہے (29)

نظم مذکورہ بالا میں شاعرہ نے اپنی تباہی کو روکنے کے لیے کبھی آسمان سے مدد مانگی، کبھی سورج سے مدد مانگی، کبھی زمین سے مدد مانگی۔ آخر میں دنیا سے تنگ آ کر اپنے محبوب سے مدد مانگی لیکن کسی نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ وہ محبوب جو اس کے لیے ہمیشہ کلمۂ خیر پڑھتا رہتا تھا اس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تو آخر میں شاعرہ نے یہ بتایا کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں ہے، انسان ہمیشہ اکیلا ہی آیا ہے اور اکیلا ہی جائے گا۔ اور یہی انسان کا انت ہے، یہی انجام ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا آخری شعری مجموعہ ’’پھول، خوشبو، تارا‘‘ ہے۔ یہ مجموعہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی جملہ فکر کا نچوڑ ہے، کیونکہ اس میں خیالات کی رنگارنگ تصویریں

ملتی ہیں۔ ذیل میں کتاب مذکورہ بالا کی نظموں کی تفصیل پیش ہے۔

۶۔ ''پھول، خوشبو اور تارہ'' کی نظمیں

پھول، خوشبو اور تارا، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو اس وقت تک آخری مجموعہ ہے۔ ان کا شعری سفر ابھی ختم نہیں ہوا اس لیے امید ہے کہ مستقبل قریب یں ان کے مزید کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آئیں گے۔ اس لیے یہ سفر ابھی چلتا رہے گا۔ مجموعہ ہٰذا دراصل غزلیات کا مجموعہ ہے لیکن اس میں کچھ نظمیں بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں کل سترہ نظمیں شامل ہیں۔ لیکن ہر نظم زندگی کا ایک مکمل باب ہے۔ تفصیل آئندہ صفحات میں درج کی جاتی ہے۔

پہلی نظم ''عجیب ہوتی ہے یہ محبت'' کے عنوان سے ہے جو سرورق پر بھی موجود ہے۔ اس نظم میں شاعرہ نے محبت کے ردِ عمل میں پیش آنے والی صورت حال کی نشان دہی کی ہے اور محبت کی خصوصیات کی تفصیل بھی پیش کیا ہے۔ یہ آزاد نظم ہے جس کے آغاز میں شاعرہ کہتی ہیں:

عجیب ہوتی ہے یہ محبت
نصیب والوں کے دل میں جب یہ جاگتی ہے
تو پہلے نیندیں اُجاڑتی ہے
یہ جھومتی ہے، ناچتی ہے
یہ پھیلتی ہے، بولتی ہے
ہر ایک لمحہ ہر ایک وعدہ کو تولتی ہے
صلیب ہوتی ہے یہ محبت
عجیب ہوتی ہے یہ محبت (۳۰)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا شعری سفر جوں جوں آگے کی طرف بڑھتا ہے تو وہ داخلیت سے خارجیت کی طرف آتی ہیں۔ مثلاً پہلے دو شعری مجموعوں میں وہ اپنی ذات میں

چھپی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن آخری دو کتب میں انھوں نے غمِ دوراں کی بات کی ہے۔ ان کے اندر پلنے والے دکھوں نے جب کھلی فضا میں سانس لی تو کائنات کے دکھ دیکھ کر وہ اپنے دکھ بھول گئیں۔ انھیں لوگوں کی پریشانیوں اور تکالیف سے غرض ہوگئی اور وہ ان کے تدارک کے لیے خارجیت کے سفر پر چل نکلیں۔

''ایک بختوں والے کا قصہ'' اس حوالے سے بہت عمدہ نظم ہے۔ شاعرہ نے ایک فرضی کردار کی زبانی اس کہانی کو بیان کیا ہے۔ نظم مذکور میں کہانی کا عنصر نمایاں ہے جس میں ایک سہیلی اپنی دوسری دوست کو اپنی محبت کا قصہ سناتی ہے۔ اور اس قصہ کا انجام ایک دوسرے کی دائمی جدائی پر ہوتا ہے۔ انجام ملاحظہ ہو:

لیکن ہجر کا آبِ زم زم اس نے ہاتھ جھٹک دیا تھا
درد کا وہ انمول سا قطرہ
وصل کا اک انمول سا لمحہ
اس پل خاک میں خاک ہوا تھا
ہجر کے دریا شعلوں میں
میرا جیون راکھ ہوا تھا (۳۱)

مجموعہ ہٰذا کچھ نظمیں شاعرہ کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں جن میں مختلف تجربات اور مشاہدات کیے گئے ہیں۔ ان نظموں میں محبت اور عشق کے جذبات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تحریریں بظاہر نظموں کے عنوانات سے ہیں لیکن گیت کا انداز پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً ''اسے عید مبارک کہتی ہوں''، ''مگر میں کیسے پرسہ دوں''، ''دل دیس تمھارا مسکن تھا''، ''مرے قصہ گو مرے نامہ بر'' جیسی نظموں میں گیت کا سا انداز اپنا گیا ہے۔ ان نظموں میں ہجر، پیا ملن کی آس اور جسم کی پکار کو پیش کیا گیا ہے۔ نظم'' کوچہء عشق سے اس طرح رہا بھی کیوں ہوں'' میں عشق کے کوچے سے زندگی کے تجربات پیش کیے گئے ہیں۔ اس نظم کے تین بند ہیں جن کا مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ عشق صرف محبوب کی یاد میں تڑپنے اور اس میں قید

ہونے کا نام ہے۔عشق کے لیے وصل لازم نہیں ہے بلکہ محبوب کو حاصل کرنے کی تگ و دو ہی دراصل عشق ہے۔آخری بند دیکھیں:

آج تھک ہار کے اب ہم نے یہی سوچا ہے
ہم اگر ایسے نگر میں بھی بسیرا کر لیں
جز تیری یاد بھلا زادِ سفر کیا رکھیں؟
بے خبر ہو کے بھی ہم اپنی خبر کیا رکھیں؟
ہم نے سوچا ہے،ہم اب تجھ سے خفا بھی کیوں ہوں؟
اتنی تنہائی میں،ہم خود سے جدا بھی کیوں ہوں؟
تیرے ہوتے ہوئے،ہم وقفِ قضا بھی کیوں ہوں؟
کوچہِ عشق میں اس طرح رہا بھی کیوں ہوں (۳۲)

مندرجہ بالا بند سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ کے نزدیک عشق جہدِ مسلسل کا نام ہے۔اس نظم میں وہ علامہ اقبال کے ''فلسفہءعشق'' سے متاثر نظر آتی ہیں۔اس حوالے سے عشق کی روحانیت اس میں خوب انداز سے پیش کی گئی ہے۔نظم ''صبح تو ہوگی''میں شاعرہ نے اپنی خودی اور خود پسندی کو پیش کیا ہے۔اس طویل نظم میں عقل و دل کے حوالے اپنے مضبوط قوتِ فیصلہ کا سہارا لیتے ہوئے شاعرہ نے اپنی اہمیت کا ثبوت دیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر میرا عشق اور عقیدہ سچا ہے تو مجھے عشق میں کامیابی ضرور ہوگی اور تکمیلِ عشق پر وہ مطمئن نظر آتی ہیں۔اس نظم میں رجائیت کو قنوطیت پر ترجیح دی گئی ہے۔

مجموعہ ہٰذا میں عید کے حوالے سے دو نظمیں کہی گئی ہیں جو بالترتیب عید حیران ہے اور اسے عید مبارک کہتی ہوں کی عنوانات سے ہیں۔گویا انھوں نے عید کے موضوع پر نظمیں لکھ کر دراصل مسلمانوں کے خوشی کے دنوں کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اگرچہ عید کے حوالے سے شاعرہ نے اپنی یادوں کو بھی سمیٹا ہے لیکن اصل مقصد انھوں نے مسلمانوں کے تہواروں کے لیے تحسینی کلمات ادا کیے ہیں جو ایک نیا موضوع ہے۔

بحیثیتِ مجموعی باب ہٰذا کا جائزہ لیا جائے تو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں کا تجزیہ بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جو بیک وقت نظم گو اور غزل گو شاعرہ ہیں،ان کی نظم گوئی کی خصوصیات کو ممکنہ حد تک پیش کر دیا گیا ہے۔اس ضمن میں نظم کا آغاز و ارتقاء ▯ بھی پیش کیا گیا ہے جو اضافی معلومات ہیں۔یعنی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں کو بھی تحقیق و تجزیے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔آئندہ باب ان کی غزل گوئی کے حوالے سے جس کی تفصیل آئندہ صفحات پر ملاحظہ کریں۔

باب سوم:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بحیثیت غزل گو

اردو غزل کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنی کہ اردو زبان کی تاریخ،یعنی اردو زبان کے آغاز کے ساتھ ہی اردو غزل وجود پذیر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو غزل کے اولین شعراء امیر خسرو اور مسعود سعد سلمان کے ہاں بھی اردو غزل کے نمونے مل جاتے ہیں۔ اردو غزل کے آغاز سے لے اکیسویں صدی کے طلوع ہونے تک یہ صنف اپنی عمر کے سات سو سال مکمل کر چکی ہے(۱)۔اس عرصے میں بیسیوں اصنافِ نظم جلوہ گر ہوئیں لیکن غزل کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ اردو غزل کی مقبولیت کے سبب اسے نیم وحشی صنف،مقبول ترین صنف،وارداتی صنف،شرمیلی صنف اور دیگر کئی القابات سے نوازا جاتا ہے۔ان سب تعریفوں سے نہ صرف غزل کو تقویت ملتی ہے بلکہ اس کے مقام میں بھی بلندی آتی ہے۔ذیل غزل کے آغاز وارتقاء کے تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱۔اردو غزل آغاز وارتقاء

اردو غزل کے آغاز وارتقاء پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے اس کے با قاعدہ نمونے ہمیں دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کے بادشاہوں اور ان کی رعایا کے ہاں ملتے ہیں۔حیدر آباد دکن کی دو ریاستوں بیجا پور اور گول کنڈہ غزل کی آبیاری میں پیش پیش رہیں۔بیجا پور میں عادل شاہی جبکہ گول کنڈہ میں قطب شاہی خاندان کی آزاد اور خود مختار ریاستیں اردو غزل کا پرچار کرنے میں پیش پیش رہیں جن کی خدمات کو نظر انداز کرنا گویا پورے ادب کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے(۲)۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں محبوب کی باتیں کرنا یا محبوب کے حوالے سے باتیں کرنا۔غزل میں ایک باوقار اور سنجیدہ سوز و گداز کا انداز اپنایا جاتا ہے،جو انسان سے سچے جذبوں کی عکاسی کرتا ہے۔یہی انداز عشق کی پاسداری بھی کرتا ہے۔غزل کا لفظ عربی ہے لیکن اس کا نزول فارسی سے اردو میں آیا۔عرب شعراء ایک خیال کو پھیلا کر کئی اشعار میں ڈھالنے کے عادی تھے اس لیے وہ قصیدے تک محدود رہے لیکن غزل کو ریزہ خیالی نے خوش آمدید کہ کر اسے الگ پہچان دے دی۔

غزل کی خصوصیات جو ہمارے ناقدین اور شعراء نے گنوائی ہیں وہ تمام کی تمام عرب کی عشقیہ شاعری سے ماخوذ ہیں لیکن اس کے باوجود جسے آج غزل کا نام دیا جاتا ہے وہ عربی شاعری میں موجود نہیں ہے۔غزل کی مجموعی خصوصیات دیکھی جائیں تو جو تاثر ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ کہ غزل میں عشقیہ اشعار،عشق و محبت کی فضا اور خود سپردگی جیسے عناصر حمیت اور خودداری کے مقابلے میں زیادہ ہوتے ہیں۔غزل میں داخلی کیفیات، معشوق کا ادب و احترام،سوز و گداز،زبان نرم و ملائم،شیریں اور عام فہم ہو۔جہاں تک ممکن ہو سکے تشبیہات،استعارات اور صنائع بدائع سے بھی کام لینا چاہیے۔خیالات و جذبات کے پیش کرنے کا انداز منفرد اور نرالا ہونا چاہیے۔

اردو غزل کی ابتداء مسعود سعد سلمان لاہور اور حضرت امیر خسرو نے کی۔ مسعود سعد سلمان کا کلام سب سے پہلے غزل کی صورت میں ادب کے افق پر نمودار ہوا تو بعد میں امیر خسرو نے با قاعدہ طور پر غزل گوئی کی ابتداء کی۔مسعود سعد سلمان غزنوی دور کا شاعر تھا جس کا ذکر حضرت امیر خسرو نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''غر? الکمال'' میں کیا ہے۔

مسعود سعد سلمان کے بعد ایک طویل مدت تک قدیم اردو شاعری کی تاریخ خاموش ہے۔مسعود سعد سلمان متوفی ۱۱۲۱ء کے بعد حضرت امیر خسرو نے قدیم اردو شاعری کا بیڑا اُٹھایا۔ان کا زمانہ حیات 1253ء تا1325ء ہے(۳)۔انھوں

نے سلاطینِ دہلی کے سات بادشاہوں کا دور دیکھا جو غیاث الدین بلبن کے دور سے شروع ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے پہلی بار فارسی اور اردو کو ملا کر شعر کہنے کی جسارت کی جسے بہت پذیرائی ملی۔ اس حوالے سے ان کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی جو آج بھی زبان زدِ عام ہے۔ غزل ملاحظہ ہو:

زحالِ مسکیں، مکن تغافل، دورائے نیناں ملائے بتیاں
جو تابِ ہجراں ندارم ایجاں، نہ لیو گاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں، تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

جو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں، ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں، نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

بحق آن مہ کہ روزِ محشر، بداد مارا فریبِ خسرو ؟
سپیت من کی دوراہے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں (۴)

شمالی ہند میں قدیم اردو کے نمونے دکن کی بہمنی سلطنت کے دور میں دکن پہنچے جن کی بدولت اردو غزل کی ابتداء □ ہوئی۔ دکن میں بہمنی سلطنت کا دورِ محمد تغلق اردو شاعری کے ابتدائی نمونوں کا دور ہے۔ قابلِ ذکر شعراء □ میں فخر الدین نظامی کی مثنوی ''قدم راؤ پدم راؤ'' بہت مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شمس العشاق شاہ میراں جی، فیروز، ملا خیالی اور اشرف بیابانی وغیرہ بھی بہمنی دور کے شعراء □ تھے۔ یہ وہ شخصیات ہیں جن کو اردو خدمات کو تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ بہمنی دور کے شہنشاہ سلطان محمد شاہ کے انتقال کے بعد بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے ساتھ ہی

قدیم اردو غزل کا رسمی دورِ افتتاح اختتام پذیر ہو کر دکن کی قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں میں ضم ہو گیا۔

بیجا پور کی عادل شاہی حکومت کے جن شعراء □ نے اردو غزل کو فروغ دیا ان میں ابراہیم عادل شاہ، محمد عادل شاہ، برہان الدین جانم، عبدل، مقیمی، صنفی، امین الدین اعلیٰ، حسن شوقی اور نصرتی قابلِ ذکر ہیں۔ مندرجہ بالا شعراء □ نے اردو غزل کو جس راستے پر استوار کیا وہ غزل کے لیے صراطِ مستقیم ثابت ہوا۔ گول کنڈہ کی قطب شاہی حکومت کے جن شعراء □ نے غزل میں طبع آزمائی کی ان میں فیروز، ملا خیالی، محمودی، محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، احمد گجراتی، عبداللہ قطب شاہ، ابنِ نشاطی، میراں یعقوب اور ابوالحسن تانا شاہ کے نام سرِ فہرست ہیں (۵)۔

بیجا پور اور گول کنڈہ کی ریاستیں باقی علوم کی نسبت علم و ادب میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو غزل کی تاریخ میں پہلی بار قلی قطب شاہ کا دیوان شائع ہوا۔ جس سے اردو غزل اپنے اصل مقام کی طرف تیزی سے گامزن ہو گئی۔

قطب شاہی دورِ ادب کا اہم نام ولی دکنی ہے جسے اردو غزل کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ جب اہلِ ذوق ولی دکنی کی شاعری کا موازنہ قدیم ادب سے کرتے ہیں تو انھیں ولی دکنی کے علاوہ سب کچھ ادھورا ادھورا لگتا ہے۔ ولی دکنی نے غزل کے نامکمل اور ادھورے پن کو اپنی کمال قابلیت سے ایسا پورا کیا کہ آج تک غزل کو اس کے مقام سے ہٹانے کی تمام کوششیں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی ہیں۔ ولی دکنی کی شاعرانہ لیاقت کے بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''ولی صحیح معنوں میں جہاں گرد شاعر تھا۔ تعلیم کے سلسلے میں اس نے احمد آباد کا سفر کیا۔ خاندانی تعلقات اسے اورنگ آباد کا سفر کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ علم کی تلاش میں وہ برہان پور کی جانب جا نکلا اور ایک مرتبہ اس نے سورت کا سفر بھی کیا۔ سورت شہر کو وہ زندگی بھر نہ بھول سکا اور

مسلسل یاد کرتا رہا‘‘(۶)

ولی دکنی کی پیدائش اورنگزیب عالمگیر کے دورِ آخر میں ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب مغل شہزادوں نے دکن کی بیجا پور اور گول کنڈہ حکومتوں پر اپنی دھاک بٹھالی تھی۔ دکن کا ادبی شیرازہ بکھر چکا تھا۔ دہلی میں فارسی آموز اردو شاعری کا وجود پیدا ہو چکا تھا۔ ولی دکنی پر قطب شاہی عہدِ ادب کا خاص اثر تھا۔ انھوں نے عشق و محبت کی داستانوں کو اپنی غزل میں سمونا شروع کر دیا۔ ولی کا انداز خالص عشقیہ تھا اور غزل کے معاملات پر پورا اترتا تھا۔ ولی دکنی نے دہلی کا پہلا سفر کیا تو شمالی ہند کی شاعری پر ان کے دیوان کا بہت اثر پڑا۔ دہلی میں ان کی ملاقات سعد اللہ گلشن سے ہوئی جہاں سے ولی کو کچھ ادبی مشورے بھی ملے تھے۔ ولی کے انداز اور سعد اللہ گلشن سے ملاقات کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

’’ولی دکنی کی شاعری کا انداز اس وقت بالکل ویسا ہی تھا جو دوسرے دکنی شعراء □ کا۔ اس کے بعد ولی دکنی دو مرتبہ دہلی گئے۔ پہلی بار عہدِ اورنگ زیب 1700ء □ میں گئے اور اس وقت شاہ سعد اللہ گلشن نے ان کا کلام سن کر کہا کہ ’’مضامینِ فارسی ریختہ میں کیوں نہیں استعمال کرتے‘‘ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولی نے فارسی آمیز ریختہ میں شعر کہنا شروع کر دیا۔‘‘(۷)

اس واقعہ کے بعد ولی کی شاعری میں نیا موڑ آیا اس نے بڑی جر?ت مندی کے ساتھ نئے شعری دور کا آغاز کر دیا۔ دیوانِ ولی اس بات کا عکاس ہے کہ اردو غزل دکن کے حصار سے نکل کر پورے ہندوستان کی شاعری بن گئی۔ ولی کا دیوان جب شمالی ہند پہنچا تو اس وقت دہلی میں ایہام گو شعراء □ کا دور شروع ہو چکا تھا۔ عہدِ محمد شاہی میں ایہام گوئی کی تحریک کا تیس سالہ دور شروع ہوا جو محمد شاہ کی وفات کے بعد خود بخود ختم ہو گیا۔ ایہام گو شعرا ء □ نے ولی کی ایہام گوئی کا بہت اثر لیا اور ایک نئی تحریک کا آغاز کر دیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

’’ایہام گوئی کی ترویج و اشاعت میں مختلف النوع محرکات کارفرما تھے۔ اس میں ادبی روایت کے حوالے سے ولی کی شاعری کے ایہام کا اثر بھی تھا اور برج بھاشا کے دوہروں کا اثر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عہدِ مغلیہ کے آخری دور کے فارسی گو شعراء □ میں ایہام کی روایت کا اثر بھی دکھا رہا تھا۔ تہذیبی روایت کے حوالے سے محمد شاہی عہد کی نشاطیہ ثقافت نے فکری عنصر کے خلا کے باعث لفظی صناعی کے فن سے اس کمی کو پورا کرنے کی سعی کی۔ اس کا ساتھ ساتھ ایک غالب عنصر کے طور پر ایہام گو شعراء نے ولی کی پیروی بھی کی۔ ایہام گوئی ان ہی مختلف النوع محرکات کے زیرِ اثر پروان چڑھی اور تقریباً تیس برس سے زیادہ مدت (1722ء تا 1755ء) شمالی ہند کی شاعری میں ایک غالب رجحان کے طور پر چھائی رہی۔‘‘(۸)

ایہام گوئی تحریک کے زیرِ اثر جن شعراء نے کام کیا ان میں حاتم، آبرو، محمد شاکر ناجی اور مرزا مظہر جانِ جاناں کا نام سرِ فہرست ہے۔ ان شعراء □ نے اردو غزل کو ایہام کے پردے میں پیش کیا جو ایک زبر دست تحریک کے طور پر وجود میں آ گئی۔ مرزا مظہر جانِ جاناں نے اول تو ایہام گوئی کی شاعری کی لیکن بعد میں خود ہی اس سے اکتا کر اس کے خلا ف ردِ عمل کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ان کے ساتھ سرج الدین علی خان آرزو، عبدالحی تاباں، علی حزیں اور دیگر شعراء □ نے مل کر ایہام گوئی کی تحریک کا خاتمہ کر کے اصلاحِ زبان کے سلسلے کا آغاز کر دیا جہاں غزل اپنے اصلاحی دور سے گزرتی ہوئی میر و میرزا کے دور تک پہنچ گئی۔‘‘(۹)۔

اردو غزل جب میر و میرزا کے دور تک پہنچی تو اس وقت شمالی ہند کی غزل نصف صدی سے زیادہ کا سفر طے کر چکی تھی۔ ملکی سیاسی انتشار کی بازگشت اردو غزل میں سنائی دی جا

رہی تھی۔اس دور میں دہلی کوتخت وتاراج کیا گیا۔نادرشاہی لوٹ مار، جاٹ، مرہٹے، سکھ، روہیلے اور دیگر مقامی گروہوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ملکی انتشار عروج پر تھا۔ جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہونے والا تھا تو عین اسی وقت غزل اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ادب کے افق پر جلوہ گر تھی۔اس سنہری دور میں میر تقی میر، میرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد، غلام ہمدانی مصحفی اور قائم چاند پوری نے اردو غزل کو بلند مقام پر پہنچا دیا جس میں زیادہ کردار میر و میرزا کا تھا(10)۔

دبستانِ دہلی کے بعد لکھنو میں بھی ایک دبستان کا وجود ہوا جسے ''لکھنو کا دبستانِ شاعری'' کہتے ہیں۔اس دبستان میں انشا، جر?ت، مصحفی، رنگین، آتش، ناسخ، انیس، دبیر اور ان شاگردوں نے بہت کام کیا۔آتش و ناسخ تک غزل نے اصلاحِ زبان کے تمام مراحل طے کر لیے۔دونوں دبستانوں میں غزل کو خوب رونق بخشی گئی۔اس سلسلے میں معاصرانہ چشمکوں کا دور بھی شروع ہو گیا۔

دبستانِ دہلی کے آخری دور میں مرزا غالب اور ابرہیم ذوق نے اپنے شاگردوں کی کثیر تعداد کے ساتھ غزل کو فروغ دیا۔ان کی دیکھا دیکھی مومن خان مومن، نواب غلام مصطفیٰ خان شیفتہ، شاہ نصیر دہلوی اور دیگر شعراء ▯ بھی دہلی کے دبستان میں شامل ہو گئے۔بہادر شاہ ظفر کے اس دور میں دبستان دہلی ایک مرتبہ پھر اپنے ماضی کی روشن روایات کو زندہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔اس دوران جنگِ آزادی ہوئی تو ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ چلا گیا اور اردو غزل کچھ عرصہ کے لیے میدانِ عمل سے غائب ہو گئی۔

جنگِ آزادی کے بعد سرسید کی علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر جدید ادب کا دور شروع ہوا جس میں غزل کو پسِ پشت ڈال کر اس کی جگہ نظم، ناول، تنقید، سوانح عمری، تاریخ نویسی، مضامین اور جدید ادب کی دیگر اصناف کو فروغ دیا گیا۔محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی? نے اپنی تنقید اور نظموں کے ذریعے غزل کی مخالفت کی جو وقتی طور پر کامیاب بھی ہو گئے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اردو غزل ایک بار پھر باقی اصناف کا مقابلہ کرتے ہوئے سامنے

آئی۔اس دور میں جن شعراء ▯ نے غزل کے لیے کام کیا انھیں متاخرین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس کے اولین سرخیل داغ دہلوی اور امیر مینائی ہیں جن کی پیروی میں حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال، یگانہ چنگیزی، مجاز لکھنوی اور جدید شعراء ▯ کی ایک جماعت نے منظّم ہو کر نظم کی ابھرتی ہوئی چنگاری بجھا کر ایک بار پھر غزل کی حکمرانی کو بحال کر دیا۔

ابھی غزل ایک بار پھر اپنی رونق دکھا رہی تھی کہ تقسیمِ ہند کا واقعہ پیش آ گیا اور ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔تقسیمِ ہند کے بعد اردو ادب بھی دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا۔پاکستانی ادب میں بھی غزل اپنے راستے پر چلتی رہی لیکن غزل کے ساتھ نظم، افسانہ، آپ بیتی، ناول نگاری اور متعدد اصناف بھی ادب کا حصہ بن گئیں(۱۱)۔

جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے، پاکستان میں غزل کے سیکڑوں شعراء ▯ اس صنف میں شامل ہو گئے۔آج اگر پاکستانی غزل گو شعراء ▯ کی فہرست مرتب کی جائے تو درجنوں صفحات اس فہرست کی نذر ہو جائیں گے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کی اردو غزل پاکستانی اردو غزل کے نام سے جانی جاتی ہے۔اس دور کے آغاز میں اردو غزل کو ایک بار پھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس دور کے آغاز میں اردو غزل جب مشکلات کا شکار ہوئی تو اس وقت پاکستان میں مختلف تحریکیں وجود پذیر ہو چکی تھیں۔ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق، اسلامی ادب کی تحریک، پاکستانی ادبی تحریک اور کچھ دبستان بھی کام کر رہے تھے۔اصنافِ ادب میں افسانہ، انشائیہ، ناول، نظم، آزاد نظم، نثری نظم، گیت، ملی نظمیں، ترانے اور بہت سی دیگر اصناف کی بازگشت سنائی دی جا رہی تھی۔ان حالات میں اردو غزل کچھ عرصہ کے لیے نظم گو شعراء ▯ کا ہدف بنی رہی لیکن فتح غزل کی ہوئی۔ترقی پسندوں نے اسے اپنے مزاج میں ڈھالا تو اسلامی ادب والوں نے اس میں نعتیہ و حمدیہ انداز پیش کرنا شروع کر دیا۔قیامِ پاکستان کے بعد اردو غزل کو کچھ ایسے شعراء ▯ میسر آئے جنھوں نے غزل کو اس کا اصل مقام دلوانے میں اہم کردار ادا کیا

۔(12)

پاکستانی اردو غزل میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ایم ڈی تاثیر، حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، حفیظ ہوشیار پوری، احسان دانش، سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری، مجید امجد، عدم، ناصر کاظمی، ماہر القادری، ابنِ انشاء ، ظہور نظر، ساغر صدیقی، حمایت علی شاعر، مصطفیٰ زیدی، عبید اللہ علیم، جون ایلیا، منیر نیازی، مظفر وارثی اور سیکڑوں شعراء نے اردو غزل میں طبع آزمائی کی۔ مندرجہ بالا فہرست حتمی نہیں ہے اس میں ابھی بہت سے ناموں کی گنجائش موجود ہے(13)۔

پاکستانی اردو غزل میں شاعرات نے بھی مختلف ادوار میں غزل گوئی جاری رکھی۔ شعراء کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم تھی لیکن پھر بھی ان کی ادبی خدمات مسلمہ ہیں۔ اہم ناموں میں ادا جعفری، پروین شاکر، زہرہ نگاہ، کشور ناہید، نوشی گیلانی، شبنم شکیل، فہمیدہ ریاض، حمیرا رحمٰن نزہت صدیقی، حمیدہ معین، شاہین مفتی، بسمل صابری، فاطمہ حسن وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں۔ جب پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں داخل ہوئی تو اس میں ہزاروں شعراء و شاعرات منظرِ عام پر آئے۔ آج پاکستان کے مختلف شہروں میں غزل گوئی عروج پر ہے۔ کراچی، لاہور، ملتان، ڈیرہ غازی خان، راولپنڈی، پشاور، بہاول پور، کوئٹہ، حیدرآباد، ایبٹ آباد اور دیگر مضافاتی علاقوں میں غزل کے ہزاروں شعراء و شاعرات غزل کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں۔ زیرِ تحقیق شخصیت ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق خواتین شاعرات کے اس گروہ سے ہے جو اکیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آیا۔ اب تک ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ آپ کی اردو غزل جدید ادبی تقاضوں کے مطابق ہے۔ ان کی غزل میں ہر وہ تجربہ شامل ہے جو آج کے شاعر پر لازم آتا ہے۔ فن اور فکر دونوں کو ساتھ ساتھ پیش کرنے کے علاوہ مصنفہ نے کچھ منفرد انداز بھی اختیار کیا ہے۔ ذیل میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیہ شاعری کو فکر و فن کے آئینے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن میں تمام تر تحقیقی حربے آزمائے گئے ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

۲۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بنیادی طور پر غزل گو شاعرہ ہیں تاہم انھوں نے نظم گوئی میں بھی بہت سے تجربات کیے ہیں۔ انھیں خود نظم سے لگاؤ ہے لیکن ان کی غزل گوئی کا حسن نظم کے مقابلے میں قدرے بہتر ہے۔ زیرِ نظر باب میں ان کی غزلوں کو فنی اور فکری حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہو۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا کلام فنی حوالے سے آخری تین کتب اغلاط سے پاک ہیں لیکن پہلی تصنیف عروضی طور پر بہت کمزور ہے۔ اُن کے موضوعات کی بات کی جائے تو عشقیہ شاعری کا موضوع اولین حیثیت رکھتا ہے جبکہ دیگر موضوعات میں نرگسیت، غمِ دوراں، دیہات کا پس منظر، بچپن کی یادیں، ناامیدی اور رجائیت کا امتزاج، نسوانیت اور دیگر موضوعات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ ذیل میں ان کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

۳۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل کے موضوعات:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی غزل کے متعدد موضوعات ہیں تاہم اہم ترین موضوعات عشقیہ شاعری، رجائیت، قنوطیت، نسوانیت، نرگسیت اور غمِ دوراں ہیں۔ مندرجہ بالا موضوعات کی تمام تر تفصیل ذیل کے صفحات میں بیان کی جارہی ہے۔

i۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی عشقیہ شاعری

عشق ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا محبوب موضوع ہے۔ ان کی شاعری کا خمیر بھی عشق ہی سے پھوٹا ہے۔ عشق میں ناکامی، بے نیازی، مجاز سے حقیقت تک کا سفر ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نسوانیت پرست ہیں لیکن ان کے اندر سچے جذبات نے انھیں عاشقوں کے گروہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی غزل عشق و عاشقی کی آئینہ دار ہے۔ جس طرح غزل اپنے مزاج میں عشق و محبت کے جذبات رکھتی ہے، اسی طرح ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی اس میں وہی اقدار پیش کیے ہیں جو اس کے فکری تقاضوں کے مطابق ہیں۔ ان کی ابتدائی تصنیف میں موجود چند عشقیہ اشعار دیکھیں:

بدلتے موسموں میں گر بھلا دیا مجھے تو کیا
مرا تو شعر ہے تمھاری یاد میں ڈھلا ہوا (14)

میری تنہائی نے اس کو اور تنہا کر دیا
جھیل سی آنکھیں تھیں انکو خشک صحرا کر دیا (15)

تجھ سے جدا ہوئے تو لگا عمر کٹ گئی
کیا کیا ملیں نہ پیار میں ہم کو رعائتیں (16)

ہنسی نہ دے سکا مجھے مگر مجھے ملال دے گیا
وہ ایک شخص روح کو عجب زوال دے گیا (17)

دیکھو تو کتنے درد ملے کوئے یار میں
کاٹا جو ہم نے ہجر ترے انتظار میں (18)

مندرجہ بالا اشعار ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے پہلے شعری مجوعے سے لیے گئے ہیں۔ یہ اشعار عشق میں ناکامی اور ہجر وفراق کی تڑپ کو واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مصنفہ نے اپنی شاعری کا آغاز ہی خود کو رد کرنے کے ردِ عمل میں کیا تھا۔ اس بات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''محبت کے بغیر شاعری کچھ بھی نہیں، پھر شعر لفظوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے، جس میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔ عشق محبت کی بنیاد ہے۔ محبت جب ہر تفریق کو ختم کر دے اور وہ جنون کا امتزاج بن جائے تو عشق ہو جاتی ہے۔ عشق وحدانیت ہے، خدا ہے'' (19)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی یہ محبت کبھی دھرتی سے ہوتی ہے تو کبھی بچپن کی یادوں سے۔ ان کا تعلق خواجہ غلام فرید کی دھرتی سے ہے اس لیے اس دھرتی میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی تاثیر رکھی ہے۔ موصوفہ کا ابتدائی عشق جدائی کی تڑپ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ ہجر وفراق کی یہ تڑپ ان کے دوسرے شعری مجموعے میں بھی موجود ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

ہجر کی وحشت نے دل کو کر دیا رنجور اب
بھولتے جاتی ہوں میں اب صورتیں دیکھی ہوئی (20)

ہجر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے (21)

ہجر کے موضوع پر چند اشعار پیش کیے گئے جن اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان اشعار پر نظر پڑتے ہی داد وتحسین کو دل کرتا ہے۔ مزید کچھ مثالیں دیکھیں:

جس کے خیال نے کیا سب سے جدا مجھے
زخموں سے کر گیا ہے وہی آشنا مجھے (۲۲)

سوزِ فراق و ہجر میں رنجور ہو گئے
اپنی فصیلِ درد میں محصور ہو گئے (23)

ملنا تھا صلہ میری وفاؤں کا یہی کیا
آنکھیں ہوئی ویران بیابان کی صورت (24)

آنکھیں لہو لہو ہیں شکستہ تمام خواب
شامِ فراق نے عجب تحفہ دیا مجھے (25)

ہم کریں گے نہ کسی طور وفا کو رسوا
ہم نہ بھولیں تجھے ہم کو بھلانے والے(26)

جب سے وہ میری چاہتوں سے اجنبی ہوا
دل ہو گیا اجاڑ بیابان کی طرح (27)

مندرجہ بالا اشعار ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دوسرے شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' سے لیے گئے ہیں۔ان اشعار میں بھی ہجر وفراق، جدائی تڑپ، محبوب کی یاد تنہائی اور اداسی کے جذبات ملتے ہیں۔شاعرہ اپنی تعلیم اور دنیاوی معاملات میں کبھی ناکام نہیں ہوئیں لیکن ان کے دلی جذبات کو ہمیشہ ٹھیس پہنچتی رہی۔وہ اپنی ملازمت اور دیگر کامیاب زندگی سے قطع نظر ہو کر اپنی دل کی کیفیت کو چپ چاپ ڈائری پر لکھتی رہیں۔اس عمل کے ذریعے وہ الجھاؤ سے سلجھاؤ کی طرف سفر کرتی رہیں۔ان کے اندر قوتِ برداشت اور قناعت کا مادہ شامل ہوا لیکن انھوں نے اپنے دل کی ٹیسیوں کو شاعری میں پیش کر دیا۔وہ اپنی غزلوں میں ہمیشہ بے کل بے کل سی نظر آتی ہیں۔اس حوالے سے محمد حسنین کامران لکھے ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے کوہِ سلیمان کے غریب معاشرے میں جکڑی ہوئی عورت کے درد کو خود پر طاری کر کے اس کی عکاسی کی ہے انھوں نے اس درد کی کیفیت اور تکلیف کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے''(28)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے شاعری کے ذریعے اپنے آبائی علاقے اور ارد گرد کی خواتین کے دکھ درد کو صیغہء واحد متکلم کے طور پر بیان کیا ہے۔انھوں نے دلوں کی حبس اور گھٹن کی پاس داری کرتے ہوئے صحرائی جزیرے میں قدم رکھا ہے۔یہ راستہ اگرچہ بہت کٹھن ہے لیکن موصوفہ اس میں کامیاب نظر آتی ہیں۔وہ اپنے دوسرے شعری مجموعے کے دیباچے میں اپنے رنج و الم کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرتی نظر آتی ہیں۔زندگی کی نا

ہمواریوں اور نا مطمئن لمحات کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''لفظوں کی، خیالوں کی، دکھ اور سکھ سے سجے موتیوں کی، یادوں کے ڈھیر پہ اٹھنے والی چنگاریوں کو شعلہ بنانے کی اور دل کی بنجر زمین پہ یادوں کے پھول اگانے کی خواہش کتنا دھوکہ دیتا ہے خود کو انسان۔ہار کے بھی جیت کے خیال سے خود کو خوش رکھتا ہے۔خوش فہمیوں میں ایک خیال کو اپنے سلیقہء ہنر سے کس کمال کا بت بنا دیتا ہے اور اسے ہی پوجتا رہتا ہے۔ایک ایسا پجاری بن بیٹھتا ہے کہ جو عقل وشعور اور اور ادراک کے معنی کھو چکا ہے۔جو اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے پیکر کو خدا سمجھ رہا ہے مگر اسے کون شعور دے کہ لا حاصل عشق میں تو سب رائیگاں جاتا ہے۔''(29)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اصلاحِ معاشرہ خصوصاً حقوقِ نسواں کی بات کرتے ہوئے کتاب ہٰذا کے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس لیے وضاحت کے ساتھ کوئی بات بیان نہیں کر سکیں۔انھوں نے دبے لفظوں میں انسان کو خیالی جنت سے باز رہنے کا مشورہ دے دیا ہے۔ہجر وفراق، کربِ تنہائی اور بے چینی سے پر زندگی کا احساس موصوفہ کے تمام شعری مجموعوں میں بیک وقت موجود ہے۔پہلے شعری مجموعے سے لے کر آخری مجموعے تک ہجر و فراق کے جان لیوا لمحات ان کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔چند اشعار دیکھیں:

اے آنکھ تو بے خواب ہے خوابوں کی طلب میں
یہ ہجر ہی آخر ترا انعام ہوا کیوں

جو تیری محبت کو سمجھ ہی نہیں پایا
شاہین یہ دل اس کے بھلا نام ہوا کیوں (30)

اب تک ترے بغیر میں میں زندہ ہوں کس طرح
ہوتی ہے اپنے آپ پر حیرت کبھی کبھی (31)

وہ چارہ گر کہاں گیا جو دل میں ہے بسا ہوا
ہے رات کی کہاں سحر، مجھے نہیں ہے کچھ خبر

خبر نہیں، خبر نہیں، کہاں وہ اب مقیم ہے
کہاں سے لاؤں اب خبر، مجھے نہیں ہے کچھ خبر (32)

تیرے لیے جب آنکھ برستی ہے رات کو
پھر دل کے ساتھ ساتھ سلگتی ہے زندگی (۳۳)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ابتدائی شاعری میں ہجر وفراق باقاعدہ موضوع کے طور پر نظر آتا ہے۔ یہ ہجر ان کی ارتقائی شاعری میں کرب والم برداشت کرنے کا استعارہ بن جاتا ہے جسے وہ قوتِ برداشت کے بل بوتے پر استعمال کرتی ہیں۔ آگے چل کر جب ان کی شاعری میں پختگی آتی گئی تو ان کا عشق بھی پختہ ہوتا گیا۔ اس لیے وہ بعض مقامات پر ہجر و جدائی کو عشق کا لازمی جزو قرار دے کر اسے اپنی پختہ شخصیت و شاعری کے لیے ضروری قرار دیتی ہیں۔ ذیل میں ہجر وفراق سے مطمئن ہو کر کہتی ہیں:

ساتھ ہی وہ رہتا ہے کب اسے بھلایا ہے
ہم نے خانۂ دل میں یاد کو بسایا ہے (34)

بڑی خوبصورت ہے شاہین دنیا
وہ آنکھوں میں سپنے بسا کر گئے ہیں (35)

تیز ہوا میں دیپ بجھے اور تاریکی سی پھیل گئی
ہجر وفراق کی ہر منزل میں اشک بہائے رکھتی ہوں (36)

اک پل کا جو وصال تھا ان ماہ و سال میں
دیتا ہے ہجر میں بھی رفاقت کبھی کبھی (37)

میں ایک مشعل، میں ایک جگنو، میں ایک شمعِ وفا ہوں شاہین
مرے خدا نے رکھا ہوا ہے مجھے تو یوں خوش خیال اب تک (38)

جب مرا ہر ایک دکھ میرا ہنر ہو جائے گا
زندگی کا یہ سفر آسان تر ہو جائے گا (39)

ترے فراق میں جیے، ترے فراق میں مرے
چلو یہ خواب ہی سہی، وصال کا گماں ملے (40)

مندرجہ بالا اشعار میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہجر وفراق کو اپنی شخصیت اور شاعری کے لیے بطور پختہ ہتھیار استعمال کرتی نظر آتی ہیں۔ کلاسیکی شعراء کی طرح ہجر میں وصال کے مزے لینے کی روایت یہاں نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں تازہ ہوتی نظر آتی ہے۔ اس لیے موضوعِ عشق میں وہ جدت کے ساتھ ساتھ روایت سے بھی جڑی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ بشریٰ اعجاز ان کی اس خاصیت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"قلم اور نشتر کا بڑا قدیم رشتہ ہے، کبھی نشتر سب دکھوں کی دوا بن جاتا ہے اور کبھی قلم درد کا اندمال بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین دونوں سے بہت خوبصورت کام لے رہی ہیں۔ شعوری طور پر وہ انسانیت کی خدمت کر

رہی ہے اور لاشعور طور پر محبت کی خوش رنگ کلیاں چن کران کی مالا پرو رہی ہے۔اس لئے اس کی شاعری خوشبوؤں کی پھوار لگتی ہے۔ہجر، فراق، انتظار، رت جگے، اضطراب ، بے کلی، آس، امید سب محبت کے قبیل میں شامل ہیں۔''(۴۱)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں ہجر، فراق، انتظار، تڑپ اور بیداری وغیرہ عشق کے سلسلے کے عوامل ہیں لیکن ان کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے عشق سے مایوس اور ناامید ہو چکی ہیں۔انھوں نے ان تمام عوامل کو اپنی ذات پر ظاہر کرنے کی بجائے خود کو رجائیت اور امید کے پیکر میں ڈھال رکھا ہے۔ان کی شاعری میں محبت کی ناکامی کا مطلب شخصیت کی پختگی اور تربیتِ خودی ہے۔چند مثالیں دیکھیں:

موم کر دیتا ہے شاہین یہ پتھر دل کو
عشق انسان کو معبود بنا دیتا ہے(42)

تنہائیوں میں چھیڑ کر تارِ ربابِ شوق
صحرا میں آج جشنِ مسرت منائیں ہم(43)

بڑی خوبصورت ہے شاہین دنیا
وہ آنکھوں کو دل میں بسا کے گئے ہیں(۴۴)

اک پل کا جو وصال تھا ان ماہ و سال میں
دیتا ہے ہجر میں بھی رفاقت کبھی کبھی(45)

عشقیہ شاعری کی مندرجہ بالا چند مثالیں پیش کی گئی جن میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے شعری قواعد کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اپنی فکر کو ان اشعار میں پیش کیا ہے۔مزید اشعار

دیکھیں:

میں ایک مشعل، میں ایک جگنو، میں ایک شمعِ وفا ہوں شاہین
مرے خدا نے رکھا ہوا ہے مجھے تو یوں خوش خیال اب تک(46)

چار جانب شام ہے یا گردشِ ایام ہے
پھول،خوشبو اور تارا زندگی کا نام ہے(47)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا غالب موضوع عشق میں رجائیت ہے لیکن وہ کبھی کبھی شدید مایوسی کا جزوی طور پر اظہار بھی کرتی نظر آتی ہیں۔درحقیقت غزل گوئی کا اصل حسن بھی یہی ہے کہ اس میں ریزہ خیالی اور تغیرات کے عناصر زیادہ ہوں۔کبھی کبھی موصوفہ کی مطمعن شخصیت خیالوں کے گرداب میں پھنس کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے:

زندگی کے کھیل کا شاہیں عجب انجام ہے
حسرتوں کی لاش ہے، اشکوں بھری اک شام ہے

زندگی خیرات میں لی، موت کی اب التجا
وہ مرا آغاز تھا اور یہ مرا انجام ہے(48)

وصل کی راہ میں نہیں کچھ بھی
ہجر والی ہی شام ہے اب تک (49)

یہ زخم جدائی کے کبھی سلنے نہیں ہیں
تو جان لے اپنی یہی تقدیر ہے جاناں(50)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں موضوعِ عشق مختلف حوالوں سے اپنی پوری

آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کبھی محبت سے مطمئن اور کبھی پریشان دکھائی دیتی ہیں۔ انھیں انسان، فطرت اور خدا سے عشق ہے۔ اس لیے وہ عشق کے درجات سے مرحلہ وار گزرتی نظر آتی ہیں۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے نامور ادیب پروفیسر اور نقاد ڈاکٹر ستیہ پال آنند، نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج کا اردو شاعر اس عبوری دور سے گزر رہا ہے جہاں اس کے پیچھے کلاسیکی غزل کی وہ تابناک روایت ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں ہی ختم ہوگئی تھی اور وہ پھر اندھا کنواں بھی ہے جس میں سکہ روایتی غزل آج تک ڈوبی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی کچھ نظمیں یقیناً بڑی نظمیں ہیں جنھیں سراہا جانا چاہیے۔ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے اس میں صوفیانہ عشق کی آسماں بدست بلندی سے لے کر تعشق اور ہوس کے تحت السرا تک شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ نجمہ شاہین کی نظموں میں یہ جذبہ ان دو بے نہایت حدود کے درمیان اس سطح مرتفع پر قائم ہے۔ جسے ہم ''من وتو'' کا علاقہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس ''من وتو'' ''میں'' ''من'' تو یقیناً شاعرہ کا واحد متکلم ہے۔ وہ خود ہے یا اس کی انا ہے لیکن ''تو'' ''محبوب بھی ہوسکتا ہے، دوست بھی ہوسکتا ہے، نامہرباں آسماں بھی ہوسکتا ہے اور ظالم حاکم بھی۔ اس کی ایک وجہ تو غزل کی چار سو برس پرانی اور مستحکم وہ روایت ہے جس نے غزل ہی کو نہیں بلکہ اردو نظم کو بھی ابتک من وتو کے حصار میں قید کر رکھا ہے۔ اور دوسری وجہ آسان راہوں کے سفر کو پر پیچ راستوں پر فوقیت دینا ہے۔ وہ محبت کے پاک صاف جذبے کو جہاں خوش روی اور شائستگی سے بیانیہ یا مکالمہ کے فارمیٹ میں ڈھالتی ہیں وہاں پر کاری اور سحر کاری کا انداز بھی اپناتی ہیں'' (51)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں محبت کے موضوع کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا

جائے تو اس میں کائنات میں چھپے رنگوں سے والہانہ عقیدت کے جذبات وا ہوتے ہیں۔ کبھی وہ الفتِ ذات میں گم ہو کر اپنے داخلی حسن کی کیفیات بیان کرتی ہیں، کبھی خارجیت سے متاثر ہو کر خود کو فطری حسن کے حوالے کرنے پر مجبور دکھائی دے رہی ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ محبت ایک لازوال جذبہ ہے جو شاعرہ کے وجدان کا جز بن چکا ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی ان کے جذبہء عشق کو تکمیل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کی شاعری عشق کے بغیر بالکل ادھوری اور نامکمل نظر آتی ہے۔ اپنے اس جذبے کے بارے میں وہ خود لکھتی ہیں:

''وقت بیت جاتا ہے، عمریں گزر جاتی ہیں، مگر حقیقتیں وقت کی دھند میں دھندلا کے بھی ختم نہیں ہوتی۔ زندگی کے جھمیلوں سے تھک ہار کے شام کو اپنے اپنے گھروندوں میں لوٹنے والوں کو کوئی ایسا پل ضرور ملتا ہے جب وہ اپنی ذات کا سفر کرتے ہیں۔ اپنی سوچ کا سفر اور سفر تو سارا سوچ کا ہی ہے۔ یہ سوچ ہی تو ہے جو پیٹ کے بل لڑکھڑاتی عشق کا روپ دھارے گردشِ زمانہ کی تمام تلخیاں سمیٹے تمام کٹھن اور اذیت سے بھرپور راہوں کا سفر طے کرتے کرتے اپنے قبلہ وکعبہ تک پہنچتی ہے اور اپنے خلوص کا تحفہ اپنے معشوق کے منتظر ہونے کی صورت میں پاتی ہیں۔'' (52)

پیار، محبت اور عشق ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی تمام شاعری کے گرد دائرے کی شکل میں گھومتے ہیں۔ ان پر مزید تفصیل لکھنے کا مطلب صفحات بڑھانے کے مترادف ہے۔ اس لیے اسی پر اکتفا کرتے ہوئے ان کی شاعری کے اگلے موضوع رجائیت اور قنوطیت کا امتزاج کی طرف پیش رفت کرنا چاہوں گا۔ یاد رہے کہ ایسے موضوع پر قلم اٹھانا اور موضوع کے ساتھ انصاف کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بڑے احسن طریقے سے اپنے مؤقف کو پیش کیا ہے۔

ii۔ رجائیت اور قنوطیت کا امتزاج

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی غزلوں میں کبھی رجائیت کے پردے سے جلوہ گر ہوتی

ہیں تو کبھی قنوطیت کی تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہیں۔اس لیے ان کی غزلوں میں بین السطور فکر و فلسفہ کی آویزش ملتی ہے۔رجائیت میں ان کی شاعری پر علامہ اقبال کے اثرات ہیں جبکہ قنوطیت انھوں نے روایت سے لی ہے۔ان دونوں کو یکجا کرنا ہی در اصل شاعرہ کا کارنامہ ہے۔اس حوالے سے نامور نقاد شبیر ناقد اپنی کتاب ''شاعراتِ ارضِ پاک'' میں ان کے اسلوب کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''ان کا' ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا' پیرایۂ اظہار فطری نوعیت کا ہے۔ان کا لہجہ بھرپور قسم کا ہے۔ان کے جذبوں میں شدتِ وحدت ہے۔ان کے کلام میں سوز و گداز ہے۔معرفت و مجاز کے فزوں تر حوالے ہیں۔ان کے اشعار میں خیالات کے تضاد کا بھی خوبصورت التزام ملتا ہے۔''(53)

قنوطیت اور رجائیت دو ایسے تضادات ہیں جو کسی ایک شخصیت میں بیک وقت بہت کم پائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں ان دو رجحانات کا ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے۔ان کی فکر کا بحرِ بیکراں دونوں کو اپنے اندر سمیٹے موج در موج رواں دواں ہے۔قنوطیت کے حوالے سے چند اشعار دیکھئے:

وعدہ بھی ساتھ لے گیا جاتے ہوئے وہ آج
ملنے کا آخری تھا جو امکان لے گیا(54)

درد ہی درد ملے ہاتھ کی ریکھاؤں میں
کم نصیبی نے دیے حیف یہ اسباب مجھے(۵۵)

زندگی بسر کرنا اس قدر نہیں آساں
تشنگی ہے صحرا کی اس کے گہرے پانی میں(56)

ہیں گرد گرد راستے منزل دھواں دھواں
دشتِ وفا کو کون یہ سنسان کر گیا(57)

مندرجہ بالا مثالوں میں قنوطیت کے جذبات نمایاں ہیں۔ان کی رجائیت کے حوالے سے چند مثالیں دیکھیں

ہزار شکوہ شکایت سہی ہمیں لیکن
وہ اس کے سامنے سارے گلے بھلا دینا(58)

قدم ہمارے نہ ڈگمگائے
گو راستے پر خطر رہے ہیں(59)

لٹ گیا اسباب لیکن آرزو باقی رہی
جستجو جاری مجھ میں اور سفر کے درمیاں(60)

عمر بھر کے جس سفر کو رائیگاں کہتے ہو تم
اک نہ اک دن دیکھنا کارِ جہاں ہو جائیگا(61)

مندرجہ بالا شعری مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں روایتی رنگ جدید تر آب و تاب کے ساتھ چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ان کی فکر میں جب امید کا دامن سکڑتا ہے تو نا امیدی کے بھنور میں پھنس جاتا ہے۔لیکن دفعتاً وہ رعنائیء خیال کے ذریعے پر امید ہوتی نظر آتی ہیں۔یہی ان کی غزل کا حسن بھی ہے اور خاصیت بھی ہے۔اس موضوع پر اور بھی بہت سے اشعار ملتے ہیں لیکن وقت کی کمی کے تحت قلمزد کر دیے گئے ہیں۔آئندہ موضوع مصنفہ کی ''نسوانی شاعری کے حوالے سے ہے جو ان کا مستقل موضوع ہے اور اس موضوع کا انھیں قانونی اور فطری حق بھی حاصل ہے۔تفصیل دیکھیں:

iii۔ نسوانیت

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں نسوانیت کے توانا لہجے کی خوشبو بھی کھل کر ابھرتی ہے۔خواتین شاعرات میں بہت کم ایسی ہیں جونسوانی حسن کی پاس داری نہیں کرتی۔ دراصل نسوانیت ہی خواتین کا زیور ہے جس کی جھلک شاعری میں دکھانا اچھا عمل ہے، نسوانیت کی چند مثالیں دیکھیں جو خالص نسوانی شاعری کی اعلیٰ اقدار کی حامل ہیں، مثلاً:

جس رستے میں جگمگ کرتی یاد کے دیپک روشن تھے
اس کی خوشی کی خاطر میں اب وہ رستہ بھی چھوڑتی ہوں(62)

مقتل میں جان دینا تھی پیاروں کے واسطے
میں ہی تھی ان کو جان سے پیاری گئی ہوں میں (63)

اس کے قدموں میں جنت ہے تو مطلب یہ ہے
آسمانوں سے جسے رب نے اتارا ''ماں'' ہے(64)

نسوانیت اس شاعرہ کی شاعری میں ابھر کر سامنے آتی ہے جو خانہ داری اور خاندانی نظام کے تحت اپنی زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔اس لیے جس خاتون کا خاندانی پس منظر، کلچر، تہذیب وتمدن مضبوط ہوگا وہ عورتوں کے حقوق اور تعمیری کردار کے لیے اپنی آواز بلند کرتی ہے۔رضی الدین رضی موصوفہ کی اس خوبی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وہ ایک باوقار، مہذب اور شائستہ خاتون ہیں۔انہوں نے ثابت کیا ہے کہ عورت اپنے تقدس کو برقرار رکھتے ہوئے بھی سب کچھ حاصل کرسکتی ہے ۔جس کے حصول کے لئے بعض خواتین اپنا سبھی کچھ داؤ پر لگاتی دیتی ہیں۔وہ ایک مثال ہیں۔ان سینکڑوں، ہزاروں لڑکیوں کے لئے اور ان والدین کے لئے جنہیں کسی انجانے خوف اور اندیشے کے باعث تعلیم سے دور رکھا جاتا

ہے۔انہوں نے ثابت کیا ہے کہ والدین جب اپنی بیٹیوں پر اعتماد کرتے ہیں تو بیٹیاں بھی ان کے اعتماد پر پورا اترتی ہیں اور ان کے وقار کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دیتیں۔انہیں اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے شاعری کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے لیکن اس کم وقت میں بھی انھوں نے جس تیزی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کیے ہیں وہ قابلِ ستائش ہیں۔''(65)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ شاعری میں کتنا مقام حاصل کر پائیں گی اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔تاہم اردو کے چند نامور شعراء □ نے ان کی شاعری پر کچھ نہ کچھ آراء □ ضرور دی ہیں۔جن کی روشنی میں ن کا مقام ومرتبہ متعین کیا جاسکتا ہے۔سعداللہ شاہ ان کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعری دراصل چاند کے ہالے کی طرح ہوتی ہے جو مرکز کو منبع کا پتہ دیتی ہے۔ڈاکٹر تو ویسے ہی نرم دل، نرم خو ہوتا ہے کہ اس کے من میں انسانیت کا درد اور خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے اور اگر ڈاکٹر شاعر ہو تو سونے پہ سہاگے والی بات ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ پھولوں کے پودے پر شہد کا چھتہ لگا ہوا ہے۔مجھے معلوم ہے کہ نجمہ شاہین شاعری کو اتنا وقت نہیں دے پائے گی جتنا یہ ظالم مانگتی ہے۔مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ شاعری کو اپنے منفرد اور والہانہ خیالات سے ضرور ہم آہنگ کر دیں گی کیونکہ شاعری ان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہے۔''(٦٦)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ میں موجود عورت پن کا احساس اور ذمہ داری ان کی پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔جس طرح وہ اپنے معمولات میں اپنے ہونے کا ثبوت دیتی ہیں اس طرح ان کی شاعری بھی ان کے کردار اور جذبات کی عکاسی کرتی ہے، مثلاً ایک شعر دیکھیں:

میری آنکھوں پر ابھی تک ہے ترے خوابوں کا بوجھ
ان کی گٹھڑی اپنی پلکوں پر اٹھا کر جاؤں گی

خاتون شاعرہ جب اپنی شاعری کا انداز صیغہء واحد متکلم (مؤنث) کے طور پر اپناتی ہے تو اس کی شاعری میں نسوانیت شامل ہوتی چلی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی انداز ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں بھی موجود ہے جو انھیں حقوقِ نسواں کا علم بردار ٹھہراتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں بھی کتنی سادہ دل ہوں، دشمنِ جاں کو دوست کہوں
مفت میں خود کو وہم و گماں میں اکثر ڈالے رکھتی ہوں

کہ میں نے چاہت کو بھی عقیدہ بنا لیا ہے
اگر ملی تو عقیدوں میں تمھیں ملوں گی

پہلے تو پاگل ہوتی ہے کوئی تنہا کسی کی یادوں میں
پھر ہوتے ہوتے ہوتی ہیں، یہ پایل، چوڑیاں اور مہندی

بھول جاتی جو تیری چاہت کو
آنکھ میں یہ نمی نہیں ہو تی

مانوں گی ہار ظلمتِ شب سے نہ میں کبھی
جب تک کہ روشنی ہے اس دل کے چراغ میں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں جہاں عشق و محبت اور ہجر و فراق کے سچے جذبات موجود ہیں وہاں نسوانیت کی علم برداری بھی ان کی شاعری کے حصے میں آ گئی ہے جو انھی کا خاصہ ہے۔ ان کی غزلوں میں نسوانی حسن تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کتب کی آرائش و زیبائش میں بھی نسوانی حسن نظر آتا ہے۔ مزید مثالوں سے قطع نظر کرتے

ہوئے آئندہ موضوع ''نرگسیت'' کی تفصیل ملاحظہ ہو جو ان کی شخصیت کا خاصہ بھی ہے اور انھیں جچتا بھی ہے۔

iv۔ نرگسیت

نرگسیت ایک ایسا موضوع ہے جو ہر بڑے شاعر کے ہاں ضرور ملتا ہے۔ ولی سے لے کر اقبال تک ہر شاعر کے ہاں یہ موضوع بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر دیکھا گیا ہے۔ ''نرگسیت'' کا لفظ اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے اور اس کی متعدد شاخیں ہین جو نرگسیت کے زمرے میں آ جاتی ہیں۔ مثلاً الفتِ ذات، خود پسندی، شاعرانہ تعلّی، مضبوط تصوریت، عقل خرد کی پختگی وغیرہ نرگسیت ہی کی شاخیں ہیں۔ نرگسیت کے لوازمات کہیں نہ کہیں ہر چھوٹے بڑے شاعر میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ شاعری ایک ایسا احساسِ جذبہ ہے جو صرف حساس دل والوں کے نصیب میں ہی ہوتا ہے۔ اس لیے حدیثِ دل کی پاکیزگی ہی بذاتِ خود نرگسیت ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں نرگسیت کے نمونے ان کے علم و ادب سے گہری وابستگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مدار تو عشق و محبت، ہجر و فراق، خواہشِ وصال اور روح کی پکار ہے لیکن کہیں کہیں انھوں نے اپنی شاعری میں نرگسیت کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے دو اشعار دیکھیں:

مثال بن کے مثالوں کے ساتھ مرنا ہے
مجھے تو اپنے حوالوں کے ساتھ مرنا ہے

وہ کہہ رہے ہیں مقدر ہے تیرگی لیکن
میں کہہ رہی ہوں اجالوں کے ساتھ مرنا ہے

مندرجہ بالا اشعار پر غور کریں تو ان میں نرگسیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یعنی شاعرہ کی ذات کو کسی قسم کے کرب و آلام بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بلکہ وہ اپنی ذات،

تجربات اور مشاہدات کے ساتھ رہنے کا ہنر سیکھ چکی ہے۔ انھیں اپنے حوالوں سے زندہ رہنے کا پختہ یقین ہے۔ اس لیے ان اشعار میں نرگسیت کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو اپنی ذات پر اعتماد ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے وقت کسی پریشانی یا تکلیف سے نہیں گھبراتی۔ وہ اپنی کیفیت پوری دنیا پر طاری کرنے کی خواہش مند ہیں۔ اور اپنے تصوریت کے سہارے اس طرح کے تجربات اور فیصلے دیتی رہتی ہیں۔ مثلاً:

دل کو کیا ملول، اور ویران آنکھ کو
کچھ یوں بھی جسم و جاں میں قدم دھر رہی ہے رات

رکھ کر ردائے عشق میں کچھ پھول اور خواب
شاہین آج میری طرح مر رہی ہے رات

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نرگسی شخصیت کا اعتراف بہت سے ادیبوں نے کیا ہے۔ اسی بات کا اظہار کرتے ہوئے شاکر حسین شاکر لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں رنگ اور پھول نمایاں ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نظموں میں روزمرہ کے مسائل کے علاوہ ان اقدارِ کائنات کے دکھوں کا موضوع بناتی ہیں۔ وہ تخلیقی شعور کی عکاس ہونے کے علاوہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں۔ جس نے نجمہ شاہین کھوسہ کو ہم عصروں سے ممتاز کر دیا ہے۔''(75)

اردو شاعری خصوصاً غزل میں نرگسیت کے عناصر کا نہ ہونا شاعری کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہر وہ شاعر یا شاعرہ جو غزل میں طبع آزمائی کرتا ہے، نرگسیت کے بغیر شعر تخلیق نہیں کر سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نہ چاہتے ہوئے بھی نرگسیت کا شکار ہوئی ہیں۔ کیونکہ ان کا نمایاں موضوع غریب اور دیہی طبقوں کی مشکلات کی

نشان دہی کرنا ہے۔ نرگسیت کی مثالوں پر بات کرنے کے بعد اب ''غمِ دوراں'' کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے تفصیل پیش کرنا چاہوں گا۔

۷۔ غمِ دوراں

غمِ دوراں بظاہر زمانے کے غم یا شہر آشوبی شاعری کو کہا جاتا ہے لیکن جب انسان داخلی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے تو غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کی علم برداری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں بھی غمِ دوراں کا موضوع ان کی اپنی ذات سے پھوٹا ہے۔ ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی اسے کسی حد تک قدیم جبریہ ماحول کہا جا سکتا ہے۔ شاعرہ نے جبریہ نظام کے خلاف کسی حد تک علمِ بغاوت بلند کرنے کی کوشش ان کی نظم میں زیادہ ابھرتی ہے لیکن ان کی غزل میں بھی غمِ دوراں سے خالی نہیں ہے۔ یہ موضوع بھی باقی موضوعات کی طرح ہمیشہ جاری و ساری نظر آتا ہے۔ غمِ دوراں کے حوالے سے مثلاً چند اشعار دیکھیں:

اگر ڈھونڈنا ہے وجود اپنا تم کو
کسی دل کے اجڑے مکاں ہی میں ڈھونڈو

ملے گی اندھیرے میں اجلی کرن بھی
اسے سوچ کی کہکشاں ہی میں ڈھونڈو

زندگی میں زندگی دکھ بھر گئی
روشنی آنکھوں کی مدھم کر گئی

اب یہاں بس شور ہے اور سسکیاں ہیں چار سو
دیکھ لینا یہ جہاں وحشت کا گھر ہو جائے گا

عمر بھر کے جس سفر کو رائیگاں کہتے ہو تم
اک نہ اک دن دیکھنا کارِ جہاں ہو جائے گا

مندرجہ بالا اشعار میں شاعرہ نے کہیں جزوی طور پر اور کہیں کلی طور پر غمِ دوراں کی پاس داری کرتے ہوئے زمانے بھر کو درپیش مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔اس کے علاوہ مسائل کے خاتمے کی صورت حال پر بھی غور کیا ہے جو ان کی رجائی شاعری کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تیسرا شعری مجموعہ اس حوالے مکمل ہے کہ اس میں موضوعات کی وسعت ہے۔اس مجموعے میں شاعرہ کا فن کھل کر سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جہاں داخلی جذبات کے حوالے سے اپنی غزل میں اظہار کرتے ہیں اسی طرح خارجی طور پر بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔غمِ دوراں خارجیت کی ایک کڑی ہے جس کا اظہار انھوں نے ہمیشہ کیا ہے موضوع کے حوالے سے چند مزید اشعار دیکھیں:

ساری تحریریں مٹیں اور ساری تنویریں بجھیں
ہچکیاں ہی ہچکیاں ہیں، سو گئیں پروائیاں

بے بسی کی شام پر سسکی ہے پہروں زندگی
خواب کی خواہش میں ہم تو کھو چکے بینائیاں

دل بھی پتھر، ا ؟ نکھ بھی پتھرا گئی
کھو گئیں دنیا کی سب بینائیاں

دب گئی ان کی صدا چیخوں میں جب
مقتلوں میں رو پڑیں شہنائیاں

وہ لا پتہ ہوں جس نے خود گنوا دیا تھا راستہ
ہوئی کہاں سے در بدر مجھے نہیں ہے کچھ خبر

کبھی محبت تو اپنی انا کی خاطر بھی مارتے ہیں
یہ بھیڑیے شاہ زادیوں کو خدا کی خاطر بھی مارتے ہیں

یہ مقتلوں کی روایتیں بھی عجب ہیں نجمہ یہاں پہ اکثر
گلا دبا کر کسی کو اپنی صدا کی خاطر بھی مارتے ہیں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی غزل فکری حوالوں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ان میں غمِ جاناں، غمِ دوراں، نسوانیت، نرگسیت، محبت میں کامیابی و ناکامی، ہجر و وصال اور دیگر چھوٹے چھوٹے موضوعات نظر آتے ہیں۔اگر فنی حوالے سے دیکھا جائے تو صنائع بدائع اور علمِ بیان بھی ان کے پیشِ نظر دکھائی دیتے ہیں۔بحور پر گرفت بھی ان کی فنی پختگی کی علامت ہے۔

۴۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل کا فنی جائزہ

الفاظ ایک آلہء اظہار ہیں جن کا صحیح اور مناسب استعمال کسی کسی کو آتا ہے۔یہی الفاظ اگر شاعری کی صورت میں ادا ہوں تو تلوار کے کام سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔دنیا کے ہر ادب کے کچھ نہ کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں جو اس ادب کی شناخت بنتے ہیں۔اردو زبان اور شاعری بھی اصول وضوابط کے کثیر سرمائے سے لبریز ہیں جو اپنے اندر جادوئی کیفیت رکھتے ہیں۔

جب کسی غزل گو کے کلام کا فنی جائزہ لیا جاتا ہے تو اس میں صنائع بدائع اور علمِ بیان کے ضابطے دیکھے جاتے ہیں۔صنائع بدائع شاعری کا وہ علم ہے جو علم و ادب کا حصہ ہے۔صنائع بدائع میں علمائے زبان و ادب نے شاعری میں لفظوں کے صحیح استعمال کو

فصاحت و بلاغت بھی کہا ہے۔ یہی فصاحت و بلاغت صنائع بدائع بھی کہلاتے ہیں۔ اس حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی امام فخر والدین رازی کے کے نظریہ فن کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بلاغت یہ ہے کہ انسان عبارت میں اس باریکی تک پہنچ جائے جو اس کے دل میں ہے اور ساتھ ہی خلل پیدا کرنے والے اختصار اور ملال پیدا کرنے والی طوالت سے بھی عبارت کو بچائے اور فصاحت یہ ہے کہ عبارت تعقید سے خالی ہو۔ فصاحت و بلاغت شاعری کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کو زندہ رکھنے کے لیے روح ضروری ہوتی ہے۔''(84)

فصاحت و بلاغت یعنی صنائع بدائع کے حوالے سے علمائے علم و ادب نے خاصے دقیع مقالات لکھے ہیں جو آنے والے ادیب و شعراء □ کے لیے گردِ کارواں کا کام دیتے آئے ہیں۔

صنائع بدائع پر سید انشاء □ اللہ خان انشاء □، امام بخش ناسخ، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق اور جدید نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ مقدمہ شعر و شاعری کو اس موضوع کی پہلی تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی صنائع بدائع کی تعریف نیچرل شاعری کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

''نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو لفظاً و معنیاً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچرل شاعری کے موافق ہونے کی یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تابہ مقدور اور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔''(85)

الطاف حسین حالی نے نیچرل شاعری کی آڑ میں غزل کی مخالفت کی اور صنائع

بدائع کی بھی مخالفت کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی شکوہ کیا ہے کہ جو شعراء □ صنائع بدائع کا علم نہیں رکھتے انھوں نے صنعتِ الفاظ کے ذریعے ہماری شاعری کو صدمہ پہنچایا ہے۔ حالی کی طرح شبلی نے بھی فارسی اور اردو شاعری کے حوالے سے صنائع بدائع پر مباحث کیے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''الفاظ کی فصاحت یہ ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ ناموزوں نہ ہوں اور قواعدِ صرفی کے خلاف نہ ہوں۔ کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا سہی ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب ان کی ساخت، ہیئت، نشست، ہلکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب و توازن حاصل ہو۔ بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو اس لیے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا غلط ہے، کیونکہ کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے تمام الفاظ، مفردات، مرکبات فصیح نہ ہوں۔ پس بلاغت یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔''(86)

صنائع بدائع کی تعداد اور تعین کا اندازہ کرنا مشکل ہے تاہم اردو ادب میں عام طور پر ایہام، تضاد، مراد النظیر، حسنِ تعلیل، مبالغہ، تکرار، تلمیح اور تجنیس کی صنعتیں زیادہ تر برتی گئی ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا کلام میں بھی لفظی صنعت گری کے نمونے بخوبی ملتے ہیں جن کی تفصیل ذیل ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بالواسطہ طور پر لفظی و معنوی صنعت گری کی بہت بڑی سخن طراز نہیں ہیں تاہم ان کا ہاں چیدہ چیدہ صنعتوں کے کچھ نمونے ضرور ملتے ہیں۔ پہلی مثال صنعتِ تلمیح کے حوالے سے دیکھیں:

پھر مصر کے بازار میں نیلام ہوا کیوں
اے عشق بتا تیرا یہ انجام ہوا کیوں

اس شعر میں صنعتِ تلمیح کے ذریعے قصہ یوسف و زلیخا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔قصہ یوسف و زلیخا کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔اس لیے جب مصر کے بازار کا ذکر آئے گا تو ذہن خود بخود اس واقعہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ایک مثال صنعتِ تضاد کی ملاحظہ ہو:

موت لکھ کر مری ہتھیلی پر
زندگی آپ بھی تو شرمائی

اس شعر میں زندگی اور موت کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے صنعتِ تضاد کو بہت خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں صنائع بدائع کے زیادہ نمونے صنعتِ تضاد اور صنعتِ تکرار کے ملتے ہیں۔تاہم تلمیح،تجنیس،مرا ?النظیر اور لف و نشر کی غیر شعوری کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔علمِ عروض اور بحور کی زیادہ اقسام سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود بھی صنعتوں کا استعمال موصوفہ کی شاعری سے خصوصی لگاؤ کا پتا دیتی ہیں۔صنعتِ تضاد کی ایک اور مثال دیکھیں جس میں تضاد کے ساتھ ساتھ غزل کی مشکل پسندی کا اعتراف بھی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

کل سوچا تھا شعر میں تجھ سے سارے شکوے کر ڈالوں گی
آج غزل کہنے بیٹھی تو کیوں اتنی دشواری سائیں

اپنے من کو آگ لگائی اور پھر اس کی راکھ اُڑائی
یوں ہی جلتے بجھتے شاہیں ساری عمر گزاری سائیں

ان اشعار میں ''آج کل''اور''جلتے بجھتے'' کے الفاظ کو بطور صنعتِ تضاد استعمال کیا گیا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل فکر و فن کے حوالے سے نظم کی نسبت زیادہ پختہ ہے۔مغربی ادب سے متاثر ہو کر اردو ادب کی جدید تحریک جو پروان چڑھی تھی اس نے غزل سمیت دیگر اصناف پر بھی اثرات مرتب کیے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بیک وقت غزل اور نظم

لکھتی ہیں۔نظم میں ان کے قلم میں بلوغت بہت دیر بعد آئی لیکن غزل کو وہ جدید رنگ میں ڈھال کر اپنے کلام کو بہت پہلے پختہ کر چکی تھیں۔کلام میں فنی پختگی کے حوالے سے بحور، وزن، نئی زمینیں، مقفعٰ و مسجع سخن اور ترتیبِ الفاظ کا اعلیٰ مظاہر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر ان کی غزل کے فکری حوالے گزشتہ صفحات پر بیان کیے گئے لیکن ابھی ان کی غزل کا سفر ختم نہیں ہوا۔چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں گہرائی کی بات کہہ جانا، معاشرے کے کج رویوں پر نظر رکھنا، نچلے طبقے کا استحصال، خاندانی پس منظر، دیہات کی رنگینی، تسخیرِ کائنات اور فطرت کی عکاسی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل میں خوب کی گئی ہے۔مستقبل قریب میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی غزل کی بدولت صاحبِ طرز شاعرہ کے طور پر خود بخود جلوہ گر ہو جائیں گی۔

باب چہارم:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی متفرق شاعری

سابقہ ابواب میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی سوانح اور شخصیت کے علاوہ ان کی غزل گوئی اور نظم نگاری کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ باب ہٰذا میں تحقیقی شخصیت کی متفرق ادبی خدمات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یعنی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی دیگر اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی تمام تفصیل اس باب کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نہ صرف نظم اور غزل میں اپنے فن کا جادو جگایا ہے بلکہ حمد، نعت، منقبت قطعہ، سلام، مرثیہ اور گیت بھی ان کی توجہ کے مراکز رہے ہیں۔ ان تم ?ام شعری اصناف کی تفصیل اس باب کا حصہ ہے جسے بخوبی پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تفصیل ملاحظہ ہے:

i۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی حمدیہ شاعری

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی متفرق شاعری میں ''حمد'' کو اوّلیت حاصل ہے۔ ان کے تمام مجموعہ ہائے شاعری کا آغاز حمد سے ہی ہوتا ہے۔ تخلیق کار کے ذاتی خیالات سے قطع نظر حمد اور نعت قریب قریب ہر شاعر کے ہاں نظر آتے ہیں۔ نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی روایت کی پاس داری کرتے ہوئے اپنے تمام شعری مجموعوں کا آغاز حمد سے کیا ہے جو ان کے خدا پر پختہ یقین کی دلیل ہے۔ شعری اصناف میں ہر صنف اپنی جگہ خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اردو ادب کی شعری روایت میں حمد کو اس لیے بھی اہم مقام حاصل ہے کیونکہ تمام تخلیق کار اپنے شعری مجموعوں کا آغاز حمد سے کرتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ شعری مجموعہ جس صنف کے حوالے سے ہے اس میں صرف مطلوبہ صنف کو ہی جگہ دی جاتی ہے۔ لیکن حمد کے معاملہ

میں تمام قواعد بے معنی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً غزل، نظم، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، قطعات اور گیت وغیرہ کی کتب میں بھی حمد کو سرِ آغاز کی حیثیت سے شاملِ دیوان کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا مرکز ومحور تو نظم اور غزل ہے تاہم مندرجہ بالا اصناف بھی ان کے قلم کا خاصہ رہی ہیں۔

جہاں تک حمد کے پس منظر کا تعلق ہے اس کے ابتدائی نمونے اردو کے اولین شاعر حضرت امیر خسرو کے ہاں ملتے ہیں۔ شاعری کیساتھ ساتھ نثر کے ابتدائی نمونے بھی مذہبی قوال اور پند و نصیحت کی شکل میں ملتے ہیں۔ حمد کی تعریف کرتے ہوئے صباحت مشتاق رقم طراز ہیں:

> ''لفظ حمد عربی زبان کا لفظ ہے، مؤنث ہے اور اس کا مطلب ہے تعریف و توصیف، یہ لفظ صرف خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ثنا کسی انسان کی بھی ہو سکتی ہے مگر حمد صرف خدا کی ہے۔'' (۱)

حمد بذاتِ خود ایک شعری صنف ہے لیکن دیگر اصنافِ سخن میں بھی حمدیہ اشعار کا اہتمام کرنا ہماری شاعری کی درخشاں روایت کا حصہ ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال رقم طراز ہیں:

> ''حمدیہ شاعری مختلف اصنافِ شعری میں کی جاتی ہے۔ نظم ہو یا رباعی، ہائکو ہو یا سانیٹ، غزل ہو یا مثنوی، قصیدہ ہو یا رباعی سب میں حمدیہ شعر لکھے جاتے رہے ہیں۔ شعری مجموعوں، دیوان یا کلیات کا آغاز بھی عموماً حمدیہ اشعار سے کیا جاتا ہے کیونکہ اسلامی معاشرے میں تصورِ توحید اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دوسرے شعری مجموعے ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں حمد، دعا اور دیگر حمدیہ اشعار شامل ہیں جو انھیں حمد کی شاعرہ کے طور پر پیش کرتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جہاں جہاں گئی نظر وہاں وہاں ملا ہے تُو
ہر اک جگہ ہر اک نگر جو دیکھیے خدا ہے تُو

ہے رنگ و نور چار سو ترا وجود کو بہ کو
چمن چمن دمن دمن جمالِ دلربا ہے تُو

کہیں ہے تو بلال میں، کہیں کسی جمال میں
نہ ہو کسی کا گر کوئی اسے بھی پالتا ہے تُو

یہ زندگی کی رونقیں ترے ہی دم سے گلفشاں
مرا نصیب ہے بلند، میرا آشنا ہے تُو

ہر ایک بحر و بر میں تُو ، وجودِ خیر و شر میں تو
ہر ایک سمت جلوہ گر جہاں میں اے خدا ہے تو

حمد کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے یعنی خدا انسان اور کائنات کا باہمی تعلق ’’حمد‘‘ میں خوبی کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ خدائے رب ذوالجلال کی شان کو حمد میں بیان کرنا ہی دراصل حمد ہے لیکن خدا انسان اور فطرت کو حمد میں یک جا کرنے سے اشعار میں وسعت آتی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں شاعرہ نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا تذکرہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ قلبی لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ شاعرہ کے نزدیک اللہ کا وجود چارسو ہے وہ ہر ایک کا پالنے والا ہے اور زندگی کی تمام رونقیں اسی کے دم سے ہیں۔ شاعرہ کہتی ہیں میرا نصیب بلند ہے کیونکہ خدا میرے ساتھ ہے۔ شاعرہ نے ان اشعار میں خدا کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ خدا اور خدا کے نائب کا گہرا رشتہ پیش کردیا ہے۔ مزید اشعار دیکھیں جس میں خدا کے حضور دست بستہ دعا گو نظر آتی ہیں۔

اے خدا تُو محتسب ہے، مجھ پہ اک احسان کر
بھول کر لغزش مری، یہ زندگی آسان کر

وقت کی اس دھوپ میں جلتے ہیں میرے جسم وجاں
چپچہاتے موسموں میں سایہ مہربان کر

ان اشعار میں شاعرہ اللہ سے اپنے دکھوں اور تکالیف کو دور کرنے کی دعا کر رہی ہیں۔ چنانچہ حمد کے انداز میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی ایک انداز ہے جو مختلف شعراء کے ہاں نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ایک اور شعری مجموعے ’’اور شام ٹھہر گئی‘‘ میں شامل ’’حمد‘‘ اور ایک نظم ’’اے خدا اک دعا‘‘ میں شاعرہ نے اللہ تعالیٰ کے حضور کائنات کی سلامتی اور اپنے رنج والم دور کرنے کی التجا کی ہے۔ حمد کے چند اشعار دیکھیں:

اے میرے مولا، اے میرے آقا، بس اپنے رستے پہ ڈال دے تُو
یہ فانی دنیا کے غم ہیں جتنے، یہ میرے دل سے نکال دے تُو

ہو نام تیرا ہی دل کے اندر ہو ذکر تیرا مرے لبوں پہ
ہو اتنی سچی یہ میری چاہت کہ عشق بھی بے مثال دے تُو

یہ پھول کلیاں، ستارے خوشبو مری زباں اور ترجماں ہوں
اب اپنی مدحت کی ایسی قدرت اے مالک ذوالجلال دے تُو

مندرجہ بالا اشعار میں شاعرہ نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ وہ انھیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی طاقت عطا فرمائیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنے دل میں ’’خدا کے عشق‘‘ کی بھی دعا کی ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ میری زبان سے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان ہوتی رہے۔

پروفیسر بشریٰ قریشی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے ماحول اور اپنی سخت چٹانوں جیسی روایات میں راستہ بنانے کے لیے بغاوت نہیں کی بلکہ ایک مثبت راستہ

اختیار کیا اور بلوچ قبیلے کی ایک بستی سے نکل کر ترقی کی وہ منازل طے کیں جو شہر میں بسنے والوں کے نصیب میں کم ہی آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کی بولتی آنکھوں میں حیا کی شوخی ہے وہ آج بھی معصوم سوچوں کے اسی جلو میں زندہ ہے جہاں اسے اپنے بابا کے خواب کی تعبیر بننا تھا۔ چاہے اس تعبیر کے حصول کے لیے اپنا معصوم بچپن اور تتلیوں کے سنگ اڑان بھرتی خوبصورت جوانی کے ایام کو محنت کی بھٹی میں جھونکنا پڑا۔ وہ اپنے مقام کو حاصل کر کے رہی۔''(۶)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جب حمد میں دعائیہ اشعار شامل کرتی ہیں تو ان کی حمد بیک وقت مناجات، دعا اور التجا کو پیش کرتی نظر آتی ہے۔اگرچہ دعا اور مناجات دو الگ الگ اصنافِ سخن ہیں اور حمد کی طرح اپنا الگ وجود رکھتی ہیں۔لیکن ایک موقع پر تینوں آپس میں مل جاتی ہیں۔ڈاکٹر عبید احمد خان مناجات کے معانی اور مفاہیم بیان کرتے ہوئے اسے حمد کے قریب لے جاتے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مناجات کے معنی دعا، عرض، التجا کے ہیں یا وہ نظم جس میں خدا کی تعریف اور اپنی عاجزی کا اظہار کر کے دعا مانگی جائے۔ دعا کی لغوی تعریف یوں کی جاتی ہے، خدا سے مانگنا، التجا، التماس، استدعا، مناجات، مغفرت کی طلب مراد لی جاتی ہے''(۷)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ''حمد'' میں مناجات اور دعائیہ اشعار شامل کر کے انھیں باہم یکجا کر دیا ہے۔حمد کے ذریعے جہاں خدا کے حضور مناجات اور دعائیہ عناصر شامل کیے گئے ہیں وہاں ڈاکٹر نجمہ شاہین نے کچھ نظموں میں بھی حمد کی صورتیں پیش کی ہیں، مثلاً ''اے خدا اک دعا'' میں لکھتی ہیں:

اے خدا اک دعا، اک دعا اے خدا
ا ?ج کعبے کا دیدار میں نے کیا

ا ?ج تو نے مکمل کیا ہے مجھے
رحمتوں کا مرا یوں سہارا کیا

x x x x x x x x
خاک تھی ا ?سماں کا ستارہ کیا

اے خدا میں تہی دست ا?ئی یہاں
پھر بھی سب کچھ مجھ ا?ج یوں مل گیا

میں دکھی تھی یہاں ہر سکوں مل گیا
واسطہ ہے تجھے تیرے محبوب کا

چاہے زندہ رہوں یا کہ مر جاو?ں میں
اس جہاں میں نہ اب لوٹ کر جاؤں میں

مندرجہ بالا اشعار میں شاعرہ نے دلی جذبات میں ڈوب کر ایک تو خانہ کعبہ میں اپنی حاضری کو بیان کیا ہے دوسرا یہ کہ شاعرہ نے خانہ کعبہ کی زیارت کے بعد یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اس کی زندگی کعبہ کے اردگرد گزرے۔شاعرہ کا واپس اپنی بستی کی طرف آنے کا دل نہیں کر رہا۔شاعرہ اس نظم میں خدا کو اپنے محبوب کا واسطہ دے کر کہہ رہی ہے کہ چاہے میں زندہ رہوں یا مجھے موت آ جائے خانہ کعبہ کے قریب رہنے کا شرف حاصل ہو۔اپنے جذبات شاعرہ نے بہت خوب صورتی سے اس نظم میں بیان کیے ہیں۔وہ اپنی کامیابی کا راز بھی اللہ تعالیٰ سے عشق کرنے کو قرار دیتی ہیں۔خدا کے عشق میں ڈوبی ہوئی شاعرہ نے اپنے ایک مکالمے میں اپنی کامیاب زندگی اور شاعری کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اپنے والد صاحب

سے منسوب کیا ہے، لکھتی ہیں:

''میں اپنی کامیاب زندگی اور شاعری کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد اپنے والد کی دل و جان سے مشکور ہوں کہ جنھوں نے خاندان کے ہزار روکاوٹیں ڈالنے کے با وجود مجھے بیٹوں کی طرح پالا اور میری تعلیم میں ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اللہ تعالیٰ اور اپنی ماں کی قربانیوں اور باپ کی محبتوں کی بدولت ہوں''(۹)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں صرف حمد ہی نہیں بلکہ ان کی غزلوں اور دیگر اصناف میں جگہ جگہ حمد یہ اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتی ہیں تو کبھی امتِ مسلمہ کے لیے دعا گو ہوتی نظر آتی ہیں۔ غرض یہ کہ ان کے ہاں حمد کے عناصر تقریباً تمام شعری مجموعوں میں موجود ہیں۔ چند اشعار دیکھیں:

یہ جو عشق مسند کے لوگ ہیں انھیں رمز سارے سکھا پیا
یہ جنون عشق کی داستاں انھیں حرف حرف سنا پیا

میرے آسماں میرے سائباں تُو ہی راز داں تُو ہی مہرباں
جہاں لامکاں ہیں سلسلے وہیں میرا گھر بھی بنا پیا

مندرجہ بالا اشعار شاعرہ کے انٹرنٹ کے صفحہ سے اخذ کیے گئے ہیں جن میں شاعرہ نے عشقِ حقیقی کے ذریعے اپنے خالقِ حقیقی سے مکالمہ کیا ہے۔ ان کے شعری مجموعہ ''پھول، خوشبو اور تارہ میں شامل ایک حمد یہ نظم بھی اس حوالے سے عشقِ حقیقی کی ترجمانی کرتی ہے۔ شاعرہ نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو بطور ردیف استعمال کیا ہے۔ حوالے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مری اُجڑی لمبی رات سئیں
کب بدلیں کے حالات سئیں

مرا عشق ہی مذہب مسلک ہے
اور عشق ہے تیری ذات سئیں

مجھے اپنی خطائیں یاد آئیں
مجھے خود سے ہوئی ہے مات سئیں

کبھی گیتوں میں تبدیل تو ہوں
مرے درد بھرے نغمات سئیں

مندرجہ بالا اشعار کی ردیف ''سئیں'' سرائیکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مالکِ صاحب اور بڑے کے ہیں۔ شاعرہ نے ''حمد'' کے زیرِ عنوان ان اشعار کو منظّم کیا ہے جو براہِ راست اللہ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جہاں غزل کی شاعرہ ہیں وہاں انھوں نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری کے حوالے سے سلیم ناز لکھتے ہیں:

''اگر نجمہ شاہین شاعری نہ کرتیں تو آج ڈی جی خان کے علاقے میں ڈاکٹر ہوتیں یا ایک پسماندہ گاؤں میں مظلوم خاتون ہوتیں۔ ان کی شاعری میں محرومی کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آج بھی اپنے ان خلوص خوابوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔''(12)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی ایک غیر مطبوعہ حمد یہ نظم میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ میرے سجود کا جو حسین پیرہن ہے وہ میری روح تک اتر جائے۔ مندرجہ ذیل حمد یہ اشعار میں وہ اپنے دل کی آواز سناتے ہوئے لکھتی ہیں:

یہ جو عشق مسلک کے لوگ ہیں انھیں رمز سارے سکھا پیا
یہ جنونِ عشق کی داستان انھیں حرف حرف سنا پیا

نہ حدود میں نہ قیود میں مرا دل ہی دل ہو وجود میں
یہ سجود کا حسیں پیرہن مری روح پر تو سجا پیا(13)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی حمد یہ شاعری پر مجموعی طور پر بات کی جائے تو ان کی شاعری میں خدائے ذوالجلال کی شانِ اقدس، جاہ وجلال، مناظرِ فطرتِ خدا اور انسان کا تعلق اور دعائیہ اشعار کی کثرت ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نجمہ شاہین کھوسہ نے حمد یہ شاعری کے دبستان میں بھی اپنا نام لکھوالیا ہے۔

ii۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نعتیہ شاعری

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے حمد کے بعد نعت کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نعت اُن کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔انھوں نے صرف موضوعی نعتیں کہی ہیں بلکہ نظموں اور غزلوں میں نعتیہ اشعار بھی لکھے ہیں۔ جہاں تک نعت کے معانی و مفاہیم کا تعلق ہے، شمیم احمد نے نعت کی تفصیلی تعریف یوں کی ہے:

''ایسے اشعار جن میں حضورِ سرورِ کائنات، پیغمبرِ اسلام ? کے اوصاف با برکات کا ذکر بہ توصیف وعقیدت ہو۔شعری اصطلاح میں نعت یا نعتیہ اشعار بالعموم کسی نظم یا مثنوی کے شروع میں لائے جاتے ہیں۔ ویسے نعتیہ نظمیں علیحدہ سے بھی لکھی جاتی ہیں اور یوں ہمارے ہاں نعتیہ شاعری کی خاص معقول روایت بھی موجود ہے۔نعتیہ قصیدے بھی بہ کثرت لکھے گئے ہیں۔''(14)

ڈاکٹر محمد اشرف کمال نعت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نعت کے لغوی معنی تعریف وتوصیف کرنا کے ہیں اور اصطلاحی معنی شعری اصناف میں حضرت محمد ? کی تعریف وتوصیف کرنا ہیں۔اردو میں مختلف اصنافِ سخن اور ہیئتوں میں نعت لکھی جارہی ہے۔ مثلاً قصائد، مسدس، مخمس، مثنوی، قطعات، رباعیات، مثلث، نظم اور ہائیکو کی صورت

میں نعت تخلیق کی جاسکتی ہے۔''(15)

نعت کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا تھا۔حضرت علی المرتضیٰ ? کے والد ماجد ابو طالب کے قصیدہ میں حضور ? کی نعت کے چند اشعار موجود ہیں۔ جب آنحضرت ? نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو وہاں پر نعت گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا۔ بہت ہی کم مدت میں سیکڑوں شعراء □ نے نعت گوئی میں نام کمایا۔حضرت حسان بن ثابت ? سمیت متعدد صحابہ کرام ? نے عمدہ نعتیں لکھیں۔مسجد نبوی ? میں ایک منبر مخصوص تھا جہاں پر کھڑے ہوکر صحابہ کرام ? نعتیں پڑھتے تھے۔حضرت کعب بن زبیر ?، حضرت عبداللہ بن وائل، حضرت سفیان بن حارث سمیت کئی صحابہ کرام ? نے نعتیں لکھی تھیں۔

عرب کے بعد جب نعت عجم میں آئی تو سب سے پہلے فارسی ادب میں نعت تخلیق ہوئی۔ بہت سے نامور شعراء □ نے شہرہ آفاق نعتیں تخلیق کیں۔فرید الدین عطار، خاقانی، انوری، مولانا رومی، شیخ سعدی، حضرت امیر خسرو، عرفی اور قدسی وغیرہ نے نعت کے میدان میں نام کمایا۔متذکرہ بالا تمام شعراء □ نے بارگاہِ رسالت ? میں نعتیہ کلام پیش کرکے اپنے لیے جنت کا مقام حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اردو میں نعت گوئی کی روایت فارسی سے آئی تاہم بہت قلیل مدت میں اردو نعت گوئی نے عربی اور فارسی کے ہم پلہ مقام حاصل کرلیا۔اردو نعت گوئی کے حوالے سے شمیم احمد لکھتے ہیں:

''اردو کے ابتدائی شعراء میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز، امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ولی دکنی، میر تقی میر، میر درد، سراج اورنگ آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔اردو کی پہلی نعت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے لکھی ہے۔ انھوں نے عربی، فارسی میں سو سے زائد کتب تحریر کیں۔ان کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کو اردو کی پہلی نثری تصنیف کہا جاسکتا ہے''(16)

اردو نعت گوئی کا کامیاب اور سنہری دور محسن کاکوروی سے شروع ہوکر دورِ جدید

کے نام ورنعت گو حفیظ تائب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام دورانیے میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں نعت گو سامنے آئے لیکن محسن کا کوروی کے مرتبے کو کسی نے فراموش نہیں کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اردو میں نعت گوئی کا مقبول ترین اور کامیاب ترین دور حقیقت میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی سے شروع ہوتا ہے۔ دونوں بزرگ قال اللہ اور قال الرسول کے پابند اور حبِ رسول ? سے سرشار تھے۔ دونوں نے نعتیہ شاعری میں ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ دونوں ہم عصر و ہم عمر تھے۔ دونوں نے اگرچہ ہر صنف میں نعتیں کہی ہیں لیکن دونوں کے کمالِ فن کا حقیقی مظاہر قصیدوں اور مثنویوں میں ہوا ہے۔ دونوں نے اپنے نعتیہ کلام کو یک جا کر کے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے اور اردو میں نعتیہ شاعری کی ترتیب و تدوین کی نئی طرح ڈالی ہے اس طرح دونوں نے ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعراء □ کو خاصا متاثر کیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک اردو شعراء □ نے نعت کو حضور ? سے جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور جس شفقت کے ساتھ اپنے کلام میں حبِ رسول ? کو جگہ دی ہے اسے اول اول شاعری کی بلند سطح تک پہنچانے میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی ہی کا ہاتھ ہے۔''(17)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق اردو ادب کے دورِ جدید سے ہے اس لیے آج کے دور تک آتے آتے اردو نعت گوئی نے ایک کامیاب سفر طے کر لیا ہے۔ آج ہر شاعر اپنی شاعری کی ابتداء □ ہی حمد اور نعت سے کرتا ہے۔ اردو ادب میں موجود ہزاروں شعری مجموعے ہیں جن کا آغاز حمد اور نعت سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دوسرے شعری مجموعے'' میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں دو نعتیں شامل ہیں جو بہت عمدہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہوں نعت کیسے سلیقہ سکھا دو
مری سانس کو موجِ خوشبو بنا دو

گھری ہوں میں کب سے پریشانیوں میں
میں عاجز ہوں آقا ? مجھے حوصلہ دو

شبِ تیرہ و تار میں میرے آقا ?
رُخِ پاک سے اپنے پردہ اٹھا دو

محبت ہو تیری مری بندگی میں
مجھے دین و دنیا میں اچھا بنا دو

مندرجہ بالا اشعار میں ایک طرف نعت ? لکھنے کا سلیقہ سیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے تو دوسری طرف رُخِ پاکِ انور ? کا دیدار کرنے کی خواہش بھی کی گئی ہے۔ عشقِ رسول ? سے سرشار اور دین و دنیا میں صرف اور صرف محبتِ رسول ? ان کی منزلِ اولیں ہے۔ حمد اور نعت کی تخلیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دل عشقِ اللہ اور عشقِ رسول ? سے سرشار ہے۔ نعت شریف کہنے کا انداز اور سلیقہ بھی کسی کسی شاعر کو نصیب ہوتا ہے نبی پاک ? کی سچی اور صحیح تعریف صرف رسمی و لفظی سے ممکن نہیں ہے بلکہ شاعری کا ملکہ صرف انھی شعراء □ کو حاصل ہوتا ہے جنھوں نے ادب کے پاک پانی سے وضو کر کے نعت مبارک ? تخلیق کی۔

نعت تخلیق کرنے کا اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ شرف ہر شاعر کو حاصل نہیں ہوتا۔ نعت کیسے اور کس طرح لکھی جانی چاہیے؟ کو کب نورانی شعراء □ کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لفظوں کے سانچے، لہجوں کے زاویے، انداز کے قرینے، بیان کے جامے وہ ابھی وضع ہی کہاں ہو سکتے ہیں جب تک نعت کے محبوب کریم ? کی صحیح، سچی اور عمدہ تعریف کا حق ادا کر سکیں۔ اس ذات والا صفات کی

حقیقت جاننے کا دعویٰ کسی مخلوق کا حصہ ہی کہاں ہے؟ حقیقتِ کعبہ کون سی تجلی ہے؟ کلام اللہ کے اسرار کتنے ہیں؟ رسول اللہ کی شان کتنی ہے؟ اے انسان اسے سعادت جان کہ تجھے یہ شرف حاصل ہے کہ اس باب میں زبان وقلم سے اپنی بساط کے مطابق ہے''(19)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نعتیں بھی عشقِ رسول ? میں ڈوب کر تخلیقی مراحل سے گزرتی نظر آتی ہیں۔ان کے ایک ایک مصرعے سے عقیدتِ رسول ? ٹپکتی ہے۔ایک نعت کے چند اشعار دیکھیں:

میں مدینے جو پہنچی تو دل میں مرے روشنی ہوگئی
روح مردہ تھی لیکن مجھے یوں لگا زندگی ہوگئی

ہے مرے واسطے تو یہ روشن مدینہ ہی روشن جہاں
چاند یثرب سے ابھرا تو چاروں طرف چاندنی ہوگئی

میرا ماتھا چمکنے لگے گا میں خود بھی نکھر جاؤں گی
دھول شہرِ نبی ? کی جبیں پر اگر دائمی ہوگئی

آپ کی شان کے لفظ ملتے نہ تھے میں پریشان تھی
آپ ? نے لفظ بھیجے تو آقا مری نعت بھی ہوگئی

مندرجہ بالا اشعار جو نجمہ شاہین کی ایک نعت سے ماخوذ ہیں،شاعرہ کی آں حضرت ? سے عقیدت کا واضح اظہار ہیں۔انھوں نے آنحضور ? کی سیرت وکردار اور مقام کا حوالہ دیتے ہوئے اور تخلیقی سرگرمیوں کا سہرا بھی نبی آخرالزمان ? کے سر بیان کیا ہے۔ یعنی شاعرہ کو نعت کی ترتیب اور آرائش وزیبائش کے لیے الفاظ بھی نبی آخرالزمان ? کی

ذات پاک سے عطا ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا آخری شعری مجموعہ'' پھول،خوشبو اور تارہ'' میں ایک خوبصورت نعت شامل ہے جو ان کی بہترین اور عمدہ نعتوں میں سرِ فہرست ہے۔اس نعت کی خاص بات جو اسے تمام نعتیہ کلام سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی ردیف'' یا رسول اللہ '' ہے۔نعت متذکرہ بالا کے چند اشعار دیکھیں:

ہمیں پھر سے عطا ہو سرفرازی یا رسول اللہ
جواں جذبوں میں ہو روحِ حجازی یا رسول اللہ

ہمیں گھیرا ہوا ہے دشمنوں نے چار جانب سے
کہاں ہیں ملتِ بیضا کے غازی یا رسول اللہ
مسلماں کاش! ملت کی بھلائی کا ذرا سوچیں
لگا دیں ہر طرح سر دھڑ کی بازی یا رسول اللہ

درددوں کا ثمر ہے نعتوں کا سلسلہ شاہیں ?
سدا حاصل رہے یہ دلنوازی یا رسول اللہ

ان اشعار میں بھی شاعرہ نے آنحضرت ? سے امتِ مسلمہ کی بھلائی کی دعا مانگی ہے اور درود پاک ? کو زندگی کا مرکز ومحور بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک اور نعت میں کہتی ہیں کہ اس جہاں کو جتنی بھی روشنی مل رہی ہے اس کا مرکز ومنبع مدینہ شریف ہے۔میرے پیارے آقا ? تمام جہاں کی ہدایت کا راستہ دکھا رہے تھے۔شاعرہ نے یہ نعت روح اور دل کی گہرائیوں سے لکھی ہے،چند اشعار ملاحظہ کریں:

کھاتے تھے زخم سب کی ہدایت کے واسطے
پھیلا رہے تھے آپ ? قرینے کی روشنی

شق الصدر سے ہو گئے حیران جبرائیل
پھیلی تھی کل جہان میں سینے کی روشنی

رمضان ہو کہ ماہِ ربیع الاول ہو بس
چاروں طرف ہے ان کے پسینے کی روشنی

پچھلے صفحات میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی تخلیق کردہ نعتیں اور حمد کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے موصوفہ ایک کامیاب نعت گو اور حمد نگار ہیں۔ حمد اور نعت پر سیر حاسل گفتگو کرتے ہوئے اب نجمہ شاہین کھوسہ کے قطعات زیرِ بحث ہوں گے۔

iii۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے قطعات

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے جہاں متفرق شاعری میں حمد، نعت اور دیگر اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی وہاں ان قطعات بھی کسی شاہکار سے کم نہیں ہیں۔ نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی ہر کتاب میں قطعات کا اہتمام کیا ہے جو ان کی اس صنف سے لگاؤ کا ثبوت ہے۔ ان کے قطعات پر بات کرنے سے پیش تر قطعہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں، اصطلاح میں قطعہ ایک ایسی صنفِ شاعری ہے جس میں ایک ہی مضمون کے اشعار قلمبند کیے جاتے ہیں۔ کم از کم دو جبکہ زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ قطعہ کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ابوالاعجاز صدیقی قطعہ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اصطلاحی معنوں میں قطعہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں قوافی کی ترتیب قصیدے یا غزل کے مطابق ہوتی ہے، یعنی تمام اشعار کے مصرعے یا مصرعہ ہائے ثانی ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن غزل اور قصیدے کے برعکس قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا اور مقطع ضروری نہیں ہے۔ قطعہ کے لیے کم از کم دو شعروں کا ہونا ضروری ہے''(23)

قطعہ نگاری کی صنف فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ فارسی میں انوری، سعدی اور خاقانی کے قطعے مشہور ہیں جبکہ اردو میں میر جعفر زٹلی، میر تقی میر، عزیز لکھنوی وغیرہ نے قطعات لکھے ہیں۔ جدید شعراء ▯ میں حالی، شبلی، اکبر، اقبال، ظفر علی خان اور احسان دانش سمیت سیکڑوں شعراء ▯ نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس صنف کو مزاحیہ شعراء ▯ نے بھی اپنایا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی قطعہ نگاری میں دلچسپی لی ہے، اور بہت عمدہ قطعات لکھے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بطور خاص اس صنف کو نہیں لیا لیکن چند قطعات تخلیق ضرور کیے ہیں۔ ان کے آخری شعری مجموعے ''پھول، خوشبو اور تارہ'' سے دو قطعات ملاحظہ ہوں:

اپنے پیروں کے چھالوں اور دل کے زخم کو دھول لکھا
ہم نے وصل کی خواہش کو بہکے جذبوں کی بھول لکھا

ہم تقدیر کی تال کو چال بنا کر رقص کناں تو ہیں
وقت نے در بدرری کو ہمارے جیون کا معمول لکھا

مثال بن کے مثالوں کے ساتھ مرنا ہے
مجھے تو اپنے حوالوں کے ساتھ مرنا ہے

وہ کہہ رہے ہیں مقدر ہے تیرگی لیکن
میں کہہ رہی ہوں اجالوں کے ساتھ مرنا ہے

مندرجہ بالا دونوں قطعات میں شاعرہ نے قطعہ نگاری کے قواعد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی پختہ کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ قطعہ میں ایک ہی موضوع پر اشعار کہے جاتے ہیں جو شاعرہ نے بھی کہے ہیں۔ ایک اور قطعہ دیکھیں:

زندگی کچھ طنز مجھ پر اس طرح کرتی رہی
میں تو روتی ہی رہی پر یہ مگر ہنستی رہی

خواب بھٹکے رہ گئے تھے آسماں پر ہی مرے
اور میرا یہ مقدر یہ زمیں تپتی رہی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اگرچہ قطعہ نگاری میں کوئی بڑا معرکہ سر نہیں کیا لیکن کہیں کہیں لگتا ہے کہ وہ قطعہ نگاری میں بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ افتخار عارف ان کی من جملہ شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں لیکن نہایت ہی اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں آفاقیت، غمِ دوراں، غمِ جاناں جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موسیقیت اور ترنم بھی موجود ہے۔ وہ عصرِ حاضر کی ایک اہم آواز ہیں۔ ان کا تعلق ڈیرہ غازی خان جیسے پسماندہ اور دور افتادہ ضلع سے ہے۔ ان کو وہ مقام نہیں ملا جو بڑے شہروں کے ادیبوں کو ملتا ہے۔ امید ہے آنے والے وقتوں میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے گا'' (27)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے حمد، نعت، قطعہ نگاری کے علاوہ سلام، منقبت اور دعا جیسے اصنافِ سخن پر بھی وقتاً فوقتاً طبع آزمائی کی ہے جن کی تفصیل ذیل ہے۔

iv۔ سلام، منقبت، دعا اور دیگر اصناف

سلام، دعا اور منقبت دراصل ایک ہی تصویر کے مختلف روپ ہیں۔ دعا اور سلام

کی تاریخی حیثیت کچھ اور ہے لیکن آج کل شہدائے کرب و بلا کے حوالے سے سلام اور دعا کی اصناف محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ شہدائے کربلا کی شان میں شعر کہنا اب مرثیہ، سلام اور دعا کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ سلام کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

''یہ جو مرثیہ غزل یا قصیدے کے طور پر لکھا جائے اسلیے سلام کہتے ہیں، آج کل سلام اردو شاعری میں ایک الگ صنف کے طور پر رائج ہو چکا ہے جو عموماً غزل کی ہئیت میں لکھا جاتا ہے۔ سلام کی محفل کو غزل کے مشاعرے کی مناسبت سے مسالمہ کہا جاتا ہے۔ سلام میں شہدائے کربلا کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔ ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے اور ان کی ہمت و حوصلہ اور ظلم کے خلاف ڈٹ جانے پر خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے'' (۲۸)

سلام اصنافِ سخن کی باقاعدہ صنف ہے جس پر دو طرح سے بحث ہو سکتی ہے، یعنی ہیئت اور موضوعی مباحث۔ ہیئت کے ذیل میں تو ایک بات طے ہو چکی ہے کہ سلام غزل کی ہیئت میں لکھا جاتا ہے۔ یعنی سلام میں مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف اور بحر کا انتخاب غزل کی طرز کے ہوتے ہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے سلام میں ہر وہ بات کہی جاسکتی ہے جو مرثیے کے موضوع پر مشتمل ہو۔ پروفیسر انور جمال سلام کی مفصل تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''سلام اشعار کی تعداد کے اعتبار سے غزل جیسا ہی ہوتا ہے یعنی بارہ تیرہ اشعار تک، البتہ موضوعی طور پر غزل اور سلام میں فرق یہ ہے کہ غزل میں بنیادی طور پر عشقِ مجازی اور معاملاتِ حسن و عشق کے مضامین بیان ہوتے ہیں جبکہ سلام میں وہ تمام مضامین بیان ہو سکتے ہیں جو مرثیے کا موضوع ہیں۔ واقعات و مصائب کربلا، مناقب آلِ رسول ?، شہادت و مناقب، اہلِ بیت کے مضامین اور ان کے علاوہ تصوف اور اخلاقی مضامین بھی سلام میں بیان ہوتے ہیں۔ میر انیس ? کے سلاموں میں

بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو غزل کے اشعار ہی معلوم ہوتے ہیں'' (29)

سلام کے ساتھ ساتھ منقبت بھی شاعری کی ایک قسم ہے جو سلام سے ملتی جلتی ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے دونوں مین فرق ہے۔ منقبت مذہبی شاعری کی اصطلاح ہے جس کا مطلب تعریف کرنا کے ہیں۔ مذہبی عقیدے کی رو سے کسی اسلامی شخصیت کی تعریف و توصیف کرنا منقبت کے زمرے میں آتا ہے۔ منقبت میں [illegible] رسول کی مدح میں شاعری کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص ترکیب یا سانچا مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ کسی بھی ہیئت میں لکھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر منقبت کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

''منقبت کا مطلب ہنرمندی، صفت، ثناء □، بزرگانِ دین کی تعریف، مسح آئمہ کبار و اصحابِ رسول ? ہے۔ حضرت علی ? کے فضائل کے بیان کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ منقبت کو قصیدہ ہی کا انداز سمجھنا چاہیے۔ مرزا غالب نے جو دو منقبت لکھیں، ان کے تیور قصیدہ جیسے ہی ہیں'' (30)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے سلام اور منقبت بھی تخلیق کیے ہیں جن میں واقعہ کربلا اور آئمہ کرام کی مدح کے پہلو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر سلام کے دو اشعار دیکھیں:

کربل والوں کے دم سے ہے ہم کو پیارا ماتم
اپنے دکھوں میں اس جیون کا بس ہے پیارا ماتم

عشق نے ہجر و وصل کو جب اک جیسا ہی ملبوس کیا
جانے کیوں پھر کون سے دکھ کا ہے یہ اشارہ ماتم

امام حسین کے غم میں آنسو بہانا اور ماتم کرنا بھی ایک لحاظ سے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنا ہوتا ہے۔ موصوفہ نے اسی بات کو ان اشعار میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ایک اور ''سلام'' امامِ حسین سے مخاطب ہو کر سلام لکھنے کی کی خواہش کو یوں گویا ہوتی ہیں:

دکھوں کی تفصیل لکھنے بیٹھوں تو اشک اپنے تمام لکھوں
لہو میں ڈوبیں جو حرف سارے، امام تیرا سلام لکھوں

وہ جس نے سجدے میں سر کٹا کے ہمیں نوازا بلندیوں سے
وفا کے سجدوں کے شاہ کو ہی ا? ج شاہ و امام لکھوں

یہاں سکینہ کا ، اصغر ، اکبر کا اور قاسم کا تذکرہ ہے
ورق ورق پہ ہیں اشک پھیلے میں حرف حرف احترام لکھوں
مجھے شہیدوں کا ذکر کرنا ہے سوچ کو معتبر تو کرلوں
قطار میں سارے لفظ لکھوں، ملے جنہیں پھر دوام لکھوں

ہماری زلفوں میں قتل کب تک روا رہے گا، سوال پوچھوں
ہمارے ظلمت کدے میں کب ہو گا روشنی کا قیام لکھوں

یہی تقدس ہے اب تو میرا، اسی سے نجمہ میری حفاظت
میں اپنی چادر کے چاروں کونوں پہ بی بی زینب کا نام لکھوں

مندرجہ بالا سلام میں نجمہ شاہین نے مرثیہ سے متعلق موضوعات کو جس سلیقے سے پیش کیا ہے وہ ان کا خاصہ ہے۔ سلام متذکرہ بالا میں حضرت امامِ حسین اور اہلِ بیت سے والہانہ عقیدت کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخی معلومات بھی موصوفہ نے خوب پیش کی ہیں۔ ایک اور سلام ملاحظہ کریں:

بنام شاہِ شہیداں، سلام کیا لکھوں
حقیر لفظ ہیں، مدح اما م کیا لکھوں

غضب کہ نوکِ سناں پر ہے کربلا کا سفر
ہر ایک تیغِ ستم بے نیام، کیا لکھوں

دہک رہے ہیں ہر اک سمت دھوپ کے شعلے
مسافرانِ وفا کا قیام، کیا لکھوں

عجیب وقت، تھی چشمِ فلک ہی خود حیراں
کھڑی تھی سر پہ قیامت کی شام کیا لکھوں

ہر ایک نام ہے لوحِ دوام پر محفوظ
کتابِ دل میں شہیدوں کے نام کیا لکھوں

خدا نے جن کو عطا کی ہے چادرِ تطہیر
میں ان کی شان میں نجمہ کلام کیا لکھوں

مندرجہ بالا سلام میں امامِ عالی مقام کا مقام اور مرتبہ بیان کرتے ہوئے شاعرہ نے لکھا ہے کہ آلِ رسول کی شان اتنی زیادہ ہے جس الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ سلام اور منقبت کے ساتھ ساتھ نجمہ شاہین نے دعائیہ نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی کرم کی دعا مانگی گئی ہے۔ ذیل میں ''دعا'' کے عنوان پر مشتمل نظم کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

اے خدا تو محتسب ہے مجھ پہ اک احسان کر
بھول کر لغزش مری یہ زندگی آسان کر

وقت کی اس دھوپ میں جلتے ہیں مرے جسم وجاں
چلچلاتے موسموں میں اپنا سایہ مہربان کر

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے سلام اور دعا کے بعد کچھ گیت بھی لکھے ہیں جو ان کی دھرتی کی محبت کا واضح ثبوت ہیں۔ گیت کی صنف واحد صنفِ شاعری ہے جس کا تعلق برِ صغیر سے ہے۔ گیت کا لفظ ہندی زبان سے اردو میں آیا ہے۔ گیت ایک ایسی صنف ہے جو عوام وخواص میں برابر مقبول ہے۔ ڈاکٹر الف۔ دال۔ نسیم گیت کے آغاز وارتقاء □ پر مفصل بحث کرتے کی ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''نامہ قدیم اردو سے فارسی میں منتقل ہوا، دکنی میں چکی نامہ اور لوری نامہ ایسی ہی دو مخصوص صورتیں ہیں۔ ان میں چکی پیستے وقت اور بچوں کو لوری دیتے وقت عورتوں اور ماؤں کے الاپنے کے لیے خاص سروں اور دھنوں میں شعر کہے جاتے ہیں۔ پنجاب میں لوری نامہ کا بڑا رواج رہا ہے اور فقیر اب بھی برِ صغیر کے مختلف حصوں میں جا کے اور بچوں کو گود میں اٹھا کر لوریاں گاتے پھرتے ہیں۔ پنکھا نامہ، ڈھول نامہ، چرخہ نامہ قسم کی نظمیں اسی صوفیانہ مقصد وغرض کے تحت لکھی جاتی رہیں'' (35)

اُردو میں جدید گیت کی لہر امیر خسرو سے ہوتی ہوئی کبیر داس، تلسی داس، میرابائی، تان سین تک پہنچ کر ہم تک پہنچی۔ انھوں نے اردو فارسی میں گیت لکھے جسے ہم مقامی زبان کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین نے بھی گیت کی روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گیت لکھے ہیں۔ ان کے ایک گیت ''زندگی رک جا ذرا'' کے چند مصرعے ملاحظہ کریں جس میں گیت کی زبان استعمال کی گئی ہے۔

زندگی رُک جا ذرا اب پھر کہاں تُو ہے چلی
زردیوں کو موسموں میں کب کھلی کوئی کلی

پھر کہاں تُو ہے چلی
x x x x x x x x

دیکھ وہ اک یاد دل میں موجزن ہے آج بھی
آنکھ میں جو خواب تھے ان کی چبھن ہے آج بھی

جانتی ہے سامنے تیرے ہے اک اندھی گلی
پھر کہاں تُو ہے چلی

ایک اور گیت'' قاتل شہر کے لوگ'' بھی معرکے کا گیت ہے جس میں شاعرہ موصوفہ نے عشق میں حائل لوگوں کو قاتل کہہ کر للکارا ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

بانٹ رہے ہیں لمحہ لمحہ ہر جانب یہ روگ
قاتل شہر کے لوگ
اندھیارا ہے گلیوں میں اور رستے سب سنسان
ان رستوں پر بھٹک رہی ہوں میں تنہا حیران
ہر جانب کیوں سوگ
قاتل شہر کے لوگ
قاتل شہر کے رستوں میں کل اُتری ایسی شام
سامنے اک دروازہ کھلا اور اک روشن سا نام
باہر تھا اک جوگ
قاتل شہر کے لوگ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بحیثیت نظم گو اور غزل گو علمی و ادبی حلقوں میں اپنی پہچان خوب بنا چکی ہیں لیکن نظم اور غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی جو طبع آزمائی کی ہے وہ بھی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مثلاً حمد، نعت، سلام، منقبت، قطعہ نگار، گیت نگاری، فردیات وغیرہ پر شاعری کرنا بھی کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف متعدد بار کیا جاتا رہا ہے۔ اسد محمود اعوان ان کی جملہ اوصاف کا اعتراف کرتے

ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نجمہ شاہین کھوسہ، ادراک و الہام کے بیچ کی منزل پر موجود ایک خوبصورت تخلیق کار ہیں جن کے کاندھے دھری رنگ برنگ کپڑوں والی پوٹلی میں احساسات، کیفیات، موجودات، روایات، مدارات، امکانات، خیالات، وجوہات، سوالات، جوابات اور جذبات سے جڑی نظم و نثر اور تخلیق پڑی ہے جسے فقط شاعری کہا، لکھا اور پڑھا جائے گا بلکہ ایک خوبصورت تخلیق مراد شاعری کہا، لکھا اور پڑھا جائے گا، کیونکہ یہ وہ منزل ہے جسے پانے کے لیے اس نے زندگی کی گھمبیرتا کو سلجھانے کا مقصد اٹھایا اور ایک زندہ جاوید تخلیق مراد شاعری پیش کی ہے۔ زندہ تخلیق اور خوبصورت شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قاری سے مکالمہ کرتی اور جذبات و کیفیات کی باہمی اشتراک کا معاملہ در پیش کرتی ہے۔ جہاں قاری تخلیق کے سحر میں گرفتار، شدتِ جذبات اور حسِ ادراک کی زمینوں کے سفر پر نکل جاتا ہے''(38)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا متفرق شاعری کے باب میں زیادہ بحث کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ ممکنہ معلومات پچھلے اوراق میں پیش کی جا چکی ہیں۔ انھوں نے ان متفرق اصناف کو شوقیہ طور پر لکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کا اصل میدان غزل اور نظم ہے۔ ان کی شاعرانہ فکر کا اصل میدان چونکہ غزل اور نظم کی اصناف ہیں جن کی تفصیل سابقہ ابواب میں دی جا چکی ہے۔ اہلِ ذوق، تخلیق کاروں، نقادوں اور محققین کی آراء مجموعی جائزہ کے باب میں آئندہ سطور میں ملاحظہ کریں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے گھریلو افراد کی آراء بھی اسی باب میں مندرج کر دی گئی ہیں تاکہ ان کی شخصیت کا احوال ان کے گھر والوں کی زبانی بھی معلوم ہو سکے۔

باب پنجم:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ

شاعری حدیثِ دل یا انسانی جذبات کا نام ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ آئے جو احساسات و جذبات میں عام لوگوں سے کہیں زیادہ تھے لیکن بات کہنے کا سلیقہ یا دوسرے لفظوں میں شعر کہنے کا سلیقہ نہ ہونے کی بدولت اپنی بات لوگوں تک نہ پہنچا سکے اور اپنی خواہشات اور جذبات لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جن لوگوں کو بات کرنے کا سلیقہ آ گیا وہ دنیا میں اپنے حالات و واقعات اور زندگی کی کٹھن راہوں پر چلنے کے تمام واقعات کو آئینہ کر گئے۔ آج ان کی تحریریں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں دلوں پر راج کرتی ہیں۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ ادب ہی وہ منزل ہے جس کے ذریعے انسان کروڑوں دلوں میں مکین ہو جاتا ہے۔

ادب کی دنیا کی کوئی حد نہیں ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر انسان ادب کے ذریعے دل کی بات دنیا تک پہنچا سکتا ہے۔ دل کی بات دوسروں تک پہنچانے کا سلسلہ یونان سے شروع ہوا تھا اور بہت سی دیگر زبانوں سے گزرتا ہوا آج عالمی دنیا تک پہنچ چکا ہے۔ ہومر، سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ قبل مسیح کا زمانہ ہے لیکن وہ آج بھی ان کے نظریات اور فلسفے سے اس لیے واقف ہیں کہ انھوں نے ادب کے ذریعے اپنی تحریروں کو قرطاسِ ادب پر محفوظ کیا۔ یونان کے بعد عربی، فارسی، انگریزی، اردو، چینی، جاپانی، روسی اور دیگر زبانوں کا ادب تخلیق

ہوا جو مختلف زبانوں میں تراجم ہو کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ جن کی [illegible] وسعت اور گہرائی تھی وہ رومی، حافظ، عمر خیام، شیکسپئر، گوئٹے، نیطشے، کولرج، ٹی

ایس ایلیٹ اور اقبال بن کر دنیا کے سامنے آئے اور جو ادیب صرف وقتی ضروریات کے پیشِ نظر اپنی تخلیقات پیش کرتے رہے وہ صفحہءادب میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔

اردو ادب آج اپنی ہزار سالہ تاریخ سے گزر رہا ہے، اس کا پہلا باقاعدہ ادبی دور قدیم دکنی ادب کا دور ہے۔ اس دور میں بہمنی ادب کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی صورت میں باقاعدہ ادبی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ حضرت امیر خسرو اور مسعود سعد سلمان اس کارواں میں سرِ فہرست ہیں۔ رفتہ رفتہ ہندوستان سیاسی حوالے سے مختلف کروٹیں بدلتا رہا اس لیے ادب بھی مختلف ادوار سے گزرتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ولی دکنی، میر تقی میر، میرزا رفیع الدین سودا، مرزا غالب، شیخ ابراہیم ذوق، آتش و ناسخ، داغ و امیر جیسے قد آور شعراء اس میں شامل ہوتے گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری نے مسلمانوں کے عہدِ رفتہ کو شعری پیکر میں ڈھال کر ادب میں مزید وسعت پیدا کر دی۔

قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب مختلف نشیب و فراز سے گزر کر ''پاکستانی ادب'' کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اس میں ہزاروں ادباء وشعراء، افسانہ نویس، ناول نگار، شاعرات وغیرہ نے اپنی اپنی خدمات پیش کیں۔ پاکستانی ادب میں جہاں پاک بھارت جنگوں نے اپنا اپنا اثر ڈالا وہاں مقامی ماحول بھی ادب پر اثر انداز ہوتا رہا۔ اس عرصے میں پاکستانی شاعرات کا گروہ بھی تخلیق سرگرمیوں میں سرگرم رہا۔ 1980ء کی دہائی میں پاکستانی شاعرات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی اُن شاعرات سے تعلق رکھتی ہیں جو 1990ء کے بعد ادب کے افق پر جلوہ گر ہوئیں اور اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت ادبی کارواں میں چمکتا ہوا ستارہ بن کر سامنے آئیں۔ ذیل میں انکی ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ پیش ہے۔

i۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا ادبی مقام

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے شاعری میں اپنا مقام اپنی تخلیقی اور فطری صلاحیتوں اور جہدِ مسلسل کی بدولت حاصل کیا ہے۔ اس بات کا واضح ثبوت ان کے چار شعری مجموعوں

اور کچھ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ مستقبل قریب میں ان کا پانچواں شعری مجموعہ بھی آنے کی امید ہے۔ انھوں نے پنجاب کے دور دراز علاقے ڈیرہ غازی خان میں بیٹھ کر علم و ادب کا جو چراغ روشن کیا ہے اسے آنے والی نسلیں ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ شعبہ حیاتیات سے تعلق رکھنے والی خوبصورت لب و لہجے کی شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ملکی و بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکی ہیں۔ علم و ادب کے سلسلے میں کئی ممالک کا دورہ بھی کر چکی ہیں۔ تخلیقی ادب کا سلسلہ جوانھوں نے آج سے تیس برس قبل شروع کیا تھا ابھی تک جاری و ساری ہے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف دورِ جدید کے بہت سے ادیبوں اور نقادوں نے کیا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا میدان غزل اور نظم ہے، اگرچہ یہ دونوں اصناف اپنی عمر کا طویل حصہ گزار چکی ہیں لیکن باقی شعراء □ اور شاعرات کی طرح ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی انھیں منفرد لب و لہجہ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے، نئے اور منفرد لہجے کے چند اشعار دیکھیں:

جس کہانی کے ہر اک باب میں تم جیت گئے
اس کہانی میں تمھیں مات بھی ہو سکتی ہے

وہ جو مانوس سی آہٹ ہے سنائی دے گی
اس امید پہ اب خود کو جگاتی ہوں میں

میری آنکھوں سے مرے دل میں گرا ہے جو ابھی
منجمد لمحوں میں یہ آبِ رواں کچھ بھی نہیں

میں اپنی لو میں ہی جل رہی ہوں
جو بجھ گیا وہ دیا نہیں ہے

مندرجہ بالا خوبصورت اشعار ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہیں جن میں جدت، طرزِ ادا کا سلیقہ، منفرد لب و لہجہ اور آفاقیت نمایاں ہے۔ موصوفہ نے اس طرح کے اسلوب میں متعدد اشعار کہے ہیں جو انھیں منفرد غزل گو شاعرات میں ہمیشہ سرفہرست رکھیں گے۔ غزل کی طرح انھوں نے نظموں میں بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ آزاد اور پابند نظموں میں بھی بیک وقت طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ان کی ایک آزاد نظم ’’آپ کون‘‘ کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

جو مرکزِ نگاہ تھا
وہ میری بارگاہ تھا
وہ ایک دن ملا مجھے بہت ہی تیز دھوپ میں
اک اجنبی کے روپ میں
وہ ہجر میں بسے ہوئے سے ماہ و سال دے گیا
میں سوچتی ہوں آج بھی
رُکا ہوا تھا سن کے چاپ وہ
جو کہہ رہا تھا آپ کون؟

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نہ صرف نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی بلکہ انھوں نے حمد، نعت، گیت، دوہے، قطعات، سلام، دعا اور کچھ نثری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس حوالے سے ان کا ادبی مقام منفرد و اعلیٰ حیثیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو کچھ اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا ہے جن میں اہم ترین ایوارڈز اور اعزازات میں ’’درشن میگزین ایوارڈ‘‘، ’’خوشبو رائٹرز ایوارڈ‘‘، ’’بے نظیر بھٹو ایوارڈ‘‘ اور ’’حسنِ کارکردگی ایوارڈ‘‘ ہیں۔ اس کے علاوہ اکادمی ادبیات ملتان میں آپ ایڈوائزری کمیٹی کی ممبر بھی ہیں۔ اکادمی ادبیات ملتان کی ہر اہم تقریب میں آپ کی شرکت یقینی ہوتی ہے۔ خواتین کے حوالے سے بھی آپ کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں

ہیں۔آپ جنوبی پنجاب خواتین ونگ قومی یک جہتی اور بین المذاہب ہم آہنگی کی چیئر پرسن ہیں اور عرصہ دراز سے خواتین کی خدمت کرتی چلی آ رہی ہیں۔

ڈیرہ غازی خاں کی مشہورِ زمانہ سماجی و ادبی تنظیم جو خواتین کی بہبود کے لیے ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس تنظیم کی صدر ہیں۔یہ تنظیم آنچل کے نام سے خواتین کی پہلی تنظیم ہے جو ابھی سرگرمِ عمل ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہمیشہ یتیم بچوں اور بیواؤں کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔آپ کی بدولت بہت سے گھر روشن ہوئے ہیں۔یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ڈیرہ غازی خاں میں ادبی و سماجی تقاریب منعقد کروانا بھی موصوفہ کا ذوق ہے۔الغرض ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنے پرائیویٹ ہسپتال کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ادب کو ہمیشہ وقت دیتی ہیں اور جب ادب کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جائے تو اپنی نیند کو ادب پر قربان کر دیتی ہیں۔اس حوالے سے وہ تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ ادبی خدمت میں بھی پیش پیش ہیں اور ادب کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کرتی رہتی ہیں۔ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا تعین الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔بہرحال وہ ایک ایسی شاعرہ ہیں جن کا نام ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ii۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، مشاہیرِ ادب کی نظر میں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک مستند اور پختہ شاعرہ ہیں اس لیے ملکی و بین الاقوامی ادیبوں، شعراء □، نقادوں اور محققین نے ان کی ادبی خدمات کو ہمیشہ سراہا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اخلاقیات اور انسان دوستی کا پیغام دے کر خود کو اعلیٰ تخلیق کار کے طور پر پیش کیا ہے۔ذیل میں ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے مشاہیرِ اردو کے آراء □ پیش ہیں۔ڈاکٹر ستیہ پال آنند لکھتے ہیں:

''آج کا اردو شاعر اس عبوری دور میں سانس لے رہا ہے، جہاں اس کے پیچھے کلاسیکی غزل کی وہ تابناک روایت بھی ہے جو بیسویں صدی کے

شروع میں ہی ختم ہو گئی اور پھر وہ اندھا کنواں بھی ہے جس میں سکہ بند روایتی غزل آج تک ڈوبی ہوئی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں نے مجھے یقیناً متاثر کیا ہے۔ان کی نظمیں دیگر متعدد، اسٹیریو ٹائپ شعریء □ کی طرح گزشتہ نصف صدی کے شہرہ آفاق نظم گو شاعروں (بطورِ خاص فیض احمد فیض) کی لفظیات کے دسترخوان کے باقی ماندہ بچے کھچے ٹکڑوں سے پاک ہیں جن پر وہ قانع رہ کر بہت سے شاعر آج تک غزلیں اور نظمیں لکھے جا رہے ہیں''(۶)

نامور ادیبہ اور ناول نگار بشریٰ رحمن، ڈاکٹر نجمہ شاہین کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تقدیر جو ازلوں سے لکھی ہوئی ملتی ہے اور تدبیر جو ہمیشہ اس سے الجھتی رہتی ہے، پھول کتنا بھی دل آویز کیوں نہ ہو اپنی خوشبو پر اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا، نجمہ شاہین کھوسہ کی طرح ایک بے چین سی روح ہے جسے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تقدیر کا رانجھا کیسے راضی ہوگا شعر سنانے سے یا نشتر چلانے سے؟''(۷)

پروفیسر بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے فن اور اخلاقی جر?ت کو سلام کرتے ہوئے ان کی کتاب ''پھول، خوشبو اور تارہ'' کے دیباچے میں لکھتے ہوئے کہتی ہیں:

''مجھے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی اداسی دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا مگر'' پھول، خوشبو اور تارہ'' کے مسودے کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے اس پر عورت اور عورت کا گمان گزرتا رہا۔یعنی کہ عورت کا عورت سے مکالمہ! عورت بھی وہ جو ڈاکٹر ہے، ماں ہے، فرماں بردار بیٹی اور بیوی ہے، مگر اس کی ذات کے کچھ حصے شاید ان تمام حیثیتوں کے درمیان ان بوجھے اور ان کہے رہ گئے ہیں''(۸)

ملتان کے ادبی افق پر ایک طویل عرصہ راج کرنے والے نامور ادیب، شاعر اور پروفیسر رضی الدین رضی، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے فن کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''کسی بھی شاعر کے فن کو پرکھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کا ادبی سفر کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض شاعر ابتدائی کتابوں میں بہت مضبوط اور منجھے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن بعد کے دنوں میں ان کے ہاں وہ شاعرانہ مہارت کم دکھائی دیتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک حقیقی قلم کار کی طرح ہمیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بتدریج اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتی دکھائی دے رہی ہیں''(۹)

ڈاکٹر شہناز مزمل لکھتی ہیں:

''تارے کی طرح؟ دمکتی، خوشبو کی طرح مہکتی اور پھولوں کی طرح شگفتہ نجمہ شاہین کھوسہ جس سے میں کبھی ملی نہیں۔ اخبارات اور رسائل کے ذریعے اس سے ملاقات رہی اور دل کے اندر اترتی چلی گئی۔ اس کی ذات کے مصرعوں نے مجھے محصور کر لیا اور اس کی شاعری روح کے تاروں کو چھیڑتی رہی''(10)

امجد اسلام امجد کی شاعرانہ عظمت اور ادبی خدمات سے ایک زمانہ واقف ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ادبی خدمات کا اعتراف یوں کیا ہے۔

''ایک تو ڈیرہ غازی خان جیسے نسبتاً دور افتادہ اور پسماندہ علاقے سے تعلق، اس پر ڈاکٹری جیسے سائنس نژاد مضمون میں تخصیص اور ان دونوں مشکلات کے باوجود تین عدد شعری مجموعوں کی تخلیق اپنی جگہ پر ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو جتنی داد دی جائے کم ہے''(۱۱)

جدید اردو غزل اور نظم کے نامور شاعر قمر رضا شہزاد اپنی جدید شاعری کے بل بوتے پر جدید ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ''باطن کی سچائیوں کا اظہاریہ'' میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محترمہ نجمہ شاہین کھوسہ جنوبی پنجاب کے ایک پسماندہ ضلع ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی شاعرہ ہیں جو اپنی شاعری کے حوالے سے ادبی منظر نامے پر نمایاں ہوئی ہیں۔ بطور ڈاکٹر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے ساتھ ساتھ تخلیق فن سے بھی اپنی کمٹ منٹ نبھا رہی ہیں اور یہی وہ راستہ ہے جو کسی بھی تخلیق کار کو اس کی منزل تک پہنچا سکتا ہے''(۱۲)

پروفیسر حسین سحر، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

''شاعری میرے لیے سانس لینے کا اک بہانہ ہے اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی انتظار اور دکھ پر مبنی شاعری قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے''(13)

ڈاکٹر روبینہ ترین (صدر شعبہ اردو، بہاوالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان) نے نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر جامعاتی تحقیق کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ سمیت اس خطے کی تمام شاعرات اور قلم کاروں پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ زکریا یونی ورسٹی تحقیق کے ذریعے یہاں کے علمی و ادبی کام کو محفوظ کر رہا ہے''(14)

اسد محمود اعوان، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نجمہ شاہین کھوسہ کے نزدیک دکھ دل و شب کا چراغ، تن من کا روگ، تنہائی، رسوائی، عشق، پیار، روح، آنسو، خاموشی، زندان، پت جھڑ اور شبِ تنہائی کی اذیت ہیں۔ یہ صبح اور شام کے دائروں میں چکر کاٹتا رنج والم، موسم کا رنگ روپ جس میں خزاں، صحرا اور دھوپ نمایاں ہے

لیکن یہ سب روپ ہی نجمہ شاہین کی شاعری کا سندرتا جوبن ہیں اور یہی شاعری تو اس کا کل اثاثہ ہے''(15)

سلیم سرمد، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو تلمیحات، استعارات اور تشبیہات کی شاعرہ کا اعزاز دیتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، استعارے، کنائے، تشبیہات اور تلمیحات کے استعمال کا فن بخوبی جانتی ہیں۔ان کی اکثر کتابوں کے نام بھی استعاراتی ہیں۔میں انھیں استعاراتی شاعرہ کا خطاب دینا پسند کروں گا، وہ اپنا مدعا اور اپنی بات اور اپنے اظہار کے لیے استعاروں کا استعمال کر کے کمال مہارت کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ جاتی ہیں''(16)

طاہرہ جبیں، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے مقام کا تعین کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا شمار ان شاعرات میں ہوتا ہے جنھوں نے مختصر عرصے میں اپنی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کروایا۔ان کی شاعری میں ہمیں ان کے ذاتی دکھ،، اجتماعی دکھوں سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔وہ ادبی افق پر اہم شاعرہ کے طور پر ابھری ہیں ان کی شاعری میں عورت کے دکھوں کی کہانی ہے۔وہ عورت جس کے قدموں تلے جنت ضرور ہے لیکن اس تنگ نظر معاشرے کا مرد اسے پاؤں کی جوتی سمجھنے میں فخر محسوس کرتا ہے''(17)

معروف کالم نگار، ادیب اور صحافی راجہ ناسد ساحل اپنے ایک کالم میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا پس منظر اور تلمذ کے حوالے سے معلومات دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ابتداء میں کسی سے اصلاح نہیں لی تھی مگر جب غزل کہنے کے بعد جاوید احسن اور رضی الدین رضی سے اصلاح کرواتی ہیں۔ان کی دوسری کتب پر انھیں دو ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔وہ

ان شاعرات میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی الگ شناخت بنا لی ہے''(18)

نامور محقق اور نقاد حسنین کامران، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت اور شاعری پر رومانی انداز سے تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ڈیرہ غازی خان کی مشہور و معروف اور خوبصورت شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ جو اب پورے پاکستان کے ادبی حلقوں میں شہرت کی بلندیوں کو چھو چکی ہیں۔قدرت نے ڈاکٹر صاحبہ کو دو انمول تحفے عطا کیے ہیں۔جن میں ایک ان کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ، دوسرا ان کی شاعری میں پختگی اور وہ معیار کا بڑھنا جس پر ادب کے لاکھوں دیوانے نچھاور ہوئے جا رہے ہیں''(19)

نامور کالم نگار اور ملتان کی صحافت کا ایک اہم نام جاوید اسلم بروہی ہے، جس نے نجمہ شاہین کھوسہ کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایک کالم مطبوعہ روزنامہ ''اوصاف'' ملتان، مورخہ ۲۰ مئی ۲۰۰۹ء میں لکھا ہے کہ:

''ڈیرہ غازی خاں شہر جغرافیائی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔یہ چاروں صوبوں کے سنگم پر واقع ہے۔یہاں پر قیمتی معدنیات کے ذخائر خصوصاً آئل اینڈ گیس کا ذخیرہ، جپسم کا ذخیرہ، قیمتی دھاتوں کا ذخیرہ مو جود ہے۔علمی و ادبی حوالے سے بھی یہ علاقہ بہت زرخیز ہے۔یہاں پر محسن نقوی جیسے عظیم شاعر کی پیدائش ہوئی، اس کے علاوہ مقامی زبان کے کئی شعراء یہاں موجود ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ان سے ملاقات کے بعد میں نے انھیں انتہائی سادہ لوح پایا۔وہ اپنے پیشے اور ادبی ذوق میں ہمیشہ انصاف کرتی نظر آتی ہیں''(20)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت اور فن پر مختلف آراء پیش کی گئیں جن کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب شاعرہ اور ڈاکٹر ہیں۔انھوں نے جہاں اپنے فنی قابلیت کا لوہا منوایا وہاں اپنے پیشے کے ساتھ بھی ہمیشہ انصاف کیا۔ذیل میں خضر حیات مون کی رائے پیش ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے حوالے سے مفید معلومات دی ہیں:

''ڈیرہ غازی خان کی دھرتی ادب وفن کے حوالے سے بہت زرخیز ہے۔اس دھرتی پر جنم لینے والی شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری نئی سوچ، نئی فکر، نیا تجربہ، نئی تحریر، نئی نظم اور نئی نثری نظمیں، غزلیں، جدت کے ساتھ موجود ہیں۔ان کے اشعار عوامی رنگوں اور معاشرتی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں غمِ زندگی اس کی شاعری کا نمایاں موضوع ہے۔وہ شاعری کی روایات سے بھی واقف ہیں اور مستقبل کے امکانات سے بھی۔وہ نہایت مخلص، باشعور، ذہین اور محنتی خاتون ہیں۔وہ اپنے ہسپتال کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات اور اردو زبان کی آب یاری میں ہمہ وقت مصروف ہیں''(12)

ڈاکٹر محمد وسیم انجم، نجمہ شاہین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ''شاہین'' تخلص سے لکھتی ہیں۔ان کی شاعری علامہ اقبال کے ''شاہین'' سے مختلف نہیں ہیں۔علامہ اقبال نے شاہین کے اوصاف کی بدولت اسے اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے اور ڈاکٹر نجمہ شاہین میں ایسے اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔اگر انھیں علامہ اقبال کا شاہین کہا جائے تو بجا ہوگا۔انھوں نے اپنی تعلیم (ایم بی بی ایس) کے دوران اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کا بغور مطالعہ ہی نہیں ان گنت تجربات بھی کیے ہیں جو ہمیں ان کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں۔انھیں

فطرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے پیشے کے تقدس میں انسانیت کی خدمت کا جذبہ بھی نمایاں ہے جو ہمیں ان کے شعری مجموعوں میں پڑھنے کو ملتا ہے''(۲۲)

آخر میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے والد صاحب کی رائے شامل کی جاتی ہے۔ان کے والد جان محمد کھوسہ کا تعلق ادب سے نہیں ہے لیکن باپ ہونے کے ناطے ان کی رائے کو شامل کیا جا رہا ہے۔

''نجمہ شاہین کھوسہ بچپن ہی سے بہت محنتی تھیں اور اپنے کام سے مخلص تھیں۔تیسر کلاس تک گاؤں میں پڑھا، اس کے بعد ڈیرہ غازی خان شہر میں منتقل ہو گئیں۔گھر میں سب بہن بھائیوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔اپنی ماں کے گھریلو کاموں میں بہت مدد کرتی تھیں۔بچپن ہی سے کھانا پکانے میں دلچسپی لینا شروع ہو گئی تھیں۔زمین میں پھول بونا ان کا ذاتی مشغلہ تھا۔مصوری، سلائی کڑھائی، نعتوں کو ترنم سے پڑھنا جیسے شوق بھی رکھتی تھیں۔انسان کی تربیت دیہاتی ماحول میں اچھے طریقے سے ہوتی ہے اس لیے ذمہ داری کا احساس انھیں ہمیشہ سے تھا۔''(23)

محاکمہ

اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کا عمل انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے اس لیے جب بھی انسان کوئی ایسی بات سنتا ہے جس کا اثر لینا امر ہو جاتا ہے تو وہ غور وفکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔انسان نے جب اپنی بات دوسروں تک پہنچانے میں با قاعدہ ادب کا سہارا لیا تو اس وقت سے لے کر آج تک ادب کسی نہ کسی صورت میں دنیا کی مختلف زبانوں میں افزائش عمل سے گزرتا رہا۔

ادب کے ابتدائی نمونوں کی اوّلین مثالیں یونانی ادب میں ملتی ہیں۔اس سلسلے میں ہومر، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نام سرفہرست ہے۔تاہم قدیم یونانی ادب کے بعد جدید یونان کے ادب نے بھی بہت ترقی کی۔یونان والوں کے بعد ادب عربی اور فارسی میں شامل ہوا تو علم ادب کے شاہکار فن پارے سامنے آئے۔اس کے بعد انگریزی اور اردو ادب نے تو ادب کو کلاسیکی ادب کا درجہ دے دیا اس وقت دنیا میں یونانی، عربی فارسی، انگریزی اور اردو ادب کے فن پارے بہت توجہ سے ساتھ پڑھے جا رہے ہیں۔ادب کا ایک اور رُخ طنز ومزاح کا بھی ہے جو ہمیں اردو ادب میں زیادہ نظر آتا ہے۔کسی بھی ادب میں چاہے وہ فارسی ہو، اردو ہو یا عربی ہو بطور احتجاج ملاّ، شیخ، واعظ، ناصح اور مذہبی شخصیت کے خلاف ان کا مذاق اڑانے کی شاعری ہمیں ہر دور میں تخلیق کی جاتی رہی ہے۔اردو ادب کو یہ رواج فارسی ادب سے بطور ورثہ ملا ہے۔البتہ اگر طنز ومزاح کو با قاعدہ خاص رنگ میں اپنانے کی پہلی سعی عہدِ عالمگیری میں ہوا۔اس کا آغاز میر جعفر زٹلی ? نے کیا تھا۔اس لیے جعفر زٹلی کو مزاح گوئی اور ہجو گوئی کا موجد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

میں نے جب اپنی تحقیق کا آغاز کیا تو سب سے پہلے ادب کی ابتدائی صورتوں کو دیکھنے اور پڑھنے کی نوبت پیش آئی اس لیے بہت غور وفکر اور مطالعہ کے بعد دکن کے بہنی دور سے لے کر قطب شاہی، عادل شاہی اور دبستانِ دہلی کا خوب مطالعہ کیا۔میری موضوع چونکہ غزل اور نظم دونوں کے حوالے سے ہے اس لیے مجھے غزل کی ابتدائی صورتوں کو دیکھنے کے لیے قدیم ادب کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔حضرت امیر خسرو سے لے کر عہدِ جدید کے تمام غزل گو شعراء □ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد میں اس قابل ہوا کہ تحقیقی شخصیت کی غزلیہ خدمات پر کچھ رائے تحریر کر سکوں۔

غزل کے بعد نظم نگاری کی تاریخ بھی کھنگالنے کی ضرورت پیش آئی تو سب سے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کی نظمیں دیکھنے کو ملیں۔نظیر ? اکبر آبادی کے ساتھ ہی میر و سودا کا دور شامل ہے جس میں میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے عہد میں ہجو یہ اشعار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔میر و سودا کی معاصرانہ چشمک کے علاوہ ان کی مثنویوں میں بھی ہجو یہ اشعار ملتے ہیں اس کے علاوہ اکبر الہٰ آبادی کی مزاحیہ نظمیں بھی میرے مطالعہ کو وسیع کرنے میں مدد معاون ثابت ہوئیں۔اکبر کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''اکبر نے سائنس، عقلیت اور علم وفن کا مذاق فی نفسہٖ اُڑایا ہی نہیں۔ہاں سر سید دینی اصلاح کے لیے ان کا استعمال جس طرح کر رہے تھے اس کا مذاق انھوں نے ضرور اڑایا ہے۔اکبر نہ تو سیاسی اور تعلیمی جدو جہد کا بیکار سمجھتے تھے اور نہ ہی بے جا توکل اور قناعت کا پرچار کرتے تھے اور نہ سعی و عمل کو کارِ لایعنی خیال کرتے تھے۔سعی و عمل کے بارے میں تو سر سید اور ان کے درمیان اختلافِ رائے تھا ہی نہیں۔انیسویں صدی عیسوی کے مسلمان اقتدار چھن جانے کے بعد جس بے حسی و بے عملی کا شکار تھے اس کا اظہار اکبر ?، سر سید، حالی ?، نذیر احمد سبھی نے ایک جگہ نہیں جگہ جگہ کیا

ہے‘‘(24)

اُردو غزل اور نظم کا تاریخی مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان’’ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری‘‘ کا آغاز کیا جسے پانچ مختلف ابواب میں تقسیم کیا۔ ابواب کی فہرست یوں ہے:

باب اوّل: ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی سوانح اور شخصیت

باب دوم: نجمہ شاہین کھوسہ بحیثیت نظم گو

باب سوم: ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بحیثیت غزل گو

باب چہارم: ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی متفرق شاعری

باب پنجم: ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ

راقم نے اپنے مقالے کے مختلف ابواب کی مدد سے شاعری کے آغاز و ارتقاء □ سے لے کر تحقیقی شخصیت ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر میں ضرورت کے تحت تحقیق کی ہے۔ جہاں جہاں جس موضوع کی ضرورت پڑی وہاں جدید شعراء □ کی شاعری سے استفادہ بھی کیا گیا ہے ہر باب کو موضوع کی مناسبت سے مکمل کر کے تسوید کیا گیا ہے۔ جدید تحقیق کے مروجہ اصولوں کے مدِنظر رکھتے ہوئے تحقیقی مقالہ تیار کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر تحقیق کے موضوع پر بات کی گئی ہے۔

تحقیق کے سلسلے میں مجھے پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں جانا پڑا۔ جس کے لیے میں جملہ لائبریرین اور عملے کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے کتب سے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ جن کتب خانوں میں زیادہ تر جانا رہا اُن میں وفاقی اردو یونی ورسٹی لائبریری، میونسپل پبلک لائبریری لیاقت باغ (راولپنڈی) نیشنل لائبریری اسلام آ?باد، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اِسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد اور اکادمی ادبیات اسلام آباد کے کتب خانے قابلِ ذکر ہیں۔

تحقیق کے مکمل مراحل سے گزرنے کے بعد میں اس قابل ہو چکا ہوں کہ تحقیقی

شخصیت کے فن پر اپنی رائے تحریر کر سکوں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے میری حتمی رائے یہ ہے کہ موصوفہ ایک عمدہ غزل گو ہیں۔ ان کی غزلوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ قدیم اور جدید غزل کے مطالعہ کے حامل قارئین ان کی غزلوں ک و سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں پرانے موضوعات کو نئی طرز کے مطابق بھی ڈھالا ہے اور کہیں کہیں جدید اندازِ غزل بھی اپنایا ہے۔ شعر کہنے میں کبھی کبھی علامتی انداز بھی اختیار کیا ہے جو ہمیشہ غزل کا حسن سمجھا جاتا رہا ہے۔ تشبیہات اور استعارات سے بھی کام لیا ہے کہ یہ بھی غزل کی خوبصورت میں اضافہ کرتے ہیں۔ جہاں جہاں بات کرنے میں دشواری محسوس کی وہاں نظموں سے کام چلانے میں بھی موصوفہ نے کوئی عار محسوس نہیں کی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظم گوئی پر بات کی جائے تو یہ صنف غزل کے مقابلے میں بہت مضبوط نظر آتی ہے۔ وہ دراصل نظم میں شعر کہنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی نظمیں غزل کے مقابلے میں معیار اور مقدار میں کہیں زیادہ ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نہ صرف نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی بلکہ انھوں نے حمد، نعت، گیت، دوہے، قطعات، سلام، دعا اور کچھ نثری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس لیے انھیں صرف غزل گو یا نظم گو کہنا بھی درست نہیں ہوگا۔ دیگر اصناف پر کام کرنے کی وجہ سے ان کا ادبی مقام منفرد و اعلیٰ حیثیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کے اصولوں پر ہمیشہ عمل پیرا رہی ہیں۔ وہ اپنے علاقے میں ہر اس تقریب میں شرکت کرتی چلی آ رہی ہیں جو علم و ادب سے متعلق ہو۔ ان کی انھی ادبی خدمات کی بدولت انھیں کچھ اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا ہے جن میں اہم ترین ایوارڈز اور اعزازات میں’’درشن میگزین ایوارڈ‘‘، ’’خوشبو رائٹرز ایوارڈ‘‘، ’’بے نظیر بھٹو ایوارڈ‘‘ اور’’حسنِ کارکردگی ایوارڈ‘‘ ہیں۔ اس کے علاوہ اکادمی ادبیات ملتان میں آپ ایڈوائزری کمیٹی کی ممبر بھی ہیں۔ اکادمی ادبیات

ملتان کی ہر اہم تقریب میں آپ کی شرکت یقینی ہوتی ہے۔خواتین کے حوالے سے بھی آپ کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔آپ جنوبی پنجاب خواتین ونگ قومی یک جہتی اور بین المذاہب ہم آہنگی کی چیئر پرسن ہیں اور عرصہ دراز سے خواتین کی خدمت کرتی چلی آ رہی ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نہ صرف علمی و ادبی کاموں میں پیش پیش رہی ہیں بلکہ سماجی کاموں میں بھی حصہ لیتی چلی آ رہی ہیں۔ڈیرہ غازی خاں کی مشہورِ زمانہ سماجی و ادبی تنظیم جو خواتین کی بہبود کے لیے ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے،ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس تنظیم کی صدر ہیں۔یہ تنظیم آنچل کے نام سے خواتین کی پہلی تنظیم ہے جو ابھی سرگرمِ عمل ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہمیشہ یتیم بچوں اور بیواؤں کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔آپ کی بدولت بہت سے گھر روشن ہوئے ہیں۔یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اللہ تعالیٰ انھیں اس کارِ خیر میں ہمیشہ مصروف رکھے تا کہ ادبی کاموں کے ساتھ ساتھ وہ سماجی خدمات میں بھی اپنہ حصہ ڈالتی رہیں۔

ڈیرہ غازی خاں میں ادبی و سماجی تقاریب منعقد کروانا بھی موصوفہ کا ذوق ہے۔الغرض ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنے پرائیویٹ ہسپتال کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ادب کو ہمیشہ وقت دیتی ہیں اور جب ادب کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جائے تو اپنی نیند کو ادب پر قربان کر دیتی ہیں۔اس حوالے سے وہ تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ ادبی خدمت میں بھی پیش پیش ہیں اور ادب کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کرتی رہتی ہیں۔ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا تعین الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔بہر حال وہ ایک ایسی شاعرہ ہیں جن کا نام ادبی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

سفارشات و نتائج

مقالہ ہٰذا میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کو مختلف حوالوں سے تحقیق کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔وہ نہ صرف غزل گو ہیں بلکہ پابند نظم،آزاد نظم،نثری نظم،گیت، حمد،نعت،قطعات بھی لکھتی ہیں۔شاعری کے حوالے سے اب تک ان کی چار کتب منظر عام پر آ چکی ہیں یہ سلسلہ ہنوز آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔میں نے انھیں بحیثیت شاعرہ فنی اور فکری حوالوں سے تحقیق کر کے پیش کیا ہے۔تاہم ان کی تخلیقی کتب کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔مستقبل قریب میں ان کی متعدد کتب شائع ہونے کی امید ہے جس سے ان کی شاعری پر مزید مقالہ تحقیق کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔میں نے بطور شاعرہ نجمہ شاہین کھوسہ کے فکر و فن کو پانچ مختلف ابواب میں منقسم کیا ہے تاہم ان کی غیر مطبوعہ تصنیف و تالیف کے اشارات آنے والے محققین کے لیے پیش کر دیے ہیں۔

پہلے باب میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی سوانح اور شخصیت کے ذیل میں ان کی دیگر تصانیف کا سرسری تبصرہ دیا گیا ہے تا کہ مستقبل میں تحقیق شخصیت پر کام کرتے ہوئے آئندہ محققین کے لیے کوئی دقت نہ ہو۔ان کی سوانح اور شخصیت کے حوالے سے دی گئی معلومات بھی آئندہ محقق کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔

اردو نظم و غزل کی روایت اور ارتقائی مراحل کے ذریعے تحقیقی شخصیت کی تخلیقی صلاحیتوں کی اہمیت و افادیت کی تفصیل پیش کر دی ہے۔جو تمام تر حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔کسی قسم کے مبہم پہلو سے بچنے کے لیے کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔غزل اور نظم کی حد تک تو کسی بھی پہلو سے چشم پوشی سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔یعنی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

کا اسلوب، طرزِ تحریر، شاعری میں ان کا مقام، معاصرین کی آراء □ اور محاکمہ وغیرہ تحقیق میں پیش کر دیے گئے ہیں۔

اپنی تحقیق کی سفارشات اور نتائج مرتب کرتے ہوئے تحقیق کے تمام اصولوں کر مدِنظر رکھ کر تحقیقی فن پارہ تیار کیا گیا ہے۔ ایک سو پینسٹھ صفحات پر مشتمل اس مقالہ کو ایم فل کی سطح کے لیے تحقیق کیا گیا ہے جو ڈگری کے لیے پیش ہے۔ نتائج اور خلاصہء بحث یہ ہے کہ مقالے کو تحقیقی اصولوں پر جانچا جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ تحقیق کے مروجہ اصولوں کے مطابق ثابت ہو گا۔ حوالہ جات و کتابیات کو جدید جامعاتی اصولوں کے تحت درج کیا گیا ہے۔ کتابیات کے ذیل میں اخبارات، رسائل و جرائد، انٹرویوز اور دیگر لوازمات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے تحقیق کو اِشاریہ سازی کے عمل سے بھی گزارا گیا ہے۔ اشاریے کے ذیل میں جن عوامل کا اہتمام کیا گیا ہے وہ بالترتیب اسماء □ ُالرجال، اسماء □ ُالکتب و لغات، اخبارات و رسائل، اماکن، اسماء □ اللسان ہیں۔ اشاریہ سازی کا عمل اضافی ہے لیکن جامعہ ہٰذا کے قواعد کے مطابق اسے عمل میں لایا گیا ہے تاکہ ڈگری کے حصول کے بعد اگر مقالہ کی اشاعت ہو تو قارئین اس سہولت سے مستفید ہو۔

تحقیقی مقالہ

مقالہ نگار

رضیہ نور

(نواز شریف یونیورسٹی، ملتان)

باب اوّل

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، سوانح اور شخصیت

زندگی کے کسی بھی شعبے کو دیکھ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ خواتین ہر سطح پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ وہ شعبہ چاہے ادب سے متعلق ہو یا کسی اور فیلڈ کا ہو خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے اپنی لیاقت و قابلیت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ادب کے شعبہ میں خواتین غزل اور نظم میں اپنی شناخت کروا رہی ہیں۔ خواتین افسانہ، ناول اور ڈرامہ کی صنف میں بھی اپنی منفرد پہچان بنا چکی ہیں۔

اردو کے شعری فلک پر بھی خواتین شاعرات نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اردو شاعری میں ہمارے سامنے ادا جعفری، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید ،عذرا عباس، یاسمین حمید، ماہ طلعت زیدی، غزالہ خاکوانی، نوشی گیلانی اور سارہ شگفتہ ایسی شاعرات ہیں جو عہد حاضر کے جو جدید موضوعات کو اپنے شعری تجربے میں کامیابی سے پیش کر رہی ہیں۔

اگر جنوبی پنجاب کے حوالے سے دیکھیں تو جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والی کہانی کاروں میں جہاں طاہرہ اقبال ہیں وہیں شاعرات میں ایک بڑا نام نوشی گیلانی کا آتا ہے۔ نوشی گیلانی نے اپنی شاعری کے ذریعے سے جدید موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی شاعری بھی ہمارے جدید دور کے مسائل کی نشاندہی کرتی ہے۔ جنوبی پنجاب کی شاعرات میں اہم اور نمایاں نام ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا بھی ہے ان کا شمار آج کی جدید شاعرات میں ہوتا ہے مختصر عرصے میں انہوں نے خود کو کامیاب شاعرہ کے طور پر منوایا ہے اور اردو ادب کی

شعری روایت میں اپنی ایک خاص پہچان بھی بنائی ہے۔

خاندانی پس منظر:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان کی ایک نواحی بستی ''جندانی والا'' میں پیدا ہوئیں۔ڈیرہ غازی خان کے معروف قبیلہ کے ایک معزز بلوچ گھرانے سے ان کا تعلق ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے آباؤاجداد کافی عرصہ سے یہاں سکونت پذیر ہیں اور وہ صدیوں سے یہیں آباد تھے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دادا ''پیر بخش کھوسہ'' اپنے علاقے کے جدی پشتی زمیندار تھے یہی وجہ ہے کہ اہل علاقہ میں ان کا شمار اہم شخصیت کے طور پر ہوتا ہے اگر تاریخ پاکستان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ کھوسہ خاندان پاکستان کی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔

پیر بخش کھوسہ کے سات بچے تھے جن میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں مگر گاؤں کے رسم و رواج کے مطابق بیٹیوں کے لیے تعلیم کے دروازے بند کر دیے گئے اور بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی گئی۔پیر بخش صاحب نے ایک بیٹے کو کھیتی باڑی میں لگا لیا جس کی وجہ سے وہ بیٹا تعلیم سے محروم رہا۔''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ'' کے والد ''جان محمد کھوسہ'' اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے یہی وجہ کہ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر بھی خوب توجہ دی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے والد جان محمد کھوسہ کا بھائیوں میں سے آخری نمبر ہے وہ ایک پڑھے لکھے باشعور اور علم دوست انسان ہیں۔ان کی علم دوستی کے حوالے سے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ خود بتاتی ہیں:

"ہمارے گاؤں میں سرکاری سکول نہیں تھا اور گاؤں کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوسرے گاؤں میں سفر کر کے جانا پڑتا تھا جب میرے والد نے ہوش سنبھالا تو سرکاری سکول کی کمی کو دور کرنے کے لیے اپنی ذاتی زمین وقف کر کے حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم سے سکول منظور کروالیا۔یہ سکول آج بھی آپ کے گاؤں میں ''گورنمنٹ مڈل سکول تگیانی'' کے نام

سے موجود ہے اور بستی جندانی میں واقع ہے۔"(1)

اس سکول سے اب تک ہزاروں بچے تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے والد جان محمد کھوسہ کے چار بچے ہیں جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ان میں بہن بھائیوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے کہ ''محمد سلیم کھوسہ''، خلیل احمد کھوسہ''، سلمیٰ شاہین کھوسہ'' اور ''نجمہ شاہین کھوسہ'' شامل ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی والدہ کا نام ''امیر بیگم'' ہے۔جو پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے بڑے بھائی سلیم کھوسہ ایڈووکیٹ اور چھوٹے بھائی خلیل احمد کھوسہ ایم۔ایس۔سی تک تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ان کے والد جان محمد کھوسہ کاشتکاری کے علاوہ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتے تھے اور بعد میں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد اپنے شہر ''ڈیرہ غازی خان'' واپس لوٹ آئے اور اپنے ہی شہر میں ٹریول ایجنسی کھول لی۔

یہ ایجنسی ''عرب ٹریول ایجنسی'' کے نام سے مشہور ہے اور ڈیرہ غازی خان اور اس کے گردونواح میں اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ڈیرہ غازی خان کے میئر جان محمد کھوسہ کے دوست تھے اور ان کی ٹریول ایجنسی میں شراکت دار کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔''جان محمد کھوسہ'' ایک زیرک اور حالات و واقعات کو سمجھنے والے انسان تھے اسی وجہ سے وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی غرض سے شہر آ گئے۔

شروع سے ہی ان کی کوشش رہی کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر اچھی زندگی گزارے یہی وجہ ہے کہ ان کی کوشش اور محنت رنگ لائی۔آج ایک بیٹا وکیل ''محمد سلیم کھوسہ'' اور ایک انجینئر ''خلیل احمد کھوسہ'' ایک بیٹی ڈاکٹر ''نجمہ شاہین کھوسہ'' اور دوسری ''سلمیٰ شاہین کھوسہ'' ایم۔ایس۔سی سیاسیات ہے یعنی ان کا سارا خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی تربیت کا حامل ہے۔

پیدائش اور بچپن:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ 5 دسمبر 1973ء □ کو ڈیرہ غازی خان کی بستی ''جندانی

والا'' میں پیدا ہوئیں۔ان کے دو بھائی ''محمد سلیم کھوسہ'' اور ''خلیل احمد کھوسہ'' اور ایک بہن ''سلمٰی شاہین کھوسہ'' اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا بچپن بھی ڈیرہ غازی خان کے علاقوں میں گزرا ہے ڈیرہ غازی خان کے وڈیرہ شاہی نظام میں بچیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ان کے والد جان محمد کھوسہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار انسان تھے۔انہوں نے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی اور اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو بھی ڈیرہ غازی خان شہر بھیج دیا۔

ڈیرہ غازی خان شہر میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا ننھیال تھا۔ان کا بچپن اسی شہر میں گزرا اور ابتدائی پرورش بھی اسی شہر میں ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ بچپن کے اثرات آج بھی ان کے ذہن پر نقش ہیں۔مثلاً اپنی پیدائش اور بچپن کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہتی ہیں کہ:

> ''میں 5 دسمبر 1973ء کو ڈیرہ غازی خان کی نواحی بستی ''جندانی والا'' میں پیدا ہوئی۔میرا بچپن بہت سنجیدہ گزرا مجھے یاد نہیں کہ کھیل کود میں بھی وقت گزرا ہو بس اتنا یاد ہے کہ میرا میری کزنوں سے مقابلہ رہتا تھا کہ کام کس نے زیادہ کیا ہے یہ میرے والدین کی بہترین تربیت اور قربانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم چاروں بہن بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔''(2)

ابتدائی تعلیم وتربیت:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ابتدائی تعلیم کے لیے گورنمنٹ پرائمری سکول جندانی والا تحصیل وضلع ڈیرہ غازی خان میں داخلہ لیا۔وہ ابھی تیسری جماعت میں زیر تعلیم تھیں کہ ان کے والدین نے دونوں بہنوں کو ننھیال بھیج دیا۔ان کا ننھیال بھی ڈیرہ غازی خان شہر میں تھا۔ان کے والدین کو مکمل یقین تھا کہ شہر میں رہ کر ان کی تعلیم وتربیت بہتر طریقے سے ہو جائے گی۔پرائمری کی تعلیم مکمل ہوئی تو انہوں نے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا اسی طرح ان کے والدین بھی شہر منتقل ہو گئے۔گویا ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جانے

لگی۔میٹرک کا امتحان انہوں نے شہر کے بہترین سرکاری تعلیمی ادارے ''گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 2'' سے پاس کیا۔

اس کے بعد انہوں نے گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین ڈیرہ غازی خان سے ایف۔ایس۔سی کا امتحان پاس کیا اسی دوران سکول اور کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہیں۔انہی سرگرمیوں میں بھرپور نمائندگی کی وجہ سے بہت سے انعامات اور اعزازات بھی حاصل کیے۔اس حوالے سے وہ اپنے انٹرویو میں خود بتاتی ہیں:

> "میں اپنے گاؤں کی واحد لڑکی ہوں جو اس مقام پر پہنچی ہوں۔اس سے قبل گاؤں کی کسی لڑکی کو یہ مقام حاصل نہ ہوا تھا۔"(3)

اس طرح انہوں نے اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کو ابھارا اور ایک ہونہار طالبہ کے طور پر سامنے آئیں اور اپنی محنت کے بل بوتے پر اساتذہ کی نظر میں نمایاں اور منفرد مقام حاصل کیا۔ایف۔ایس۔سی کے بعد انہوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں داخلہ لیا اور 1996ء میں ایم۔بی۔بی۔ایس کا امتحان پاس کیا۔ان کی تعلیم کے بارے میں جاوید احسن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''نجمہ نے ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں سے حاصل کی اور ایف۔ایس۔سی (پری میڈیکل) گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج ڈیرہ غازی خان سے نمایاں پوزیشن کے ساتھ پاس کی۔بعدازاں نشتر میڈیکل کالج ملتان میں داخلہ لیا اور 1996ء میں ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر بن گئیں۔آپ نے نشتر ہسپتال ہی میں دوسال تک گائنی اور میڈیکل کے شعبوں میں ہاؤس جاب کی''(4)

شادی اور اولاد:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شادی 11 اپریل 1997ء کو ان کی اپنی برادری میں ہوئی۔ان کے خاوند غلام فرید کھوسہ ان کے پھوپھی زاد ہیں۔ان کی شادی ان کے قبیلے

کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیرہ غازی خان میں آج بھی مختلف برادریوں میں وڈیرہ شاہی نظام رائج ہے اس لیے وہ اپنی تمام رسمیں قبیلے اور برادری کے مطابق انجام دیتے ہیں یہ لوگ اپنی بیٹیوں کا رشتہ غیر خاندان میں کرنا توہین سمجھتے ہیں اس لیے ان کی شادیاں بھی اپنے ہی قبیلے میں ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے شوہر غلام فرید کھوسہ بھی ایک تعلیم یافتہ انسان ہیں انہوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی۔ ایس۔ سی کیا ہے اور سیمنٹ فیکٹری میں بطور انجینئر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ کھوسہ برادری میں اہم مقام رکھتے ہیں ان کے والدین بھی جدی پشتی زمیندار ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ حمزہ فرید کھوسہ آج کل سول انجینئرنگ کے سلسلے میں امریکہ میں زیر تعلیم ہیں جبکہ عمر فرید کھوسہ یونیورسٹی آف انٹرنیشنل سکول آف میڈیسن'' کرغزستان'' (I.U.K.) سے M.B.B.S کر رہے ہیں۔

ملازمت:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ملتان میں ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد جنوری 1997 میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال ڈیرہ غازی خان میں بطور میڈیکل آفیسر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ والدین کی اچھی تربیت اور ان کی تعلیم میں دلچسپی کی بدولت ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس مقام پر فائز ہوئیں۔ آج تک اس مقام پر ان سے قبل ان کے گاؤں کی کوئی لڑکی نہ پہنچ سکی۔ یہ اعزاز صرف انہی کو حاصل ہے۔

ملازمت کے دوران ہی انہوں نے شہر میں ایک پرائیویٹ ہسپتال بھی کھول لیا جو ''جان سرجیکل ہسپتال'' کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ ہسپتال کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے ان کے لیے ملازمت جاری رکھنا مشکل ہو گیا تھا اس لیے آٹھ سال کی ملازمت کے بعد اپنی نوکری سے استعفیٰ دے کر انہوں نے اپنی ساری توجہ پرائیوٹ ہسپتال پر مرکوز کر لی۔ آج بھی ڈیرہ غازی خان میں اس ہسپتال کا شمار ان ہسپتالوں میں ہوتا ہے جہاں پر ہر بیماری کا علاج ممکن بنایا گیا ہے۔ وہ اپنی ملازمت اور نجی ہسپتال کے حوالے سے بتاتی ہیں:

''ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی جنوری 1997ء کو میں نے ڈیرہ غازی خان D.H.Q. میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ دو ماہ بعد شادی ہوئی تو فوراً ہی پرائیویٹ کلینک شروع کر دیا جو آج ڈیرہ غازی خان میں جان سرجیکل ہسپتال کے نام سے کام کر رہا ہے۔ میں نے گورنمنٹ ہسپتال میں آٹھ سال ملازمت کرنے کے بعد استعفیٰ دے دیا اور ساری توجہ پرائیویٹ ہسپتال پر دی'' (5)

شاعری کا آغاز:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری کا آغاز 1996ء سے کیا۔ شروع میں ڈائری لکھتی تھیں اس طرح ڈائری لکھنے کے شوق نے انہیں شاعری کی طرف راغب کر دیا۔ اپنی شاعری کے آغاز کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

''دن بھر کاموں کے بعد بھی کتاب پڑھنا یا ڈائری لکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یوں سمجھیں کہ ڈائری میری سہیلی بن چکی تھی۔ آہستہ آہستہ ڈائری میں لکھے لفظ شاعری کی صورت اختیار کر گئے۔ یوں تو میں 1996ء سے لکھ رہی ہوں بلکہ اس سے بھی پہلے میری چھوٹی سی کاوش نشتر میڈیکل کالج کے ادبی میگزین کا حصہ بن گئی تھی لیکن میں اپنی پہلی نظم 1996 میں لکھی ہوئی ''ملاقات ا؟خری'' کو قرار دیتی ہوں'' (6)

تصانیف:

لکھنے اور لکھانے کے پہلے دس سال کے دوران ان کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہ آیا۔ 2007ء آپ کسی کانفرنس میں جا رہی تھیں کہ راستے میں حادثے کا شکار ہو گئیں اس طرح ان کو دو ماہ بستر علالت پر گزارنا پڑے یہ بہت کٹھن وقت تھا پھر بھی انہوں نے لکھنے اور لکھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر اپنے علاقے کے ایک سرائیکی شاعر "محمد

رمضان طالب" کی کوششوں اور فرمائشوں کی بدولت ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' جولائی 2007ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اور اب تک ان کی چار کتب "پھول سے بچھڑی خوشبو"، "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں"، "اور شام ٹھہر گئی" اور "پھول خوشبو اور تارہ"، شائع ہو چکی ہیں۔ ایک شعری مجموعہ ابھی تک زیر طبع ہے۔ مستقبل قریب میں ان کی مزید تخلیقات کی بھی آمد متوقع ہے۔ کیونکہ ایک ناول اور ایک شعری مجموعہ ترتیب کے مراحل میں ہیں۔

انہوں نے غزل اور نظم کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ غم دوراں اور غم جاناں کے موضوعات ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں علاوہ ازیں بہت سے دیگر موضوعات کو بھی انہوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی شائع شدہ چار کتب پر تبصرہ، تعارف اور جائزہ پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا پہلا شعری مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو" جولائی 2007ء کو "فرید ادبی سنگت" کے تعاون سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے ''میرے پیارے دوستوں اور اپنوں کے نام جو میرا آغاز بھی ہیں اور انجام بھی'' کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب 160 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شاعرہ نے اپنی ذاتی رائے کے علاوہ کسی اور ادیب یا شاعر کی کوئی رائے شامل نہیں کی جو ان کی اپنی ذات اور شاعری پر اعتماد کا واضح ثبوت ہے۔

"پھول سے بچھڑی خوشبو" مجموعہ نے اپنے منفرد نام اور اسلوب کی وجہ سے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل کی۔ اس مجموعہ سے ڈاکٹر نجمہ شاہین کے ادبی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ کتاب کے بارے میں وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

"پھول سے بچھڑی خوشبو بچھڑی محبتوں کا راکھ ہوا خوشبو، یقین اور بے یقینی کی ایک کیفیت کا، ٹوٹے اور بکھرے خوابوں کا عکس، بکھرے خواب جو زندگی کے لمحے لمحے پر محیط ہو جائیں جو عہد فردا اور عہد رفتہ کے درمیان

ایک پل بن جائیں نہ ٹوٹنے والی زنجیر کی مانند جو ہر لمحہ کو اپنے اندر جکڑ لے۔"(7)

اس مجموعہ کی اشاعت کے بارے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ لکھتی ہیں:

اس کتاب کی اشاعت میں کبھی بھی نہ کرواتی اگر میرے والدین اور گھر والوں کا تعاون نہ ہوتا اور میرے مہربان استاد حاجی محمد رمضان طالب کا اگر تعاون نہ ہوتا۔ میں ان لفظوں کی اشاعت کے حق میں نہ تھی جو میری سوچوں اور جذبوں کا عکس ہے مگر ایک بڑے حادثے نے اس کو منظر عام پر لانے میں مدد میری کی۔(8)

"پھول سے بچھڑی خوشبو" میں شاعرہ نے غزل اور نظم میں اپنے تجربات زندگی کا خوبصورت عکس پیش کیا ہے۔ کچھ نظموں میں بحر کی جدا جدا شکلیں نظر آتی ہیں۔ ان پر نثری نظموں کا گمان ہوتا ہے پس ورق پر دیے گئے بے وزن اشعار ملاحظہ ہوں۔

اجڑے ہوئے لوگوں سے نہ پوچھ داستان زیست
راہ وفا میں ویران راستوں کی دھول بن گئے

سچائی عشق کیا ڈھونڈتا ہے تو اس زمانے میں
وہ وقت اور تھا جب انگارے پھول بن گئے"

مندرجہ بالا اشعار میں قافیہ اور ردیف کا ملانے کی کوشش واضح طور پر دکھائی دیتی ہے جبکہ الفاظ کی ترتیب اور بحر کے موزوں تسلسل میں شاعرہ ناکام نظر آتی ہے۔ "پھول سے بچھڑی خوشبو" میں آزاد نظمیں، نثری نظمیں اور چند غزلیں شامل ہیں۔ اولین شعری مجموعہ ہونے کے سبب شاعرہ کے شعری شعور کی ناپختگی واضح طور عیاں ہے۔ جذبات اور خیالات پورے شعری مجموعہ میں غالب نظر آتے ہیں۔ نظموں میں شاعرہ کے بچپن اور ماحول کی خوبصورت عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ غزلوں میں کلاسیکی اور جدید دونوں اصول کارفرما نظر

آتے ہیں جو مجموعے کی خوبصورتی کی اصل وجہ ہیں۔ایک غزل کچند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کوئی تو ہے مکیں ، اور کوئی تو ہے بسا ہوا
جو دل میں ایک درد ہے، دبا ہوا چھپا ہوا

بدلتے ہوئے موسموں میں گر بھلا دیا مجھے تو کیا
میرا تو شعر ہے تیری یاد میں ڈھلا ہوا

میں ساحلوں پر اس کا نام لکھ رہی ہوں اس لیے
کہ جانتی ہوں میرا لفظ لفظ ہے مٹا ہوا

نظموں کے مقابلے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیں زیادہ عمدہ ہیں۔ڈاکٹر صاحبہ کو نظم گوئی زیادہ پسند ہے۔لیکن میرے خیال میں غزل گوئی پر ان کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے عاصی صحرائی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

"سرائیکی کے ایک بزرگ شاعر "چاچا رمضان طالب" ایک دن میری عیادت کو آئے۔انہوں نے ضد کی کہ میری شاعری کے حصے کو ایک کتاب کی صورت میں آنا چاہیے۔ میں نے اپنی اس کتاب کا نام اپنی ایک نظم "پھول سے بچھڑی خوشبو" سے لیا۔ یوں ایک ڈاکٹر، ایک شاعرہ کے روپ میں سامنے آئی۔"(11)

"پھول سے بچھڑی خوشبو" کو علمی و ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن ڈیرہ غازی خان نے اس کتاب کی باقاعدہ تقریب رونمائی کرائی۔ یہ پہلا قدم علمی و ادبی حلقوں میں شاعرہ کی پہچان کا سبب بھی بن گیا۔اور شاعرہ کی بعد میں آنے والی تخلیقات کی وجہ بھی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دوسرا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ یہ شعری مجموعہ پہلے شعری مجموعہ کے مقابلے میں ضخامت کے اعتبار سے پہلے شعری مجموعہ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔اس مجموعہ نے اپنے منفرد نام کی وجہ سے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی اس کتاب کے انتساب میں اپنی ایک غزل دی ہے۔اس کتاب کا انتساب انہوں نے اشعار سے کیا ہے۔

اسے کہو جب بھی وہ میری تصویر دیکھے
میری آنکھوں میں چھپے گرداب پڑھ لے

میرے بے رنگ ہونٹوں کی خموش زباں کو سمجھے
اور میری ژاویدہ پیشانی مانند کتاب پڑھ لے

میرے اوراق میں بکھرے ہوئے لفظوں کو سمیٹے
گردش دوراں سے جو ملے وہ عذاب پڑھ لے

میرے شب و روز کا محور ہے اس کا ہجر و فراق
دشت جنوں میں جو پائے ہیں وہ اعتاب پڑھ لے

اس کہو کہ میری روح کے قرب کو بھی سوچ
ظلمت دوراں نے جو کیے برباد میرے وہ خواب پڑھ لے
اسے کہو میں اس کے ذکر میں رہوں نہ رہوں
وہ ہے میرا حرفِ طلب میرا انتساب پڑھ لے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا یہ مجموعہ کلام خزینہء علم و ادب لاہور کے اہتمام سے

اپریل 2010ء کو منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ تین سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں ایک حمد،ایک دعا اس کے علاوہ غزلیں،نظمیں شامل ہیں۔اس کتاب کا دیباچہ شاعرہ نے خود تحریر کیا ہے۔ٹائٹل کے پہلے فلیپ پر سعدا؟ شاہ کی رائے تحریر ہے۔جبکہ پس ورق اندرونی حصہ پر شاعرہ کی غزل درج ہے۔اس کے علاوہ پس ورق کے آخری بیرونی حصہ پر بھی ایک غزل کے تین اشعار تحریر ہیں۔

سعدا؟ شاہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"مجھے معلوم ہے کہ نجمہ شاہین شاعری کو اتنا وقت نہیں دے پائیں گی جتنا یہ ظالم مانگتی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ شاعری کو اپنے منفرد اور والہانہ خیالات سے ضرور ہم آہنگ کر دیں گی کیوں کہ شاعری ان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہے۔" (13)

"میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" کا انتساب منظوم صورت میں پیش کیا گیا ہے۔اس منظوم انتساب میں شاعرہ نے بیتی ہوئی یادوں اور بچھڑے ہوئے پیاروں کو ایک دفعہ پھر سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔انتساب میں محبوب کے لیے واضح پیغام ہے کہ وہ اس کتاب کا انتساب ضرور پڑھے۔اس مجموعہ کلام میں نظموں اور غزلوں کے لیے شاعرہ نے الگ الگ گوشے ترتیب دیے ہیں جو قاری کو نظموں اور غزلوں کی تعداد کے تعین میں سہولت فراہم کرتے ہیں۔

"اور شام ٹھہر گئی 2013"ء میں شائع ہوا۔یہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تیسر شعری مجموعہ ہے جسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔انتساب کی عبارت یوں ہے:

"امی،ابو اور عمر حمزہ کے نام جو میرے جیون کا بہانہ ہیں اور ان دکھوں کے نام جو سرمایہ حیات ہیں"(14)

انتساب سے پہلے صفحہ پر مصنفہ کے دو اشعار تحریر ہیں جو ان کی شاعرانہ پختگی کی گواہی دے رہے ہیں۔اشعار کچھ یوں ہیں:

اجنبی شہر کی اجنبی شام میں
زندگی ڈھل گئی ملگجی شام میں

آخری بار آیا تھا ملنے کوئی
ہجر مجھ کو ملا وصل کی شام میں

اس مجموعہ کلام میں حمد،نعت،سلام،غزلیں،نظمیں،نثری نظمیں اور گیت شامل ہیں۔اس کتاب میں شاعرہ نے جن ادیبوں اور شاعروں کے مضامین کو شامل کیا ہے ان میں امجد اسلام امجد،بشریٰ رحمٰن،شاکر حسین شاکر،رضی الدین رضی،قمر رضا شہزاد اور جاوید احسن کے نام شامل ہیں۔

انہوں نے خود بھی" کچھ سوچیں،کچھ باتیں آپ سے" کے عنوان سے اپنے اور کتاب کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے مطابق:

"پھول سے بچھڑی خوشبو"اور"میں آنکھیں بند رکھتی ہو" کیبعد سوچا تھا کہ شاید سفر کٹ گیا مگر یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں۔تنہائیوں ،محرومیوں،محبتوں اور جدائیوں کے دکھ کہیں انت ہی نہیں ٹھہرتا ان کا۔"(16)

لفظ شام تو ویسے ہی اداسی اور ہجر کی علامت ہے اسی مناسبت سے ان کا یہ مجموعہ بھی قارئین شعر و ادب میں خاصا مقبول ہوا۔یہ کتاب 176 صفحات مشتمل ہے۔حسنین ساحر اس کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"اور شام ٹھہر گئی’’ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا حال ہی میں منظر عام پرا؟ نے والا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو حمد،نعت،غزلوں اور گیتوں پر مشتمل رنگا رنگ خیالات کا عکاس ہے۔ چونکہ ان کی غزل معروضی حالات کا صاف

شفاف آئینہ ہیاس لیے اس کے بین السطور خود اپنی زندگی اور معاشرتی اقدار کی سچی اور منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔"(17)

"اور شام ٹھہر گئی" کے موضوعات میں محبت، ہجر و فراق، وصال کی خواہش، دیہاتی زندگی سے عقیدت، غمِ دوراں کی تڑپ اور غمِ جاناں شامل ہیں۔فن کے حوالے سے بغور جائزہ لیا جائے تو سوائے چند نثری نظموں کے شاعرہ نے خوبصورت شاعرانہ نمونے پیش کیے ہیں۔ پہلے دو مجموعوں کی نسبت تیسرے مجموعہ کلام میں شاعرانہ پختگی اور نکھار واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔غزلوں میں ذاتی واردات یعنی داخلیت کا راج نظر آتا ہے جبکہ نظموں میں خارجیت کا پہلو نمایاں ہے۔اس مجموعہ کلام کے حوالے سے نامور شاعر و نقاد امجد اسلام امجد یوں رقمطراز ہیں:

"ان (ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ) کی شخصیت ااور ماحول کے مخصوص حوالے کم و بیش ٹھیک ٹھاک ہیں۔البتہ جہاں تک ہنر کا معاملہ ہےاس میں ابھی انہیں مزید محنت کی ضرورت ہے کہ شاعری کسی مخصوص وزن اور بحر میں الفاظ کو پرونے کا نام ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق موضوع کی مناسبت سے بہترین الفاظ کے چناؤ سے بھی ہے۔"(18)

"حنائی رنگ، غنائی آہنگ" کے عنوان سے تحریر کردہ دیباچے میں بشریٰ رحمٰن ، نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کو کچھ اس انداز میں خرج تحسین پیش کرتی ہیں۔

"ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی دوسری خوبی اس کا شیریں لب و لہجہ ہے، اس کی مٹھاس ہے۔خواجہ غلام فرید کی دھرتی کے اندر ویسے بھی بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ نجمہ جب بات کرتی ہے تو اس کے لہجے کی شیرینی ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے اور جب شعر کہتی ہے تو کلبلاتے، تڑپتے، مچلتے اور سلگتے جذبوں کے اوپر شہد کا چھڑکاؤ کرتی جاتی ہے۔وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے لیے سکھ اور سکون کی خیرات مانگنے نکلی ہے وہ چاہتی ہے کہ کسی آنکھ میں آنسو نہ ہوں، کوئی مانگ نہ اجڑے، کوئی دل نہ ٹوٹے،

نظامِ ہستی میں بلندی، پستی، اونچ نیچ نہ ہو۔"(19)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں عشق ایک پاکیزہ اور زندگی کو با مقصد بنا دینے والا جذبہ ہے۔عشق کی یہ پاکیزگی اور مقصدیت ہی ان کو عشق و محبت پر شاعرانہ اظہار کرنے کے لیے مجبور کرتی ہوئی نظر ?تی ہے۔عشق و محبت کی پر پیچ وادیوں اور مسائل کو انہوں نے جا بجا اپنے شعری تجربے میں سمویا ہے۔چند مثالیں دیکھیے۔

"سرحدیں پھلانگ کر عقل و شعور کی
راہِ وفا میں خود سے بھی انجان ہو گئی

جس نے مجھے عطا کیا یہ خامشی کا گیت
اس کی صدا ہی اب مری پہچان ہو گئی

"یوں تو دنیا کے لیے ہم نے بہت کچھ پا لیا
بعد اس کے تھا اگر کچھ تو بے کار تھا

ایک چاہت کب تلک لڑتی وہاں شاہین بس
جس طرف بھی دیکھیے مصر کا بازار تھا

"پھر مصر کے بازار میں نیلام ہوا کیوں
اے عشق بتا تیرا یہ انجام ہوا کیوں

اے عشق فلک پر تجھے لکھا جو خدا نے
پھر تیرا مقدر بھلا ابہام ہوا کیوں

جو تیری محبت کو سمجھ ہی نہیں پایا
شاہین یہ دل اس کے بھلا نام ہوا کیوں

"اب تو وحشت ہی ٹپکتی ہے ہر اک منظر سے
سوز ہجراں کی تپش سے سلگتی ہیں آنکھیں

درد کی شدت اور بڑھی تھی شہرِ وفا کی شاموں میں
اور ویرانی بیٹھ گئی تھی ان اکھیوں کے پانی میں

ملتان کے نامور شاعر رضی الدین رضی نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری اور فن کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اب ڈیرہ غازیخان میں ہی نہیں بلکہ اپنے پورے وسیب کی پہچان بن چکی ہیں اک مسیحا کی حیثیت سے بھی اور ایک شاعرہ کے طور پر بھی۔ وہ دن رات مسیحا بن کر خواتین کے زخموں پر مرہم رکھتی ہیں۔ انکے دکھ سنتی ہیں اور ان دکھوں کا مداوا بھی کرتی ہیں۔ پھر انھی دکھوں کو قرطاس پر منتقل بھی کر دیتی ہیں۔ انکی شاعری عورت کے دکھوں کی کہانی ہے۔"(25)

2016ء میں ان کا چوتھا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ جس کا نام "پھول، خوشبو اور تارہ" ہے۔ جسے الحمد پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا۔ یہ کتاب 164 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کلام میں نظموں کی نسبت غزلیں زیادہ تعداد میں ہیں۔ اس مجموعہ میں شاعرہ کے فن میں پختگی اور نکھار پہلے تین مجموعوں کی نسبت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ شاعرہ کی غزلوں میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا سنگم موجود ہے۔ مجموعہ کلام کے آخر میں پذیرائی کے عنوان سے مختلف ملکی و بین الاقوامی ادباء وشعراء کی ماہرانہ آراء کو کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ جس میں شاعرہ کے فن وفکر کے حوالے سے ان کے شعری محاسن پر بے

لاگ تبصرے کیے گئے ہیں۔ شاعرہ نے "سوچ کا سفر" کے عنوان سے کتاب کا دیباچہ خود تحریر کیا ہے۔ دیباچے کے علاوہ اس کتاب کا انتساب بھی ہمیشہ کی طرح لائقِ توجہ اور لاجواب ہے۔ انتساب کی عبارت ملاحظہ کیجیے۔

"اپنوں اور غیروں کے ان زخموں کے نام جو جلا بخشتے ہیں اور قلم کی سیاہی بن کر لفظوں کی صورت کاغذ پر اترتے ہیں اور شاعری بنتے ہیں۔ اور اس وحدہ لاشریک کے نام جس کا عشق ہی اصل عشق ہے، سچا اور کھرا عشق۔"(26)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کے نزدیک بھی عشق مجازی، عشق حقیقی تک رسائی کا وسیلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ اب وہ پردہ مجاز کو ہٹا دینے اور سچے اور کھرے عشق کی متلاشی نظر آتی ہیں۔ یہی سچا اور کھرا عشق اب ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ کیونکہ یہی عشق ان کی شاعری کو بھی دوام اور آفاقیت بخشے گا۔ اس کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور بشریٰ رحمٰن کی آراء درج ہیں۔ کتاب کے پس ورق پر شاعرہ کی نثری نظم "عجیب ہوتی ہے یہ محبت" موجود ہے۔ اس نظم کے بائیں طرف خود مصنفہ کی خوبصورت تصویر پس ورق کا حصہ ہے۔ اس مجموعہ کے آغاز میں نعت اور سلام لکھے گئے ہیں جو غزل ہیئت میں ہیں جو کہ شاعرہ کی غزل پر مضبوط گرفت کا ثبوت ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

"میری اجڑی لمبی رات سئیں
کب بدلیں گے حالات سئیں

مرا عشق ہی مذہب مسلک ہے
اور عشق ہے تیری ذات سئیں

"ہمیں پھر سے عطا ہو سرفرازی یا رسول ا??
جواں جذبوں میں ہو روح حجازی یا رسول اللہ

ہمیں گھیرا ہوا ہے دشمن نے چار جانب سے
کہاں ہیں ملتِ بیضاء کے غازی یا رسول

"بنام شاہِ شہیداں ، سلام کیا لکھوں
حقیر لفظ ہیں مدحِ امام کیا لکھوں

دہک رہے ہیں ہر اک سمت دھوپ کے شعلے
مسافرانِ وفا کا قیام کیا لکھوں(29)

نجمہ شاہین کھوسہ کے چوتھے شعری مجموعہ کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعرہ نے ہجر وفراق، وصال کی خواہش، حسین یادوں، انسانی ہمدردی اور رنج والم وغیرہ کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔شاعرہ کی نظموں کا جائزہ لیں تو شاعرہ ماضی کی پرانی یادوں میں کھوئی ہوئی اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور قصوں اور حکایتوں کو قرطاس پر اتارتی دکھائی دیتی ہے۔ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اپنے مضمون "محبت کی شاعرہ "میں ان کی نظم گوئی پر کچھ اس انداز سے تبصرہ کیا ہے۔

"ان (ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ) کی کچھ نظمیں یقیناً بڑی نظمیں ہیں جنہیں سراہا جانا چاہیئے۔محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔اس میں صوفیانہ عشق کی آسمان بدست بلندی سے لے کر تعشق اور ہوس کی تحت الثر اتک شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ نجمہ شاہین کی نظموں میں یہ جذبہ ان دو بے نہایت حدود کے درمیان اس سطحِ مرتفع پر قائم ہے جسے ہم من وتو کا علاقہ قرار دے سکتے ہیں۔اس ''من وتو "میں "، "من "تو یقیناً شاعرہ کا واحد متکلم ہے۔ وہ خود ہے یا اس کی انا ہے۔لیکن "تو" محبوب بھی ہوسکتا ہے دوست بھی ہو سکتا ہے، نامہربان آسمان بھی ہوسکتا ہے اور ظالم حاکم بھی"۔(30)

اس کتاب کی اہمت اور مقام کے حوالے سے بشریٰ رحمٰن رقمطراز ہیں۔

"ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی چوتھی تخلیق منظر عام پر لائی ہیں۔ پھول خوشبو اور تارہ" میں" پھول "ان کی اپنی ذات ہے،"خوشبو "ان کے افکار ہیں اور" تارہ "تقدیر کا استعارہ ہے۔تقدیر جو ازل سے لکھی ہوئی ملتی ہے اور تدبیر جو ہمیشہ اس سے الجھتی ہی رہتی ہے۔ پھول کتنا ہی دل آویز کیوں نہ ہو اپنی خوشبو پر اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ نجمہ خوشبو کی طرح ایک بے چین سی روح ہے۔اسے سمجھ میں نہیں آرہا کہ تقدیر کا رانجھا کیسے راضی ہوگا شعر سنانے سے یا نشتر چلانے سے۔"(31)

"اجنبی مسافر کے نام "، "اسے عید مبارک کہتی ہوں "، "عید حیران ہے "،" تمہارا بھی یقین ٹوٹے "، "ایک بختوں والے کا قصہ "،"وہ کہتے ہیں ہمیں لکھو "اور " مجھے جانا ہے جاناں طرف"شاعرہ کی مشہور عشقیہ نظمیں ہیں۔ان نظموں میں شاعرہ کے عشقیہ جذبات کا واضح اظہار ملتا ہے۔ مذکورہ بالا نظموں میں شاعرہ نے خود کو نظم کی بہترین شاعرہ کے طور پر منوایا ہے۔اس کے علاوہ غزلوں میں بھی محبت کے سچے اور کھرے جذبات کی بھرپور عکاسی ان کی شاعری میں پیش کی گئی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ نظرِ قارئین ہیں۔

جرم بس یہ تھا کہ منزل کا تعین کر لیا
پھر سدا رہنا پڑا ہم کو سفر کے درمیاں

پھول، کلیاں، خوشبوئیں، مہکتے ہوئے راستے
خواب ہو کر رہ گئے ہیں بام و در کے درمیاں

جو میری مانگ میں کچھ زخم جگمگاتے ہیں
کسی کے عشق میں مجھ کو ملی یہ دولت ہے

زمیں ملے کہیں ہمیں ، کہیں تو آسماں ملے
دکھوں کی دھوپ میں شجر کوئی تو مہرباں ملے

ترے فراق میں جیئے ترے فراق میں مرے
چلو یہ خواب ہی سہی وصال کا گماں ملے

مندرجہ بالا اشعار میں شاعرہ کی فنی پختگی اور نکھار ان کے سچے عشق کا مظہر ہے۔ مجاز سے حقیقت تک کے اس عشقیہ سفر نے نا صرف شاعرہ کے فکر و تخیل کو جلا بخشی ہے بلکہ شاعرہ کے فن شاعری کے ساتھ عشق کو بھی سرفرازی عطا کی ہے اسی لیے عشق کے موضوعات کے بیان پر شاعرہ کو مکمل گرفت ہے۔ رضی الدین رضی "ہجر اور بلندی کا استعارہ" کے عنوان سے اس کتاب کے لیے لکھے گئے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"پھول، خوشبو اور تارہ'' ہجر کا استعارہ ہے۔ ہجر جو زندگی بھی ہے اور موت بھی، ہجر جو روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، ہجر جو بے سکون بھی کرتا ہے اور اطمینان بھی بخشتا ہے۔ یہی بندگی ہے اور زندگی ہے۔ بہت سی تشنگی ہے اور یہی آسودگی۔ یہی خواب ہے اور یہی سراب۔ یہی حقیقت ہے اور یہی گماں۔ اور جب ہجر آپ کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے تو پھر حقیقت اور گمان کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور ہجر ہی آپ کی پہچان بن جاتا ہے جیسے نجمہ شاہین کھوسہ کی پہچان بن گیا ہے۔"(35)

"پھول، خوشبو اور تارہ" شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل کر رہا ہے اور ان کو ایک حساس اور رومانوی شاعرہ کے طور پر متعارف کرا رہا ہے۔ بڑی بڑی ادبی شخصیات ان پر مضامین لکھ رہی ہیں۔ کہیں ان کو محبت کی شاعرہ کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے تو کہیں ان پر عورت اور عورت ہے کا گمان کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک خوبصورت شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ بڑی بڑی ساحری آنکھیں، کشادہ پیشانی، اور جاذبِ

نظر کتابی چہرہ رکھنے والی شاعرہ ہیں۔ اور ہر وقت ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رقصاں رہتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری ان کی شخصیت سے الگ نہیں ہے۔ ان کی شخصیت ان کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شخصیت سادگی اور حسن توازن کی عمدہ مثال ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت حسن اخلاق، شائستگی، انسانیت، خلوص، وفا، چاہت، محبت اور زندگی کے لیے جہدِ مسلسل اور بلند عزم و استقلال جیسے اعلیٰ انسانی افکار و عناصر سے مل کر بنی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ انتہائی وفادار ہیں۔ منافقت اور ہر قسم کی گروہ بندی انہیں سخت ناپسند ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت کے بارے میں سعیدہ افضل اپنے مضمون "اے کہ تو عکسِ نو بہار" میں لکھتی ہیں۔

"شاعری کے سفر میں وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بولنے والی نرم خو جس کی شخصیت میں قرینہ طریقہ، سلیقہ اور حسنِ توازن بدرجہ اتم موجود ہے اور یہی اوصاف اس کی شاعری میں ہنرمندی کے ہیں۔ میں اس کی شاعری کو اس سے جدا نہیں دیکھتی۔"(36)

صبح خیزی ڈاکٹر صاحبہ کے معمولات میں شامل ہے۔ رات کو دیر سے سونا ان کے پیشے کا تقاضا ہے۔ اتنے مشکل پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے جذبات کو بہت باوقار طریقے سے مصرعوں کی صورت میں ایسے ڈھالتی ہیں جیسے کوئی مصور کسی پیکر کو تراشتا ہے۔ ان کے لب و لہجہ سے سادگی جھلکتی ہے۔ ان کا انداز گفتگو، نشست و برخاست، سادگی کا آئینہ دار ہے۔'' اے کہ تو عکسِ نو بہار'' میں سعیدہ افضل ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے متعلق لکھتی ہیں۔

"نجمہ تم اتنی مصروفیت میں شاعری کا جوکھم سر لیتی ہو؟ جواب ملا کہ۔۔۔ آپا بس لکھ لیتی ہوں، کوشش نہیں کرتی، اشعار خود بخود ذہن میں آ جاتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ میں عشاء کی نماز ختم کر لینے

کے بعد مصلے پر بیٹھی رہتی ہوں، پھر سوچیں آتی رہتی ہیں اور میں ان کو اشعار کی صورت میں لکھتی جاتی ہوں۔"(37)

ڈاکٹر صاحبہ کی شخصیت عاجزی، انکساری اور نرم خوئی اور حسن اخلاق جیسے اوصاف کا حسین مرقع ہے۔ ان سے جو ایک بار ملتا ہے ان کا دیوانہ ہو جاتا ہے، ان کے گن گانے لگتا ہے۔ ڈاکٹری کا پیشہ خدمت کا پیشہ ہے۔ ایک ڈاکٹر کی زندگی مصروف زندگی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی شخصیت کا ایک خاص وصف ہے کہ ان کو اپنے پیشے سے عشق ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ کی قوت برداشت، متحمل مزاجی اور ان کا صبر ان کو دوسروں سے ممتاز اور منفرد بناتا ہے۔ سادگی اور منفرد سوچ ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اگر ہم ڈاکٹر صاحبہ کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے بات کریں اور ان کی شخصیت کو پرکھیں تو بطور ایک بیوی، ایک ماں ان کے انداز دلکش مشرقی روایات ہیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نرم دل، سادہ اور سچی ہونے کے ساتھ ساتھ سخی بھی ہیں۔ وہ معاف کرنے کا وسیع ظرف رکھتی ہیں۔ بنا بتائے ضرورت مندوں کی مدد کرنے والون میں سے ہیں۔ سعیدہ افضل کے مطابق:

"آپا۔۔۔۔ ایک صحافی جو کہ نامور اخبار سے وابستہ ہیں انہوں نے مجھے فون کر کے انٹرویو کے لیے وقت مانگا اور ساتھ ہی اپنی ایک عزیزہ کی شادی کے لیے امداد بھی مانگ لی۔ کسی کی بچی کی رخصتی میں مدد کرنا نیکی ہے یہ سوچ کر میں نے ان کو دس ہزار روپے بھجوا دیے مگر انٹرویو کا عندیہ نہیں دیا۔ ا? ج پھر ان صاحب کا فون آیا تھا اور انٹرویو کے ساتھ ساتھ مزید رقم کا مطالبہ کیا۔ ان حضرت سے کیسے جان چھڑاؤں؟ میں نے کہا نجمہ کہو تو میں ان کے باس کو بتاؤں؟ تو ان کی نوکری چلی جائے گی۔ کسی کی نوکری جاتی ہے تو نہ کہیے گا۔ آپا، میں کسی کو بے روزگار نہیں کرنا چاہتی۔ شاید بال بچے دار ہو۔ میں اب اس کا فون نہیں اٹھاؤں گی۔"(38)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بیک وقت شاعرہ اور ڈاکٹر ہیں۔ شاعری پر اثر لفظوں کی

بازی گری ہے۔ اشاروں کنایوں میں مبہم انداز میں بات ہوتی ہے۔ سب کچھ کہہ کر بھی بہت کچھ مبہم رہ جاتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹری میں انسان کو بہت زیادہ حاضر دماغی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ڈاکٹری اور شاعری دو متضاد چیزیں ہیں۔ وہ مسیحائی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی دنیا میں بھی اپنا نام پیدا کر رہی ہیں۔ ڈاکٹری اور شاعری کے علاوہ وہ خواتین کے حقوق کے لیے اس معاشرے کے اندر رہ کر کام کر رہی ہیں جہاں عورت کو وہ مقام قطعاً نہیں دیا جاتا جس کی ماں، بہن اور بیٹی حق دار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایسی خواتین کی آواز بن کر ابھری ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ اپنی شاعری کے ذریعے خواتین کے حقوق کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ وہ مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے اس قدر لگاؤ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں۔ انہیں سماج کے کچلے ہوئے مظلوم عوام سے ہمدردی ہے۔ ان کی دلی خواہش ہے کہ ہر انسان کو جینے کا پورا حق حاصل ہو۔ وہ ایک مثالی معاشرہ تشکیل کرنے کی خواہش مند ہیں۔ جس میں جھوٹ، منافقت اور ریاکاری کی گنجائش نہ ہو۔

اعزازات، مشاغل اور دیگر ادبی خدمات:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو مختلف اوقات میں ادبی حلقوں اور ادب نواز شخصیات نے اعزازات و انعامات سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کو ان کی خدمات کے اعتراف میں درج ذیل ایوارڈز سے بھی نوازا گیا ہے۔

1۔ خوشبو رائٹرز ایوارڈ
2۔ بینظیر بھٹو ایوارڈ
3۔ درشن میگزین ایوارڈ
4۔ جنوبی پنجاب لٹریری ایوارڈ
5۔ خادم ریختہ ادبی ایوارڈ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو درج ذیل مختلف اداروں کی ممبر شپ بھی دی گئی ہے۔

1۔ ممبر سکروٹنی کمیٹی اکیڈمی ادبیات اسلام آباد

2۔ ممبر آرگنائزیشن کمیٹی اکیڈمی آف لیٹر ملتان

3۔ ممبر نارکوٹکس کمیٹی ڈیرہ غازی خان

4۔ بورڈ آف مینیجمنٹ ووکیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ڈیرہ غازی خان

5۔ ایگزیکٹوممبر آف المنظور آئی ٹرسٹ ڈیرہ غازی خان

6۔ ممبر آف کامرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ڈیرہ غازی خان

7۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کو جنوبی پنجاب خواتین ونگ کی چیئر پرسن بھی بنایا گیا۔

ان کو PTV کے ادبی Poet پروگراموں میں مدعو کیا جاتا ہے۔انہیں PTV نے Outstanding کی کیٹیگری میں رکھا ہے۔

ProductionLee کے تعاون سے پاکستان میں ان کی دس غزلیں اہم البم میں ریلیز کی گئیں جنہیں صائمہ جہاں، انور رفیع، اور حنا نصرا? نے اپنی آواز دی۔UK کی ایک بڑی کمپنی HiTec نے بھی یہ البم ریلیز کیا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا کلام پاکستان کے تمام قومی اخبارات نوائے وقت، جنگ اور بین الاقوامی ریڈیو پروگراموں میں باقاعدگی سے Air On لیا جاتا ہے۔انہوں نے اپنے علاقے میں خواتین کی پہلی ادبی تنظیم ''آنچل'' بنائی۔جس کی روح رواں اور IMP وہ خود ہیں۔اس ادبی تنظیم کے تحت وہ اس علاقے میں متعدد ادبی پروگرام کرواچکی ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمہ جہت شخصیت ہیں۔طب کے میدان کے ساتھ ساتھ انہیں دوسرے شعبوں میں بھی عزت و سرفرازی سے نوازا جا رہا ہے۔ وہ دور جدید کی ایک قابل تحسین شاعرہ ہیں اور خوبصورت شخصیت کی مالک ہیں۔اس بناء □ پر وہ اپنوں اور غیروں میں یکساں مقبول و معروف ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔خدا کرے زور قلم اور زیادہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی زندگی کے ابتدائی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے رضی الدین رضی لکھتے ہیں:

"وہ بچی (نجمہ شاہین کھوسہ) جب پیدا ہوئی تو اس کے والد نے اس کا نام نجمہ شاہین رکھا تھا۔ یہ نام بلندی کی علامت ہے۔''نجمہ'' ایک چمکتا ستارہ اور ''شاہین'' جو بہت بلندی پر پرواز کرتا ہے۔اس کے والد جان محمد کھوسہ نے یہ نام ممکن ہے لاشعوری طور پر ہی رکھا ہو لیکن آج نجمہ شاہین واقعی بلندی پر ہیں اور اس مقام تک پہنچنے میں بنیادی کردار انکے والد کا ہے کہ اس معاشرے میں کسی بھی عورت کو عملی زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سہارا شادی سے پہلے اس کا باپ اور بھائی شادی کے بعد اس کا شوہر بنتا ہے۔جن خواتین کو یہ سہارا میسر نہ ہو ان میں کتنی ہی صلاحیت کیوں نہ ہو وہ پرواز نہیں کرسکتی نجمہ شاہین کو شادی سے پہلے اپنے والد جان محمد کھوسہ اور شادی کے بعد شوہر غلام فرید کھوسہ کا سہارا میسر آیا تو ان کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں دور ہو گئیں۔"(39)

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری ایک مستند اور منجھی ہوئی شاعرہ کی شاعری ہے۔ان کے آخری مجموعہ کلام'' پھول، خوشبو اور تارہ'' کی اشاعت اور ادبی حلقوں میں پذیرائی کے بعد ان کو پاکستان کی مشہور ان شاعرات کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے جنہوں نے محنت اور ریاضت سے اپنا ایک مقام بنایا۔ کیونکہ ان کا یہ آخری مجموعہ کلام فکر اور فن کے حوالے سے ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ان کے اس مجموعہ کلام میں فکر و فن کے حوالے سے کوئی ایک بھی مصرعہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے ان کے فکر و فن کے حوالے سے سوال اٹھتا ہو۔خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔۔۔

حوالہ جات

1۔ مقالہ نگار کی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (ڈیرہ غازی خان) سے ٹیلی فون پر گفتگو، 26 مئی 2021 بوقت رات 10:30 منٹ۔
2۔ ایضاً۔
3۔ ایضاً۔
4۔ جاوید احسن (رائے)، مشمولہ ،اور شام ٹھہر گئی از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013)، ص 12۔
5۔ مقالہ نگار کی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (ڈیرہ غازی خان) سے ٹیلی فون پر گفتگو، 26 مئی 2021 بوقت رات 10:30 منٹ۔
6۔ ایضاً۔
7۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو (ڈیرہ غازی خان: فرید ادبی سنگت، 2007)، ص،2۔
8۔ ایضاً، ص 10۔
9۔ ایضاً، ص 11۔
10۔ ایضاً، پس ورق۔
11۔ عاصی صحرائی، انٹرویو نگار، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا انٹرویو مطبوعہ ''یو کے ٹائمز'' لندن، ص 6۔
12۔ نجمہ شاہین، ڈاکٹر، میں آنکھیں رکھتی ہوں (لاہور: خزینہ علم وادب 2010)،

ص 5۔
13۔ سعد اللہ شاہ (فلیپ)، مشمولہ، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (لاہور: خزینہ علم وادب، 2010)۔
14۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، اور شام ٹھہر گئی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013)، ص 5۔
15۔ ایضاً، ص 5۔
16۔ ایضاً، ص 5۔
17۔ حسنین ساحر (رائے)، مشمولہ، فیملی میگزین (لاہور: 22 جون 2008)۔
18۔ امجد اسلام امجد (رائے)، مشمولہ، اور شام ٹھہر گئی، از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، ص 15,16۔
19۔ ایضاً، ص 18۔
20۔ ایضاً، ص 126۔
21۔ ایضاً، ص 135۔
22۔ ایضاً، ص 114۔
23۔ ایضاً، ص 84۔
24۔ ایضاً، ص 81۔
25۔ ایضاً، ص 25,26۔
26۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 2016)، ص 4۔
27۔ ایضاً، پس ورق۔
28۔ ایضاً، ص 5۔
29۔ ایضاً، ص 17۔

30۔ ایضاً،ص139,140۔
31۔ ایضاً،ص141۔
32۔ ایضاً،ص72۔
33۔ ایضاً،ص103۔
34۔ ایضاً،ص116۔
35۔ ایضاً،ص144۔
36۔ ایضاً،ص150۔
37۔ ایضاً،ص147۔
38۔ ایضاً،ص150۔
39۔ رضی الدین رضی (رائے)،مشمولہ، اور شام ٹھہر گئی از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، ص23۔

باب دوم

اردو شاعری کی روایت

(الف) جدید اردو نظم کی روایت
(ب) جدید اردو غزل کی روایت

(الف) جدید اردو نظم کی روایت:

ایک خیال یا مضمون کو کسی بھی شعری ہیئت میں باندھنا نظم کہلاتا ہے۔نظم کو کسی بھی ہیئت میں کہا جا سکتا ہے۔نظم کے معانی پرونے اور یکجا کرنے کے ہیں۔

اصطلاحی لحاظ سے دیکھا جائے تو نظم ادبی اظہار کے اس پیکر کو کہا جاتا ہے جسکی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف ہیئتی اور معنوی تعریفیں کی جاتی رہی ہیں۔اردو ادب کی کلاسیکی تنقید میں نظم سے مراد جملہ شاعری لی جاتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:۔

"دراصل قدیم شعراء اور نقادوں کے ہاں نظم کا کوئی تصور نہ تھا۔انہوں نے پورے شعری سرمائے کو ہیئت کے لحاظ سے غزل،قصیدہ،مثنوی،قطعہ اور رباعی وغیرہ کے نام سے تقسیم کر رکھا تھا۔"(1)

جس طرح نظم میں ربط وتسلسل کا پایا جانا ضروری ہے اسی طرح اس کا موضوعاتی ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔اس لیے ہر نظم کا کوئی نہ کوئی عنوان ضرور ہوتا ہے۔نظم کی صنف اردو شاعری میں مغرب سے آئی بلکہ اردو شاعری میں ہیئت اور تکنیک کے جس قدر بھی

تجربے ہوئے ہیں وہ عالمی ادب کی تقلید میں ہوئے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر شوکت سبز واری رقمطراز ہیں:

اردو شاعری میں اب تک ہیئت کے جو تجربے ہوئے ہیں وہ اردو میں بہت نئے سہی حقیقت میں نئے نہیں۔ فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ زبانوں کے ادب میں پہلے یہ تجربے کیے جا چکے ہیں۔اردو شعراء □ نے ان ہیئتوں کو ان زمانوں کے ادب سے لے کر اردو میں رواج دیا۔ "
(2)

ادب کی ہر صنف کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص ہیئت ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر صنف دوسری صنف سے جداگانہ اور انفرادی اہمیت رکھتی ہے۔بنیادی طور پر اردو شاعری گیت، غزل اور نظم پر مشتمل ہے۔تاہم اردو نظم میں بعض ایسی خوبیاں ہیں جو اسے گیت اور غزل کے مقابلے میں نمایاں کرتی ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

" گیت "، " کل '' کے بدن میں "جزو" کے ابتدائی تحرک کا غماز ہے اور غزل "جزو" اور " کل " کے عارضی فراق کی نشاندہی کرتی ہے لیکن نظم "جزو" کی اس حیثیت سے متعلق ہے جب وہ نشوونما پا کر خود ایک " کل " میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"(3)

وہ اپنی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" میں اس نقطہ نظر کو اپناتے نظر آتے ہیں کہ گیت اس وقت جنم لیتا ہے جب عورت کے دل میں محبت کے بیج کو قبولیت کا شرف حاصل ہو جاتا ہے جبکہ جذبے اور تخیل کا خوبصورت امتزاج غزل کو جنم دیتا ہے۔نظم کا افق گیت اور غزل دونوں سے نسبتاً زیادہ وسیع ہے۔نظم جہاں معاشرے کی عکاسی کرتی ہے وہاں فرد کی شخصیت کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہے۔غزل کے ہیئتی ڈھانچے میں قافیہ اور ردیف کی پابندی بھی شاعر کے اظہار کو محدود کر دیتی ہے۔نظم غزل جیسی تنگ دامانی سے آزاد ہے اسی لیے مرزا ریاض نظم کی اہمیت بارے لکھتے ہیں:

"سر سید نے بے کار زندگی کو ایک مشن دیا لہٰذا نظم معرض وجود میں آئی ایک جماعتی منشور پیدا ہوا۔زندگی اب حالات کے مجموعوں کا نام نہ تھی عہد کا نام تھا اور عہد کو نظم ہی اپنی گرفت میں لے سکتی ہے۔عشق و عاشقی، ہجر و وصال اور انفرادی آرزوؤں کی شکست و ریخت کا عمل جاری ہو گیا۔آزادی، تہذیب و تمدن، ادب و تاریخ اور شکست و ریخت کا کینوس بڑا وسیع ہو گیا تھا۔ اسے فوکس میں لانے کے لیے مختلف میڈیم کی ضرورت تھی اور یہ میڈیم صرف نظم ہی بن سکتی تھی۔"(4)

برصغیر میں بیسویں صدی میں نظم کے موضوعات حقیقی زندگی کی تصویر کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے مقصدی نقطہ نظر کی ترسیل میں نظم ہی نے سب سے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔۔نظم نے اس دور میں جنم لیا جب انسان کا تعلق اپنے معاشرے سے کٹ چکا تھا۔نظم کا شاعر فرد اور معاشرے کے درمیان رہ کر شاعری کرتا ہے۔نظم شاعر کے مسائل، اسکی مجبوریوں اور اس کے معاشرے سے کٹ جانے کی وجوہات کی عکاسی کرتی ہے جیسے کہ فیض کی نظم "مجھ سی پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" دراصل نظم کے شاعر کے نزدیک حقائق کی اہمیت ہوتی ہے۔نظم کے محبوب کا تعلق ہماری ہی زمین سے ہوتا ہے۔وہ غزل کے محبوب کی طرح نایاب نہین ہے۔ڈاکٹر وزیر ?غا لکھتے ہیں:

"محبت کے ضمن میں نظم ایک خاص محبوب پر اپنی تمام تر توجہ مرتکز کر دیتی ہے اور یوں محبوب کی انفرادیت کو ابھار دیتی ہے۔گویا جس طرح نظم بنیادی طور پر انفرادیت کے رجحان کی پیداوار تھی اسی طرح نظم کا محبوب بھی گوشت پوست کی منفرد ہستی ہے۔"(5)

اگر تاریخی روایت کے حوالے سے دیکھیں تو غزل کی طرح نظم کی ابتداء □ بھی دکن سے ہوئی۔

"جہاں تک اردو نظم کی ابتداء □ کا تعلق ہے غزل کی طرح اردو نظم کا آغاز

بھی دکنی دور سے ہوتا ہے۔"(6)

دکنی دور میں نظم زیادہ تر مذہبی رسومات، داستان گوئی اور قصیدہ گوئی کے رجحانات کے اظہار میں کہی گئی۔ نظم گوئی کی باقاعدہ تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ نظم گوئی کا باقاعدہ ا?غاز نظیر اکبرا?بادی سے ہوا اور نظیر اکبرا?بادی کو عوامی شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ ہزاروں نظموں کے خالق نظیر اکبرآبادی کی نظموں کو ان کے دور میں تو کوئی خاص پذیرائی نہ مل سکی لیکن عہد سرسید میں ان کی نظموں کو زندہ کیا گیا۔ اس طرح اردو نظم کی تاریخ پختہ ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

"اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں جو شخص اردو شاعری کو امراء کے دیوان خانوں، اعلیٰ مجلسوں، اور ادبی خواص کے حلقوں سے نکال کر لوک معاشرت کے زندہ منظر نامہ میں لے آیا وہ نظیر ہی تھا جو نیا آباد کار تھا۔ نظیر کی تخلیقی قوت نے اردو شاعری کے اس روایتی قلعہ پر ضرب لگائی جو فارسی شاعری کی روایات پر کھڑا تھا اور یہاں غزل، مثنوی اور قصیدے جیسی اصناف سے ہٹ کر کسی دوسری صنف کے پنپنے کے امکانات نظر نہ آتے تھے۔"(7)

روشِ عام سے ہٹ کر نظیر اکبرآبادی کو نظم کی جدید روایت میں ایک معمار کی حیثیت حاصل ہے۔ جنہوں نے نظم نگاری کو غزل گوئی پر فوقیت دی اور نظموں کو اپنی ذات کی اور اپنے زمانے کی ترجمان بنایا۔ نظیر کی زبان سادہ اور عام بول چال کی زبان تھی۔ نظیر نے آٹے، دال، مفلسی، تیرا کی کے میلے، ہولی، عید، برسات کی بہاریں اور پیسہ نامہ جیسے موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ ان کی نظمیں شاعری کے اعتبار سے چاہے کوئی حیثیت نہ رکھتی ہوں لیکن جدید شاعری کی پیش رو ہونے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

نظیر اکبرآبادی کی وفات کے بعد عہد سرسید میں نظم گوئی کو باقاعدہ صنف سخن کے طور پر اپنایا گیا۔ یوں حالی، شبلی، آزاد، اور اکبرالہ آبادی نے اردو نظم میں گراں

قدر اضافے کیے۔ ا?ل احمد سرور لکھتے ہیں:

"نظم کی دنیا غزل سے ہٹی نہیں ہے۔ اس میں حالی، شبلی، آزاد کے بعد اسماعیل میرٹھی، اکبرالہ آبادی، چکبست، اقبال، سلیم، سرور جہاں آبادی، شوق قدوائی اور بینظیر شاہ کے نام ممتاز ہیں۔ ان کے یہاں اک نیا ذہن، اک نیا احساس، اور ایک نیا جذبہ ملتا ہے۔"(8)

1857ء تک نظم کو غزل کے سامنے کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی لیکن جیسے ہی سیاسی حالات بدلے، ہندوستان کی زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ زندگی کے جن پہلوؤں میں تبدیلیاں آئیں اور ان تبدیلیوں سے جو نتائج رونما ہوئے ان ہی نتائج کے زیر اثر نظم نگاری کی تحریک شروع ہوئی۔ غزل کے مقابلے میں نظم کو شعوری طور پر فروغ دینے کی مہم کا آغاز ہوا۔

وقت نے جن تقاضوں کے زیر اثر، ناول، تنقید، افسانہ نویسی، مضمون نگاری کی طرف متوجہ کیا تھا۔ انہی تقاضوں کے زیر اثر مخصوص و معین اور مسلسل و مربوط موضوعات کے مطابق لکھی ہوئی نظموں کا بھی مطالبہ کر دیا۔

انہی مطالبات کے زیر اثر نظم جدید عہد میں داخل ہوئی۔ اس سلسلے میں حالی وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نظم کے مقصد کے تعین کی از سر نو کوشش کی۔

مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کی بنیاد باہمی مشاورت سے رکھی۔ اس انجمن کے تحت نیچرل شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کی نظم پر مقصدیت کا غلبہ تھا۔ حالی اور آزاد ? ہم آہنگ ہوتے ہوئے بھی نظم اور شاعری کی تحریک میں ایک دوسرے سے الگ سوچ رکھتے تھے۔ حالی چوں کہ سرسید تحریک کے اہم رکن تھے اس لیے نظم کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ غلام جیلانی اصغر لکھتے ہیں:

"18 مئی 1974ء کو انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی تو مولانا آزاد نے اردو شاعری میں انقلاب برپا کرنے کی تجویز پیش کی اور اپنی نظم

"شام کی آمد اور رات کی کیفیت" پیش کی۔ پنڈت کیفی نے اس مشاعرہ کو نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ قرار دیا ہے۔" (9)

حالی نے نظم میں اخلاقی مضامین کو اہمیت دی جب کہ آزاد قومی مقصد کی بجائے ادبی مقاصد کے لیے مغربی روایت کو عام کرنا چاہتے تھے۔ آزاد اور حالی کی کوششوں سے مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی نعمانی نے بھی اسی رنگ میں نظمیں کہیں۔ اس دور میں اسماعیل میرٹھی بھی شامل ہیں۔

جس طرح زندگی ارتقاء پذیر ہے اسی طرح شاعری اور خاص طور پر اردو شاعری نے بھی وقتاً فوقتاً خود کو بہتر سے بہتر بنایا۔ اردو شاعری بالخصوص اردو نظم کی بہت سی جدید ہیئتوں اور صورتوں میں اضافہ ہوا جن میں نظم معریٰ، آزاد نظم، اور نثری نظم کو خصوصی اہمیت اور توجہ حاصل ہوئی۔ اس حوالے سے ن۔م راشد "ماورا" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"قدیم اصناف سخن کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوئے یہ بھی کہنا پڑتا ہےکہ ادب میں حرکت پیدا کرنے کے لیے نئے ذرائع اظہار تلاش کرنا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اکثر اصناف سخن جدید خیالات کے سیلاب کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان کے لیے نئے راستوں کا پیدا کرنا ایک مقدس فرض ہے۔" (10)

بیسویں صدی کے آغاز میں ممتاز نظم گو شعراء میں بے نظیر شاہ، تلوک چند محروم، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی میر غلام بھیک نیرنگ مولانا ظفر علی خان، سیماب اکبر آبادی عظمت اللہ خان اور نادر کاکوروی کے نام شامل ہیں۔ اس کے بعد رومانوی تحریک کا آغاز ہوتا ہے جس کے علم برداروں میں نمایاں نام اختر شیرانی، عظمت اللہ خان اور جوش ملیح آبادی کے ہیں۔ بالخصوص اختر شیرانی کی اس دور میں نظمیں سراسر رومانوی ہیں۔
اختر کے کلام میں تخیل کی گہرائی کی جگہ فکر کی رعنائی پائی جاتی ہے۔ اختر شیرانی نے

موجودہ دور کی جدیدیت اور ترقی پسند شعراء کی روش کو نہیں اپنایا بلکہ ہیئت میں بھی انداز بدل بدل کر لکھا انہوں تکرار لفظی کے ذریعے ردیفوں، قافیوں، کے تجربات بھی کیے۔ اختر نے دوسری زبانوں کے اصناف کو بھی اردو میں متعارف کروایا۔ جیسے

"ماہیا" پنجابی زبان سے اور "سانیٹ" اطالوی زبان سے اردو میں منتقل کیا۔
عظمت اللہ نے بھی ہندی بحروں کے استعمال سے اردو نظم کے لب ولہجہ میں تبدیلی پیدا کی ان کے علاوہ حفیظ جالندھری، افسر میرٹھی، اکبر حیدر آبادی آنند نرائن دہلوی، جلیل قدوائی، رازش جان پوری اور شام موہن لال، جگر نے نظم کی روایت کو آگے بڑھایا۔ رفتہ رفتہ نظم کے موضوعات و ہیئت میں وسعت آئی۔ حمد، نعت، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، ریختی، واسوخت پر تو پہلے ہی طبع آزمائی کی جارہی تھی اب ہیئت کے حوالے سے قطعہ، مسمط، مستزاد، رباعی، ترجیع بند، ترکیب بند، پابند نظموں، آزاد نظموں، اور معریٰ نظموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تاہم یہ بات توجہ طلب ہے کہ رفیع الدین ہاشمی موضوعاتی اور ہیئتی نظموں کو جدید نظم خیال نہیں کرتے۔

"شاعری میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں خیال یا موضوع، ہیئت یا فارم۔ اس لحاظ سے اصناف نظم کا جائزہ دو حیثیتوں سے لیا جا سکتا ہے۔ ایک تو موضوع کے لحاظ سے، دوسرے ہیئت کے اعتبار سے۔ مگر بلحاظ موضوع او ربلحاظ ہیئت شاعری کی جتنی بھی اقسام ہیں، نظمِ جدید ان میں سے کسی کی ذیل میں نہیں آتی۔ وہ اپنی حیثیت اور نوعیت میں جملہ اصناف شعر میں جدا اور منفرد ہے۔" (11)

پابند نظموں کا دور عہد سرسید سے شروع ہوا اور 1940ء تک یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ اس دور میں جن شعراء نے پابند نظمیں لکھیں، ان میں آزاد، حالی، شبلی، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، علامہ اقبال، سیماب اکبر آبادی، پنڈت چکبست، فانی بدایونی، اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی کے نام سرفہرست ہیں۔

1936ء سے نظم ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ یہ دور انقلاب کا دور تھا۔ ترقی پسند تحریک کے اس دور نے نظم کو بالواسطہ اور بلا واسطہ طور پر متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک نے نظم کی روایت کو متاثر کیا۔ ترقی پسند شعراء میں جو نام قابل ذکر ہیں ان میں احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، ظہیر کاشمیری، احمد ظفر، افتخار عارف، خاطر غزنوی، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، فہمیدہ ریاض، اختر حسین جعفری، ظہور نظر وغیرہ شامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے نظریہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس دور کے دیگر شعراء میں فارغ بخاری، احمد راہی، رضا ہمدانی، احمد ظفر، جمیل ملک، احسان دانش، حمایت علی شاعر، جمیل الدین عالی، عرش صدیقی، ماہر رضوی اور اسلم انصاری شامل ہیں۔

آزاد نظم کا باقاعدہ آغاز 1940ء میں ہوا جس کا سہرا تصدق حسین خالد، میرا جی، ن۔م راشد اور مجید امجد کو جاتا ہے۔ مغربی اثرات کی وجہ سے اردو شاعری میں خاص طور پر نظموں کے موضوعات اور ہیئت میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ باعتبار ہیئت نظم جدید کی جو شکلیں سامنے آئیں ان میں سانیٹ، نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم اور ہائیکو وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم ان میں سب سے زیادہ شہرت آزاد نظم کو نصیب ہوئی۔

1955ء میں نظم کے نئے افق سامنے آتے ہیں۔ جن میں ن۔م۔ راشد اور میرا جی کی مثالیں موجود ہیں۔ ن۔م۔ راشد تصدق حسین خالد اور میرا جی کی بدولت اس صنف کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ مغربی اثرات کی وجہ سے اردو شاعری خاص طور پر نظموں کے موضوعات اور ہیئت میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

آزاد نظم کی تعریف، آغاز و ارتقاء

انگریزی ادب کی اس ہیئت کو "فری ورس" کہا جاتا جسے مشرق میں آزاد نظم کے نام سے اپنایا گیا ہے۔ یہ فرانس کی ایک شعری ہیئت ہے۔ یہ ہیئت وزن اور قافیہ دونوں پابندیوں سے آزاد ہے۔ راشد نے پہلی آزاد نظم "جراءت پرواز" لکھی جو کہ

1932ء میں لکھی گئی۔ جبکہ تصدق حسین خالد نے 1919ء میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ بقول تصدق حسین خالد:

> "1919ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتداً غالب اور اقبال کا مطالعہ بیشتر رہا، اس لیے ان کا رنگ غالب تھا۔ ازاں بعد 1925 میں نئے نئے فارم اردو میں رائج کرنے کی کوشش شروع کر دی"(12)

اس کا مطلب ہے کہ راشد نے آزاد نظم 1932ء میں لکھنی شرع کی جبکہ تصدق حسین خالد نیا آزاد نظم کی ابتداء 1925ء سے کی۔ تاہم خالد کی ابتدائی نظمیں شائع نہ ہونے کے باعث، راشد اور میرا جی کا کلام پہلے منظر عام پر آ گیا۔ اسی وجہ سے بعد کے محققین نے س خالد کی آزاد نظموں کو اہمیت دی۔

اردو کی آزاد نظم میں راشد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ راشد کو جو مقام اردو شاعری میں حاصل ہے وہ آزاد نظم کی بدولت ہی ہے۔ راشد کی خوبی یہ ہے کہ جو شہرت و بلندی انہوں نے آزاد نظم کو کم وقت میں عطا کی وہ کوئی دوسرا شاعر نہ کر سکا۔ اردو نظم کے فروغ میں راشد کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ راشد کو شہرت اسی آزاد نظم کی بدولت ملی۔ راشد کی نظموں کے مجموعوں میں "ماورا"، "ایران میں اجنبی"، لا۔انسان، گمان کا ممکن" شامل ہیں۔ جدید شعراء میں راشد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ راشد مادی رویوں اور انسان کی آزادی کی تصورات کا نوحہ گر ہے۔ راشد روحانیت اور قناعت پسندی کو سماجی پستی اور سیاسی غلامی کا سبب قرار دیتا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند باغی کا نقطہ نظر رکھتا ہے۔ راشد کی نظموں میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "راشد محسوس کرتا ہے کہ ماضی کی طرف مڑ کر دیکھنے والا تو کہانی کی شہزادے کی طرح پتھر بن جاتا ہے۔ نئے انسان کی جولان گاہیں، مدائن کے کھنڈروں میں نہیں بلکہ نئی بستیوں میں تلاش کرنی چاہئیں۔"(13)

راشد کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کو عروج تک لے جانے میں ایک اور بڑا نام میرا جی کا ہے۔ میرا جی اس دور کے مخصوص رجحان ساز نظم نگار تھے۔ میرا جی کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کو مشرقی ومغربی ادب سے مکمل ا? گاہی حاصل تھی۔ جدید اردو نظم میں داخلیت پسندی کے علمبردار میرا جی ہیں۔ میرا جی کی نظموں میں تنوع وسعت اور گہرائی ہے میرا جی کے نظموں میں تین پہلو بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کا بیاں، نظموں میں ابہام کی کارفرمائی اور ا? زاد نظم کی ہیئت کا استعمال ہے۔

میرا جی نے اپنی نظموں میں ابہام اور جنسیت کو برتا۔ نظموں میں جنسی اشارات کے بکثرت استعمال کی بناء پر ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن میرا جی نے بھی بغاوت کو اپنا شعار بنالیا۔ روایت سے بغاوت میرا جی کے علاوہ ن۔م راشد، اختر شیرانی اور فیض احمد فیض نے بھی کی۔ میرا جی نے انسانی نفسیات پر دلیری کے ساتھ ا? واز بلند کی۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اپنے تصورات کی جو تصویر پیش کی ہے۔ وہ مکمل اور جامع ہے۔ میرا جی کی نظم میں جہت باہر سے اندر کی طرف ہے۔ میرا جی کی نظموں میں محبوب سے نارسائی کے جذبات بھی ملتے ہیں۔

میرا جی حلقہ اربابِ ذوق کے اہم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

میرا جی کی نظموں میں ہندی اسلوب غالب ہے میرا جی کی شاعری کا ایک اہم پہلو بغاوت بھی ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی میرا جی کی نظم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میرا جی کی ا? زاد نظم ایک بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح میرا جی کی ا? زاد نظم بیک وقت روایت کی اہمیت کا احساس بھی دلاتی ہے اور اس سے بغاوت کا تاثر بھی رکھتی ہے۔"(14)

ڈاکٹر انور سدید آزاد نظم کے حوالے سے میرا جی کی نظم گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میرا جی کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے غیر ملکی شعرا کے مطالعے

اور ترجمے سے جدید شاعری کے اصول وضع کئے اور جب حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ہوئے تو نئے شعرا کی ادبی تربیت میں ان اصولوں کو حسن وخوبی سے استعمال کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ یورپ کی بیشتر ادبی تحریکیں مثلاً علامت نگاری، تاثریت، سرئیلزم وغیرہ، میرا جی کی وساطت سے ہی اردو نظم میں داخل ہوئیں اور ان کے بیش تر نمونے میرا جی نے ہی فراہم کئے"(15)

حقیقت سے رومان کی طرف آنے کا رجحان تمام ترقی پسند شعراء میں موجود ہے۔ فیض احمد فیض جب ترقی پسندی کی بات کرتا ہے تو نظریہ کے ساتھ جراء ت بھی ایک خاص قسم کے نرم جذبے اور حسی رومان میں ڈھل جاتی ہے

اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" میں حقیقت اور رومان اس طرح مدغم ہوتے ہیں۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو
x x x x x x x x x x x

اس کے علاوہ آزاد نظم لکھنے والوں میں مختار صدیقی، ضیا جالندھری اور مسعود حسین شامل ہیں۔ تاہم جدید شاعری میں مجید امجد ایک معتبر نام ہے مجید امجد نظریاتی طور کسی ایک

مکتبہ فکر کے تابع نہ تھے۔ مجید امجد کی شاعری کا محور و مرکز حیات ہے۔ ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کی شاعری میں نہ صرف انسان بلکہ جمادات، نباتات اور حشرات الارض وغیرہ سب شامل ہیں۔ تنہائی اور ناقدری زمانہ کے احساسات کی عکاسی بھی ان کی نظموں میں ملتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مشاہدہ کی گہرائی کی بنیاد پر چھوٹے سے چھوٹے منظر کا تصور پیش کرتے ہیں۔

مجید امجد کی شاعری کے موضوعات عام سے ہیں مثلاً ہری بھری فصلو، توسیع شہر"، "پنواڑی"، " کنواں اور کوئٹے تک" لیکن عام موضوعات میں زندگی کے بڑے بڑے فلسفے بیان کیے گئے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کے دیگر شعراء □ میں یوسف ظفر، قیوم نظر، اور جیلانی کامران وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

یوسف ظفر کی نظموں میں حرکت اور حرارت کے عناصر جا بجا پائے جاتے ہیں۔
مثلاً:

اب میرا عزم ہے فولاد کی مضبوط چٹان
اب یہاں کانچ کی تلواریں نہیں رہ سکتی

اب میں خود آگ ہوں، ہر شئے کو جلا سکتا ہوں
مجھ سے اب ہاتھ اٹھالو کہ میں جا سکتا ہوں

جدید شعراء میں منیر نیازی نے اپنی نظموں میں موت کے احساس اور ذات کے کرب کو موضوع بنایا ہے۔ موت کے احساس سے خوف زدہ آدمی کی تصویر کشی وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی ذات کا کرب معاشرے کے ہر فرد کا کرب محسوس ہونے لگتا ہے۔

جس کے کالے سایوں میں وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی ایک شہزادی

اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نقش کی گردن چوم رہے تھے

ایک بڑے سے بڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے

اختر الایمان کے ہاں غم کے جذبات اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا شخص موت کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر شعراء □ جنہوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ان میں محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، مخروم محی الدین، عزیز حامد مدنی، پروین شاکر، کشور ناہید، امجد اسلام امجد، ناصر کاظمی، تابش صدیقی، ظہور نظر، ثروت حسین، مسلم احمد، انجم رومانی، وزیر آغا، عرش صدیقی وغیرہ اہم ہیں۔

سب سے پہلے اردو شاعری کی دنیا میں فہمیدہ ریاض کی وہ نظمیں آتی ہیں۔ جو ایک طرف تو نئی زندگی اور نئے راستوں کا کھوج لگانے کی جستجو کرتی ہیں۔ تو دوسری جانب مردانہ سماج کے مقابلے ایک چیلنج کے طور پر ابھرتی ہیں۔ انہوں نے عورت کے استحصال کا بھرپوری جواب اپنی شاعری کے ذریعے دیا ہے۔ ان کی نظموں "دھوپ" اور "شہر والو سنو" میں اس طرح کی توانا مثالیں موجود ہیں۔

پروین شاکر کا رنگ بھی بہت گہرا اور مختلف ہے۔ انہوں نے علامتوں کے ذریعے عورت کے دکھ کی ترجمانی کی ہے۔ جو نئی عورت کے لیے ایک بہت بڑا Tribute ہے۔

پروین شاکر خواتین شاعرات میں نظم کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ پروین شاکر پاکستان کی پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے پہلی بار نسوانیت کے جذبات واحساسات انفرادیت کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کئے نسوانیت کے حسین اور متنوع سانچوں میں نظم

کو تسلسل اور دوام بخشا، نظم کو بامعنی بنایا۔ صنف مخالف کے شعور اور اس کی دانش کا آئینہ اسے دکھایا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ صنف نازک مکمل ہے وہ کبھی تہی دست اور بے سایہ نہیں ہو سکتی۔

پروین شاکر کی نظموں میں روزمرہ زندگی کی علامتیں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے سادہ زبان استعمال کی۔ ان کی شاعری کی موضوعات عشق و محبت ہیں۔

پروین شاکر سے ملتا جلتا انقلابی آہنگ کسی حد تک ہمیں کشور ناہید کی نظموں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے "لب گویا" میں شاعری کی دوہری لہریں موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ عورت کیلئے اصول زندگی مرد نے بنائے تھے۔ دوسرے کہ ان سے ہٹ کر اپنی ضرورتوں اور حالات کے تحت اپنی دنیا آپ بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔

جدید اردو شاعرات میں عذرا عباس کا نام جدید اردو نظم کی روایت میں ایک معتبر نام ہے۔ ان کے ہاں ہر طرح کی باتیں بے خوف کہنے کا ایک نڈر پن موجود ہے۔ جس پر پرانی عورت شرما جاتی تھی۔ سوچنے کا یہ انداز عذرا عباس کے ہاں اشارتی اور تجزیاتی انداز میں ان کی بہت سی نظموں پایا جاتا ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی اپنی نظموں میں اشاریت کا سہارا لے کر ایک مدت سے عورتوں کے ساتھ ہونے والے جبر کو ابھار رہی ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی کی نظموں میں ایک نئی عورت نئی فکر کی تعمیر کرتی نظر آتی ہے۔

زہرہ نگار نے عورت کی انسانی دوستی اور انسانی رشتوں کو بہت ہی خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ یہ سماج عورت سے کس طرح کے تقاضے کرتا ہے۔ بدلتے ہوئے سماجی اور استحصالی نظام میں جہاں عورت کو کال گرل یا سیکس ورکر سمجھا جاتا ہے وہاں زہرہ نگار کی نظموں میں نظام کے خلاف بغاوت، احتجاج اور سماجی نظام سے ٹکرانے کا حوصلہ چھپا ہے۔

ان خواتین شاعرات کے علاوہ شبنم عشائی، شبنم شکیل، وحیدہ نسیم، سارہ شگفتہ،

بسمل صابری، ناہید قاسمی، زاہدہ صدیق اور نوشی گیلانی وغیرہ جدید اردو نظم کے اہم اور معتبر نام ہیں۔

اردو کی شعری روایت میں ملتان کے نامور شعراء □ عرش صدیقی، اسلم انصاری، انور جمال، غلام حسین ساجد، عاصی کرنالی، ارشد ملتانی، عابد ملک، مبشر سعید، طاہر تونسوی، سلیم اختر، شوکت واسطی کے نام نمایاں ہیں۔

جنوبی پنجاب کا سرائیکی خطہ "ڈیرہ غازی خان" بھی شعر و ادب کا مرکز ہے۔ ڈیرہ غازی خان سے ایسے بہت سے شعراء □ سامنے آئے جنہوں نے اردو شاعری کی کوکھ کو اپنے شعری سرمائے سے بھر دیا۔ ان نظم گو شعراء □ میں ایمان قیصرانی، حسن علوی، رامز ہاشمی، شبیر ناقد، صباحت عروج، عدنان محسن، فرخ عدیل اور نجمہ شاہین کھوسہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت اس سے بھی زیادہ زرخیز ہے کیوں کہ اس میں شعراء □ کرام نے اپنی اپنی روایت کو شاعری کے ذریعے سے اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ شعری روایت کے لحاظ سے یہ خطہ بہت زرخیز ہے۔ اس خطے میں جنوبی پنجاب کے تمام شعراء □ کرام نے روایت کو کامیاب کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

جنوبی پنجاب میں ڈیرہ غازی خان کی بات کی جائے تو "بانو بلوچ" کا نام بھی سر فہرست ہے "سعیدہ بانو" غلام فرید ملغانی کے ہاں 1968ء □ میں تونسہ شریف میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ایم۔ اے اردو اور ایم۔ ایڈ کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے علاوہ ضلع لیہ میں بطور ایس ایس ٹی تعینات ہوئیں۔ وہ معروف ادیب، شاعر حمید اللہ الفت ملغانی کی بیوی ہیں وہ ایک اچھی نثر نگار اور شاعرہ ہیں۔ بانو بلوچ کے نام سے لکھتی ہیں۔ "جھومیڈی بجھارت"، " گھوٹ کنوار دے لطیفے"، "مٹھری مسکار"، "ڈاکٹریں دے لطیفے" اور "نرسیں دے لطیفے" جیسی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ سماج کی اجتماعی حبس زدہ زندگی جن موہوم

امیدوں کے سہارے گزرتی ہیا نو بلوچ اس کو اپنی شاعری میں خوبصورت انداز میں بیان کرتی ہیں۔ان کی شاعری میں سماجی مسائل اور اپنے قبیلے کی بھرپور نمائندگی دکھائی دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں ایک اہم نام "ثمینہ نرگس" کا ہے۔ثمینہ نرگس منیر احمد چھجڑا کے ہاں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئیں۔ان کا پورا خاندان معلّمی پیشہ سے منسلک ہے۔مگر یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے تعلیم کو جاری رکھا اور ایم۔اے انگلش اور ایم۔ایڈ کرنے میں کامیاب ہوئیں وہ اپنا تخلیقی اظہار شاندار طریقے سے کرتی ہیں۔اس طرح کتب،اخبارات میں بھی وقتاً فوقتاً لکھتی رہتی ہیں۔

انہوں نے مرد حاکم سماج اور پسماندہ ترین ماحول میں جہاں پر فرسودہ روایات کی جکڑ اور کمزور پر طاقتور کی پکڑ مضبوط ہو وہاں ایک خاتون یا لڑکی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار شاندار طریقےسے کر پاتی ہے۔جاگیردارانہ نظام کے ڈسے ہوئے والدین اپنی بچی کو معاشرے میں اونچی گردن کے ساتھ کب چلنے دیتے ہیں۔ان تمام موضوعات کو ثمینہ نرگس نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور قلم کی نوک سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔انہوں نے سماج کے اجتماعی مسائل اور روایات کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ان کی شاعری میں ہمیں سماجی اور سیاسی موضوعات کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس لیے ثمینہ نرگس نے اپنی شعری روایت کی وجہ سے ڈیرہ غازی خان کی دھرتی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شعری ادب میں آج بھی ان کا نام زندہ ہے۔

ڈیرہ غازی خان کی خواتین شعراء میں ایک نام ''ثمینہ ناز'' کا بھی ہے۔ثمینہ ناز نے شعری روایت میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ثمینہ ناز کا تعلق بلاک 25،ڈیرہ غازی خان سے ہے۔1976ء میں عبدالمجید خان شادی خیل پٹھان کے ہاں پیدا ہوئیں۔انہوں نے انٹر تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد امور خانہ داری کے ساتھ پرائیویٹ سیکنڈری سکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کیا اور موسیقی سے لگاؤ کے علاوہ بچوں کی تعلیم و

تربیت سے خاص رغبت کے باعث بچوں کے لیے مختصر کہانیاں،لطیفے اور نظمیں لکھنا شروع کیں۔ان کی بچوں کی کہانی پر مشتمل ایک کتاب "مسکراتی کلیاں" زیر طبع ہے۔مگر ان کی ادبی ذوق آج بھی رواں دواں ہیں۔

ڈیرہ غازی خان کے شعری روایت میں ان کا خاص کردار ہے۔ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں ایک نام "زہرہ انجم" کا بھی ہے۔مشہور سرائیکی شاعر غلام سرور شاکر کے ہاں 5جنوری 1945ء کو مکول کلاں تحصیل تونسہ میں پیدا ہوئیں۔1968ء میں پرائمری سکول میں بطور معلّمہ تعینات ہوئیں۔ان کی شادی 1969ء میں غلام محمد خان گشکوری سے ہوئی۔

مقامی ادبی تنظیم سلمان اکیڈمی کے بانی وسرپرست جناب جاوید احسن نے ان کا ادبی تعارف کروایا۔سرائیکی افسانے،انشائیے اور شاعری کرتی ہیں۔ان کی سرائیکی نظم "سمی" ادبی حلقوں میں بہت مشہور ہوئی مگر ان کا شعری مجموعہ شائع ہو کر سامنے نہ آسکا۔ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں ایک نام "شکیلہ رحمٰن" کا بھی ہے۔شکیلہ 28 مئی 1973ء کو کوٹ چھٹہ میں پیدا ہوئیں۔

قاضی عبدالرحمٰن آرائیں کی بیٹی ہیں۔انہوں نے 1995ء میں شعر لکھنا شروع کیا۔انہوں نے جاوید احسن جیسے اسکالر سے بھی اصلاح لی۔وہ ایم۔اے انگلش اور بی۔ایڈ ہیں۔اس کے علاوہ محکمہ صحت میں بطور سپروائزر بھی کام کر رہی ہیں۔کوٹ چھٹہ شہر میں تعلیمی اکیڈمی بھی چلانا چاہتی ہیں۔اس کے علاوہ اچھی مقرر بھی ہیں۔سٹیج سیکرٹری کا کردار بھی بڑے بھلے انداز سے کر کے سامعین کو مسحور کرتی ہیں۔ان کی دو کتابیں "آنکھ تماشائی" اور "Your beauty" شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں ان کا اہم کردار ہے ان کی ادبی خدمات کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں ایک نام "رضوانہ تبسم درانی" کا بھی ہے۔وہ 1990ء سے شعر لکھ رہی ہیں۔ان کی تعلیم بی۔اے ہے۔انہوں نے شاعری میں

اصلاح ساقی سمہوتی سے لی ہے۔اب ڈیرہ غازی خان سے ملتان منتقل ہوگئی ہیں۔اس کے علاوہ محکمہ تعلقات عامہ ڈیرہ غازی خان سے اعزازات بھی وصول کرتی رہیں۔ان کی کتاب "چنڑاں چنڑاں رنگ" شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کی شاعری میں سماجی اور رومانوی رنگ کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں "سعیدہ افضل" کا بھی اہم کردار ہے۔وہ محمد افضل کی صاحبزادی ہیں۔وہ جنگ اخبار سے منسلک ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب "تین عورتیں تین کہانیاں" لکھ کر مستقل کالم سے ملک گیر شہرت پائی ہے۔اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں کی خوبصورت شاعرہ ہیں۔حقوق نسواں کی علمبردار بن کر عرصہ سے تحریک چلا رہی ہیں۔جس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔بہت سی خواتین پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہیں۔شاعری بھی چھپوا رہی ہیں۔ناول اور افسانے بھی لکھ رہی ہیں۔اس کے علاوہ مختلف دفاتر میں بھی کام کر رہی ہیں۔اردو شعری روایت میں ان کا اہم کردار ہے۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں "نیر رانی شفق" کا کردار بھی اہم ہے۔وہ مختیار خان قیصرانی کی بیوی ہیں۔ڈویژنل پبلک سکول و کالج ڈیرہ غازی خان میں تدریس سے منسلک ہیں۔انہوں نے ایم۔اے اردو اور بی ایڈ کیا ہوا ہے۔بچپن ہی سے شاعری میں شغف تھا۔اس طرح کچھ غزلیں مجید تمنا سے درست فرمائیں۔اور کچھ کلام جناب کیف انصاری صاحب کی نظر بابرکت سے گزرا تو انہوں نے اس کو بہتر سے بہتر کروایا۔

وہ فیض ?،اقبال ?، جالب ?،ساحر ? لدھیانوی، مجاز ? اور پروین شاکر سے کافی متاثر ہوئیں۔پاکستان پریس فاؤنڈیشن اور ایشیاء □ فاؤنڈیشن کی جانب سے فیچر رائٹنگ مقابلہ میں اول انعام فاطمہ ثریا بجیا سے حاصل کر چکی ہیں۔انہوں نے بچوں کی کتاب "وطن خوشبو" پر صدارتی ایوارڈ بھی وصول کر چکی ہیں۔ان شعراء □ کرام کے علاوہ آج جنوبی پنجاب میں ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا بھی نام سرفہرست ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ڈیرہ غازی خان کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئیں۔پرائمری، میٹرک کے بعد ایف۔ایس سی کی اور اس کے بعد نشتر میڈیکل کالج سے ایم۔بی۔بی۔ایس کیا۔اس کے بعد انہوں نے شاعری میں لکھنا شروع کیا۔اس وقت ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوکر سامنے آچکے ہیں۔

ان کی شاعری ایک خوبصورت شاعری جو پڑھنے والوں کو اس جہاں کی سیر کراتی ہے۔جس کی سیر انہوں نے تخیلاتی پرواز کے دوران کی تھی۔وہ زندگی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جس سے مخاطب کرتی ہے۔تو آگاہی کا عذاب اسے خوبصورت اشعار کا نمونہ پیش کرتا ہے۔جو اس کے ساتھ ساتھ قاری کی تسکین جان کا سبب بھی بنتا ہے۔ان کی کتابوں میں شامل چند حمد و نعت اور سلام جہاں داخلی اور خارجی معاملات کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں احترام و احتیاط کے تقاضے بھی نبھاتے ہیں۔

غزل کی طرح یہاں اشعار کی تعداد برابر کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش نہیں کی گئی بلکہ اس معاملے کو ترجیح دی گئی ہے جس نے زبان کی سادگی و سلاست کو بھی قائم رکھا۔آداب کے معاملوں کو بھی سنبھالا اور شعریت کے تقاضوں کو بھی شاندار طریقے سے نبھایا ہے۔

ان کی شاعری کا انداز فطری اور برمحل ہے۔جس میں عورت کی نمائندگی نے حساسیت اور جر ?ت سچ کی کیفیت کو طاری کر رکھا ہے جس کا اثر اشعار میں بھی موجود ہے اور قاری پر بھی لازم ہوجاتا ہے۔ان کی نظموں میں بھی خارجیت کا عنصر جہاں شاعرہ کے حساس نسوانی رویوں کا پتا دیتا ہے وہاں شاعرہ کی سماج، معاشرے تہذیب و ثقافت سے فطری میلان کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے جو ڈاکٹر نجمہ شاہین کے شعروں سے جدا نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی شعروں کو خارجیت سے بیگانہ کرتا ہے ان کی شعری آواز تخلیق بھی سنتی ہے اور تخلیق کار بھی سنتا ہے اور قاری بھی سنتا اور حظ اٹھاتا ہے

مثلاً:۔

" کونسی شاخ پر
کونسا گل کھلے
ہے نصیب کی بات
نصیب کے یہ فیصلے
تو ہم سفر نہیں
غم کی یہ بات سہی
مگر اٹھتے ہیں
ہاتھ یہ
کہ
تجھ کو ہر خوشی ملے۔۔۔!

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نظم کے رجحان کو شعری صورت میں مزید بہتر سے بہتر بیان کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظمیں شاندار تخلیق کا مظاہر کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں رومانوی اور سماجی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ رفیع الدین ، ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب (لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز ، 1975)،ص23۔
2۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ، نئی اور پرانی قدریں ، (کراچی، مسلم لیگ کوارٹرز ، 1961)، ص270۔
3۔ وزیرا؟غا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج (دریا گنج، دہلی: سیمانت پرکاش دریا گنج، 1961)،301۔
4۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، نئی پرانی قدریں، ص24
5۔ وزیرا؟غا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، ص309۔
6۔ ایضاً، ص309۔
7۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2003)، ص552۔
8۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو ادب کی فنی تاریخ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 2003)، ص134۔
9۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، نئی پرانی قدری، ص37
10۔ ن۔م۔راشد، ’’دیباچہ‘‘، مشمولہ، ماورا (لاہور: مکتبہ اردو، 1941)، ص3۔
11۔ رفیع الدین، ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب، ص22۔
12۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ن۔م۔راشد ایک مطالعہ (کراچی: احمد برادرز ناظم ا؟باد،

1986)، ص153۔
13۔ حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو نظم میں معریٰ اور نظم ا؟ زاد (دہلی: شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، 1982)، ص153۔
14۔ ایضاً، ص505۔
15۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (پاکستان: انجمن ترقی اردو، 2004)، ص 570۔
16۔ وزیر ا؟ غا، ڈاکٹر حرکت و حرارت کی ایک مثال، مشمولہ، نظم جدید کی کروٹیں (لاہور: مکتبہ میری لائبریری، 1974، ص111۔
17۔ وزیر ا؟ غا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، ص، 401۔
18۔ ایضاً، ص44۔
19۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو (ڈیرہ غازی خان، : فرید ادبی سنگت، 2007)، ص17۔

(ب) جدید اردو غزل کی روایت:

اردو کی معروف اور ہر دلعزیز صنف سخن غزل ہے۔ اردو میں غزل کو وہی مقام حاصل ہے جو پھولوں میں گلاب کو۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا اور ان کے حسن و جمال کی تعریف کرنا ہے۔ اصطلاح میں غزل اشعار کا وہ مجموعہ ہے جن میں شاعر محبوب کے حسن و جمال اور زیبائی و رعنائی کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے حسن و عشق کا دم بھرتا ہے۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ ایرانی شاعروں کی اصطلاح میں غزل کے لغوی معنی ہیں "عورتوں سے باتیں کرنا" کے ہیں۔

ڈاکٹر انور صابر لکھتے ہیں:

"لغوی اعتبار سے یہ صنف حسن و عشق کی واردات و کیفیات اور معاملات کا ذریعہء اظہار ہے۔"(1)

ہرن کے منہ سے بوقت خوف جو دردناک آواز نکلتی ہے اسے بھی غزل کہا جاتا ہے۔ واردات حسن عشق کی مختلف کیفیات کا بیان غزل میں کیا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام غزل پڑ گیا۔ اردو ادب کو ابتداء میں فارسی سے جو اصناف ملی ہیں ان میں غزل بھی شامل ہے۔ قصیدہ سے علیحدہ کر کے ایک الگ صنف بنایا گیا تو اسے غزل کا نام دیا گیا۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے غزل توازن میں لکھی جاتی ہے۔ غزل کے اشعار کی تعدار عموماً پانچ، سات، نو یا گیارہ ہوتی ہے۔ غزل ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتی ہے۔ مطلع کے علاوہ غزل کے باقی تمام اشعار کے مصرع اولیٰ میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی۔ مصرع ثانی میں غزل کا ہم قافیہ ہم ردیف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے لیکن اگر شاعر اپنا تخلص استعمال

نہ کرے تو وہ صرف غزل کا آخری شعر کہلائے گا مقطع نہیں۔اگر ہم غزل کی روایت کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں غزل عاشقانہ واردات کے اظہار کا ذریعہ تھی۔غزل کا بنیادی موضوع حسن وعشق تھا بعد میں جب غزل میں تصوف کا تذکرہ ہونے لگا تو اس کی رنگینی میں اضافہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے اردو ادب کی آبرو کا درجہ مل گیا۔

جوں جوں غزل اپنے ارتقائی منازل کی طرف بڑھتی گئی اس کے اصطلاحی معنی بھی تبدیل ہوتے گئے اب غزل میں صرف حسن وعشق کے معاملات ہی نہیں بلکہ حیات و کائنات کے راز، زندگی کے مسائل، سیاسی سماجی رویے، فلسفیانہ اور تہذیبی موضوعات بھی بیان کیے جانے لگے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

"غزل اپنی تعمیر وترکیب کے لحاظ سے نہایت خوش امتزاج کی متقاضی ہے۔لفظ ومعنی کا حسین و لطیف پیوند جذبے کی سچائی اور رعنائی کیفیت، خون جگر اور لطف نظر کا امتزاج، خاص قسم کی نغمگی اور موسیقیت ، یہ سب ایک اعلیٰ غزل کی خصوصیات ہیں۔غزل حسن کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ذرا سی بے اعتدالی بھی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔کامل تناسب اور موزونیت اس کی بنیادی صفت ہے اور اعتدال وتوازن اس کی اساسی شرط ہے۔"(2)

غزل کی اب تک کی روایت کے پیش نظر اردو غزل کے دو دبستان اہم اور مرکزی حیثیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں۔دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ دونوں کی غزل کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔دبستان دہلی کی غزلوں میں داخلیت، سوز وگداز اور قلبی واردات کا بیان ملتا ہے اس کے برعکس دبستان لکھنؤ میں محبوب کے سراپا کی تعریف، صنائع لفظی ومعنوی کے ساتھ ساتھ لفظی تراش خراش اور خارجیت کے عناصر ملتے ہیں۔

جہاں تک اردو غزل کی ابتداء کا تعلق ہے تو اردو غزل کی ابتداء کے

بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔غزل کی روایت میں جو شعراء ابتدائی دور میں غزل کی روایت سے جڑے نظر آتے ہیں ان میں محمد قلی قطب شاہ، شہباز حسینی، مرزا دولت شاہ ظہوری، حسن شوقی، کمال خان رستمی، ملک خوشنود، محمد عادل شاہ، نصرتی ، ہاشمی ، وجہی، غواصی، آزاد، وجدی، لطفی مشتاق فراقی اور ولی دکنی کے نام شامل ہیں۔

ابتداء میں محمد قلی قطب شاہ کا نام دکن میں غزل کے حوالے سے آتا ہے۔اس کے بعد دکن میں ولی دکنی غزل کا عظیم شاعر بن کر ابھرتا ہے۔جس نے مقامی دکنی الفاظ کی آمیزش سے اردو زبان میں خوبصورت غزلیں کہیں اور اپنا دیوان مرتب کیا درحقیقت ولی ہی وہ شاعر ہے جو اپنا دیوان دہلی سے لے کر آیا اور دہلی کے شعراء نے اس کی پیروی میں فارسی میں شعر کہنا چھوڑ کر اردو غزل میں کہنا اور لکھنا شروع کیا۔جن شعراء نے ولی کی تقلید کی ان میں شاہ حاتم، خان آرزو، شاکر ناجی، مضمون، آبرو اور مصطفیٰ خان یک رنگ کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ولی کی غزلوں میں زیادہ تر مقامی ہندی الفاظ کی کثرت تھی۔دہلی میں اس کی جگہ فارسی نے لے لی۔

ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ولی نے لسانی طور پر غزل کو سنوارا۔

"ولی صحیح معنوں میں جہاں گرد شاعر تھا تعلیم کے سلسلے میں اس نے احمدا?با کا سفر کیا خاندانی تعلقات اسے اورنگ ا?باد کا سفر کرنے پر مجبور کرتے رہے۔علم کی تلاش میں وہ برہان پور کی جانب جا نکلا اور ایک مرتبہ اس نے سورت کا سفر بھی کیا۔سورت شہر کو وہ زندگی بھر نہ بھول سکا۔اور مسلسل یاد کرتا رہا"(3)

ولی دکنی نے دہلی کا پہلا سفر کیا تو شمالی ہند کی شاعری پر ان کے دیوان کا بہت اثر ہوا۔دہلی میں ولی کی سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی۔ولی کے انداز اور سعد اللہ گلشن سے ملاقات کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔

"ولی دکنی کی شاعری کا انداز بلکل ویسا ہی تھا جو دوسرے دکنی شعراء

کا۔ اس کے بعد ولی دکنی دو مرتبہ دہلی گئے۔ پہلی مرتبہ عہد اور نگزیب ا1700ء میں گئے اور اس وقت شاہ سعد اللہ گلشن نے ان کا کلام سن کر کہا کہ "مضامین فارسی ریختہ میں کیوں نہیں استعمال کرتے" تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولی نے فارسی ا? میز ریختہ میں شعر کہنا شروع کر دیا"(4)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں۔

"ایہام گوئی کی ترویج واشاعت میں مختلف النوع محرکات کارفرما تھے۔ اس میں ادبی روایت کے حوالے سے ولی کی شاعری کے ایہام کا اثر بھی تھا۔ اور برج بھاشا کے دوہڑوں کا اثر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عہد مغلیہ کے ا?خری دور کے فارسی گو شعراء میں ایہام کی روایت کا اثر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ تہذیبی روایت کے حوالے سے محمد شاہی عہد کی نشاطیہ ثقافت نے فکری عنصر کے خلا کے باعث لفظی صناعی کے فن سے اس کمی کو پورا کرنے کی سعی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک غالب عنصر کے طور پر ایہام گو شعراء نے ولی کی پیروی بھی کی۔ ایہام گوئی ان ہی مختلف النوع محرکات کے زیر اثر پروان چڑھی اور تقریباً تیس برس سے زیادہ مدت تک (1723ء تا 1755ء) شمالی ہند کی شاعری پر چھائی رہی۔"(5)

اس کے بعد میر، درد اور سودا کا دور آتا ہے جسے اردو شاعری کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔

اس عہد زریں میں میر تقی میر کے یہاں غزل پوری نزاکتوں اور جمال کے ساتھ اپنی شان وشوکت برقرار رکھے ہوئے ملتی ہے۔ میر کی غزلوں میں قنوطیت، یاسیت، حزن وملال کا عنصر غالب ہے جیسے میر پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔

میر کی نسبت مرزا سودا بنیادی طور پر قصیدہ گو تھے تاہم غزل بھی خوب کہتے ہیں ان

کی غزلوں میں بھی ان کے قصیدے کی طرح بندش الفاظ اور شوکتِ الفاظ بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایک وجہ دونوں کے معاشی حالات کا فرق تھا۔ ان کے یہاں میر جیسا سوز وگداز اور غم نظر آتا ہے۔ اسی دور کے تیسرے نمایاں غزل گو "خواجہ میر درد" ہیں۔ خواجہ میر درد صوفی اور درویش صفت انسان تھے اس لیے انہوں نے غزل کو بھی تصوف کے مضامین سے روشناس کیا۔ غزل میں ارکان تصوف کی کیفیت اور روحانی تجربات کو احسن طریقے سے پیش کیا۔ غزل کی روایت میں تصوف تصوف کی باتیں کرنے والا شخص میر درد سے پہلے کوئی نہ تھا۔ ان کی غزل صبر وقناعت، توکل اور زندگی کی ناپائیداری جیسے مضامین پر مشتمل ہے۔

"اردو غزل جب میر ومرزا کے دور تک پہنچی تو اس شمالی ہند کی غزل نصف صدی سے زیادہ کا سفر طے کر چکی تھی۔ ملکی سیاسی انتشار کی بازگشت اردو غزل میں سنائی دی جا رہی تھی۔"(6)

دہلی کے اجڑنے کے بعد دہلی کے شعراء، شرفاء اور امراء نے لکھنوء کا رخ کیا۔ اس طرح لکھنوء غزل کا مرکز بن گیا۔ لکھنوء کے شعراء میں انشاء ?، جر ?ت ?، رنگین ?، مصحفی ?، ناسخ ? اور آتش ? نے غز ل میں نام پیدا کیا۔ لکھنوء کے زوال کے بعد رام پور غزل کا مرکز بن گیا تاہم اس سے کچھ عرصہ پہلے دہلی میں ابراہیم، ? ذوق ?، غالب ? اور مومن خان مومن ? نے غزل کو وسعت دی۔

بیسویں صدی میں مولانا حالی، حسرت موہانی اور علامہ اقبال نے اردو غزل کو نئے مضامین، خیالات اور احساسات سے آشنا کیا جس سے اردو غزل کے دامن میں مزید وسعت ہوئی۔

حالی نے غزل میں جدت کی اچھی مثال قائم کی۔ حالی نے غزل کے اندر بدلاؤ پیدا کیا۔ غزل میں قومی، ملی اور نظموں دونوں میں پیش کیا۔ ملی مسائل کو محبوب موضوع بنایا۔ ان موضوعات کو انہوں نے غزلو ں اور نظموں دونوں میں پیش کیا۔ تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی، معاشی، اقتصادی مسائل سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔

وہ ہر ایک چیز کو خوب سے خوب تر دیکھنا اور کرنا چاہتے تھے۔حالی کے بعد اقبال ان کی مقصدی غزل کو پروان چڑھاتے ہوئے آگے لائے۔انہوں نے اپنی غزل میں مقصدیت اور محرک کی فضاء پیدا کی۔انسانیت،فطرت اور خدا ایسے موضوعات اور شاعری کو جانچنا شروع کیا۔

اخلاقیات اور مقصدیت کے علاوہ،مکالمے کا انداز ان کی شاعری کی دَین ہے۔اقبال کے ساتھ حسرت موہانی اردو غزل کو جدید روایت میں ڈھالنے کے معمار بن کر ابھرے۔جنہوں نے ایک نیا تصورِ عشق دیا تاہم یہ تصور نیا ضرور تھا مگر نامانوس نہیں تھا۔حسرت نے اپنی غزل میں گوشت پوست کے انسانی حسن کو قریب سے دیکھا اور اس سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔تاہم اس لطف اندوزی کی حدیں عیش اور ہوس ناکی سے نہیں ملتیں بلکہ وہ اس کو انسانی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ کر کے پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ان الفاظ میں حسرت موہانی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"یہ ٹھیک ہے کہ حسرت کے یہاں عشق کی فلسفیانہ تحلیل نہیں ہے۔وہ اس پر ایک انسان کی طرح غور کرتے ہیں۔اس لیے اس میں فلسفیانہ گہرائی پیدا نہیں ہوتی لیکن نفسیاتی گہرائی ضرور پیدا ہوتی ہے۔"(7)

حسرت کے علاوہ بہت سے جدید شعراء ہیں جنہوں نے اپنے تجربات سے غزل کی روایت کو آگے بڑھایا۔ان میں اہم نام اصغر گونڈوی،جگر مرادآبادی اور فانی بدایوانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اصغر گونڈوی نے غزل کو تصوف و پاکیزگی جیسے موضوعات دیے۔اور حیات کائنات کے مسائل کو اردو غزل میں پیش کیا۔فانی بدایوانی نے جدید غزل کو زندگی کی حسرتوں اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں کا احساس دیا۔

جگر نے اردو غزل کو سرشاری و رعنائیت بخشی اور آرزو لکھنوی نے خالصتاً اردو

غزل کو اردو زبان عطا کی۔ان کے علاوہ سیماب اکبرآبادی،جوش ملیح آبادی،احسان دانش،آنند نرائن،عرش صدیقی،ساغر صدیقی،حامد اللہ افسر،حفیظ جالندھری،صوفی تبسم،عابد علی عابد،عبدالمجید سالک،ایم ڈی تاثیر،ماہر القادری،ادیب سہارن پوری اور اثر صہبائی وغیرہ کے نام غزل کو جدت سے پوری طرح ہمکنار کرنے کے حوالے سے معتبر قرار پائے ہیں

پہلی جنگ عظیم کے بعد بیسویں صدی میں خاص طور پر انسان کے لیے ایسی پناہ گاہ کی ضرورت کو محسوس کیا جہاں اسے دکھوں اور غم سے چھٹکارہ مل سکے وہ جذباتی،نفساتی اور ذہنی طور پر خوشی اور راحت محسوس کرے۔اگرچہ ایسا سیاسی و سماجی ماحول کی راہبری کے باعث تھا اگرچہ ایسی خواہشات کو پورا تو نہیں کیا جاسکتا تھا۔

نتیجے کے طور پر لوگوں کے اندر اس گھٹن اور حبس زدہ ماحول سے بغاوت کی جر؟ت پیدا ہوئی۔انہوں نے خود کو دنیا کے دکھوں سے بیگانہ کرلیا۔خود کی ایک خیالی دنیا بسائی اس طرح اس عہد کے بہت سے غزل گو شعراء کا رویہ بھی ایسا ہی ہوا۔نتیجتاً یہ تحریک رومانوی تحریک کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔جوش ملیح آبادی،حفیظ جالندھری،اختر شیرانی،ساغر صدیقی،روشن صدیقی،ساغر نظامی،تاثیر،عدم اور احسان دانش اس تحریک کے اہم نام قرار دیے جاتے ہیں۔

رومانوی تحریک کے ردِعمل میں 1936ء میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔تحریک علی گڑھ کے بعد یہ دوسری بڑی تحریک تھی۔جس نے ادب پر دوررس اثرات مرتب کیے۔عالمگیر سیاسی سماجی حالات میں ہندوستانیوں نے قومی بیداری کا شعور اجاگر کیا۔ویسے بھی انگریزی تعلیم اور صنعتی ترقی نے لوگوں کو ذہنی و قلبی سطح پر بیدار کر دیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ جیسے جیسے کسی معاشرے کے حالات بدلتے ہیں ویسے ویسے اس دور کا ادب بھی سماجی حقیقتوں کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔اس عہد میں ادب میں بڑی تبدیلی آئی کہ جہاں اس معاملے میں پہلے کبھی کسی خاص طبقہ کی ترجمانی کی جاتی تھی اب یہ ہر خاص و

عام کی امنگوں کا ترجمان بن گیا۔

بالخصوص ہندوستان میں اشتراکیت اور عالمی سطح پر بھی ترقی پسند تحریک کے تحت ادب برائے زندگی کا نعرہ گونجا۔ جس میں ظلم، ناانصافی، غلامی اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی گئی تاہم ترقی پسندوں کے ہاں غزل کی نسبت نظم زیادہ ترجمان سمجھی گئی۔ اور نظم کو غزل پر فوقیت حاصل ہوئی۔ غزل کو اس تحریک کے زیر اثر بامقصد شاعری کے لیے ناکافی سمجھا گیا۔ غزل ایک پابند روایتی صنف سخن بھی تھی جس میں تبدیلی بہت مشکل سے ہوتی تھی اسے جاگیردارانہ نظام کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس تحریک میں نظم کو غزل پر سبقت حاصل رہی۔

خلیل الرحمن اعظمی کے مطابق:

> "اردو شاعری کی سب سے اہم صنف غزل جس میں طبع آزمائی معیاری شاعر ہونے کی دلیل تھی۔ اب اس کی حیثیت ثانوی ہوتی جارہی تھی۔"(8)

اس بات میں جزوی صداقت ہے کیونکہ غزل پر تمام اعتراضات کے باوجود ترقی پسند شعراء □ اپنے آپ کو پوری طرح غزل سے الگ نہیں کر سکے۔ تحریک کے آغاز میں ہی ہمیں ترقی پسندوں کے یہاں غزل کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

مجاز لکھنوی، مجروح سلطان پوری، مخدوم، وامق، جزبی، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی نے غزل کو بڑی کامیابی سے جدیدیت کے رنگ میں ڈھالا۔ آزادی کے بعد جب فیض احمد فیض کا دوسرا مجموعہ کلام "دست صبا" شائع ہوا تو اس کی بدولت غزل پھر سے عوام میں مقبول ہونے لگی۔

فیض کی شاعری ابتداء □ میں رومانوی تھی۔ فیض احمد فیض کا شمار ترقی پسند شعراء □ میں ہوتا ہے۔ جنہیں سب سے زیادہ شہرت ملی۔ فیض نے روایتی غزل میں استعمال ہونے والی علامتوں اور استعاروں کو سماجی خیالات ور جحانات کا وسیلہ بنایا۔ نظموں

کے مقابلے میں فیض کی غزلوں کی تعداد کم ہے۔ پھر بھی یہ غزلیں جدید غزل میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فیض کی غزلوں کا تکنیکی سراپا روایتی غزل سے ملتا ہے۔

فیض احمد فیض کی ترقی پسندی سے غزل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ فیض احمد فیض کی غزلوں کے موضوعات روایتی ہیں۔ فیض کی غزلوں میں ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں جن میں روایت کی چھاپ ملتی ہے۔ موجودہ صدی میں فیض احمد فیض وہ واحد شاعر ہیں جن کی رگوں میں روایت کا پہرہ دوڑتا ہے۔

فیض نے غزل کی روایتی صنف کو اپنا ذریعہ □ اظہار بنایا۔ فیض احمد فیض نے جو غزلیں اور نظمیں لکھیں ہیں وہ اس عہد کی غزل کے مزاج، آہنگ، ترتیب و توازن کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ فیض احمد فیض اعتدال پسند اور توازن کے شاعر تھے اور کلاسیکیت سے انہیں رغبت تھی۔ فیض احمد فیض انفرادیت میں اپنی مثال آپ تھے۔

فیض احمد فیض کی انفرادیت کے بارے میں ڈاکٹر نصرت چوہدری لکھتی ہیں۔

> "میر وسودا، غالب، اقبال اور اختر شیرانی" کا اثر فیض پر ضرور ہے لیکن اس کے باوجود فیض اپنے منفرد لب و لہجے کی بناء □ پر پہچانے جاتے تھے۔"(9)

فیض احمد فیض کے بعد احمد ندیم قاسمی ترقی پسند شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ جنہوں نے غزل کی روایت کو آگے بڑھایا۔ احمد ندیم قاسمی کی غزلوں میں بھی کئی طرح کے رنگ اور انداز پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزلیں نرمی، توانائی و نزاکت کا حسین امتزاج ہیں۔ جس میں عظمت انسانیت اور حکیمانہ بصیرت چھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ موجودہ دور کی نئی نسل پر احمد ندیم قاسمی کے اثرات ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی غزل فکر اور جذبے کا حسین امتزاج ہے۔ ان کی غزلوں میں جدت کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید کے مطابق:

> "احمد ندیم قاسمی کی غزلیں بھی ان کے خیالات کی جدت کے اعتبار سے

بڑی اہمیت کی حامل ہیں انہوں نے اپنے دیگر ترقی پسند معاصرین کے
دوش بدوش زندگی کو اس کے برہنہ حقائق سمیت اپنے اشعار میں منتقل کیا
ہے۔جذبہ عصری حقائق اور ان کے داخلی تجربات نے متحد ہو کر ان کے
تخیل کو آشنا کیا ہے۔"(10)

فیض احمد فیض کی طرح احمد ندیم قاسمی کا مزاج بھی روایت سے منسلک ہے۔احمد ندیم قاسمی کی غزل لفظی پیچیدگی میں نہیں الجھی۔احمد ندیم قاسمی نئی تبدیلیوں کے مطابق اپنی فکر کو شاعری کا پیکر عطا کرنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہے۔

احمد ندیم قاسمی شاعری کے بنیادی عناصر زندگی کی حرکت اور حسن کا احساس ہیں۔احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا مرکزی موضوع انسان ہے۔ہمیں ان کی شاعری میں انسان کے متنوع روپ ملتے ہیں۔

ہماری نئی غزل میں شعراء □ نے نئے عہد کی تصویر کشی کی ہے۔شاعری کے چار موضوعات جنسی بھوک، معاشرتی ناہمواریوں، اخلاقی اور معاشرتی ضابطوں سے بےزاری کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔اس کے علاوہ ترقی پسند غزل گوؤں کے قبیلے میں "جاں نثار اختر، ظہیر کاشمیری، ادا جعفری، احمد ظفر، عارف عبدالمتین، فارغ بخاری اور رضا ہمدانی" کے نام قابل ذکر ہیں۔ان شاعروں نے بڑی مہارت سے ترقی پسندانہ افکار کو غزل کے منظر نامے میں سجایا۔

1947ء □ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم نے دو زمانوں کو جدا کر دیا اس تقسیم میں غزل متاثر ہوئی۔غزل میں تقسیم کے بعد ہونے والے واقعات کو پیش کیا گیا اس دور کے شاعروں ادیبوں کے خاص موضوعات آزادی، تقسیم، فسادات اور ہجرت وغیرہ تھے۔

یہاں پر روایت سے دلچسپی کا رجحان بھی دکھائی دیتا ہے۔احمد ندیم قاسمی، مجروح سلطان پوری اور ساحر لدھیانوی وغیرہ ایسے غزل گو ہیں جنہوں نے ان حالات کی عکاسی اپنی غزلوں میں کی۔تقسیم کے بعد غزل میں فسادات کا ذکر کیا۔کچھ تو ایسے تھے جو با قاعدہ

ترقی پسند تحریک سے وابستہ بھی رہے۔

ناصر کاظمی کا شمار قیام پاکستان کے بعد بننے والے شعراء □ میں ہوتا ہے۔ناصر کاظمی نےبطور غزل گو اپنی انفرادیت تسلیم کرائی۔ناصر کاظمی نے حلقہء □ ارباب ذوق کی تحریک کے تحت غزل کو ترقی دی۔ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کا دکھ دکھائی دیتا ہے۔

ناصر کے نزدیک ہجرت ایک تہذیب کی بربادی کا نام بن گئی۔ہجرت ہی وہ سبب ہے جس نے ناصر کی شاعری میں یادوں کا سلسلہ پیدا کیا۔ناصر کاظمی کی شاعر یاد، دکھ، اداسی، خواب کی شکستگی سے مزین ہے۔

سلیم احمد کے مطابق:

"ناصر کی آواز اپنے دور کی سب سے زیادہ دکھی اور اداس آواز ہے۔اور
بعض اوقات اپنی سچائی سے ہمارے وجود کے سچے تاروں کو اس طرح
چھوتی ہے کہ اس کی چوٹ دیر تک دل میں محسوس ہوتی رہتی
ہے۔"(11)

پچاس کی دہائی میں غزل کے افق پر جو قابل قدر شاعر ابھرے ان میں ابن انشاء □، باقی صدیقی، شان الحق حقی، صباء □ اکبرآبادی، سید عبدالحمید عدم، سید عابد علی عابد اور جمیل الدین عالی کے نام شامل ہیں۔ان شعراء □ نے غزل کو اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے وسعت عطا کی۔جدید غزل کو کلاسیکی غزل کی روایت سے جوڑنے کو بھی کوشش کی۔

ساٹھ کی دہائی میں غزل میں بہت سے تجربات ہوئے۔بہت سے شاعروں نے محسوس کیا کہ غزل میں موضوعات اور اسالیب دونوں حوالوں سے تبدیلی آئی۔اس دور میں غزل کو لسانی تشکیلات کے تجربوں سے بھی گزارا گیا جن کے باعث غزل اظہار کی نئی صورتوں سے آشنا ہوئی۔

ظفر اقبال جدید اردو غزل کے دور حاضر کا اہم نام ہے۔ظفر اقبال نے لسانی

تشکیلات سے اردو زبان کے دامن کو وسیع کیا۔ظفر اقبال نے غزل میں نئے نئے لسانی تجربات کیے۔انہوں نے روایت سے بغاوت کی۔الفاظ ومشاہدات کے لیے نئے تجربات کیے۔ظفر کے کلام میں ہمیں شگفتگی اور رعنائی دکھائی دیتی ہے۔ظفر کے ہاں کوئی کیفیت و رجحان زیادہ دیر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ظفر اقبال کی غزلوں میں روایتی شعراء کے اثرات نظر آتے ہیں جن کو وہ نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔

عہد جدید میں سلیم احمد بھی غزل کے اہم شاعر ہیں۔ان کی شاعری کی ابتداء میں ان پر میر تقی میر کا اثر دکھائی دیتا ہے۔بعد میں وہ حسرت اور یاس یگانہ چنگیزی سے متاثر نظر آتے ہیں ان کے ہاں بھی غزل کی صنف میں منفرد تجربات ملتے ہیں۔

سلیم احمد نے غزل میں اسلوبیاتی اور موضوعاتی دونوں حوالوں سے تجربات کیے۔انہوں نے جدید غزل میں روح،جسم،سائنس،فطرت اور جذبات کا حسین امتزاج پیش کیا۔

افتخار عارف اپنی پہچان ایک سنجیدہ شاعر کی حیثیت سے رکھتے ہیں ان کے فن اور مواد میں ایسی پختگی کا اظہار ملتا ہے جو دوسروں میں کم یاب ہے۔وہ دوسروں کی طرح تجربے کے جزوی اظہار پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنا پورا تجربہ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کی پوری نزاکتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ اس کو پیش کرتے ہیں۔وہ سوچنا بولنا اور محسوس کرنا کے فن سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

عبدالحمید عدم اپنے دور کے مقبول شاعر تھے ان کی شاعری میں بے ساختگی،روانی،سلاست اور شیرینی متاثر کن ہے۔ ان کی غزلوں میں موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔ان کے خاص موضوعات ہمارے سماج کے منافقانہ رویے ہیں۔جو معاشرے میں سیاسی وسماجی حالات کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔عبدالحمید عدم نے سیاسی جبر کے خلاف بھی خوب آواز بلند کی۔

جمیل یوسف کے مطابق:۔

"عدم ایک کھرا اور سچا شاعر ہے۔بناوٹ اور تصنع اور تکلف سے پاک۔۔۔اس کے منفرد اسلوب اور انداز کی وجہ سے اس کا ایک مخصوص رنگ بن گیا ہے۔جسے عدم کا رنگ کہتے ہیں۔"(12)

مختار صدیقی بھی جدید اردو غزل میں اپنی ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں مختار صدیقی موسیقی کا ذوق رکھتے تھے۔ان کا ہر شعر منفرد اور پرکشش ہے۔مختار صدیقی کا تعلق حلقہ ارباب ذوق سے رہا ہے۔مختار صدیقی کے ہاں زبان وبیان اور دکھ کے حوالے سے میر تقی میر کے اثرات نمایاں ہیں۔مختار صدیقی کی شاعری میں تصوف کی لہر موجود ہے۔موسیقیت لب ولہجے اور اسلوب کی بناوٹ کے باعث ان کی غزلیں میر کی غزلوں سے ہم رنگ دکھائی دیتی ہے۔

فتح محمد ملک کے مطابق:

"مختار صدیقی کی شاعری جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم اردو شاعری کی ذات پرستی اور دروں بینی کی اس روایت سے رشتہ بند ہے جسکے خلاف بغاوت ہی جدید شاعری کا امتیاز رہا ہے۔اظہار کے رنگارنگ سانچوں کے باوجود مختار صدیقی کی ساری ساری شاعری ایک طویل خود کلامی ہے۔"(13)

قتیل شفائی جدید اردو غزل میں ایک اہم نام ہے۔اس نے اردو غزل کو نئے نئے موضوعات سے آشنا کیا۔قتیل شفائی کو پاکستان کا "ساحر لدھیانوی" بھی کہا جاتا ہے۔ان کی غزلوں میں نغمگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔وہ حقیقت کے اظہار کے لیے خلوص سے کام لیتے ہیں مبالغے سے نہیں۔

قتیل شفائی ترقی پسندانہ نقطہء نظر رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی غزلوں میں انسانی رشتوں کی مختلف کیفیات کو مختلف طریقوں سے پیش کیا۔

ادا جعفری کا نام جدید اردو غزل کی روایت میں بڑی اہمیت کا حامل ہے بالخصوص

خواتین شاعرات ان کے ہاں عورت کے مسائل کا گہرا احساس ہے وہ اپنی شاعری میں عورتوں کو درپیش مسائل کا ذکر اجتماعی انداز میں کرتی ہیں۔ادا کی شاعری میں دو چیزیں بڑی واضح نظر آتی ہیں۔پہلی ان کا تہذیبی رویوں سے جڑ کر رہنا اور دوسری بحیثیت عورت ان کا عورتوں کے جذبات،احساسات کی ترجمانی کرنا۔ادا نے سادہ مگر خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔ان کی شاعری لطافت محبت اور کچھ خارجی مسائل جیسے موضوعات کی کہانی پیش کرتی ہے۔

رشید امجد کے مطابق:

"غزل میں ادا جعفری کا ایک خاص لہجہ متعین ہو چکا ہے جو غزل کی روایت کے ساتھ جدید اندازِ شعر گوئی اور لطیف نسوانی احساسات کے خوبصورت امتزاج کا حامل ہے۔انہوں نے اردو شاعری میں پہلی مرتبہ شاعرہ کی حیثیت سے غزل میں صیغہء ▯ تانیث کا استعمال کرتے ہوئے نہایت جر?ت سے اپنے جذبے اور واردات قلبی کا اظہار کیا۔"(14)

حسن نعیم کا شمار بھی جدید اردو غزل گو شعراء ▯ میں ہوتا ہے۔حسن نعیم کی غزلوں کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی انفرادیت نظر آتی ہے۔جو اس کے دور کے لیے نئی تھی۔حسن نعیم نے غزل سے ہی ایک لب و لہجہ اخذ کیا۔آخر وقت تک وہ غزل کی آبیاری میں مصروف رہے۔

تسمیم طارق ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

"حسن نعیم کے لیے شاعری وہ منکوحہ رہی ہے جو مہر بدن کا لہو مانگ لینے کے بعد جہیز میں تاثیر لاتی ہے۔"(15)

حسن نعیم دور جدید میں غزل کے ایک نمائندہ شاعر بن کر ابھرے انہوں نے غزل کو نت نئے تجربات و احساسات کے اظہار کے لیے نئی زبان بخشی۔لفظیات کو نئی معنویت،جہات دے کر ان کو سلیقے کے ساتھ برتا جس سے ایک منفرد انداز گفتگو کا جنم

ہوا۔تخیل کی دنیا کو علامت نگاری اور پیکر تراشی کے سانچوں میں ڈھالا۔

پروین شاکر خواتین شاعرات میں غزل کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔پروین شاکر پاکستان کی پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے پہلی بار نسوانیت کے جذبات و احساسات انفرادیت کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیے۔نسوانیت کے حسین سانچوں میں غزل کو تسلسل بخشا۔غزل کو بامعنی بنایا۔صنف مخالف کے شعور اور اسکی دانش کا آئینہ اسے دکھایا۔انہوں نے ثابت کیا کہ صنف نازک مکمل ہے وہ کبھی تہی دست اور بے سایہ نہیں ہو سکتی۔

نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"لڑکی یا عورت کے محسوسات و معاملات جس حد تک جتنی خوبصورتی کے ساتھ اور جتنے دل کش انداز میں پروین شاکر کی بدولت غزل میں آ گئے ہیں اتنے کسی اور کی شاعری کی بدولت کبھی نہیں آئے۔"(16)

پروین شاکر کی غزلوں میں روزمرہ زندگی کی علامتیں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے سادہ زبان استعمال کی۔ان کی شاعری کے موضوعات عشق و محبت ہیں۔

اسی طرح پروین شاکر کی طرح بہت سی دوسری شاعرات ہیں جنہوں نے عورتوں کے حقوق کی بات کی جن میں" کشور ناہید،نوشی گیلانی،زہرہ نگاہ،فہمیدہ ریاض،شبنم شکیل،وحیدہ نسیم،سارا شگفتہ،بسمل صابری،ناہید قاسمی،زاہدہ صدیقی"وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ اس دور میں منیر نیازی،شکیب جلالی،احمد مشتاق،احمد فراز،عبدالعزیز خالد،اقبال ساجد،سید جون ایلیاء ▯،ابن انشاء ▯،حفیظ ہوشیار پوری،محسن نقوی،راحت اندوزی،مجروح سلطان پوری،جمال احسانی اور ثروت حسین کے نام شامل ہیں۔

اردو غزل میں جدیدیت کے آغاز کے بعد تقریباً وجودیت،انفرادیت اور جدیدیت کا دور دورہ تقریباً بیس سال تک رہا۔1980ء ▯ کے بعد جو غزلیں لکھی گئیں

ان میں تبدیلی کی لہر دوڑ گئی۔ان غزلوں میں اسلوب مواد اور خاص نقطہء نظر کی بدولت جدیدیت سے علیحدہ اپنا ایک مقام بنایا۔ان غزلوں کی اکیسویں صدی میں "مابعد جدید غزل" کا نام دیا جانے لگا۔

اردو عہد بہ عہد تبدیل ہوتی رہی اس لیے غزل میں شعراء نے نئے عہد کی تصویر کشی کی جن میں اسلم انصاری، اطہر نفیس، انور شعور، انور مسعود، امجد اسلام امجد، خالدہ احمد، عدیل ہاشمی اور شان الحق حقی کی غزلوں میں نئے عہد کی تصویر کشی ملتی ہے۔

پاکستان میں جدید اردو غزل کی روایت کو مضبوط کرنے میں جنوبی پنجاب میں ڈیرہ غازی خان ایک ایسا شہر ہےجو ادبی اور شعری اعتبار سے بہت زرخیز ہے۔ڈیرہ غازی خان سے بہت سے شعراء وادباء سامنے آئے ہیں جنہوں نے ناقدین شعروادب سے اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کروایا اور اردو غزل میں اضافے کا باعث بنے۔

جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان کے ان شعراء میں محسن نقوی، ثمینہ نرگس، عابدہ بزدار عابی؟ حمیرا جان؟، بانو؟ بلوچ، زہرا انجم، شکیلہ رحمٰن، طاہرہ سوز، بشریٰ قریشی، قدسیہ کوثر، شاہین ڈیروی؟، ڈاکٹر نسیم اختر نسیم؟، راشدہ قاضی؟، نیئر رانی؟ شفیق لغاری، سعیدہ افضل، آپا شمیم سلطانہ، بخت آور کریم، رضوانہ تبسم؟ درانی، ثمینہ ناز؟ اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا نام شامل ہے۔

محسن نقوی ڈیرہ غازی خان کے مشہور شاعر ہیں۔محسن نقوی ڈیرہ غازی خان کے ان شعراء میں سے ایک ہیں جنہوں نے ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اپنا نام پیدا کیا۔

محسن نقوی غزل کے شاعر ہیں اسی لیے ان کے ہاں جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ان کی شاعری کا بڑا موضوع عشق ہے۔انہوں نے نظمیں بھی لکھیں ہیں۔انہوں نے نظموں میں معاشرے میں ہونے والے ظلم و جبر اور ناہمواریوں کو پیش کیا۔

ان کے شعری مجموعے، "بند قباء"، برگ صحرا، موج ادراک، ردائے خواب

، ریزہ، عذاب دید، طلوع اشک، رخت شب خیمہ، جان فرات فکر" شامل ہیں۔محسن نقوی کی شاعری میں ہمیں کربلا، پیاس، صحرا، چاند، سمندر اور نیزے جیسے موضوعات ملتے ہیں۔وہ روایتی شاعری کی نسبت جدید شاعری کے حامی ہیں۔

محسن کی شاعری سچی شاعری ہے۔ان کے نزدیک روایتی شاعری میں مختلف تبدیلیوں کے باعث اب وہ مردہ ہو چکی ہے۔ان کی شاعری میں سماجی و سیاسی موضوعات سے زیادہ عشق و محبت کے موضوع ملتے ہیں۔

عابدہ بزدار عابی؟ ڈیرہ غازی خان کی تحصیل ''تونسہ'' کے قبیلہ بزدار سے تعلق رکھتی ہیں۔ عابدہ بزدار عابی؟ 6 اکتوبر 1976ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئیں۔شعروادب اور تخلیق ادب میں قبیلہ بزدار اپنی پہچان رکھتا ہے۔

ان کی شاعری ڈیرہ غازی خان کی روایت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں معاشرے کے مسائل اور ارد گرد میں رونما ہونے والے واقعات کو اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔اس لیے عابدہ بزدار عابی؟ ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔انہوں نے شاعری میں رومانوی اور کلاسیکی رنگ کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس لیے ان کا شمار خواتین شعراء میں ہوتا ہے۔

راشدہ قاضی نے بھی ڈیرہ غازی خان کی شاعری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔وہ قاضی محمد رفیق اختر کے ہاں 12 ستمبر 1966ء کو قصبہ داجل ضلع راجن پور میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے میٹرک داجل، انٹر اور بی۔اے گرلز کالج اور ایم۔اے بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کیا۔

راشدہ قاضی گورنمنٹ کمرشل کالج برائے طالبات میں پرنسپل تعینات ہیں اور آج کل شعبہء اردو غازی یونیورسٹی میں اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ وہ پی۔ایچ۔ڈی بھی کر چکی ہیں۔انہوں نے "سقوط مشرقی پاکستان اور اردو ناول" پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی مکمل کی۔انہوں نے شعر، افسانہ، ناولٹ اور تنقید وغیرہ پر اچھا کام

کر چکی ہیں۔ان کی تخلیقی جہات ادبیات ماہ نو اور ید بیضا میں ان کی نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ان کا "مجھے کیا برا تھا مرنا" افسانوی مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔انہیں خوبصورت شعر کہنے کا ملکہ اچھے طریقے سے آتا ہے۔وہ اپنی شاعری میں سادگی اور بڑی معصومیت سے اپنی بے بسی کا ذکر کر جاتی ہیں۔ان کی شاعری سماجی مسائل اور دیگر رونما ہونے والے واقعات کا ذکر شاندار طریقے سے کرتی ہے۔ان کا شمار خواتین شعراء میں ہوتا ہے۔آپ ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اہم کردار آپا شمیم سلطانہ نیا ادا کیا ہے۔وہ فیروزالدین راجپوت کے ہاں 12 مئی 1932ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئیں۔پرائمری کلکتہ اور مڈل لدھیانہ سے کیا۔تقسیم ہند کے بعد ڈیرہ غازی خان آ گئیں۔ 1951ء میں لاہور سے جے وی کی اور ڈیرہ غازی خان میں گرلز سکول میں بطور معلّمہ تعینات ہوگئیں۔ 1958ء میں میٹرک اور 1961ء میں ایف۔اے کیا اور والد صاحب اور بھائی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ماں نے ان کی شادی خان محمد خان کھوسہ سے کر دی۔شادی کے بعد انہوں نے اپنی تعلیم کا سفر جاری رکھا۔63-1962ء میں مخلوط تعلیم کا اجراء ڈگری کالج میں ہوا تو انہوں نے بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔انہوں نے شاعری کا بھی آغاز کر دیا اور ڈاکٹر احمد رفاعی ? سے اصلاح بھی لیتی رہیں۔

اس کے بعد 1965ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کیا اور 1967ء میں بی۔ایڈ گرلز انٹر کالج میں لیکچرار تعینات ہوئیں اور بطور پرنسپل چارج لیا اور اس کے بعد مظفر گڑھ کالج میں پرنسپل بھی تعینات رہیں۔اس تمام سفر کے بعد وہ 19 جون 1998ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ نعتیہ کلام میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ حدیث کی تعلیم نے بھی ظلمت کو نور بدلا ہے۔

ان کی شاعری کا بھرپور اظہار الفاظ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔انہوں نے

اپنی شاعری میں حالات، زندگی مسائل اور مصائب کو پرکھنے کی شاندار کوشش کی۔انہوں نے ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اہم کردار ادا کیا۔یہی وجہ ہے کہ آپ کا شمار آج بھی نامور شعراء میں ہوتا ہے۔

ڈیرہ غازی خان کی اردو شعری روایت میں اہم کردار طاہرہ سوز نے بھی ادا کیا ہے۔ان کا اصل نام طاہرہ حمید تھا۔وہ اگست 1954ء کو میاں محمد عمر شہباز کے ہاں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے ایم۔اے اردو ایم۔ایڈ کیا ہوا تھا۔اور سکول میں بطور S.S.T فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔

اس کے بعد سکول ایجوکیشن میں بطور A.E.O بھی اپنے فرائض سرانجام دیے ہیں۔اپنے قبیلے کی روایت کے مطابق ان کی شادی واحد بخش خان جتوئی سے ہوئی۔مگر 2007ء میں گردے فیل ہوجانے کی وجہ سے وفات پا گئیں۔اخلاق کے لحاظ سے آپ بڑی ملنسار اور حوصلے والی خاتون تھیں۔وہ اپنے شاگردوں سے بھی اپنی اولاد کی طرح پیار کرتی تھیں۔

جب شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا تو اس کی اصلاح کیف انصاری ? سے لی۔وہ بزم امکان ڈیرہ غازی کی عہدیدار بھی ہیں۔اور اسی بزم سے اپنی شاعری پر بطور انعام ٹرافی بھی حاصل کی تھی۔اپنے کلام کے حصول کے لیے متعدد مرتبہ واحد بخش جتوئی سے بھی رابطہ کیا مگر ناکام رہیں۔مگر انہوں نے اپنی شاعری میں رومانوی اور کلاسیکی مزاج کو شاندار طریقے سے پیش کیا اس لیے ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اہم کردار ادا کیا۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں ڈاکٹر نسیم اختر نسیم نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کا شعری کردار دوسرے شعراء کی طرح اہم ہے۔وہ 5 جولائی 1973 میں نبی بخش مستوئی کے ہاں پیدا ہوئیں۔ان کا تعلق "چاہ بریوالا" تحصیل ڈیرہ غازی خان سے ہے۔انہوں نے محکمہ ٹیلی فون میں بھی اپنی ملازمت کے فرائض سرانجام دیے۔ان کی شاعری کی کتاب "میں تو وہ ہوں" 1998ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔

اس کتاب پر پروفیسر رشید ملغانی اور سعیدہ افضل کے تبصرے بھی شامل ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں سماجی محرومی،مسائل اور اردگرد کے رونما ہونے والے مسائل،حالات، واقعات کو حصہ بنایا۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سماج کا آئینہ دکھانے کی بھرپور کوشش کی۔اس کا اظہار انہوں نے شاعری کے ذریعے سے کیا۔یہی وجہ ہے کہ ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔اس لیے وہ بھی شعری روایت کا اہم حصہ ہے۔

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں اہم کردار بخت آور کریم کا ہے۔وہ قصبہ داجل ضلع راجن پور میں 1922ء □ کو پیدا ہوئیں۔ان کے والد سرکاری ملازم تھے۔اس لیے وہ پہلی خاتون ہیں۔جو زیور علم سے آراستہ بھی ہوئیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئیں۔

ملتان علی گڑھ اور ہوشیار پور میں والد صاحب کے تبادلوں کی وجہ سے تعلیم حاصل کرتی رہیں۔اپنی تعلیم کے بعد ٹیچر تعینات ہوئیں۔وہ 35 سال شعبہ تعلیم منسلک رہنے کے بعد " گورنمنٹ گرلز ہائی سکول نمبر 1 ڈیرہ غازی خان" سے بطور ہیڈ مسٹریس ریٹائر ہوئیں۔ایک خاتون کا علم کی طرف راغب ہونا اس ماحول میں انہونی بات تھی۔مگر ان تمام تر کامیابیوں کا سہرا آپکے والد کو جاتا ہے جنہوں نے سمجھداری دکھا کر ان کو تعلیم کی طرف راغب کر دیا۔

ان کو ادب سے فطری شغف تھا۔اردو اور سرائیکی زبانوں میں لکھا کرتی تھیں۔ان کا سرائیکی کلام پر مشتمل کتاب "اٹک مٹک دیداں 1984"ء □ میں شائع ہوئی اور اردو کلام پر مشتمل ان کی کتاب "پھول پھول خوشبو" بھی شائع ہو چکی ہے۔انہوں نے نثر کے حوالے سے بھی کام کیا ہے۔اور انہوں سور ؟یسین کی تفسیر بھی لکھی تھی۔

ان کے بیٹے طفیل عرشی ؟ اور ان کی بیٹی عمرانہ پروین عنبر ؟ کی شعری و ادبی خدمات بھی نا قابل فراموش ہیں۔وہ خواجہ فرید اکیڈمی آف پاکستان کی بھی ممبر تھیں۔21

فروری 1984ء □ کو دل کا دورہ پڑنے سے جان بحق ہوگئیں۔ان کو قصبہ داجل میں ہی دفن کیا گیا۔ان کے جنازے میں سینکڑوں لوگوں نے شرکت کر کے انہیں روحانی تسکین پہنچائی۔انہوں نے نعتیہ شاعری جدید انداز سے کر کے لوگوں کو چونکا دیا۔ان کی شعری خدمات کو ڈیرہ غازی خان کی خدمات میں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ان کی شاعری میں سماجی و رومانوی موضوعات اور کئی ایسے سوالات سامنے آتے ہیں۔جن سے انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ڈیرہ غازی خان کی ادبی روایت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ڈیرہ غازی خان کی جدید شعری روایت میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا بھی نام سرفہرست ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ڈیرہ غازی خان کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئیں جہاں پر لڑکیوں کی پیدائش تو قابل برداشت تھی لیکن لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ابھی تک فروغ نہ پایا تھا۔ایسے ماحول میں جہاں پر نصابی تعلیم بھی ممکن نہ ہو وہاں غیر نصابی تعلیم کی باتیں سوچنا بھی مشکل ہوتا ہے۔مگر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ پر قسمت کی دیوی مہربان نکلی۔جس نے نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر نصابی تعلیم کی راہیں ہموار کیں۔پرائمری میٹرک اور ڈگری کالج سے ایف ایس سی کے بعد نشتر میڈیکل کالج میں ایم۔بی۔ایس میں داخلہ لیا۔

اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز کیا۔ان کا پہلا شعری مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو" جولائی 2007ء □ میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔اس کے بعد "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں"،"اور شام ٹھہر گئی" اور" پھول خوشبو اور تارہ" شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں غزل،نظم کو کامیابی سے برتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں انفرادیت،عورت اور رومانویت پسند ہونے کے جواز کو خوبصورتی سے نبھایا ہے۔اس لیے عورت کے جذبات، کیفیات،حسیات اور اظہار بات کا ایک ایسا جہاں دکھائی دیتا ہے۔جہاں رومانویت دھیرے دھیرے رقصاں دکھائی دیتی ہے۔جہاں چوڑیوں کی کھنک بھی سنائی دیتی ہے۔جہاں آنچل کا پلو مچلتا دکھائی

دیتا ہے۔ جہاں حیا شرماتی اور ادا لبھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں نسوانی، روحانی جذبے کے تحت پائی جانے والی خواہشات طلب و تقاضات، کشمکش و مبارزت، حریت و انقلاب اور عشق و جذبے جیسے عوامل کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ نے ایک عورت ہو کر عورت کو سمجھنے کا دقیع کام خود بھی کیا ہیا اور دوسروں کے سامنے بھی پیش کیا ہے۔

کوئی تو ہے مکین اور کوئی تو ہے بسا ہوا
جو دل میں ایک درد ہے دبا ہوا چھپا ہوا

بدلتے ہوئے موسموں میں گر بھلا دیا مجھے تو کیا
میرا تو شعر ہے تیری یاد میں ڈھلا ہوا

تجھے نئی مسافتیں نصیب ہوں دعا مری
گو میرا ایک پل سراب میں سجا ہوا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں شعریت، رعنائی اور ترنم کی کیفیات کے ساتھ ساتھ نسبت و حرفت، تعظیم و تکریم اور عقیدت و احترام کے جذبات بھی بھرپور انداز میں جلوہ افروز دکھائی دیتے ہیں۔ موضوعاتی اور غیر موضوعاتی شاعری جہاں داخلی اور خارجی محرکات پیش پیش ہوتے ہیں۔ وہاں برتنے کا انداز بھی اپنا دکھائی دیتا ہے۔

داخلی محرکات غیر موضوعاتی اور غیر موضوعاتی شاعری کا حسن نکھارتے ہیں جبکہ خارجی محرکات موضوعاتی رچاؤ کی صورت بناتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری نے غزل کی روایت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈیرہ غازی خان کی جدید شعری روایت میں ان کا ایک الگ مقام ہے۔ انہوں نے اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے دور جدید میں عورت کے سلگتے سسکتے اور گھٹتے ہوئے

جذبات کو اپنی شاعری کے ذریعے زبان عطا کی ہے۔ فرسودہ روایات سے پیدا کردہ حبس زدہ ماحول کی عکاسی اور عوررت کی بے بسی کا اظہار نام نہاد معاشرتی اقدار کے خلاف جہاد ہے۔

حوالہ جات

1۔ انور صابر، ڈاکٹر، اردو غزل کا ارتقاء (لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ،2002)ص18۔

2۔ عارف عبدالمتین ، پروفیسر ، اردو جنرل (لاہور: پبلشرز میوزیم ، اردو بازار 1989)ص14۔

3۔ تبسم کاشمیری ، ڈاکٹر، تاریخ ادب ارد و (لاہور :سنگ میل پبلی کیشنز، 2006)ص215۔

4۔ فرمان فتح پوری ، ڈاکٹر، اردو ادب کی فنی تاریخ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 2003)ص144۔

5۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،تاریخ ادب اردو(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2006)ص 265۔

6۔ مسعود حسین خاں،مقدمہ تاریخ زبان اردو(علی گڑھ: سیر بک ڈپو،1970)ص 230۔

7۔ عبادت بریلوی ، ڈاکٹر ، غزل اور مطالعہ غزل (کراچی:انجمن ترقی اردو ، 1956)،498۔

8۔ حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو نظم معریٰ اور نظم آزاد (دہلی: شعبہء اردو جامعہ ملیہ، 1982ء)ص505

9۔ نصرت چوہدری، ڈاکٹر، فیض کی شاعری کا ایک مطالعہ (لاہور: ایچ وائی پرنٹرز،

1987)ص135۔

10۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، پاکستانی اردو غزل،، ایک اجمالی تعارف‘ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،1985)ص130۔

11۔ سلیم احمد، ہجر کی رات کا ستارہ (لاہور: نیا ادارہ،1972)ص95۔

12۔ جمیل یوسف، ادبی مضامین (اسلام ا?باد: کتاب گھر،2005)ص131۔

13۔ فتح محمد ملک، تعصّبات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،1991)ص301۔

14۔ رشید امجد، ڈاکٹر ، پاکستان کی اردو شاعرات (راولپنڈی : ادارہ عبارت ، 1997)ص100۔

15۔ سرور الہدیٰ، نئی اردو غزل (لاہور: حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس،2015)ص 163۔

16۔ غلام ا ?سی رشیدی ، اردو غزل کا تاریخی ارتقا (لاہور: طیب شمشاد پرنٹرز ،2015)ص299۔

17۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو (ڈیرہ غازی خان: فرید ادبی سنگت،2007)ص22۔

باب سوم

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں کا فکری وفنی جائزہ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں کا فنی وفکری جائزہ

الفاظ خیالات کے پیکر بھی ہوتے ہیں اور اس کا نقاب بھی انہی کی مدد سے شاعر جذبے کی شدت اور خیال کی تازگی کو نکھارتا ہے۔ یہی الفاظ بقاء □ حاصل کر کے انسانی زندگی کو رواں دواں رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی الفاظ جب روایتی چلن سے گھسے پٹے ہوتے ہیں۔تو زندہ حقیقتوں کی بجائے مردہ خیال بندے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ احساس کے خلوص اور انفرادیت کو برقرار رکھنا آج کی شاعری کا اہم مسئلہ ہے۔ اردو شاعری میں یہ سوال غزل کی عظیم الشان روایت کی بناء □ پر اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے کیوں کہ غزل میں ہندوستانی اور ایرانی ادبیات کی مدد سے اپنی مخصوص روایت اور مزاج الفاظ اور دوہرے الفاظ میں جب خیال بندی اور پرانی باتوں میں بات پیدا کرنا ہنر سمجھا جانے لگا تو اس کی دنیا اور بھی محدود ہو گئی یہی وجہ ہے کہ غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ہر دور میں اپنے اندر تبدیلیوں کی موجب ہوئی۔

نظم اپنے جدید دور میں ڈھلنا شروع ہوئی تو اس نے اندرونی طور پر بہت سی تبدیلیوں کو جنم دیا۔آج کے شاعر کے سامنے سب سے دشوار سوال یہ ہے کہ دنیا ایک تہذیبی انحطاط سے نکل کر انسانی اقدار کی ایک نئی ترتیب تک لے جانے والے عبوری دور میں ہے اور ایسی بہت کم اصطلاحیں اور الفاظ باقی رہ گئے ہیں جو مشترک ہوں اور عام طور پر ایک تصور ظاہر کیے جاسکیں۔

یہی وجہ ہے کہ شاعری میں سماجی آہنگ ، آزادی ، انفرادی دنیا غرض وہ تمام معاملات جو انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں شاعری کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ انہی جدید شاعروں میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی ایک ادبی مقام رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری میں مصرعہ لفظوں کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پروئے ہوئے ہیں اسی لیے نامعلوم سی اداسی نے چڑیلوں کی طرح اس کی غزلوں اور نظموں میں اپنے گھونسلے بنا لیتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ شاعرہ نجمہ شاہین کھوسہ ایک عمر کی رفاقت کے بعد اس اداسی سے بھی مانوس ہو چکی ہیں۔اور اسی فضاء □ میں رہنا پسند کرتی ہیں۔جس سے نہ صرف ان کی تخلیق کے سرچشمے پھوٹتے ہیں بلکہ کائنات کے مطالعے میں بھی وسعت رکھتی ہیں مثلاً ان کی نظموں کے حوالے سے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کچھ اسطرح رقمطراز ہیں:

"ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں نے مجھے یقیناً متاثر کیا ہے۔
ان کی کچھ نظمیں یقیناً بڑی نظمیں ہیں۔جنھیں سراہا جانا چاہیے۔محبت ایک پاک جذبہ ہے اس میں صوفیانہ عشق کی آسمان بدست بلندی سے لے کر تعشق اور ہوس کے تحت الثر اء □ تک شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ نجمہ شاہین کی نظموں میں یہ جذبہ ان دو بے نہایت حدود کے درمیان اس سطح مرتفع پر قائم ہے جسے ہم "من وتو" کا علاقہ قرار دے سکتے ہیں۔"(1)

دریا کے کنارے رہنے والی لڑکی کی آنکھوں میں اور لہروں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا کیوں کہ گھر کے کنارے بسنے والا دریا اچانک آنکھوں سے بہنے لگتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں سیلاب آتے ہیں مگر یہ سیلاب دل کی بنجر زمینوں کو زرخیز اور شاداب کر جاتے ہیں یہی زرخیزی اور شادابی نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں بھی شادابی اور خوش دامانی کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری مجموعوں کے ٹائیٹلز پر نجمہ شاہین کھوسہ کی جو تصاویر

ہیں ان کو دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ اسے کوئی دکھ رہا ہوگا مگر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کو پڑھ کر اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے کہ وہ خوشیوں سے کبھی آشنا رہی ہونگی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ذات میں ایسا لگتا ہے کہ دکھ ان کے ہاں موجود ہیں مگر دکھ چھپانے کا ہنر ہر لڑکی کو آتا ہے جو اپنے دکھوں کو چھپا کر لبوں پر مسکراہٹ جاری کرنا جانتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تخلیق کے لمحوں میں نجمہ شاہین کھوسہ کی آنکھیں ان سے وفا کرتی ہوں گی۔ ورنہ ایسی شبنم جو پھولوں کی پتیوں پر ہمیں دکھائی دیتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں گاؤں کے میلے میں پہلی بار کھلونوں کو دیکھنے والی بچی کی طرح سادہ ہے۔ یہی حیرت ان کی نظموں میں بھی ملتی ہے۔ وہ جس دل پذیر لہجہ میں اردو بولتی ہیں وہی دلپذیر لہجہ ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ شاعری مکمل سچ اور مکمل سادگی کا مظہر ہے اس میں جھوٹ کی آمیزش زیرو فیصد ہے کوئی دورخی نظر نہیں آتی جس طرح عموماً لوگوں کی شاعری میں ان کی زندگی سے الگ تھلگ کوئی چیز نظر آتی ہے مگر ان کے ہاں ایسا بالکل نہیں ہے۔

نجمہ کو ان کی شاعری میں با آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے اس سے شاعری میں بھی سامنے بیٹھ کر ملاقات کی جا سکتی ہے۔ اسے شاعری میں ہی دریافت کیا جا سکتا ہے جیسے ان کے سامنے بیٹھ کر گپ شپ لگائی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری میں اداسی کے رنگوں سے جو پینٹنگ ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ چھاپ نظموں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کے خدوخال شاعری میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں زندگی اور شاعری اس کے نزدیک کبھی دو الگ چیزیں نہیں ہیں وہ شاعری کی فضاء میں ہی اپنے روز و شب بسر کرتی ہیں۔ انہوں نے ایک سلجھی ہوئی گھریلو عورت کی طرح اپنی زندگی کی تمام یادوں کو شاعری کی الماری میں سلیقے سے رکھا ہوا ہے۔

ان کی شاعری پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابھی تک اپنے اردگرد کے ماحول، موسموں، راستوں اور چیزوں سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ ناہموار راستوں پر چلنے کا ہنر تو سیکھا لیکن ان کو قبول نہیں کیا ہے۔ وہ جیسا منظر نامہ اپنے اندر باہر دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ نظر

نہیں آ رہا۔

نجمہ نے اپنی شاعری میں پناہ لے رکھی ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی زندگی کے لمحات ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کے تمام تجربات ان کی شاعری میں عیاں ہیں۔ وہ ان تجربات کو نہ صرف غزلوں میں بیان کرتی ہیں بلکہ نظموں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں سدابہار ہیں وہ اپنی نظموں میں ہر اس چیز کو بیان کرتی ہیں جس سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے اسلوب کی سادگی ہی ان کے کلام کا حسن ہے انہوں نے اس حسن کو نسبتاً رواں دواں بحور میں لکھا ہے جن میں خاص آہنگ اور موسیقیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں ایسا لگتا ہے کہ ایک منزل کا سفر ہے اور یہ سفر بھی ایسا ہی ہے جس میں گمان کو یقین اور یقین کو گمان میں بدلتے دیکھا اور یقین کی تبدیلی شاید وقت کی ضرورت تھی اور لگتا ہے کہ وقت اتنا طاقتور ہے کہ اسے صرف مہرے کے طور پر استعمال کرتا ہے جب وہ استعمال ہو جاتی ہے تو اس کے بعد وہ یہاں سے چلا بھی جاتا ہے مگر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یقین اور گمان کا یہ سفر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ دونوں ایک ہی منزل کے مسافر لگتے ہیں جو آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کے عادی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں نے اپنے وقت کا تعین کیا ہوا ہے۔ اس حوالے سے امجد اسلام امجد یوں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں آج کل بیشتر خواتین شعراء کے مقابلے میں ایک مخصوص نوع کی بے باکی ایک قسم کا Restraint پایا جاتا ہے۔ بات کو نہ کہتے ہوئے بھی کہہ جانے کا یہ رنگ خوشنما بھی ہے اور دلکشا بھی۔ غزل یوں تو ہے ہی بہت دھوکے باز قسم کی صنف سخن لیکن اس کے بعض مضامین تو ایسے ہیں کہ جو مرد شاعروں کے ہاں تو بظاہر بڑے سیدھے سادھے اور Predictable سے دکھائی دیتے ہیں۔"(2)

مگر ایک سوال ہی تو ہے، رواں دواں، دکھ اور سکھ کے لمحوں کا کردار کے بدلتے

مناظر، آس، ناامیدی چاہت اور ضرورت کا، مگر اس کے ساتھ ہاں اور ناں کا عشق وحشت کا الہام اور یقین کا۔ یہ سب ایک کہانی کے کردار ہیں۔ ان کرداروں میں سے کچھ امر ہیں۔

نجمہ شاہین کی نظموں میں اکثر عشق و محبت کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ عشق ایسا عشق نہیں ہے کہ جس کو ختم ہو جانا ہے بلکہ لافانی عشق جو سانسوں اور جسموں کے اندر بسا ہوا ہے۔ عشق و محبت کا یہ موضوع ہمیں اکثر نظموں میں عیاں ملتا ہے یہی عشق تو ہے جو انسان کو بلندیوں پر لے جاتا ہے مثلاً: پھول سے بچھڑی خوشبو میں ایک نظم "عنوان محبت" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"وہ یاد میں کسی کی ہولے سے مسکرا دینا
بیٹھے بیٹھے کبھی خود کو یونہی رلا دینا

وہ نگاہ میں دنیا کے لیے اجنبیت کے سائے
اور کسی ایک شخص کے لیے محفلیں سجا دینا

خواہشیں امیدیں سب اسی سے وابستہ
خیالوں میں ارمانوں کے میلے لگا دینا

اگر چہ زیست کی ہر ساعت ہے گھائل
سوچ کے مگر اس کو روح کا ہر زخم مٹا دینا

عشق والفت کے جذبے اقلیم سخن کی جان ہوا کرتے ہیں۔ اگر چہ جدید ادبی، عصری رویوں نے انہیں مسخ کرنے کی کوشش کی جنہیں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری میں اس موضوع کو بڑی کامیابی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔

حصول محبت کی اولین شرط یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس معیار پر لے جائے

جہاں پہنچ کر انسان محبت کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ وہ اس بات کا استحقاق جتا سکتا ہے اس کو اپنے محبوب سے بھی شدید محبت ہے۔ اس لیے وہ پہلے خود کو وفاؤں کا خوگر ہونا ثابت کرتا ہے اس کے بعد اس کی یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ میرا محبوب بھی میری طرح وفا کا استعارہ ہو جب اسے محبوبہ کے اندر یہ خصلت پائی ہوئی نہیں ملتی تو وہ پھر مجبوراً بیان ہو جائے گا۔ یہی تاثر ہمیں انکی نظموں میں ملتا ہے مثلاً نظم "عشق آتش" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

" کیا تم نے کبھی دیکھا ہے
ڈوبتے ہوئے سورج کو
کہ جس کی شفق کی لالی
ان انگاروں کی مانند ہے
جو پھولوں کو جلا کر راکھ کر دیں
یہ عشق بھی ایک آتش ہے
اسی ڈوبتے سورج کی طرح
جو جلا دیتا ہے
ساری خواہشوں کو
حسرتوں کو
سب غنچوں اور پھولوں کو۔۔۔۔!"

عام طور پر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ عشق وہ ہے جو انسان کو مجنوں اور دیوانہ بنا دے اور حواس باختہ کر کے مخبوط الحواس بنا دے اور انسان مجذوب ہو جائے۔ یہ عشق کے حوالے سے ایک منفی تاثر دیا جاتا ہے جو عشق کے حسین چہرے کو بھی داغدار کر رہا ہے۔ جب کہ عشق ایسا کبھی بھی نہیں ہے اسکی حقیقی صورت یہ ہے کہ عشق ایک عنبر ہے، ایک خوشبو ہے جس کی مہک پورے آنگن میں پھیل جاتی ہے اور اپنے اردگرد محبت امن کے پھول اگاتی ہے۔

یہی عشق کی مہک نہ صرف پورے معاشرے میں بلکہ پورے تن من کو مہکائے

رکھتی ہے۔عشق کے بارے میں ان کی نظموں میں یہ تاثر کچھ اس طرح سے ہے مثلاً "نظم آزمائش عشق کا بوجھ اٹھا" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"اے میرے پاک خدا
تو مجھ کو نہ آزما
کیا تجھ کو معلوم نہیں
ہے میری اوقات کیا
وہ تو پیغمبر تھے
جو تیری آزمائش کا بوجھ اٹھا سکتے تھے
وہ تو بادشاہ بشر تھے
جو پتھریلے کہساروں میں
دردِ جدائی سہ سکتے تھے
میدان عرفات میں چالیس سال تک
آنکھوں کو لہو لہو کر سکتے تھے
میں تو مالک ایک ذرہ ہوں تیری خاک کا
جسے جب چاہے ہوا کہیں سے کہیں رکھ دے"

عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس میں بہت سے آزمائشات سے گزرنا پڑتا ہے۔آزمائش سے گزر کر انسان عشق کی حقیقی منزل تک پہنچتا ہے مگر عشق کا ایسا لافانی جذبہ ہمیں ان کی نظموں میں جا بجا ملتا ہے۔یہی جذبہ انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی طرف لا کھڑا کرتا ہے۔

نجمہ شاہین کی نظموں میں عشق کو ایک طاقتور جذبہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے جو ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں اور بھی کئی داستانوں میں موجود ہے جو آج بھی اس حقیقت کو عیاں کیے ہوئے ہے۔محبوب حسن اور احساس حسن کا مرقع ہوتا ہے مثلاً ایک نظم " کیا ملا محبت سے" کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"بول دیوانے دل
بول!
کیا ملا محبت سے
ہجر کی وحشت سے
اس دکھ کی شکایت سے
روز کی اذیت سے
دنیا کی نفرت سے
خود کو بھلا دینے سے
خود کو مٹا دینے سے
روح کی تجارت سے
دل کی بغاوت سے
ہاں
کیا ملا تجھے محبت سے"

عشق اور محبت میں تمام تر دار و مدار حسن پر ہوتا ہے۔یہی سبب ہے کہ وہ محبت سے وفا کرنا لازمی نہیں گردانتا لیکن محبوب پل پل اس کی یادیں دل میں بسائے پھرتا ہے۔عشق کا روگ بھی عجیب و غریب ہوتا ہے جو تغیر حال کا باعث بنتا ہے۔اگر یہی عشق کامیاب ہو جائے تو صحرا کو بھی گلزار بنانے پر قادر ہے اگر یہی عشق ہزیمت سے دوچار ہو تو پھر گلزار کو بھی صحرا میں ڈھال دیتا ہے۔

عشق کی مثال ایک چراغ کی مانند ہے جو شب ظلمت کے راج کو ختم کر دیتا ہے۔نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں عشق کی نظمیں ہمیں شعری مجموعے میں ملتی ہیں۔مگر یہ جذبہ قاری کو ایک نیا احساس دلاتا ہے مثلاً نظم "محبت اک ضرورت ہے" کے چند اشعار ملاحظہ

ہوں:

"بہت سے لوگ کہتے ہیں
کہ رشتے گر ضرورت سے جڑے ہوں تو
وہ اکثر ٹوٹ جاتے ہیں
ضرورت پوری ہونے پر ضرورت منداک دوجے سے
اکثر روٹھ جاتے ہیں
مگر یہ بھی حقیقت ہے
کہ یہ دنیا ضرورت ہے
یہاں پر سانس لینا، بات کرنا
ساتھ چلنا اور دھڑکنا
ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہونا
اور پھر چپکے سے رونا
یاد رکھنا، بھول جانا"

آج کے پر آشوب عہد میں محبت اور عشق کی شمعیں گل ہو چکی ہیں۔ یہ نازک سا جذبہ اپنی آخری سانس لے رہا ہے۔ مگر نجمہ شاہین نے اس جذبے کی جس طرح رونمائی کی ہے وہ بہت شاندار ہے۔ کوئی بھی دوسری عورت شاید اس کا اظہار نہ کر سکے عشق و محبت میں وفا کو سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے۔

اگر وفا کا دامن اس جذبے کے اندر نہ ہو تو یہ جذبہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے مگر انہوں نے اس جذبے کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں یہ جذبہ اپنے خالص روپ میں موجزن ہے مثلاً نظم "یہ عشق کی بستی بسانے والو" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"یہ عشق کی بستی بسانے والو

مری جو مانو تو لوٹ جاؤ
یہاں تو حاصل فقط زیاں ہے
یہاں بھٹکتے ہر اک مسافر کے پاس دکھ ہے
اب ان کی بھی تو اساس دکھ ہے
اے خواب دنیا بسانے والو
وفا کے سپنے سجانے والو"

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نزدیک محبوب کا وصل نصیب والوں کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن انکے ہاں محبوب کیقرب کو حاصل کر لینا ہی محبت نہیں بلکہ محبوب کی خوشی کی خاطر اپنی خواہشات کو قربان کر دینے کا نام محبت ہے۔ اپنی نظم "تو میرا حرف دعا" میں لکھتی ہیں۔

" کونسی شاخ پر
کونسا گل کھلے
ہے نصیب کی بات یہ
نصیب کے یہ فیصلے
تو ہم سفر نہیں
غم کی یہ بات سہی
مگر اٹھتے ہیں
ہاتھ یہ
کہ
تجھ کو ہر خوشی ملے"

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی گوشت پوست کی انسان ہیں جہاں عشق و محبت کی بلندیوں اور نعمتوں سے آشنا ہیں وہیں محبت میں ہونے والی ناکامی ان مضر اثرات سے بھی واقف ہیں۔ حن سے زندگی غم و آلام کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ خواب ٹوٹتے ہیں تو خواہشات

کا زندہ جنازہ نکل جاتا ہے۔ان کی نظم "اب تو خواب روتے ہیں" میں کچھ ایسے ہی جذبات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

"زیست کی تپتی دھوپ میں اداسی کی چادر تانے
خوف نے کچھ یوں گھیرا ہے
کہ ہم نیندوں سے ڈرتے ہیں
زندگی پر کچھ ایسے عذاب اترتے ہیں۔
کہ ان عذابوں نے خوف سے
دن کے طلسم میں جکڑے ہوئے
ہمارے ٹوٹے سہمے سے وجود
شام کے ڈھلتے ہی
ریزہ ریزہ بکھرنے لگتے ہیں
اور ڈوبتی راتوں کو
گہری نیندوں سے ڈرتے ہیں
کہ اب تو خواب بھی روتے ہیں"

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی محبت میں پختگی ہے۔جھوٹ کی آمیزش نہیں ہے۔وہ جس سے محبت کرتی ہیں اس کی یاد اور اثر کا برملا اظہار کرنے میں سچ اور خلوص کا سو فیصد سہارا لیتی ہیں ان کے نزدیک محبوب کی یادیں اور محبت کا سچا جذبہ ہی ہیجو زندگی کی شمع کو روشن رکھتا ہے۔مثلاً ان کی نظم "ہم ایسے تو نہ تھے" میں شاعرہ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

"اور یاد کے بند دریچوں پر
ایک راہرو کا دھندلا چہرہ
اپنی کہانی سناتا ہے

ہو کے اس عالم میں خاموشی توڑتی اس کی صدا
گونجتی ہے ذہن و دل میں
بس یاد کے چند لمحوں کے سہارے
عمر رواں ڈھل رہی ہے
گردش دوراں میں
چپ چاپ سلگتے ہیں
زیست کی شمع جل رہی ہے"

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں محبت ایک پاکیزہ اور مقدس جذبہ ہے ان کے مطابق خود انسان کو محبت سے تخلیق کیا گیا ہے۔محبت ایک انجمن ہے،محبت زندگی ہے۔محبت احساس ہے اپنے ہونے کا اور دوسروں کو احساس دلانے کا وہ توانا جذبہ ہے جو زندگی کو جینے کا سلیقہ بخشتا ہے۔اپنی نظم "پاکیزہ جذبہ محبت" میں بہت خوبصورت انداز میں محبت کے جذبہ کی تصویر کشی کرتی ہے۔

"جس نے تنہائی میں سجائی ہیں انجمنیں
یہ ہے وہ جذبہ
کہ جس کے سبب
تجھ سے بچھڑ کے بھی
میں نے تجھ کو آس پاس محسوس کیا ہے
جس میں ڈوب کے میں نے
اردگرد بکھرے لاتعداد دکھوں کو بھلا دیا
اس جذبے کے سبب
نفرت کی آندھیوں میں مہرووفا کی شمع کو جلایا
مایوسیوں کو بھلا کے جس نے سبھی کو جینا سکھایا

ہم جیسے کم نصیبوں کو ہنسنا سکھایا"

نجمہ شاہین کھوسہ کے پہلے شعری مجموعے میں پہلی پانچ نظمیں "میری شاعری"، "دعائے بے اثر"، "کون بچھڑے ہوؤں کو ملائے"، "تو میرا حرف دعا" اور "ملاقات آخری" میں محبوب سے بچھڑنے اور محبت میں ناکامی کے جذبات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

دوسرے شعری مجموعے "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں فطرت کی منظر کشی بھی ہے۔ دیہاتی رواج، ذاتی حالات، چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات نگاری اہم موضوعات کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان کی تمام شاعری عشق میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس مجموعے کے دیباچے میں خود لکھتی ہیں۔

"خلوص، چاہت، محبت، وفا سب اس گونگے اور بہرے عشق میں رائیگاں ہیں۔ اور جب کبھی شعور پر یہ منکشف بھی ہو تب بھی عشق اندھا بہرہ ہے۔ عشق کو تو بس ایک پیکر چاہیئے پوجنے کے لیے اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ پیکر کیسا ہے۔ اس کا طلب گار بھی ہے یا نہیں۔ اسے تو سارا سروکار اسی پیکر سے ہے اور جب وقت کا دیوداس اس سے وہ پیکر چھین لے تو عشق کا انجام صرف گور رہ جاتا ہے کہ اسے بھلا اس پیکر کے بغیر بقاء کیسے ملے"(13)

"میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" کی پہلی نظم کا عنوان "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" ہی ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں جو عشق میں پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

"میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
جب اس کی یادوں کے جھروکوں میں
میں خیالوں کا ریشم بنتی ہوں
اور وہ ریشم کھل کے بکھرتا ہے

میری تخلیق بکھرنے لگتی ہے
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں"

مذکورہ بالا اشعار سے یہ ظاہر ہے کہ شاعرہ نے مشکلات کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ عشق کی راہ میں آنیوالی مشکلات اسے خوف میں مبتلا نہیں کرتیں بلکہ مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرتی ہیں۔

عشق کا جذبہ کبھی محبوب کی صورت میں سامنے آتا ہے تو کبھی اس دھرتی سے عشق کرتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی نظموں میں عشق کو شاندار طریقے سے پیش کیا ہے ان کی نظموں میں ہمیں اکثر جگہ ان کی نمائندگی دکھائی دیتی ہے مثلاً ان کا شعری مجموعہ "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" کی نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"پھر رت یہ جدائی کی
میرا گیت نہ ہو جائے
کہیں ساز محبت ہی
ریت نہ ہو جائے
منظر یہ بچھڑنے کا
نہ آنکھوں میں ٹھہر جائے
پھر پھول کی خوشبو
نہ ہواؤں میں بکھر جائے"

یہ عشق ہی ہوتا ہے جو انسان کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتا ہے جب انسان بے وفائی، اور دھوکے کی وجہ سے اس دنیا سے کنارہ کشی کا سوچتا ہے تو اس کے اندر ایک جذبہ رونما ہوتا ہے۔ وہ جذبہ عشق کا ہوتا ہے یہی عشق اس کو منزلیں پار کرواتا ہے۔ عشق ہی سے انسان اپنے اندر کی صلاحیتوں کو پہچاننا جانتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اردو میں بہت سے شعراء نے اپنی شاعری میں اس جذبے کو شاندار

طریقے سے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری میں عشق ومحبت کو شامل کیا ہے مگر ان کی شاعری میں عشق ومحبت بہت سی منزلوں کو پار کرواتے ہیں۔ان کی اکثر نظموں میں اس کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ اس رنگ میں رچ بس گئی ہے اور اسی جذبے کے ذریعے سے وہ اپنی نظموں کو سہارا بنا کر لوگوں کو اس کی اہمیت سے آگاہ کرنا چاہتی ہے۔

مثلاً ان کی نظم " کون کہتا ہے محبت عظیم ہے " کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کس نے کہ دیا
" کہ محبت عظیم ہے
محبت تو بس چند بے ترتیب سے
لفظوں کی ترمیم ہے
محبت جب رگ وپے میں اتر جائے
اور مانند خنجر دل میں اتر جائے
تو لہو مانگتی ہے
جب آنکھ کی دھول بن جائے
اور رشتوں کی بھول بن جائے
تو آبرو مانگتی ہے"

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری محض ایک متعین چہرے کی تصویر نہیں ہے بلکہ ایک ذہنی، جذباتی اور معاشرتی واردات بھی ہے۔نظموں میں تخلیقی، جمالیاتی،لسانی، ذہنی،تہذیبی، اور تاریخی تناظر کی حد بندیوں سے یکسر آزاد اور بیک وقت ان سب کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ایک حساس دل عورت ہونے کے ناطے آپ نے اپنی نظموں میں ان جذبوں کو بھی بیان کیا جس کو ایک عام عورت بیان کرنے سے ڈرتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں میں خیال کی تجسیم، یا کسی جیتے جاگتے، متحرک اور فعال پیکر کی تجرید کے مسائل یہاں بے معنی ہو جاتے ہیں۔اسکی وجہ شاعری میں تجربے کی کلیت ہمیں اپنی بصیرت کے ادھورے پن کا شکار نہیں ہونے دیتی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ شاعری ایک نئی بوطیقا کی طلب گار ہے۔کبھی ایک چیلنج کی صورت میں تو کبھی ایک ناگزیر فکری ضرورت کے طور پر۔اس لیے نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں عشق ومحبت کے عناصر ہمیں جگہ جگہ ملتے ہیں۔

مثلاً ان کا شعری مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو" میں ان کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"وہ یاد میں کسی کی ہولے سے مسکرا دینا
بیٹھے بیٹھے کبھی خود کو یوں ہی رلا دینا

وہ نگاہ میں دنیا کے لیے اجنبیت کے سائے
اور کسی ایک شخص کے لیے محفلیں سجا دینا

خواہش امیدیں سب اسی سے وابستہ
خیالوں میں ارمانوں کے میلے لگا دینا

اصل میں ہر انسان اور ہر عہد کی پہچان اس کے سوالوں سے ہوتی ہے اسی بات سے کہ جواب کی جستجو میں ان سوالوں کی سمت کیا طے ہوتی ہے۔اردو نظم میں نجمہ شاہین بھی کچھ ایسے سوالات کی پہچان کرواتی ہیں، ہر عہد کی پہچان اور عکس ان کی نظموں میں نظر آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسی مسئلے کے درپیش مسائل اور ان سوالوں کی قدر و قیمت اور معنویت کو ہم کیسے تشکیل دے سکتے ہیں۔اور اس سے ہماری ذہنی حیثیت کیا ہے وہ بھی نکھر کر

سامنے آتی ہے۔ نجمہ شاہین کی شاعری بھی جن سوالوں کا مرکب ہے دراصل ان کی بساط ہمارا حال ہے اور ان کا سرا وقت جس دوسرے نقطے سے جڑا ہے اس کی حیثیت ایک امکان یا آئندہ کی ہے۔ محبت کی غالب میں ڈوبی یہ شاعری انہی کی طرح کا ایک نیا سرا ہے جس میں شاعرہ نجمہ شاہین انہی عناصر پر چل کر عشق و محبت کے نئے زینے تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے مثلاً نظم ''وہ کچھ بھی تو نہیں'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"اے نادان لڑکی
محبت کے بے آب و گیاہ صحرا میں
تو کیوں
بھٹکنے کے لیے آ گئی
محبت کے اعتبار پر
جس کو سمجھا تھا سمندر تو نے
وہ تو ایک قطرہ نادار بھی نہیں
حسرتوں کے صحرا میں
جس اعتماد کی بنیاد پر
تو زندگی سے بھٹک گئی
اور پھول سمجھ کر جس کو
خوشبو تو بن گئی"

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری اور اس کے ہم عصروں کی ذاتی رفاقت کا سبب بنتی ہے۔ اور اس طرح نجمہ شاہین کے لہجے اور صیغہ ء □ اظہار کی انفرادیت اس شاعری کا شناس نام بن جاتا ہے مگر یہ شاعری خالص ادبی معیاروں کی گرفت سے آزاد ایک ایسا ذہنی اور تخلیقی مظہر ہے جو اپنی شناخت کے لیے ہمیں بنائے ہوئے ادبی معیاروں کی توسیع اور بعض اوقات تنسیخ پر بھی مجبور کرتی ہے۔ اسی لیے تو نجمہ شاہین کی شاعری کی اپنی کچھ شرطیں

ہیں جن کو ہم ان کی شاعری میں بخوبی پڑھ سکتے ہیں۔ شاعری کو جاننا اپنے عہد اور اپنی تاریخ کی تہ میں چھپے ہوئے امکان کو جاننے کے مترادف ہے اسی لیے تو نجمہ شاہین اپنی نظموں میں عشق و محبت کا ایسا جذبہ بیان کرتی ہیں کہ یہ جذبہ ان کی شاعری میں عیاں نظر آتا ہے مثلاً ان کا شعری مجموعہ ''پھول خوشبو اور تارہ'' میں نظم ''عجیب ہوتی ہے یہ محبت'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"عجیب ہوتی ہے یہ محبت
نصیب والوں کے دل میں جب بھی یہ جاگتی ہے
تو پہلے نیندیں اجاڑتی ہے
یہ جھومتی ہے، یہ ناچتی ہے
یہ پھیلتی ہے، یہ بولتی ہے
ہر ایک لمحہ ہر ایک وعدہ کو تولتی ہے
یہ اپنے پیاروں کو مارتی ہے
صلیب ہوتی ہے یہ محبت
عجیب ہوتی ہے یہ محبت" (19)

محبت اور عشق کے جذبے کو نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں جس طرح سے بیان کیا ہے اس کو کسی اور شاعرہ کے ہاں نہیں دیکھا جا سکتا۔ شاعری اور اس لفظ کی حدیں شکست، ہزیمت، نارسائی، بے حصولی اور پشیمان کے عناصر شاعری میں بکثرت پاتے جاتے ہیں۔ نجمہ شاہین نے جو اپنی شاعری میں راستہ اختیار کیا ہے وہ مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اپنے شخصی آہنگ اور اپنی ذات کے اثبات کے باوجود اس سے ایک معروضی خاصے کا پتا بھی دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی جذباتی آشفتگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ نظموں میں سادگی اور سچائی کے علاوہ اس میں تاثر ملائم

اور رومانی تاثر شامل ہے۔

عشق اور محبت کے عناصر کی وجہ سے شاعری کا رنگ نکھر کے سامنے آتا ہے۔ یہ رنگ شاعری میں غالب ہے ان کی نظموں میں ہمیں جا بجا ملتا ہے جس سے رنگ اور تاثر اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً نظم ''اے عشق تیری توقیر ہے کیا'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"اے عشق تو گرد سفر بنا، تیری اور بھلا توقیر ہے کیا
تو خود ہی حسرت کا مارا، ترا خواب ہے کیا تعبیر ہے کیا

اے عشق تو بکتا رہتا ہے، کبھی راہوں میں کبھی بانہوں میں
تو بوجھ ہے دل کی دنیا کا، مرے واسطے تو جاگیر ہے کیا؟

اے عشق مزار پر رقص ترا، اور کتنوں پر ہے عکس ترا
تو بجھتے دیے کا دھواں ہے بس، تو کیا جانے تنویر ہے کیا

نجمہ شاہین اپنی شاعری میں سخت کوشی ، جو بے نام مسافت، گلیاں دھوپ دروازے سے ہوتی ہوئی ملامتوں کے درمیان تک پہنچی، بحیثیت نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت اور اس شخصیت کے تخلیقی اظہار دونوں کتھارسس کا ذریعہ ہیں۔ عشق و محبت میں شکست ، ہزیمت، انا رسائی بے حصولی، پشیمانی، رسوائی اور ذلت کا خوف، عشق و محبت کی بے توقیری، نیلامی اور دنیا کا اس خالص جذبے کے لیے مضحکہ خیز سرد مہر رویہ جیسے عناصر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں عشق و محبت کے رنگ کو گہرا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی عشقیہ پینٹنگ میں تمام تر مشکلات کے باوجود نجمہ شاہین کھوسہ کا عشق کے معاملات کا بے باکانہ اظہار صنف نازک کی طرف سے جذبات کا کھلم کھلا اظہار بھی ہے۔ اور ذلت و رسوائی کے خوف سے لاکھوں خواتین کے دلوں میں دبی ہوئی عشق و محبت کی چنگاریوں کو اظہار دینے کے لیے ایک بھرپور اور توانا تحریک بھی ہے۔ ان کے نزدیک عشق و محبت زندگی کی علامت ہیں۔ اس لیے

ان کے عشقیہ اشعار معاشرتی زندگی کے لیے رونق اور دھندلے چہرے کو غازہ فراہم کرتے ہیں۔ زندگی جینے کا یہ ہنر انہیں معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف لڑنے کے لئے اکساتا ہے۔ ان کے نزدیک عشق و محبت جیسے جذبات کا فروغ ہی زندگی کا جنم ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری یہاں ایک ایسے واقعے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو جاری ہے اور جاری رہنے والی ہے اس طرح یہ عہد ان کی شاعری میں پوری سائیکی اور تاریخ کے تحرک کا حصہ بن جاتی ہے۔ نجمہ شاہین کی نظموں میں جہاں عشق و محبت کے موضوعات پائے جاتے ہیں وہاں ان کی نظموں میں تصوف کا موضوع بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظمیں تصوف کے عناصر سے لبریز ہیں ہمیں اکثر نظموں میں تصوف کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔ تصوف میں انہوں نے خدا اور انسان کے رشتے کو اپنی شاعری کے ذریعے سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر شعراء نے اپنی شاعری میں تصوف کے موضوع کو شامل کر کے شاعری کے عنصر کو اور بھی شاندار بنا دیا ہے۔ مثلاً ان کا شعری مجموعہ ''اور شام ٹھہر گئی'' میں تصوف سے لبریز نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"اے خدا، اک دعا
اک دعا، اے خدا
آج کعبے کا دیدار میں نے کیا
آج تو نے مکمل کیا ہے مجھے
رحمتوں کو مرا یوں سہارا کیا
خاک تھی، آسمان کا ستارہ کیا
بس یہیں اب سپرد زمیں کر مجھے
اپنے ہی گھر کی اب مکیں کر مجھے"

تصوف میں انہوں نے حقیقت کے جز و اور کل میں تقسیم ہونے کے موضوع پر غور وخوض کیا۔ تصوف کے ذریعے سے انہوں نے خدا کی صفت اس کی یکتائی اور بندے کی

امتیازی صفت اور اس کی جز ویت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ کہ وہ اپنا آئینہ دل صاف کرے تا کہ اس کے اندر خدا کا نور منعکس ہونے یا بندے کو خدا میں جذب ہونے پر مائل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجمہ شاہین کھوسہ اپنی نظموں میں تصوف کے موضوع پر جب بات کرتی ہیں تو یہ موضوع اور بھی عیاں نظر آتا ہے مثلاً ان کی نظم ''حمد'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے مرے مولا، اے میرے آقا، بس اپنے رستے پر ڈال دے تو
یہ فانی دنیا کے غم ہیں جتنے، یہ میرے دل سے نکال دے تو

ہو نام تیرا ہی دل کے اندر، ہوا ذکر تیرا میرے لبوں پر
ہو اتنی سچی یہ میری چاہت، کہ عشق بھی بے مثال دے تو

کسی کو رنگ اور نور دے دے، کسی کو عقل اور شعور دے دے
تو جس کو جو کچھ بھی دیدے اے مولا، مجھے اک اپنا وصال دے تو

تصوف دراصل بندے اور خدا کے درمیان ربط قائم کرنے کی بہترین کوشش بھی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں تصوف کے ذریعے سے لوگوں کو ایک اچھا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ دراصل ان کی شاعری میں تصوف کا موضوع اس لیے بھی دیکھنے کو ملتا ہے کیوں کہ اردو شاعری میں بہت سے شعراء نے اس موضوع کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر شاعری کے اندر بہت سے رنگ بھر دیے ہیں۔ ان کے جینے اور سوچنے کا قرینہ کچھ اور ہوتا ہے۔

شاعری کے اندر احساس اور جذبات کی ایسی مہک ہے جس کو انسان صرف سونگھ کر خاموش ہو جاتا ہے ان کو معلوم ہوتا ہے کہ نجمہ شاہین ان احساس اور جذبات کے رشتوں سے بھی عاری ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نجمہ شاہین نے نہ صرف اپنے احساسات اور

جذبات کو شاعری میں سمویا بلکہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے وہ تصوف کا ذکر کر کے ان احساسات اور جذبات کو بھی علویت کی سطح پر پہنچا دیتی ہیں مثلاً ان کا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں نظم ''دعا'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے خدا تو محتسب ہے مجھ پر یہ ایک احسان کر
بھو ل کر لغزش مری یہ زندگی آسان کر

وقت کی اس دھوپ میں جلتے ہیں مرے جسم وجاں
چلچلاتے موسموں میں اپنا سایہ مہربان کر

شاعری دراصل ایک قسم کا خواب نگر ہے۔ ایک سپنا کہ بیک وقت ہم اس کا تجربہ بیداری اور نیند کی درمیانی کیفیت میں کرتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو سپنا بھی ایک طرح کی غیر اعلان شدہ بغاوت ہے جس میں فرد اور سماج کے تضادات منعکس ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب لوگ شاعری کو سننا شروع کرتے ہیں وہ بھی شاعر کے تجربے میں شریک ہوتے ہیں۔ شاعری دراصل فرد اور معاشرتی تنظیم کے ٹکراؤ سے جنم لیتی ہے۔ نجمہ شاہین شاعری لکھتی نہیں بلکہ بولتی ہیں۔ وہ شاعری کے ذریعے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانا چاہتی ہیں۔

یہ پیغام کبھی محبت تو کبھی تصوف کی صورت میں ہمیں ملتا ہے۔ تصوف کا ذکر ان کی شاعری میں خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق جوڑنے کا نام ہے۔ جس کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔ کبھی واردات قلبی، کی صورت میں تو کبھی روحانی صورت میں انسان جڑ جاتا ہے۔ قلبی و روحانی دراصل تصوف کا اہم حصہ ہے جس سے انسان خدا کے قریب آ جاتا ہے۔

تصوف ایک نظام حیات ہے جو انسانی قلوب و اذہان کی دنیاوی آلائشوں سے پاک اخوت و محبت، تحمل و رواداری بقائے باہمی کو بھی جنم دیتا ہے اور اسی طرح نفس انسانی کو

بھی اخلاقی رذائل سے پاک کر کے انسان کو بھی اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کرتا ہے۔اسی لیے ہم تصوف کو تزکیہ نفس اور باطنی تطہیر کا نام بھی دے سکتے ہیں۔اگر دیکھا جائے تو ہر انسان کے شعور اور وجدان میں اچھے و برے خیالات بھی پنہاں ہوتے ہیں مگر یہی احساسات، جذبات حصول زر وزن فعل میں اپنیا حساسات کے شعور کو دفن کر دیتے ہیں مگر نجمہ شاہین نے اپنی نظموں میں تصوف کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی اس رنگ سے ہر کوئی رنگا نظر آتا ہے مثلاً نظم ''حمد'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"جہاں جہاں گئی نظر، وہاں وہاں ملا ہے تو
ہر اک جگہ ہر اک نگر، جو دیکھیے خدا ہے تو

ہیں رنگ ونور چار سو ترا وجود کو بکو
چمن چمن دمن دمن جمال دلربا ہے تو

کہیں ہے تو بلال میں کہیں کسی جمال میں
نہ ہو کسی کا گر کوئی اسے بھی پالتا ہے تو

تصوف کے ذریعے سے انسان جب انفعالی کیفیتوں سے دوچار اور اپنے کیے پر شرمسار ہوتا ہے تو اس کے نیک جذبات لاشعور کے پردوں کو بھی چاک کر کے اس کا سہارا بنتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تصوف کا بھی بنیادی مقصد تزکیہ نفس اور قرب خداوندی ہے۔تصوف بھی ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل وصورت میں موجود رہا ہے۔کسی نے تصوف کو افلاطونیت سے ماخوذ کیا تو کسی نے بدھ مت سے ماخوذ کیا اور کسی نے اپنے نظریے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو یونانی فلسفے کی بنیاد قرار دیا۔کسی نے تو اس کو رہبانیت کی نظر بھی کر دیا۔مگر اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے انسان کو محبت اور رواداری کا درس دیا۔

اسی تصوف نے انسان کے اندر قلب ونظر کی آلودگی سے پاک کر کے بندے کو

خدا سے ملایا ہے۔اسی لیے آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دربارِ صوفیاء □ مرجع خلائق بنے رہتے ہیں۔نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں تصوف کو ان تمام نظریات سے بالاتر کر دیا۔ انہوں نے تصوف سے محبت، اخوت امن کا پیغام دیا جس سے ان کی شاعری میں شاندار رنگ نکھر کر سامنے آ گیا۔مثلاً ان کا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' میں تصوف کے اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ دعا کیوں بے اثر ہو گئی
یہ دعا کہ
جس کی منزل حسین تھی بہت
جو حرف حرف رنگین تھی بہت
یہ دعا جو کبھی
اک سلسلہ تھا کسی خواب کا
روح میں کھلے اک گلاب کا
یہ دعا جو کبھی
تھی کسی چشم منتظر کی آبرو
ملی تھی جس سے دل کی نئی جستجو

اردو شاعری میں تصوف کو زیادہ شعراء □ نے اسے موضوع سخن بنایا اور اس کو شاعری میں کامیابی سے بھی برتا گیا۔کیوں کہ سیاسی انتشار اور عدم تحفظ کا جو اس میں احساس تھا اس کو تصوف کا سہارا ملا۔اسی تصوف نے بھی برباد معاشرے کو بھی پناہ دے کر اسے خود آگاہی اور عرفان ذات کا راستہ دکھایا تھا۔اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تصوف نے اس دور میں بھی زخمی روح کو بھی امید کی روشنی دکھائی۔

اسی دور میں بامقصد طور پر زندہ رہنے کا نیا حوصلہ بھی تصوف نے دیا تھا۔مثلاً شعری مجموعہ ''پھول خوشبو اور تارہ'' کی نظم ''سلام'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"بنام شاہ شہیداں ،سلام کیا لکھوں
حقیر لفظ ہیں،مدح امام کیا لکھوں

غضب کہ نوک، سناں پر ہے کربلا کا سفر
ہر اک تیغ ستم بے نیام،کیا لکھوں

دہک رہے ہیں ہراک سمت دھوپ کے شعلے
مسافران، وفا کا قیام، کیا لکھوں

تصوف ایک کل ہے اور وجود باری تعالیٰ،حسن وعشق،فقر وغنا، بقا،تسلیم ورضا، صبر وشکر،خیر وشر اور جبر وقدر اس کے بنیادی اجزاء ہیں۔

تصوف میں قرب خداوندی اور انسان دوستی اس کا اصل منشور ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء نے اس موضوع سے انسان اور خدا کی محبت کا درس لینے کا کام کیا ہے۔ اس لیے بعض مفکر ومؤرخ تصوف کو فلسفہ سریت اور وحدانیت سے ماخوذ جانتے ہیں۔جو کہ سراسر غلط فہمی کا نتیجہ ہے مگر تصوف کا اصل منبع وسر چشمہ قرآن وحدیث ہے۔مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بھی فلسفیانہ مباحث بھی داخل ہوگئے۔اسی وجود باری کو لے کر صوفیاء کے دوگروہ میں بٹ گئے۔اس طرح ایک وجودی کہلائے دوسرے شہودی۔

وجود باری ،حسن وعشق فقر وغنا،تسلیم و رضا خیر و رضا اس کے بنیادی اجزاء شامل ہوگئے۔مگران سب میں وجود باری کوسب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔انہی تصوف کے موضوعات کو نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں اس طرح سے سمویا کہ ان کا اثر پڑھنے والوں کے دل میں اتر جاتا ہے۔ان کے اشعار کو پڑھ کر بھی انسان رہبانیت کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ خدا اور انسان کی محبت کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔مثلاً ''حمد'' نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"میری اجڑی لمبی رات سئیں
کب بدلیں گے حالات سئیں

مرا عشق ہی مذہب مسلک ہے
اور عشق ہے تیری ذات سئیں

مجھے اپنا پتا درکار ہے اب
بس اتنی سی خیرات سئیں

نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں تصوف کا موضوع اپنا کر شاعری کے اندر بھی گہرائی پیدا کردی ہے۔جس سے پڑھنے والوں کے دل کے اندر،فقر وغناء ،توکل،صبر و تسلیم وہ تمام عناصر پیدا ہوجاتے ہیں اور ان کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے جو کسی بھی انسان کے دل پر اثرات چھوڑ سکتا ہے۔

ان کے شعری مجموعہ "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" میں کچھ نظمیں "تصوف کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔حمد ونعت کے علاوہ نجمہ شاہین کھوسہ نے اس مجموعہ کلام میں دنیاوی مسائل اور عشق مجازی کے معاملات سے جیسے موضوعات سے ہٹ کر عشق حقیقی کی طرف سفر کیا ہے،عشق حقیقی کے حوالے سے ان کی ایک نظم "مجھے فرائض محبت سے آزاد کردے" ہے یہ ایک طویل اور پانچ صفحات پر مشتمل نظم ہے۔اس نظم کے ابتدائی بند کے اشعار درج ذیل ہیں:

"مرے مالک، مرے خالق
سر بسجود ہوں، معبود مرے

اپنے سجدہ ریز کو آج شاد کر دے
مرا دل اپنی معبودیت سے آباد کر دے

x x x x x x x x x

دنیا کی محبت سے مجھ کو آزاد کر دے "

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" میں خدا سے مکالموں کے حوالے سے بھی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ایک نظم "خود میرا معبود بن" کے عنوان سے ہے۔مذکورہ بالا عنوان کے تحت اپنی نظم میں اللہ کو اپنا غم خوار سمجھتے ہوئے اپنے دکھوں سے نجات کے لیے اس طرح دعا گو ہیں۔

"مرے خدا، مرے محسن، مرے تخلیق کار
تیری دنیا کے مکینوں نے
نفرت کے، حقارت کے جو داغ
میرے ماتھے پہ سجائے ہیں
ان کو تو ہی مٹا دے

تصوف کے موضوع پر تحریر کردہ چند عمدہ نظموں میں "اے مصروفِ یزداں" "دیدار کعبہ" "بارش"، " کیوں"، "ابھی نہ جا میرے چارہ گر" اور "اب کوئی نہیں" شامل ہیں۔

تاہم نجمہ شاہین کھوسہ نے اس موضوع کو جس کامیابی سے برتا ہے۔اس کی مثال نہیں ملتی۔نجمہ شاہین نے اپنی نظموں میں جہاں پر تصوف کا رنگ اپنایا ہے وہاں پر ان کی نظموں میں ہجر فراق کا موضوع بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کا یہ اعتبار ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو ایک تخلیقی آہنگ دیا۔جس سے اردو نظم میں روایت کے ساتھ ساتھ جدت کا بھی عنصر شامل ہو گیا۔

ہجر و فراق دراصل ان کی نظموں کا خاصہ ہے جس میں انہوں نے اس موضوع کے ذریعے سے نہ صرف اردو نظم سے روشناس کرایا بلکہ نئی راہیں بھی متعارف کروائیں۔عموماً شعراء □ نے ہجر و فراق کے موضوع کو نظم میں نئے طریقوں سے دیکھنے کی کوشش کی مگر نجمہ

شاہین کھوسہ نے اس میں موضوع کو جس سرے سے برتنے کی کوشش کی ہے اس سے نہ صرف ان کا فن نظر آتا ہے بلکہ شعری ذوق بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔مثلاً شعری مجموعہ ''اور شام ٹھہر گئی'' میں نظم ''موسم وصل کے استعارے میں ہوں'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"ہاتھ میں رائیگاں سی لکیریں جو ہیں
آنکھ کے دشت میں یہ جو تصویر ہے
یہ جو تعزیر ہے
آسمان پر بکھرتے ستارے جو ہیں
موسم وصل کے استعارے جو ہیں
استخارے جو ہیں
ان کو دیکھا کبھی
ان کو جانچا کبھی
تو یہ جانا میں کب ان لکیروں میں ہوں
میں کہاں آسماں کے ستارے میں ہوں"

نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں نئے اور اچھوتے موضوعات کو بھی فروغ دیا جن میں ایک ہجر و فراق کا موضوع بھی ہے۔اس موضوع کو نجمہ شاہین نے بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔اس موضوع کو متعدد تخلیقی جہتوں سے ہمکنار کرنے میں انہوں نے فنکارانہ بصیرت سے کام لیا ہے اس کو نہ صرف خارجی سطح پر شاعری میں دکھایا جا سکتا ہے بلکہ اس سطح پر دیکھ کر پوشیدہ معاملات کو بھی جانا جا سکتا ہے۔

نجمہ شاہین کو حالات نے اس قدر تند مزاج اور یاسیت کا شکار بنا دیا کہ وہ دنیا اور اہل دنیا کا مشاہدہ اور تجزیہ اپنے بنائے ہوئے تصورات اور نظریات کی بناء □ پر کرنے لگیں۔اس میں انہوں نے اپنے جذبے کو بھی اردو نظم میں سمو دیا۔ان کی زندگی جن تلخیوں اور محرومیوں کا مرقع بن گئی تھی اس کا عکس ہمیں شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔مثلاً ان کی

نظم ''دوام کرنا''، ملاحظہ ہو:

"یہ بات کہنی ہے تم سے جاناں
جو ہو سکے تو پلٹ کے آنا
جو میرے خوابوں کی کرچیاں ہیں
وہ آ کے چننا
وہ کرچیاں جن میں آج بھی کچھ نشانیاں ہیں
شرارتیں ہیں، اداسیاں ہیں
گئے دنوں کی کہانیاں ہیں
وہ دن کہ جن میں تمہیں سنا تھا
تمہارے لہجے کی چاشنی جب مری سماعت میں بس گئی تھی
جو آج تک بھی بسی ہوئی ہے"

جب یاسیت اور قنوطیت تخلیقی اور فنکارانہ صلاحیتوں میں تبدیل ہونے لگیں تو تب زندگی کے رازہائے سربستہ طشت از بام ہونے لگتے ہیں اور اسی یاسیت اور قنوطیت کے ذریعے سے فنکار آہستہ آہستہ زندگی کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ ان میں تمام تلخیوں کے باوجود اسے زندگی میں حلاوت اور شیرینی نظر آنے لگتی ہے۔ مگر نجمہ شاہین کھوسہ نے اگر ہجر و فراق کے راستے کو اپنی شاعری میں زینہ بنایا ہے تو اس میں زندگی کی ارزانی یا رائیگانی کے ساتھ ساتھ زندگی جینے کا حوصلہ بھی موجود ہے۔

انسان زندگی کے تجربات سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکے۔ زندگی کی تلخیوں، سختیوں اور الجھنوں کے باوجود زندگی سے یہ ربط اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب فنکار تاریکیوں کے بطن سے نور کشیدہ کرنے کا بھی ہنر جانتا ہو۔

جب اس روشنی سے اس کے افکار و خیالات کا افق روشن ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کو

بھی اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا رویہ نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں میں موضوعات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مثلاً ان کا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں نظم ''اک اور دسمبر گزر گیا'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

پھر دسمبر گزر گیا
پھر ہاتھوں کی ریکھاؤں میں
اک اور لکیر سج گئی
پھر اک شام اذیت اوڑھے
دھند لی رنگت آسمان پر سجائے
کسی بے بس کا تاریک مقدر بن گئی
شگوفوں نے برف کی چادر لپیٹی
خزاں ان کا ثمر بن گئی
خوابوں نے کہر تہ در تہ لپیٹی
روح کی تھکن کچھ اور بڑھ گئی"(32)

انسان جب زندگی میں نوحہ و ماتم کرنے کی بجائے غم والم کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کر لیتا ہے تو اس میں نہ صرف وہ اپنی کمزوریوں پر قابو پا لیتا ہے بلکہ زندگی کے کئی اسرار و رموز سے بھی بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے مگر حساس ہونے کے ساتھ ساتھ جس طرح سے زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں کا مقابلہ کرتا ہے وہ بھی ایک بہادر انسان کی خاصیت میں شامل ہے۔ مگر وہ زندگی کی تلخیوں سے کبھی بھی کنارہ کشی اختیار نہیں کرتا بلکہ اس سے دست و گریبان ہو کر سبک روی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔

تنہائی درد، فراق و ہجر اور تفکرات و تصورات اردو شاعری کے قالب میں ڈھل کر غمِ ذات کو بھی کائنات بنا دیا۔ نجمہ شاہین کی شاعری میں ہجر و فراق بھی کچھ اسی طرح کا عمل

کرتی دکھائی دیتی ہے۔مثلاً ''لمحہ جدائی قیامت''،نظم کے چنداشعار ملاحظہ ہوں:

"آؤ ذکر کریں ان باتوں کا
کہ
بچھڑنا تو مقدر ہے اپنا
کچھ ذکر کریں اس موسم کا
جب صبح کی روپہلی کرنوں میں
پھول جیسی مہکتی راہوں میں
امرت گھولتی باتوں میں
جب سانسوں کی سرگم بجتی تھی
جب خواب سراب جزیروں میں
دل میں قرب کی خواہش رہتی تھی"

نجمہ شاہین کی نظموں کے اشعار میں ہجر وفراق کا عنصر نمایاں ملتا ہے ایسا لگتا ہے کہ شاعرہ نجمہ شاہین خود کو تنہا محسوس کرتی ہیں اور جب یہی تنہائی حاوی ہونے لگتی ہے تو تب دوسرے معاملات بھی بے وقعت نظر آنے لگتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب تنہائی میں بیٹھ کر سوچتی ہیں تو وہ اپنے محبوب کی یادوں میں ایسے کھو جاتی ہیں کہ انہیں خود بھی احساس نہیں ہوتا۔جب بھی ان کو اپنے محبوب سے جدائی کا احساس ہونے لگتا ہے تب وہ اپنے اشعار کی سہارا لے کر بھر پور اظہار کرتی ہیں۔اچھی شاعری وہی ہوتی ہے جو بیک وقت دل و دماغ دونوں کو متاثر کرے۔اس میں سادگی اور نفاست کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی اور نظر کی وسعت بھی ہوتی ہے۔

شاعر پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اس کی شخصی محبت آفاقی محبت کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور شاعر ہر دنیا کی چیز میں اس کا روپ اور خوبصورتی کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔یہی کچھ نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔اس کی محبت بھی آفاقی ہے۔اس آفاقی

محبت کو ہم ان کی نظموں میں ہجر وفراق کا عکس دیکھ کے اندازہ لگا سکتے ہیں مثلاً شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کی نظم ''میری زندگی اب تیرا غم'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"میرے،ہم دم آ دیکھ ذرا
میں نے تری بات مان لی آخر
روتے روتے ہنسنا سیکھ لیا ہے میں نے
شاید تجھے یاد ہو!
ایک بار
آخری بار
شاید آخری ملاقات میں
تو کتنی حسرتیں اپنی نگاہوں میں بس کے
پاکیزہ جذبے اپنے ہونٹوں پر سجا کے
مجھے نصیحت کی تھی غموں میں مسکرانے کی
اور تمہیں بھول جانے کی۔۔۔۔"

نجمہ شاہین کا تصور حسن ان کے افکار کا زائچہ ہے جس سے زندگی کو تابندگی اور توانائی حاصل ہوتی ہے انہوں نے اپنی شاعری میں تصور حسن کے ان اسباب ومحرکات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جن سے زندگی میں رفعت وعظمت کے نمایاں آثار پیدا ہوتے ہیں۔

شاعری میں انہوں نے جس طرح سے ہجر وفراق اور جمالیات کی عکاسی کی ہے وہ ایک طرح سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔انہوں نے شاعری میں اپنے محبوب کے خدوخال کا بھی عکس دکھایا ہے مگر نہ تو ان کا محبوب کبھی سامنے آیا ہے اور نہ ہی کسی نے دیکھا ہے مگر اشعار کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔مثلاً ان کی نظم ''کاش تم محسوس کر سکو'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

" کچھ اگر ایسا ہو کہ
تیری آنکھوں سے دنیا کی دھول ہٹے
تیری بینائی لوٹ آئے
اور کوئی سپنا تیری زندگی سجائے
اور پھر وہ ٹوٹ جائے
اور روح کا کرب
تیرے روبرو آئے
تو کسی ایسے ہی پل میں
کسی ایک لمحے میں
مجھ کو تو سوچنا"(35)

نجمہ شاہین کی شاعری میں خوبصورتی اور ہجر وفراق کا شعور سچائی کی اسی تلاش کی علامت ہے جس طرح سے انسان اپنے وجود کا مقصد تلاش کرتا ہے۔ اس لیے نجمہ شاہین کی نظموں میں تخیل کبھی خوبصورت طریقے سے پیش کیا گیا ہے اور سچائی کا ادراک بھی۔ دنیا میں کائنات بھی ہے اور اس سے وابستہ تمام محرکات بھی ہیں۔ یہی چند ایک شاعر کے جمالیات کی تسکین بھی ہے اور شاعر کے لیے خوش بختی کی علامت تھی تصور ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری نے خوبصورتی کے اسی تصور اور ادراک نے ذہن ودل پر کائنات کے در و بام کھول دیئے ہیں۔ اسی لیے تو وہ کہتی ہیں۔ زندگی میں جہاں محبت کا جذبہ ہوتا ہے وہاں پر ہجر وفراق کا درد بھی سہنا پڑتا ہے۔ شاعری میں ہجر وفراق ایک نئی امید بن کر ابھرا ہے ایسی امید جس سے ایک عاشق کو اپنے محبوب سے وفاؤں کی امید کی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ محبت ہی کشش ہے کہ دنیا صرف اپنے محور پر ٹکی ہوئی ہے۔ اسی محبت کے جذبے سے نکل کر وہ ہجر وفراق کے جذبے میں آتی ہیں اور اشعار کی صورت میں کچھ یوں اظہار کرتی ہیں۔

مثلاً شعری مجموعہ "پھول خوشبو اور تارہ" میں نظم "دل دیس تمہارا مسکن تھا" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"دل دیس تمہارا مسکن تھا
اس میں تو تمہارا جیون تھا
اس میں تو تمہاری دھڑکن تھی
دل ہی تو تمہارا گلشن تھا
اس میں تو تمہاری خوشیاں تھیں
اک دل کا دل سے بندھن تھا
اے جان بتاؤ پھر تم نے
دل دیس کو کیوں پامال کیا؟

ان کی زندگی محبت کے زینوں میں ایستادگی، محبت کی مسافتوں میں عافیت گاہیں اور محبت میں درپیش ناکامیوں کے سنگلاخ دشت سے کامیابیوں کے ننھے ننھے پودے چننے میں گزری ہے۔ وہ لفظوں میں سموئی خوشبو اور پتیوں پر ثبت شبنم سے شعر کشید کرنے کے ہنر سے بخوبی آشنا ہیں۔ انہوں نے ہجر وفراق کی مختلف صورتوں کی پیکر تراشی جس فنکارانہ بصیرت کے ساتھ کی ہے وہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں دھیما لہجہ، نرم آہنگ اور کیفیت آفریں ہے۔ ان عناصر کا درجہ ہمیشہ عاشق سے برتر ہوتا ہے معشوق کی ستم پیشگی کو عاشق ایک انعام سمجھتا ہے۔ وہ ستم کو بھی برداشت کرتا ہے وہ معشوق کی عہد شکنی کو بسر وچشم قبول کرتا ہے۔ اس لیے کہ تہذیب عشق کا بھی یہی تقاضا ہے۔

نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں میں ہجر وفراق دراصل پنے محبوب کی جفاؤں کا ذکر ہے۔ یہ وہ صلے ہیں جو محبوب کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم "تمہارا بھی یقین ٹوٹے" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"یہ جو ایک زعم ہے تم کو
کہ تم جتنا بھی چاہو گے
مرے اس دل کو توڑو گے
مرا جو بھی یقین ہے نا
اسے تم بے رخی سے اب
گماں کی سمت موڑو گے
اور اس کے بعد پھر جاناں
تمہارا جب بھی جی چاہے
مجھے بس تم منا لو گے
اور اپنے چند لفظوں سے
مجھے اپنا بنا لو گے

نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں تمام موضوعات کو سمو کر شاعری کے رنگ کو اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ شاعری میں عشق و محبت کے جذبات اور غم جاناں کے ساتھ ساتھ حسرتِ وصال یار جلتے بجھتے آس امید کے دیے تو کہیں آنکھوں میں چبھتی ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں۔ تمام وہ موضوعات پہلوؤں موجود ہیں جو ایک حساس انسان کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے پہلے شعری مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو" کے آغاز کی پانچ نظموں میں ناکام محبت اور ہجر کی کیفیت غالب موضوعات ہیں۔ ان نظموں میں "میری شاعری" "دعائے بے اثر" "کون بچھڑے ہوؤں کو ملائے" "تو میرا حرف دعا" اور "ملاقات آخری" شامل ہیں۔ نظم "میری شاعری" میں ہجر کے کربناک لمحات کا منظر دیکھئے۔

"اے میرے سخن نا آشنا دوست

یہ جو میرے شعر ہیں
تیرے دیے ہوئے ہجر کا تحفہ
یہ جو میری غزلیں ہیں
تیری بخشی ہوءِ عنایتیں ہیں
کیسے فراموش کر دوں میں
تیری یادوں کا وہ نرم خو جھونکا
کہ جب اس شہر مہرباں میں
تیرے خوشبو سے نرم لہجے نے
مجھے کچھ خواب دیے ہیں
کچھ رت جگوں کے عذاب دیے ہیں

مذکورہ بالا نظم ہجر سے خالی ہے لیکن اس کے اشعار شاعرہ کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک نظم "ملاقات آخری" میں شاعرہ نے اپنے محبوب سے ہونیوالی آخری ملاقات کو شعری قالب میں کچھ اس انداز سے ڈھالا ہے

"مجھے کو رہے گی یاد وہ ملاقات آخری
ہونٹوں پہ رہ گئی تھی کوئی بات آخری
آنکھوں کے دشت میں تھے نگینے سجے ہوئے
چاہت کی جس طرح سے ہو سوغات آخری
ٹھہرا ہوا سا دن تھا اور گہری اداس شام
دل کے نگر میں چھپائی تھی
جذبوں کی وہ نمی
بھولوں گی کس طرح سے میں
لمحات آخری

یہ نظم شاعرہ کے ذاتی دکھ اور ناکام محبت کا شاعرانہ اظہار ہے نظم کے آغاز سے انجام تک ہجر کی کیفیت کا سحر ختم ہونے میں نہیں آتا۔ "پھول سے بچھڑی خوشبو" کی نظمیں "ناسور" "پھول سے بچھڑی خوشبو" "آفتاب لمحہ" "سوال" "کھو گئے یہ راستے" اور "تو تو کبھی میرا نہ تھا" میں شاعرہ نے جداءِ کی کیفیت کو خود پر ایسے طاری کیا کہ ہجران کی شاعری کا مستقل موضوع بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے شعری مجموعہ کا غالب موضوع عشق میں ناکامی، تڑپ اور ہجر کی کیفیت ہے۔ نظم "ناسور" کے یہ اشعار دیکھیں:

"اے دل میرے آمل بیٹھیں
آ قصہ چھیڑ پرانا تو
آ خواب سناوں میں تجھ کو
جو چار دنوں کا قصہ ہے
جو جیون باب کا حصہ ہے
آ اس ناسور کی بات کریں۔
جو روح کے اندر اتر گیا
جو تجھ کو چاٹ کے رہ گیا

نظم "تو تو کبھی میرا نہ تھا" کا عنوان ہی ہجر وفراق کا عنوان بن گیا ہے۔ ایک بند میں ہجر وفراق کی کربناک کیفیت کا کچھ اس طرح اظہار کرتی ہیں:

"اے دوست، اے ہمدم
نہ جانے کیسے مجھ سے بھول ہوئی
جانیہ میں نے کیوں سوچ لیا
کہ دشت محبت میں بھٹکتے ہیں ہم
دو سائے ایک دوجے کے ہم قدم
مگر نہ سوچ پائی میں سودائی

کہاں زمیں کہاں آسماں
کہاں دھوپ، کہاں سائباں
جب طوفاں نے حشر ڈھایا
میں نے خود کو تنہا پایا

"پھول سے بچھڑی خوشبو" میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی تقریباً ساٹھ سے زائد ایسی نظمیں ہیں جو یاد ماضی، محبت میں ناکامی، ہجر وفراق کی تڑپ اور یادوں کے سہارے زندگی گزارنا کے جذبات لیے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نظم "آکاس بیل" میں شاعرہ عشقیہ جذبات و کیفیت کی داستان سناتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دوسرے شعری مجموعے میں محبوب کی یاد اور ہجر وفراق مثبت طور پر سامنے آتے ہیں۔ "نظم آکاس بیل" ملاحظہ ہو:

" کبھی بچے تھے تو سنتے تھے
آکاس بیل تناور درخت کو جکڑ لے
اس کی طاقت اس کے حسن کو
اپنی بانہیں پھیلا کر ختم کر دیتی ہے
تب پہروں بیٹھ کے سوچا کرتے تھے
آکاس بیل ہوتی ہے کیا
جب عشق ہجر کے دکھ نے
من کے تناور شجر کو گھیرا تب معلوم ہوا
آکاس بیل ہوتی ہے کیا
آکاس بیل کے معنی کیا ہیں

ہجر وفراق کی جھلکیاں ہمیں شاعرہ کے شعری مجموعہ کلام "اور پھر شام ٹھہر گئی" میں بھیجا بجا ملتی ہیں اس میں دسمبر کے حوالے سے دو نظمیں موجود ہیں۔ دسمبر کا موضوع کلاسیکی

عہد سے ایک روایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی اسی روایت کی پاسداری میں نظم "دسمبر لوٹ جاتا ہے" لکھی ہے۔

مہینہ ہجر کا جب بھی میرے آنگن میں آتا ہے
اداسی کے ہر اک منظر کو وہ موجود پاتا ہے

نگاہوں کو جھکا کر بس دسمبر لوٹ جاتا ہے
مرا دل رک سا جاتا ہے

دسمبر کے لئے ہمیشہ شاعروں نے بے درد، ظالم تکلیف دہ اور ہجر زدہ کے عنوان تجویز کیے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی اس روایت کے تسلسل میں دسمبر کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ "اور شام ٹھہر گئی" کی آخری نظم "یہ میرا انت ہے" میں شاعرہ نے اپنی تنہائی کا نوحہ کچھ اس طرح لکھا ہے:

"میرے مقتل کو جس دن سجایا گیا
بے بسی کو سہیلی بنایا گیا
ایک شہنائی کی دھن پہ جس روز اک
ماتمی گیت مجھ کو سنایا گیا
ایسے لمحوں میں میں نے تڑپتے ہوئے
آسماں کو پکارا مدد کے لئے
میں نے دیکھا فلک کے ستارے سبھی
میری حالت پہ بس مسکراتے رہے

انہوں نے جہاں پر دوسرے موضوعات کو اہمیت دی وہاں پر ان کی نظموں میں نسوانیت کا عنصر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ نسائی آواز ہی ان کی شاعری کا اصل پیش خیمہ ہے۔ نسوانیت کا عنصر اتنا زیادہ ہے کہ ان کی نظموں میں ہمیں جا بجا ملتا ہے مثلاً نظم ''زندگی اب اور

نہ آزما مجھے'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

میں جو زمانے کی تیرگی میں روشنی ہوں
میں جو بے خواب آنکھوں کی جاگتی شبوں کی چاندنی ہوں
میں جو بہار کے پھولوں کی شگفتگی ہوں
تازگی ہوں
میرے رگوں کے بہتے خون میں تحلیل ہے
میری وفا کی خوشبو
قدم قدم پر لرزتے لمحوں میں سنبھالتی ہوں
میں اپنے جیون کی آبجو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ نجمہ شاہین نسوانی رنگ میں نہ صرف اپنے آپ کو ڈھال چکی ہے بلکہ اس رنگ میں دوسروں کی آواز بن کر ابھر رہی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ آج کے اس جدید دور میں عورت صرف اپنے خوابوں کو حدود میں رہ کر ہی پورا کرسکتی ہیں یا پھر ان پر اتنی پابندیاں لازم وملزوم قرار دی جاتی ہیں کہ وہ اپنے خوابوں کو صرف خواہشوں کی دنیا تک محدود کر لیتی ہے۔

مگر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری میں ان کی بھرپور آواز بن کر ابھری ہیں۔ وہ عورتوں کو بھی اسی جذبے کے تحت آگے بڑھنے کا جذبہ فراہم کرتی ہیں۔ جس طرح سے ایک انسان اپنی زندگی میں خوابوں کو پورا کرنے کے لیے ہے ہر طرح کی رکاوٹوں کو عبور کرتا ہے۔ شاعری بھی نسائی رنگ میں پوری رنگی ہوئی ملتی ہے۔ ایک عورت کی پکار دراصل اس کے خواہشوں اور جذبوں کی پکار ہوتی ہے۔ تاہم نجمہ شاہین ان کی مکمل آواز بن کر ابھری ہیں مثلاً ان کی نظم ''گر ہم کو تم جھٹلاؤ گے'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

"یہ شہر تو گونگا بہرا ہے
یہ بہتا ہوا اک دریا ہے

یہاں کون مجھے بتلائے گا
مرا خواب کہاں پر سویا ہے؟
اک آس کا دامن تھام کے یہ
پیاسا من کہاں پہ رویا ہے
اس شہر میں بسنے والو اب
کچھ اپنے لیے سوچو تم

ان کی شاعری کا اسلوب روایت وجدت سے مزین، سادہ عام فہم اور خوبصورت الفاظ کا پیرہن لئے ہوئے ہے۔ مرصع مترنم شعریت اور معنویت سے بھر پور لمبی بحور کی غزلیں اور نظموں کی جدت ان کے اسلوب کی شاندار خاصیت ہے ان کے کلام کی ایک یہ بھی خوبی ہے کہ شاعری میں مشکل پسندی بالکل نہیں ہے بلکہ آسان اور سادہ لفظوں میں بات کر دیتی ہیں۔ وہ فوراً ہی اپنا خیال قاری اور سامع کے ذہن وقلب میں اتار دیتی ہیں۔

جس سے قاری اور سامع بلا تامل شعر کی معنویت کی تہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری نسائی جذبوں کی ترجمان سے نجمہ شاہین کا یہ بھی اعجاز ہے کہ وہ اپنے فن میں معراج کی بدولت شاعری میں قیاس آرائی کی بجائے حقائق کے قریب ترین اور حالات وواقعات کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے جس طرح سے شاعری میں نسائی رنگ کو بیان کیا ہے وہ ان کی فنکارانہ صلاحیت کا خوبصورت مظہر ہے مثلاً نظم ''دوسری عورت'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ جو اک خوب تھی
پہلو بہ پہلو ثواب تھی
کیوں اپنی ذات کی اذیت بن گئی
اپنی ہستی کھو کر وقت کی صورت بن گئی
وہ کیوں دوسری عورت بن گئی

اب یہ عالم ہے کہ اس کی زیست
اک درد کے سوا کچھ بھی نہیں
کسی منزل کی مسافت میں
راہ کی گرد کے سوا کچھ بھی نہیں
اب اس کو آنکھوں میں
زردرتوں سے سجا ایک گھنا جنگل ہے

نجمہ شاہین حالات وواقعات کی سختیوں اور زمانے کی ستم ظریفی کو انہوں نے بڑی بردباری اور تحمل کے ساتھ جھیلا ہے اس کا عکس ہمیں ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے شاعری میں اپنا حقیقی رنگ اور سچائی کا پیکر بنایا ہے۔ آرام وآسائش کا طلبگار اور دائمی سکون کا متلاشی انسان اپنی زندگی کسی نہ کسی مقصد، خواہشات کی تکمیل اور وابستہ امیدوں کے سہارے بسر کرتا ہے۔ یہی امید اور سہارے انسان کو نئی زندگی کے زینے فراہم کرتے ہیں۔ مگر ان تمام جملہ عناصر کے حصول کا مقصد ذہنی اور قلبی سکون ہی ہوتا ہے۔

اگر انسان کو مقصد حیات مل جائے اور اس کی خواہشات پوری ہو جائیں، خوابوں کی تعبیر مل جائے تو انسان کی ویران زندگی میں بہار آجاتی ہے اور اس سے بے پناہ محبت و مسرت کا احساس ہوتا ہے ذہنی وقلبی اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً نجمہ شاہین کھوسہ کی ایک نظم ''مرے دل کی بنجر زمین کا خدا ہوا مہمان'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

میں نے کہا! محبوب میرے
میں تجھ سے محبت کرتی ہوں
میں ترے لیے ہی جیتی ہوں
اور ترے لیے ہی مرتی ہوں
وہ بولا! سب کہنا تو
مدت سے تمہاری عادت ہے

اس میں بھلا کب کوئی حقیقت ہے

نجمہ شاہین نے شاعری میں نسائی رنگ کے جذبوں کو جس طرح سمویا ہے وہ ایک الگ فن ہے مگر نسوانی رنگ کی آمیزش زیادہ اس لیے ہے کہ وہ نسوانی جذبے سے بخوبی واقف ہیں۔ اس رنگ میں رنگنا بھی عورت کا ایک الگ روپ ہے۔ تاہم شاعری میں اس جذبے کو بیان کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے مگر نجمہ شاہین کھوسہ نے اس جذبے کو خوبصورتی سے برتا ہے کہ آواز بھی سیدھے دل میں اترتی ہے۔

اگر انسان سے دنیا کی تمام رعنائیاں، رنگینیاں اور خوشیاں اچانک چھن جائیں تو زندگی بے نور اور پھیکی پڑ جاتی ہے۔ اگر زندگی میں عشق کی کیفیت ہو اور حاصل مقصد چھن جائے اور یہی غم وصال یار، فراق یار میں بدل جائے اور خوشیوں کی جگہ شقی القلب غم لے لیں تو ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا جاتے ہیں اسی طرح انسان زمین کے پاتال میں جا گرتا ہے۔

کائنات بے رنگ اور دل کی دنیا کسی اجڑے ہوئے چمن کی طرح لگتی ہے۔ زندگی کے لمحات بے کیف لگتے ہیں۔ اور انسان کو اپنی ہستی بے معنی اور اپنی ذات کی بے ثباتی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ یہی احساس نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں نسوانیت کے رنگ میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً ''کیسے بھلائیں'' ملاحظہ ہو:

بھلائی نہیں جاتی ہیں وہ دل کی نادانیاں
وقت نے جو دیں مجھے درد کی نشانیاں

وہ قصے تیرے جو ٹھہرے حصے مرے
وہ باتیں تیری وہ بستی کہانیاں

پگھلتے ہیں جسم و جان بھی روح کی طرح
ہیں وقت کی چھاؤں میں جلتی جوانیاں

شاعر چوں کہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے اس لیے ایک شاعر کا بنیادی ذریعہ اظہار شاعری میں ہوتا ہے اس لیے شاعر حالات و واقعات کی عکاسی شاعری کے ذریعے سے خوبصورت طریقے سے اظہار کرتا ہے۔ اس میں وہ با آسانی اپنے تجربات اور مشاہدات کو شعر کی صورت میں اظہار کرتا ہے۔

یہی کام نجمہ شاہین نے اپنی شاعری میں کیا ہے انہوں نے بھی نسائی پکار کو شاعری کا حصہ بنا کر اس میں جذبات اور احساسات کے رنگ کو خوبصورتی سے برتا ہے اس کا رنگ شاعری میں اور بھی نکھار پیدا کر دیتا ہے مثلاً نظم ''وہ کہتے ہیں ہمیں لکھو'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

" سبھی کی ایک خواہش ہے انہیں لکھوں
سبھی مجھ سے یہ کہتے ہیں ہمیں لکھو
وہ کہتے ہیں کہ ہم بھی تو
تری اس دکھ کہانی کا ہی حصہ ہیں
فقط جو فریاد ہے تیری
یہ جو روداد ہے تیری
ہم اس میں اب بھی شامل ہیں
نہ دشمن ہیں، نہ قاتل ہیں

کولرج کہتے ہیں کہ اگر انسان کے اندر کا موسم اچھا ہے اور خوشگوار ہو تو باہر کا موسم اور مناظر بھی بڑے اچھے لگتے ہیں۔ اور ہر طرف رنگینی اور رعنائی نظر آتی ہے۔ مسرت و شادمانی کے خوشگوار اثرات انسان کے مزاج، بول چال رومانی اور جسمانی صحت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر انسان یاس و غم کی کیفیت میں ہو تو اس کے منفی اور ناخوشگوار اثرات بھی ہمارے مزاج اور صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جب انسان دکھوں اور مصائب میں گھرا ہو تو آنکھوں میں ہزاروں سوالات کے ساتھ چہرے پر مایوسی شب کے اندھیرے کی طرح پھیل جاتی ہے۔

ماں کی محبت دنیا کی تمام محبتوں سے افضل ہے مگر نجمہ شاہین اپنی نظموں میں بھی اس کوشاندارطریقے سے بیان کرتی ہیں۔مثلاًنظم ''سہارااماں ہے'' میں ماں کے جذبات اور احساسات ملاحظہ ہوں:

دکھ کے لمحوں میں مرا ایک سہارا ماں ہے
میں اگر ڈوبتی کشتی ہوں کنارہ ماں ہے

اس کے قدموں میں جو جنت ہے تو مطلب یہ ہے
آسمانوں سے جسے رب نے اتارااماں ہے

خوشبو ایسی کہ مری روح تلک مہکی ہے
روشنی ایسی کہ بس نور کا دھارااماں ہے

ماں اس کائنات کی سب سے خوبصورت ہستی ہے۔جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔خدا کی محبتوں کے روپ میں سے ایک روپ ماں کا ہے۔نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی نظموں میں ماں کے جذبات واحساسات اور محبت کا دعویٰ اشعار کی صورت میں کیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ شاعرہ نجمہ شاہین ماں کی ممتا سے اپنا دامن خوشیوں سے بھرنا چاہتی ہیں۔اور اس دامن سے یہی کائنات کی تمام خوشیاں اپنے حصے میں شامل کرنا چاہتی ہیں مثلاًنظم ''ماں اک ایسی ہستی ہے'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ابر کی صورت میرے سر پر
اک دعاسی رہتی ہے

میری اپنی ذات بھی اس کی
خوشبو سے ہی مہکی ہے

اپنے دکھوں پر رونے والی
میرے لیے تو ہنستی ہے

''ماں'' کی وجہ سے اس کائنات میں خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس خوبصورتی کی احساس نہ صرف عورت محسوس کرتی ہے بلکہ مرد بھی اس احساس کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنی شاعری میں عشق ومحبت ،تصوف،ہجر وفراق، نسائی رنگ غرض ان تمام جذبوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے جس سے ایک شاعرہ اپنے اردگرد ماحول کو محسوس کرتی ہے۔آپ کی شاعری نہ صرف عنائی رنگوں بلکہ موسیقیت کے تمام رنگوں سے لبریز ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں خواتین کے مسائل کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔اوران کے حل کے لیے زور بھی دیا گیا ہے۔ان کی نظم "ردالی" ایک ہندولڑکی کی کہانی ہے جس کو ہمیشہ دوسرے لوگوں کےلیبقر بانی دیتے دکھایا گیا ہے۔جب کہ لوگ اسے اذیت دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں یوں سمجھیں کہ شاعرہ نے اس نظم میں عورت کے دکھوں کی کہانی کو سموکر رکھ دیا ہے۔نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

"میں ردالی اپنے ہی دکھوں پر رونے والی
ایک لڑکی گردش دوراں نبھاتی ہے
اوروں کا غم اپنا غم بناتی ہے
خود کو روتا دکھاتی ہے
سوچتی ہوں میں کیسی ردالی
اپنے غم کی محفل سجانے والی
یا اوروں کا دکھ بٹانے والی

نسوانیت کا رنگ ہر اس شاعرہ کی شاعری میں واضح طور پر عیاں نظر آتا ہے جو خانہ داری اور مربوط خاندانی نظام کے تحت اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔یہ بھی ایک طے شدہ

حقیقت ہے کہ جس خاتون کا خاندانی پس منظر، کلچر اور تہذیب وتمدن اچھا اور مضبوط ہوتا ہے وہ خواتین کے مسائل وحقوق کے حل اور حصول کے لیے ہمیشہ اپنا تعمیری اور مثبت کردار ادا کرتی ہے۔اس حوالے سے رضی الدین رضی رقمطراز ہیں:

"وہ ایک باوقار، مہذب اور شائستہ خاتون ہیں۔انہوں نے ثابت کیا ہے کہ عورت اپنے تقدس کو برقرار رکھتے ہوئے بھی سب کچھ حاصل کر سکتی ہے۔جس کے حصول کے لیے بعض خواتین اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہیں وہ ایک مثال ہیں ان سینکڑوں، ہزاروں لڑکیوں کے لئے اران والدین کے لیے جنہیں کسی انجانے خوف اور اندیشے کے باعث تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے۔انہوں نے ثابت کیا ہے کہ والدین جب اپنی بیٹیوں پر اعتماد کرتے ہیں تو بیٹیاں بھی ان کے اعتماد پر پورا اترتی ہیں اور انے وقار کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دیتیں انہیں اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے شاعری کے لیے بہت کم وقت ملتا ہےلیکن اس کم وقت میں بھی انہوں نے جس تیزی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کئے ہیں وہ قابل ستائش ہیں"(54)

خاتون شاعرہ جب اپنے جذبات واحساسات کا اظہار صیغہ واحد متکلم "مونث" میں کرتی ہے تو اس کی شاعری میں نسوانیت آجاتی ہے۔یہی انداز بیاں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کی اکثر و بیشتر نظموں میں انہوں نے صیغہ واحد متکلم "مونث" کو خواتین کے جذبات کی عکاسی کے لیے استعمال کیا ہے۔اس قدر گھٹن زدہ ماحول میں اور معاشرتی مسائل کے تناظر میں صیغہ واحد متکلم کا بہکانہ اظہار واضح طور پر ایک پیغام ہے کہ خواتین کی خواہشات اور آواز کو نام نہاد عزت و ناموس کے کھوکھلے دعوں سے دبایا نہیں جا سکتا۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نہ صرف معاشرے کے دوہرے معیارات کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے بلکہ خواتین کو یہ حوصلہ بھی دیا ہے کہ زندگی جینے کے لیے اپنی دنیا آپ پیدا کر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مردوں کا ان کی شاعری پسماندہ اور بد

حال عورت کے لیے امید کا سندیسہ ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں کا فنی جائزہ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی چار کتب "پھول سے بچھڑی خوشبو"، "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں"، اور شام ٹھہر گئی"، "پھول خوشبو اور تارہ" چھپ کر منظر عام پر آئی ہیں۔ان کا پہلا شعری مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو" جولائی 2007ء میں فرید ادبی سنگت کے تعاون سے شائع ہوا۔یہ مجموعہ ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔فنی حوالے سے دیکھیں تو اس مجموعے میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔شاعرہ نے اپنے پہلے شعری مجموعے میں کسی شاعر یا ادیب کی رائے شامل نہیں کی جو ان کی اپنی ذات اور شاعری پر اعتماد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اپنی اس کتاب کے بارے میں" کچھ یادیں، کچھ باتیں" کے عنوان سے اپنے فن اور شاعری کے بارے میں خود اظہار کرتی ہیں۔

"پھول سے بچھڑی خوشبو" بچھڑی محبتوں کا راکھ ہے یا خوشبو۔یقین اور بے یقینی کی ایک کیفیت ٹوٹے اور بکھرے خوابوں کا عکس، بکھرے خواب جو زندگی کے لمحے لمحے ہر محیط ہو جائیں جو عہد فردا اور عہد رفتہ کے درمیان ایک پل بن جائیں، نہ ٹوٹنے والی زنجیر کی مانند جو ہر لمحہ کو اپنے اندر جکڑ لے(55)

پہلے شعری مجموعہ میں کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو بحر سے خالی نظر آتی ہیں۔بلکہ ان ہر نثری نظموں کا گمان ہوتا ہے۔مثلاً چند بے وزن اشعار دیکھیں۔

اجڑے ہوئے لوگوں سے نہ پوچھ داستان زیست
راہ وفا میں ویران راستوں کی دھول بن گئے

سچائی، عشق کیا ڈھونڈتی ہے تو اس زمانے میں
وہ اور وقت تھا جب انگارے پھول بن گئے

مذکورہ بالا اشعار میں صرف قافیہ اور ردیف کو ملانے پر زور دیا گیا ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور بحر کو چلانا شاعرہ کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ اگر پہلے مجموعہ میں شاعرہ نے بہت سی آزاد اور پابند نظمیں لکھیں ہیں لیکن شاعرانہ پختگی کا فقدان واضح طور پر نظر آتا ہے جذبات اور خیالات کے سہارے تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی نظر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا دوسرا شعری مجموعہ "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" اپریل 2010ء □ کو چھپ کر منظر عام پر آیا۔

یہ مجموعہ کلام دوسو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ مجموعہ ہذا کا انتساب منظوم صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ حمد نعت، غزلوں اور نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ تاہم اس مجموعے میں نظموں اور غزلوں کو الگ الگ گوشوں میں رکھا گیا ہے۔ جس سے نظموں اور غزلوں کی تعداد کے تعین میں سہولت ہو گئی ہے۔

پہلے اور دوسرے شعری مجموعے کے درمیان فنی حوالے سے بہت واضح فرق نظر آتا ہے دوسرے شعری مجموعے میں شاعر کا فن ان کی قابلیت اور پختہ شاعری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دوسرے شعری مجموعہ میں اگر نظموں کے حوالے سے بات کی جائے تو فن کی بلندی، پیکر تراشی اور بحر کے حوالے سے ان کی شاعری قدرے مختلف بھی ہے اور بہتر بھی۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تیسرا شعری مجموعہ "اور شام ٹھہر گئی 2013ء □ میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی اہمیت کا انداز اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ تیسرے مجموعہ کلام "اور شام ٹھہر گئی" پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے والوں میں امجد اسلام امجد، بشریٰ رحمٰن، شاکر حسین شاکر، رضی الدین رضی، قمر رضا شہزاد اور جاوید احسن جیسے نامور ادباء □ اور شعراء □ شام ہیں۔

تیسرے شعری مجموعے میں بہت سے نظمیں موجود ہیں ہیں جن میں سے تین

نثری نظمیں بھی موجود ہیں لیکن ان کی نظموں میں کمال فن کو بھر پور انداز سے آزماتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں محبت، ہجر و فراق، وصال کی خواہش، دیہاتی زندگی سے عقیدت، غم دوراں کی تڑپ جیسے موضوعات اسے نظموں اور گیتوں کے فنی پیکر تراشنے کی کوشش کی ہے معروف شاعر اور نقاد امجد اسلام امجد تیسرے مجموعہ کلام کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔

> "ان کی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شخصیت اور ماحول کے مخصوص حوالے کم و بیش ٹھیک ٹھاک ہیں البتہ جہاں تک ہنر کا معاملہ ہے اس میں ابھی انہیں مزید محنت کی ضرورت ہے کہ شاعری کسی مخصوص وزن اور بحر میں الفاظ کو پرونے کا نام ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق موضوع کی مناسبت سے بہترین الفاظ کے چناو سے بھی ہے۔"(57)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے فن کے حوالے سے بشریٰ رحمٰن، "حنائی رنگ، غنائی آہنگ کے عنوان سے تحریر کردہ دیباچے میں لکھتی ہیں۔ چوتھے شعری مجموعے کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی دوسری خوبی اس کا شیریں لب ولہجہ ہے اس کی مٹھاس ہے خواجہ غلام فرید کی دھرتی کے اندر ویسے بھی بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بات کرتی ہے تو اس کے لہجے کی شیرینی ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے۔ اور جب شعر کہتی ہے تو تڑپتے، مچلتے اور سلگتے جذبوں کے اوپر شہد کا چھڑکاو کرتی جاتی ہے"(58)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے چوتھے شعری مجموعے کے لیے رضِ الدین رضی نے "ہجر اور بلندی کا استعارہ" کے عنوان سے اپنے دیباچے میں شاعرہ کے فن پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> "پھول، خوشبو اور تارہ ہجر کا ستعارہ ہے ہجر جو زندگی بھی ہے اور موت بھی ہجر جو روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، ہجر جو سکوں بھی کرتا ہیا اور اطمینان بھی

بخشتا ہے یہی بندگی ہے اور زندگی ہے یہی تشنگی ہے اور یہی آسودگی دیہی خواب ہے اور یہی سراب، یہی حقیقت ہے اور یہی گماں اور جب ہجر آپ کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے تو پھر حقیقت اور گمان کی حدیں ختم ہو جاتی ہے اور ہجر یہلی آپ کی بن جاتا ہے جیسے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی پہچان بن گیا ہے۔"(59)

مجموعی طور پر اگر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کی گرفت فنی اعتبار سے نظموں میں کمزور دکھائی دیتی ہے۔جذبات اور احساسات کا بہاو بھی نظموں میں بدرجہ اتم موجود ہے کلاسیکیت اور جدت کا امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اشعار کا بحر سے بے خالی ہونا۔اور الفاظ کا مناسب انتخاب ایک ایسی مشق ہے جس میں ان کی پختگی ان کے دیگر آنیوالے شعری مجموعے "پھول سے بچھڑی خوشبو" سے آخری شعری مجموعے "پھول خوشبو اور تارہ" تک کی نظموں میں مشاعرہ کے موضوعات کے انتخاب اور اظہار بیان میں نمایاں پختگی کا بتدریج سفر واضح طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ان کی نظموں میں موجود چار پانچ موضوعات کا احاطہ ان کے کلام میں تاثیر بھی پیدا کرتا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں فکری حوالے سے اس قدر تنوع ہیکہ جذبات و احساسات کی شدت قاری کو فنی کمزوریوں کی طرف متوجہ کرنے کی بجائے خیالات و جذبات کی دنیا سے خط اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

تاہم میں مختصراً اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری بھرپور فکری اور شعوری بالیدگی کا مجموعہ ہے۔

شاعری میں تشبیہ، استعارے اور علامتی رنگ کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔
شاعری کے تمام مجموعوں کے نام بھی علامتی طور پر رکھے گئے ہیں۔

میں مختصراً اس نتیجے پر پہنچتی ہوں کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری بھرپور فکری تنوع اور شعوری بالیدگی کا مجموعہ ہے۔شاعری میں شعری محاسن بڑی عمدگی سے پائے جاتے

ہیں اور وسعت معانی کے لحاظ سے ان کا کلام کسی تجزیے کا محتاج نہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بلا شبہ آفاقی شاعرہ ہیں ان کی شاعری میں روایتی اور جدید تمام موضوعات کمال مہارت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور ان کی اس فنی پختگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات

1۔ ستیہ پال ا؟ نند، ڈاکٹر (فلیپ)،مشمولہ، پھول خوشبواور تارہ از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ(لاہور:الحمد پبلی کیشنز)،2016۔

2۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو (ڈیرہ غازی خان : فرید ادبی سنگت،2007)،ص104۔

3۔ ایضاً،ص108۔

4۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں (لاہور: خزینہ علم و ادب، 2016)،ص142,143۔

5۔ ایضاً،ص152۔

6۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،2013)ص 42,43،۔

7۔ ایضاً،ص53۔

8۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص17۔

9۔ ایضاً،ص88۔

10۔ ایضًا،ص94۔

11۔ ایضاً،ص110۔

12۔ ایضاً،ص16۔

13۔ ایضاً،ص55۔

14۔ ایضاً،ص60۔

15۔ ایضاً،ص155۔

16۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص104۔

17۔ ایضاً،ص105۔

18۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبواور تارہ،ص25

19۔ ایضاً،ص31۔

20۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص،19۔

21۔ ایضاً،ص31۔

22۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں،ص23۔

23۔ ایضاً،ص17۔

24۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص14۔

25۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبواور تارہ،ص19۔

26۔ ایضاً،ص15۔

27۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں،ص90۔

28۔ ایضاً،ص102۔

29۔ ایضاً،ص133۔

30۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص90۔

31۔ ایضاً،ص157۔

32۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں،ص97۔

33۔ ایضاً،،ص146۔

34۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص50۔

35۔ ایضاً،ص64۔

36۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ، ص123۔

37۔ ایضاً، ص128۔

38۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو، ص12۔

39۔ ایضاً، ص18۔

40۔ ایضاً، ص28۔

41۔ ایضاً، ص35۔

42۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں، ص64۔

43۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، اور شام ٹھہر گئی، ص166۔

44۔ ایضاً، ص174۔

45۔ ایضاً، ، ص171۔

46۔ ایضاً، ص152۔

47۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں، ص83۔

48۔ ایضاً، ص101۔

49۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو، ص53۔

50۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ، ص135۔

51۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، اور شام ٹھہر گئی، ص72۔

52۔ ایضاً، ص74۔

53۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں، ص82۔

54۔ رضی الدین رضی (رائے)، مشمولہ، اور شام ٹھہر گئی از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، ص26۔

55۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو، ص10۔

56۔ ایضاً، ص12۔

57۔ ایضاً، ص77۔

58۔ امجد اسلام امجد (رائے)، اور شام ٹھہر گئی، مشمولہ، اور شام ٹھہر گئی از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، ص15,16۔

59۔ رضی الدین رضی (رائے)، مشمولہ، پھول خوشبو اور تارہ از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، ص144

باب چہارم

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیات کا فکری وفنی جائزہ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیات کا فکری وفنی جائزہ

بیسویں صدی نئی تہذیبی صورت حال، کائنات کی وسعت میں فرد کا اپنا حقیر نظر ا?نا اور تنہا محسوس ہونا وقت ، نئے عہد میں نئے روحانی تجربات کا انکشاف ، سائنسی اور کائناتی شعور سے عبارت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے تنہائی کو بیسویں صدی کا خدا کہا تھا۔ ہر دور میں غزل نے نئے نئے تجربات اور نئے خیالات کا اظہار کیا ابتدا میں غزل نے اپنے دائرہ کار کو عشق ،ا?زادی اور تصوف جیسے موضوعات تک محدود رکھا مگر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ غزل نے اس موضوع کو جنم دیا جس سے انسانی حالات اور جذبات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔

اردو کی شعری روایت میں ادا جعفری، پروین شاکر، یاسمین حمید، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض بہت اہم اور معروف نام ہیں جنھوں نے اردو کی شعری روایت میں نسائی طرز اظہار کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔اہم تعارف رکھنے والی ان شاعرات کے علاوہ اگر جنوبی پنجاب کی بات کی جائے تو اس خطے میں نوشابہ نرگس،ثمر بانو ہاشی، بشریٰ رحمٰن ،عذرا شوذب،شگفتہ الطاف ،صائمہ نورین بخاری،نوشی گیلانی،غزالہ خاکوانی اور ماہ طلعت زاہدی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

ا?ج اس جدید دور میں ایسی ہی شاعرہ موجودہ ہیں جس نے اردو شاعری کو نئے ا?ہنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل گوئی کے مختلف

رجحانات اور موضوعات دکھائی دیتے ہیں۔ان کا شمار پاکستان میں بالخصوص جنوبی پنجاب کی معروف خواتین شاعرات میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری بھی ا?ج کے جدید ترین موضوعات اور غزل کے تقاضوں پر پورا اترتی دکھائی دیتی ہے۔انہی خواتین شاعرات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی جنوبی پنجاب کی اس شعری روایت کو برقرار رکھنے والی اہم شاعرہ ہیں۔ان کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہو کر اردو کی شعری روایت کا حصہ بن چکے ہیں۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

"پھول سے بچھڑی خوشبو" فیصل فدا پرنٹنگ پریس ملتان،اپریل 2007،"میں ا?نکھیں بند رکھتی ہوں" خزینہ علم وادب لاہور،اپریل 2010،"اور شام ٹھہر گئی" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2013،" پھول،خوشبو اور تارہ" حنیف پرنٹرز لاہور 2016۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل کے موضوعات

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعرہ ہیں۔تاہم انہوں نے غزل کے علاوہ نظم گوئی میں بھی تجربات کئے ہیں۔انہیں نظم سے زیادہ لگاؤ ہے لیکن ان کی غزل گوئی نظم کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور معیاری دکھائی دیتی ہے۔ان کے موضوعات کی بات کی جائے تو عشقیہ شاعری کا موضوع اولین حیثیت رکھتا ہے جبکہ دیگر موضوعات میں نرگسیت ،غم دوراں، دیہات کا عکس وپس منظر،بچپن کی یادیں،شاعری میں بکھرے خواب، عشق کے دشوار گزار مراحل ،محبت میں محبوب کی بے وفائی، نا امیدی اور رجائیت کا ملا جلا احساس ،نسوانیت اور اس جیسے دیگر موضوعات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی متفرق خصوصیات کے حوالے سے جنوبی پچاب کی معروف ادبی شخصیت بشریٰ رحمٰن لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کی دوسری خوبی اس کا شیریں لب ولہجہ ہے۔اس کی مٹھاس ہے۔خواجہ غلام فرید کی دھرتی کے اندر ویسے بھی بڑی

مٹھاس ہوتی ہے۔ نجمہ جب باتیں کرتی ہیں تو اس کے لہجے کی شیرینی ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے اور جب شعر کہتی ہے تو بلبلاتے، تڑپتے، مچلتے اور سسکتے جذبوں کے اوپر شہر کا چھڑکاؤ کرتی جاتی ہیں۔ وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے لئے سکھ اور سکون کی خیرات مانگنے نکلی ہیں''۔(1)

رفاقتیں، اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید و یاس، دُکھ سکھ، ہنسی، ا?رزو، خلش اور کسک ایسے موضوعات ان کی شاعری کا مستقل موضوع ہیں جو ان کے دل کی دنیا کو غم دوران کے اندھیروں کے باوجود بھی روشن رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں وقت اور امتداد زمانہ کے ایسے کئی روپ ہیں جنہوں نے زمانے کی گرد سے ان ے ہاں یاسیت اور ناامیدی کے جال کو بننے کی کوشش کی۔ یاسیت کے اس ہیبت زدہ ماحول میں شاعری امید و رجائیت کی متلاشی نظر ا?تی ہے۔ یہی امید انہیں گردش دوراں سے نبرد ا?زما ہونے اور اپنی دنیا ا?پ پیدا کرنے کا سلیقہ اور ہنر بھی بخشتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے حوالے سے سعداللہ شاہ لکھتے ہیں:

"شاعری تخلیق کار کی جبلت کا وہ پہلو ہے جو کسی بھی مصروفیت، دباؤ یا رکاوٹ کے باوجود پنہاں نہیں رہ سکتا۔ اسے اظہار پانا ہی ہوتا ہے کہ فطرت اسی انکشاف کی منتظر رہتی ہے۔ بہر حال میں انہیں ان کے شعری کے مجموعے''میں ا? نکھیں بند رکھتی ہوں'' پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ ایسے ہی دھیان گیان کی منزلیں طے کرتی رہیں گی۔ اور جب وہ بند ا? نکھیں کھولیں گی تو اُن کا دامن خود بخود ستاروں سے بھر جائے گا۔"(2)

ذیل میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا فکری مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی عشقیہ شاعری

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا خمیرہ عشق سے اٹھا ہے۔ ان کے ہاں عشق

زندگی کو بامقصد بنانے اور اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔ اسی لئے عشق ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا محبوب ترین موضوع ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق میں ناکامی، محبوب کی بے نیازی اور مجاز سے حقیقت تک عشق کی منزلیں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر ا?تی ہیں۔ عشق میں ناکامی انہیں ناامیدی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے بجائے امید کے دیپ جلانے کا پیغام دیتی ہے۔ محبوب سے بچھڑنے کا غم انہیں رنج و ملال میں مبتلا بھی کرتا ہے اور عشق کے درد سے بھی ا?شنا کرتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نسوانیت پرست ہیں لیکن ان کے عشقیہ جذبات نے نہ صرف انہیں عاشقوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے بلکہ ان کی غزل کو بھی عشق و عاشقی کی ا?ئینہ دار بنا دیا ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام''پھول سے بچھڑی خوشبو''میں موجود چند عشقیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بدلتے موسموں میں گر بھلا دیا مجھے تو کیا
میرا تو شعر ہے تمہاری یاد میں ڈھلا ہوا

میری تنہائی نے اس کو اور تنہا کردیا
جھیل سی ا? نکھیں تھیں ان کو خشک صحرا کردیا

"تجھ سے جُدا ہوئے تو لگا عمر کٹ گئی
کیا کیا ملیں نہ پیار میں ہم کو رعایتیں

ہنسی نہ دے سکا مجھے مگر مجھے ملا ل دے گیا
وہ ایک شخص روح کو عجب زوال دے گیا

"دیکھو تو کتنے درد ملے کُوئے یار میں
کاٹا جو ہم نے ہجر تیرے انتظار میں

مندرجہ بالا اشعار میں عشق میں ناکامی اور محبوب سے بچھڑنے کا کرب واضح نظر ا? تا ہے۔عشق ومحبت کی ولولہ انگیزی انہیں کبھی نہ ختم ہونے والی اداسی اور یاسیت کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔تاہم اپنے مزاج کی پختگی اور قرینے کے باعث وہ ہر دو جذبات میں توازن قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔یوں لگتا ہے کہ انہوں نے شاعری کا ا? غاز ہی محبت میں ناکامی کے ردعمل میں کیا تھا۔اس بات کا اظہار اپنے ایک انٹرویو میں وہ کچھ اس طرح سے کرتی ہیں۔

"محبت کے بغیر شاعری کچھ بھی نہیں۔پھر شعر لفظوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے
جس میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔عشق محبت کی بنیاد ہے۔محبت جب ہر
تفریق کو ختم کردے اور وہ جنون کا امتزاج بن جائے تو عشق ہو جاتا ہے۔
عشق وحدانیت ہے،خدا ہے۔"(8)

عشق کی پُر خار وادی میں قدم رکھتے ہی اپنے اور بیگانے سب عاشق صادق ے رقیب ودشمن بن جاتے ہیں۔اور وہ جو میر نے کہا تھا کہ عاشقی میں عزت سادات بھی گئی۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نزدیک بھی عشق رسوائی کا سبب بنتا ہے اور صحیح معنوں میں اپنوں اور پرایوں کی پہچان کراتا ہے۔

"عشق کرتا ہے زمانے میں سبھی کو رُسوا
درد بن جاتے ہیں بارات نہ پوچھو میا

"دشمنوں سے تو مجھے خوف نہیں تھا کوئی
راہ میں اپنوں کی مگر گھات نہ پوچھو میا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نزدیک عشق میں ناکامی احساس محرومی کو جنم دیتی ہے۔عشق ومحبت میں ناکامی شخصیت پر مثبت اثر بھی ڈال سکتی ہے اور منفی بھی۔انسان کو یاسیت کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی دھکیل سکتی ہے اور رجائیت رفعتوں کی طرف بھی گامزن

کر سکتی ہے۔زندگی کو مقصدیت سے خالی بھی بنا سکتی ہے اور نئی زندگی کی شروعات کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نزدیک عشق میں ناکامی ایک مثبت عمل ہے جو ا? نے والے عشق کے امتحانات میں کامیابی کی طرف ایک قدم ہے۔اسی لئے عشق میں ناکامی ان کی حوصلہ شکنی نہیں کرتی بلکہ انہیں فراخ دل بنا دیتی ہے مثلاً:

" کسی کو میں اب تک خدا لکھ رہی ہوں
میں مجرم نہیں سزا لکھ رہی ہوں

کیا جس نے دامن کو خوشبوؤں سے خالی
میں اس کے لئے بھی دوا لکھ رہی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں عشق ومحت اور انسانی توقیر کی نیلامی پر بھی تکلیف وحیرت کا اظہار ملتا ہے مثلاً:

"ہم نے عشق کی جاگیر بکتے دیکھی ہے
بہت انمول چہروں کی توقیر بکتے دیکھی ہے

عشق ایک موسم ہے اور میں نے ایسے موسم میں
کیسے کیسے رنگوں کی تصویر بکتے دیکھی ہے

ہجر وفراق

ہجر وفراق بھی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل کا دوسرا اہم اور پسندیدہ موضوع ہے۔وہ عشق ہی کیا جو جدائی کی تڑپ سے ا? شنا نہ ہو۔محبوب سے بچھڑنے کا غم،اس کی یاد میں کٹتے شب وروز کا قصہ،تنہائی کا جان لیوا احساس اور پھر دوبارہ ملنے کی تمنا وغیرہ ایسے موضوعات کو ہمیشہ شاعروں نے اپنی غزلوں میں سمویا ہے۔ہجر وفراق کے موضوعات ہی اصل میں صحیح معنوں میں شاعری میں غزل کا رنگ بھرتے ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین نے بھی

عشق میں ناکامی اور ہجر وفراق کی کٹھن گھڑیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

دیکھو تو کتنے درد ملے کوئے یار میں
کاٹا جو ہم نے ہجر تیرے انتظا ر میں

تجھ سے جدا ہوئے تو لگا عمر کٹ گئی
کیا کیا ملیں نہ پیار میں ہم کو رعایتیں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے نزدیک ہجر وفراق کے لمحات سچے عاشق کے لئے وحشت کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ ہجر وفراق کے یاسیت سے بھرپور لمحات میں شاعرہ کے نزدیک محبت ہی واحدا? سرا ہے جو روح اور جسم کا تعلق رکھتی ہے۔

"ہجر کی وحشت نے دل کو کر دیا رنجور اب
بھولتی جاتی ہوں میں اب صورتیں دیکھی ہوئی

" ہجر میں بھی یہ میری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

عشق ومحبت ا? مد، ہجر وفراق لازم وملزوم عناصر ہیں۔ یہ عشق ومحبت ہی تو ہے جو عاشق کو محبوب کی محبت میں دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اور شاید اس کے ردعمل میں دنیا محبوب اور عاشق کے درمیان ہجر وفراق کی فصیل کھڑی کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ہجر وفراق کی تڑپ اور درد کو اپنی غزلوں کا موضوع اس طرح سے بنایا ہے کہ غزل کا سوز وگداز نمایاں طور پر عیاں ہو جاتا ہے۔

جس کے خیال نے کیا سب سے جدا مجھے
زخموں سے کر گیا وہی ا ?شنا مجھے

سوز و فراق و ہجر میں رنجور ہوگئے
اپنی فصیل درد میں محصور ہوگئے

ملنا تھا صلہ میری وفاؤں کا یہی کیا
ا? نکھیں ہوئیں ویران بیابان کی صورت

" ا ? نکھیں لہولہو کیں شکستہ تمام خواب
شام فراق نے عجب تحفہ دیا مجھے

"جب سے وہ میری چاہتوں سے اجنبی ہوا
دل ہوگیا اجاڑ بیاباں کی طرح۔۔۔۔

ہم کریں گے نہ کسی طور وفا کو رُسوا
ہم نہ بھولیں گے تجھے ہم کو بھلانے والے

مندرجہ بالا اشعار ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دوسرے شعری مجموعہ ''میں ا? نکھیں بند رکھتی ہوں'' سے لئے گئے ہیں۔ ان تمام اشعار میں ہجر وفراق محبوب سے جدائی کی تڑپ، بچھڑنے کا غم، محبوب کی یاد، اداسی اور تنہائی کا احساس جیسے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ ان چاروں شعری مجموعوں میں ہجر کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً:

"تنہائی اور ا ?نسو غم ہجراں غم جاناں
دُکھ کتنے اٹھا لائی اسے دل میں بسا کر

ہجر شاعری کا ایک خاص استعارہ ہے جو بیک وقت عاشق ومحبوب کو نئی زندگی عطا

کرتا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں ہجر کا یہ احساس اپنے مجازی رنگ میں موضوع بنتا ہے۔ ان کی شاعری ہجر کے رنگ میں رنگی نظر ا?تی ہے ان کی شاعری میں ہجر کبھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتا۔مثلاً:

"ہجر اثاثہ رہ جاتا ہے
ہاتھ میں کاسہ رہ جاتا ہے

جب امید نہ باقی ہو تو
صرف دلاسہ رہ جاتا ہے

شاعرہ زمانے کی ناقدری کی وجہ سے بیزار نظر ا?تی ہیں کیونکہ انہیں زندگی میں بہت سی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔وہ ا?زادی کی فضا میں سانس لینا چاہتی ہیں مگر ان تمام پابندیوں کو لاگو کرنا چاہتی ہے جن کو ایک روایت کے طور پر معاشرے میں اپنایا گیا ہے۔اس گھٹن زدہ ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے شاعرہ خود کو اس ماحول کا شکار گردانتی ہیں۔

زندگی بے قرار لگتی ہے
درد کی ا ?بشار لگتی ہے

پھر سے شام فراق ا?ئی ہے اب
ا ?نکھ بھی اشکبار لگتی ہے

روایتی شعرا کے ہاں ایسے موقع پر ا?ہ وفغاں بلند ہوتی ہے۔جگر کا خون بھی ہوتا ہے کبھی کبھی دشنام طرازی تک بھی نوبت ا? پہنچتی ہے۔مگر نجمہ شاہین کھوسہ کو اپنا عورت ہونا نہیں بھولا۔انہوں نے بھی نسوانی ا?واز بلند کی ہے جس سے انہوں نے محبوب کی جفاوں، صلے کا خوب ذکر کیا۔انہوں نے اپنی شاعری کو وفا شعار اور محبت کا پیکر بناتا ہے۔یہی وجہ

ہے کہ ان کی شاعری میں موجود متضاد تصورات نہ صرف ان کے پیغام کو جدت عطا کرتے ہیں بلکہ معانی کے تاثر کو گہرا اور پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔

"وہ ہم سے یہ کیسی وفا کر گئے ہیں
ہمیں خود ہی سے جدا کر گئے ہیں

ہر اک زخم دل کا ہرا کر گئے ہیں
وفا کرتے کرتے جفا کرگئے ہیں

محبت کی کہانی میں بہت ہی نازک وقت ہوتا ہے جب کسی کو الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا جاتا ہے۔اس وقت دل پر جو گزرتی ہے وہ دل ہی جانتا ہے۔ایسے میں دل خون کے ا?نسو روتا ہے،اذیت اور کرب کے ان لمحات میں بھی ایک سچے عاشق کو چارو ناچار لبوں پر مسکراہٹ سجانا پڑتی ہے۔اور دل کو جھوٹی تسلیاں دینا پڑتی ہیں۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں ان لمحات ہجر اور عشق کے جوش وجنون اور تنہائی کے سفر کا بہت خوبصورت پیرائے میں اظہار ملتا ہے۔مثلاً:

جہاں چاہو میرا نام لکھو جو چاہو تم الزام لکھو
مجھے عشق نے برسوں قید رکھا، مجھے ہجر کی گہری شام لکھو

میرے جوش وجنوں کا یہ تنہا سفر،اے چارہ گر تمہیں کیا خبر
میرے پاس ہے جو بھی درِ دِہنر،اسے تم میرے ہی نام لکھو

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ تعلیمی میدان اور عملی زندگی میں ہمیشہ کامیاب ہوئیں۔لیکن ان کیدلی جذبات کو ہمیشہ ٹھیس پہنچتی رہی،وہ گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنی واردات قلب کو اشعار کے پیرائے میں بیان کرتی چلی گئیں۔ان کی طبیعت میں برداشت اور قناعت کا مادہ شامل ہوگیا۔وہ اپنی غزلوں میں ہمیشہ بے کل بے کل سے نظر ا?تی ہیں۔

ان کی غزلیات میں خارجیت کا عنصر شاعرہ کے حساس نسوانی رویوں کا پتہ بھی دیتا ہے اور شاعرہ کے معاشرتی تہذیب وثقافت کی طرف فطری رجحان کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ خارجیت کا یہ عنصر نہ تو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے شعروں سے قاری کو جدا ہونے دیتا ہے اور نہ ہی شعروں کو داخلیت سے بیگانہ کرتا ہے۔ خارجیت سے جنم لینے والے نوحے جس دم داخلیت کے دریچوں پر دستک دیتے ہیں تو باہمی ملاپ سے ایک ترنم پھوٹتا ہے جس کی اواز تخلیق بھی ستی ہے اور تخلیق کار بھی اور قاری کی ساعتوں پر بھی پھوار کا موسم لوٹ ا? تا ہے۔ مثلاً غزل ملاحظہ ہو۔

"خود کو بھول جانے کا وعدہ کر رہے ہیں ہم
بن تیرے جینے کا ارادہ کر رہے ہیں ہم

روح و جان کا رشتہ بس ٹوٹنے ہی والا ہے
اور اب غموں کو ہی لبادہ کر رہے ہیں ہم

شاعری میں محبت سب سے سب سے اہم اور بڑا تجربہ ہے اور اس کائنات کا محور ومرکز ہے۔ اپنی ذات سے ماورا ہو کر کسی اور ذات کے لئے خود کو تج دینے کا احساس اور اس میں سے دراصل یہی محبت کی جیت ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی محبت کی یہ کہانی جہاں ایک نسوانی ا?واز کی انفرادیت لئے ہوئے ہے وہاں دوسرے شعرا کے لئے بھی ایک چیلنج ہے کہ وہ چاہیں بھی تو عورت کی محبت کی اس وسعت کو بھی اپنے اندر جگہ نہیں دے سکتے جو بطور ممتا صرف اسی کا مقدر ہے۔ اس جذبے کو رومانوی انداز میں یوں بیان کرتی ہیں۔

تیرے لئے کوئی پھول تو ہو میرے لئے کوئی خار تو ہو
جس گلشن جا کر اپنے اشک ہی ا?ج نچوڑتی ہوں

جب سے وفا بیوپار ہوئی اور جس دن عشق کی ہار ہوئی
اس دن سے ہی سر پر اپنے ہجر کی چادر اوڑھتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے مندرجہ بالا اشعار میں سچی محبت اور عشق جیسے سچے جذبات کی بے قدری کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک محبت ایک کاروبار بن چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سچی اور حقیقی محبت زوال پذیر ہے۔ نتیجتاً معاشرتی اقدار، اخلاقی انحطاط کا شکار ہو رہی ہیں۔

عشق ومحبت میں ہار اور شکست حساس شخص اور شاعر کو دنیا کی گونا گواں سنجیدہ صورتحال سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہجر وفراق کے تازیانے اسے دنیا ومافیہا سے بیگانہ کر دیتے ہیں اور شب فراق کے گہرے سکوت میں محض اپنی ہی ا?واز سے ہم کلام ہونے کا خواہاں نظر اتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں ہمکلامی کی یہ صورتحال ملاحظہ فرمائیں۔

"اے عشق اس قفس سے مجھے اب رہائی دے
دیکھوں جدھر مجھے تیرا جلوہ دکھائی دے

شہر شب فراق کے گہرے سکوت میں
اپنی صدا مجھے بھی کبھی تو سنائی دے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں شاعری اظہار ذات کا اہم وسیلہ ہے۔ ان کے ہاں شاعری مختلف موضوعات کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ ہجر ایک تجربہ ہے جو بیک وقت حقیقی ومجازی دونوں طرح سے اردو شاعری کا موضوع بنا۔ مجازی طور پر ہجر محبوب سے دوری ا?ور فراق کی صورت میں اردو شاعری کا موضوع بنا۔ مثلاً:

"یہ ہجر کا راستہ ہے جس پر میں تنہا تنہا سی چل رہی ہوں
پس اسکی یادوں کی دھوپ ہے اور میں قطرہ قطرہ پگھل رہی ہوں

یہ وصل لمحوں کی روشنی ہے جو دل کی دنیا میں ا?بسی ہے
مہکتی یادوں کی چاندنی ہے جس کی کرنوں سے جل رہی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیں ان کی زندگی میں ا?نے والے تلخ تجربات کا بیان ہے وہ اس قدر حساس واقع ہوئی ہیں کہ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور ظلم وستم کو نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ شاعری کے ذریعے ایک توانا اور صحت مند ردعمل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔معاشرتی تفاوت ان کے ہاں غزل کی پرسوز اور دل گداز فضا کو برقرار رکھتی ہے۔ان کی بے چینی خوبصورت غزلوں کی شکل میں سامنے ا?تی ہے اس حوالے سے محمد حسنین کامران لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے کوہ سلیمان کے قریب معاشرے میں جکڑی ہوئی عورت کے درد خود پر طاری کر کے اس کی عکاسی کی ہے۔انہوں نے اس درد کی کیفیت اور تکلیف کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔"(31)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ا?واز حبس زدہ ماحول کی شکار لاکھوں خواتین کے دکھ درد کی ا?واز ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ صیغہ واحد متکلم کے طور پر جنسی تفاوت اور عدم مساوات کی چکی میں پسنے والی عورت کے مچلتے، سسکتے، تڑپتے اور مرد کی خواہشات کے لئے فرسودہ روایات پر قربان ہوتے ہوئے جذبات کو زبان فراہم کر رہی ہیں۔وہ لفظوں کا سہارا لیکر معاشرتی ناہمواریوں اور کھوکھلی نام نہاد روایتوں کے خلاف جہاد کر رہی ہیں۔وہ اپنے دوسرے شعری دیباچے میں اپنے رنج والم کو فلسفیانہ انداز میں کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں۔

"لفظوں کی، خیالوں کی، دکھ اور سکھ سے سمجھوتیوں کی، یادوں کے ڈھیر پر اٹھنے والی چنگاریوں کو شعلہ بنانے کی اور دل کی بنجر زمین پہ یادوں کے پھول اگانے کی خواہش کتنا دھوکا دیتا ہے خود کو انسان ہار کے بھی جیت کے خیال سے خود کو خوش رکھتا ہے۔خوش فہمیوں میں ایک خیال کو اپنے سلیقی ہنر سے کس کمال کا بت بنا دیتا ہے اور اسے ہی پوجتا رہتا ہے۔ایک ایسا پجاری بن بیٹھتا ہے کہ جو عقل وشعور اور ادراک کے معنی کھو چکا ہے جو اپنے ہاتھوں سے بنا ہوئے پیکر کو خدا سمجھ رہا ہے مگر اسے کون شعور دے کہ

لاحاصل عشق میں تو سب رائیگاں جاتا ہے"(32)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اس کتاب کے دیباچے میں حقوق نسواں کے بارے میں اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ہجر وفراق، کرب، تنہائی اور بے چینی کا احساس ان کے تمام شعری مجموعوں میں بیک وقت پایا جاتا ہے۔ہجر وفراق کے جان لیوا لمحات انہیں کسی پل چین نہیں لینے دیتے اور کچھ یوں اشعار کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

اے آنکھ تو بے خواب ہے خوابوں کی طلب میں
ہجر ہی ا?خر تیرا انعام ہوا کیوں

جو تیری محبت کو سمجھ ہی نہیں پایا
شاہین یہ دل اس کے بھلا نام ہوا کیوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں ہجر جہاں کرب اور بے چینی سے دوچار کرتا ہے وہیں ان کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں۔یہ ہجر انہیں تنہا جینے اور اپنی دنیا ا?پ پیدا کرنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔بچھڑنے والوں کی یاد انہیں زندہ رکھتی ہے۔اسی یاد کے رومانوی احساس سے تخلیق کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ہجر میں ا?نے والی یادوں سے جہاں ا?نکھیں نم ہوتی ہیں۔وہیں ان یادوں کی لو سے دل میں چراغاں بھی ہونے لگتا ہے۔مثلاً:

"اب تک میں ترے بغیر زندہ ہوں کس طرح
ہوتی ہے اپنے ا?پ پر حیرت کبھی کبھی

"وہ چارہ گر کہاں گیا جو دل میں ہے بسا ہوا
ہے رات کی کہاں سحر، مجھے نہیں ہے کچھ خبر

خبر نہیں، خبر نہیں، کہاں وہ اب مقیم ہے
کہاں سے لاؤں اب خبر، مجھے نہیں ہے کچھ خبر

"تیرے لیے جب ا? نکھ برستی ہے رات کو
پھر دل کے ساتھ ساتھ سلگتی ہے زندگی

ہجر وفراق ان کے ہاں با قاعدہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ان کے ہاں یہ ہجر کرب والم برداشت کرنے کا استعارہ بن گیا ہے۔ان کی قوت برداشت بھی لازمی طور پر اس ہجر کی میراث ہے۔ہجر وفراق سے مسلسل عشق نے ان کے عشق میں پختگی پیدا کر دی ے۔وہ ہجر وفراق کی اس قدر قائل ہو چکی ہیں یوں لگتا ہے کہ ان کے عشق کی عمارت ہجر وفراق کی مضبوط بنیادوں کے سہارے کھڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے ان کی شخصیت وشاعری عشق کے بغیر نامکمل ہے۔اور ان کا عشق ہجر وفراق کی رومانوی فضا کے بغیر نا تمام ہے۔ذیل میں دیئے گئے اشعار ہجر وفراق میں ان کے اطمینان کی عکاسی کرتے نظر ا? تے ہیں۔

"ساتھ ہی وہ رہتا ہے کب اسے بھلایا ہے
ہم نے خانہ ? دل میں یاد کو بسایا ہے

"بڑی خوبصورت ہے شاہین دنیا
وہ ا? نکھوں میں سپنے بسا کر گئے ہیں

"تیز ہوا میں دیپ بجھے اور تاریکی سی پھیل گئی
ہجر وفراق کی ہر منزل میں اشک بہائے رکھتی ہوں

"اک پل کا جو وصال تھا ان ماہ و سال میں
دیتا ہے ہجر میں بھی رفاقت کبھی کبھی

میں ایک مشعل، میں ایک جگنو، میں ایک شمع وفا ہوں شاہین
مرے خدا نے رکھا ہوا ہے مجھے تو یوں خوش خیال اب تک

"جب مرا ہر ایک دکھ میرا ہنر ہوجائے گا
زندگی کا یہ سفر ا ?سان تر ہوجائے گا

"ترے فراق میں جیئے، ترے فراق میں مرے
چلو یہ خواب ہی سہی، وصال کا گماں ملے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہجر وفراق کے کٹھن اور بوجھل لمحات میں:

مندرجہ بالا اشعار اشعار میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ہجر وفراق کو سرمایہ ? عشق گردانتی نظر ا? تی ہیں۔ان کا ایمان ہے اگر عشق کے بغیر زندگی بے معنی ے تو ہجر وفراق کے بغیر عشق اپنی چاشنی اور لذت سے خالی ہجر میں وصال کیمزے لینے کی روایت سے پیار یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کلاسیکی انداز بیاں کی روایت سے بھی جڑی ہوئی ہیں۔اور عشق و محبت کے فسانے کو جدید انداز سخن سے بھی روشناس کرا رہی ہیں لیکن بشریٰ اعجاز ان کی اس خاصیت کے لئے کچھ اس طرح رقم طراز ہیں۔

" قلم اور نشتر کا بڑا قدیم رشتہ ہے کبھی نشتر سبھی دکھوں کی دوا بن جاتا ہیا ور کبھی قلم درد کا اند مال بن جاتا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین دونوں سے بہت خوبصورت کام لے رہی ہیں۔شعوری طور پر وہ انسانیت کی خدمت کر رہی ہیں اور لاشعوری طور پر محبت کی خوش رنگ کلیاں چن کر ان کی مالا پرو رہی ہیں۔ ان کی شاعری خوشبوؤں کی پھوار لگتی ہے۔ہجر، فراق، انتظار، رت جگے، اضطراب، بے کلی، ا? س، امید سب محبت کے قبیلے میں شامل ہیں۔"(44)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں ہجر وفراق انتظار، تڑپ، رت جگے وغیرہ عشق کی سوغات ہیں اور ان کو مسلسل بے چین رکھنے کا سبب ہیں۔اس کے باوجود کہ دکھوں اور غموں کی سوغات ان کو بے کل رکھتی ہے۔وہ کبھی بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتیں وہ اسی نا امیدی پیدا کرنے والے ماحول سے رجائیت کا پیکر تراش لیتی ہیں۔ان کے نزدیک محبت میں

ناکامی کا مطلب شخصیت کی پختگی اور عرفان ذات ہے۔ چند شعر دیکھیں:

"موم کر دیتا ہے شاہین یہ پتھر دل کو
عشق انسا ن کو معبود بنا دیتا ہے

تنہائیوں میں چھیڑ کر تارِ رباب شوق
صحرا میں ا ?ج جشن مسرت منائیں ہم

"بڑی خوبصورت ہے شاہین دنیا
وہ ا ? نکھوں میں سپنے بسا کر گئے ہیں
"اک پل کا جو وصال تھا ان ماہ و سال میں
دیتا ہے ہجر بھی رفاقت کبھی کبھی

عشق ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا غالب موضوع ہے۔ عشق سے وابستہ خواہش اور پھر ناکام حسرتیں انہیں وقتی یا جزوی طور پر مایوسی کا شکار ضرور کرتی ہیں۔ لیکن یہ نا امیدی کے سائے زیادہ دیر تک ان کی شخصیت پر نہیں چھائے رہتے بلکہ اس جزوی مایوسی سے بھی امید کی بے شمار قندیلیں جگمگانے لگتی ہیں۔ انہیں انسان فطرتاً اور خدا سے عشق ہے، اس لئے وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کو مرحلہ وار طے کرتی نظر ا?تی ہیں۔ نامور ادیب پروفیسر اور نقاد ڈاکٹر سیتہ پال ا?نند ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

"ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی کچھ نظمیں یقیناً بڑی نظمیں ہیں جنہیں سراہا جانا چاہیے۔ اس میں صوفیانہ عشق کی ا?سمان بدست بلندی سے لے کر تعشق اور ہوس کے تحت السرا تک شاعروں نے طبع ا?زمائی کی ہے۔ نجمہ شاہین کی نظموں میں یہ جذبہ ان دو بے نہایت حدود کے درمیان اس سطح

مرتفع پر قائم ہے جسے ہم من وتو کا علاقہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس "من وتو "میں ''من'' تو یقیناً شاعرہ کا واحد متکلم ہے وہ خود ہے یا اس میں اس کی انا ہے لیکن ''تو'' محبوب بھی ہوسکتا ہے دوست بھی ہوسکتا ہے۔ نامہرباں ا?سمان بھی ہوسکتا ہے اور ظالم حاکم بھی "اس کی ایک وجہ تو غزل کی چار سو برس پرانی ور مستحکم روایت ہے جس نے غزل ہی کو نہیں بلکہ اردو نظم کو بھی اب تک من وتو کے حصار میں کر رکھا ہے اور دوسری وجہ ا?سان راستوں کے سفر کو پر پیچ راستوں پر فوقیت دیتا ہے وہ محبت ہے پاک صاف جذبے کو جہاں خوش روی اور شائستگی سے بیانیہ یا مکالمہ کے فارمیٹ میں ڈھالتی ہیں وہاں پُرکاری اور سحر کاری کا انداز بھی اپناتی ہیں۔"(49)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا عمیق نظر سے جائزہ لیں تو کبھی اپنے داخلیت کے حصار میں گم ہو کر اپنی محبت کی رعنائیاں بیان کرتی دکھائی دیتی ہیں تو کبھی خارجیت سے متاثر ہو کر اپنی ذات کو فطری حسن کے حوالے کرنے پر مجبور نظر ا?تی ہیں۔ عشق کے بغیر ان کی شاعری بالکل ادھوری اور نامکمل نظر ا?تی ہے۔ عشق کے اس جذبے کے بارے میں وہ خود اس طرح لکھتی ہیں:

"وقت بیت جاتا ہے، عمریں گزر جاتیہیں مگر حقیقتیں وقت کی دھند میں دھندلا کے بھی ختم نہیں ہوتیں۔ زندگی کے جھمیلوں سے تھک ہار کے شام کو اپنے اپنے گھروندوں میں لوٹنے والوں ک کوئی ایسا پل ضرور ملتا ہے جب وہ اپنی ذات کا سفر کرتے ہیں۔ اپنی سوچ کا سفر اور سفر تو سارا سوچ کا ہی ہے۔ یہ سوچ ہی تو ہے جو پیٹ کے بل لڑکھڑاتی عشق کا روپ دھارے گردش زمانہ کی تمام تلخیاں سمیٹے، تمام کٹھن اور اذیت سے بھرپور راہوں کا سفر کرتے کرتے اپنے قبلہ و کعبہ تک پہنچتی ہے۔ اور اپنے خلوص کا تحفہ اپنے معشوق کے منتظر ہونے کی صورت میں باقی ہے۔"(50)

عشقِ حقیقی:

غزل کا عاشق جب عشق مجازی کی منزل کونہیں پا سکتا تو عشق مجازی میں ناکامی اسے عشقِ حقیقی کی طرف راغب کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ عشق حقیقی کے راستے پر چل کر ہی وہ اپنی منزل و مراد کو پا سکتا ہے۔ اس لئے غزل میں بھی ایسا ہی ایک عاشق ہے جو اپنی منزل کو عشق حقیقی کا راستہ بنا کر مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہ کامیابی اسے صرف اور صرف خدا کے ذریعے سے ہی مل سکتی ہے۔ مثلاً:

"ابتدا درد ہے ، انتہا در ہے
عشق کا درد تو لا دوا درد ہے

میں نے پوچھا وفا کا صلہ جو کبھی
اس نے ہنس کر یہ مجھ سے کہا درد ہے

عشق ایک ایسی منزل ہے جو انسان کو دنیا کے ہر دکھ درد سے عاری بھی کر دیتی ہے۔ اس میں ا؟ کر انسان دنیا کی حد بھی پار کر جاتا ہے۔ اس میں وہ درد کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اذیت کے ا؟ خری لمحات کو بھی پر سکون انداز میں جھیل جاتا ہے۔ مگر اس درد کو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے غزل کے رنگ میں ڈھال کر اور بھی پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ مثلاً:

"مرا دل اس لئے دھڑکا نہیں ہے
پلٹ کر اس نے جو دیکھا نہیں ہے

الٰہی میں کہاں پر ا ؟ گئی ہوں
اجالا بھی جہاں اجالا نہیں ہے

غزل کا عاشق زندگی کی تمام مشکلات اور مسائل کو خدا کی مدد کے ذریعے سے عبور کرنا چاہتا ہے اسے معلوم ہے کہ عشق حقیقی ہی واحد راستہ ہے جو اسے اپنی منزل تک پہنچا سکتا

ہے۔ مثلاً:

میں مٹ چکی ہوں اور نمایاں ہوا ہے تو
مرشد خمار میں یوں خماری گئی ہوں میں

اس وجد میں موجود کہاں ہے میرا وجود
جانے کہاں پہ ساری کی ساری گئی ہوں میں

رجائیت اور قنوطیت کا امتزاج:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلیں رجائیت اور قنوطیت کا حسین امتزاج لئے ہوئے ہر دو طرح کے قاری کی ضروریات کا ساماں لئے ہوئے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ کہیں ان کی غزلوں میں قنوطیت نظر ا؟ تی ہے تو کہیں رجائیت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر و فلسفہ کا رنگ نمایاں طور پر جھلکتا نظر ا؟ تا ہے۔ رجائیت میں ان پر علامہ اقبال ? کا اثر غالب نظر ا؟ تا ہے جبکہ قنوطیت روایت کی میراث لگتی ہے۔ شاعرہ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں قنوطیت اور رجائیت ساتھ ساتھ چلتی نظر ا؟ تی ہیں۔ مثلاً:

"خوشیوں کا راستہ گو بڑا مختصر رہا ہے
لیکن دکھ سدا سے مرا ہمسفر رہا ہے

قدرت نیکائنات میں ہر چیز پر عمل کا متضاد تخلیق کیا ہے۔ شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی ہر چیز کی اہمیت وافادیت کو اس کے متضاد سے پرکھتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں رجائیت ،قنوطیت کے رنگوں میں پیوست نظر ا؟ تی ہے۔ شاعرہ اس امید کے ساتھ پیغام دے رہی ہے کہ ایک دن خوشی انسان کا مقدر بنے گی۔ دکھ کے بعد سکھ نے ا؟ نا ہی ہوتا ہے۔ دکھ کا سمندر جس قدر بھی گہرا ہوا ایک دن اس کا سفر ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری امید کی کرن بن کر سامنے ا؟ تی ہے۔

"وہ رستہ ، وہ پتھر، وہ چوکھٹ ہے جاناں
نگاہوں میں اب تک وہ منظر ہے جاناں

یہ ممکن ہے خوشیاں لئے ہوئے لوٹ آؤ
کھلا ا ؟ج بھی تو مرادر ہے جاناں

جینے کی امنگ اور زندگی کا سفر بہت سے لوگوں کی منزل اور بھی ا؟سان بنا دیتا ہے۔ جب ہمت اور امید دلانے والا ہم سفر موجود ہو۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں ایسا ہم سفر ان کی شاعری میں موجود ہے جو امید اور خوشیوں کا خواہاں ہے مثلاً:

یہ جو خوشیوں کا نگر ہے یونہی ا؟باد رہے
دکھ کی نگری کو تو ہر حال میں ویران چاہوں

ان کے ہاں مایوسی اور قنوطیت کا رجحان وقتی اور جزوی طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ قنوطیت کا یہ عارضی تاثر ڈرامائی انداز میں امید اور رجائیت کی طرف لے جانے کی وجہ بھی بنتا ہے۔ حتمی طور پر ان کی شاعری، امید، امن اور خوشیوں کا سندیہ دے رہی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں قنوطیت اور رجائیت کے تضادات ایک دوسرے کے بالمقابل نظر ا؟تے ہیں۔قنوطیت کے حوالے سے چند اشعار دیکھئے:

وعدہ بھی ساتھ لے گیا جاتے ہوئے وہ ا؟ج
ملنے کا ا ؟خری تھا جو امکاں وہ لے گیا

درد ہی درد ملے ہاتھ کی ریکھاو ؟ں میں
کم نصیبی نے دیے حیف یہ اسباب مجھے

زندگی بسر کرنا اس قدر نہیں ا ؟ساں
تشنگی ہے صحرا کی اس کے گہرے پانی میں

ہیں گرد گرد راستے ، منزل دھواں دھواں
دست وفا کو کون یہ سنسان کرگیا

اب رجائیت کے حوالے سے چند مثالیں دیکھئے

"قدم ہمارے نہ ڈگمگائے
گو راستے پُر خطر رہے ہیں

"لٹ گیا اسباب لیکن ا ؟رزو باقی رہی
جستجو جاری اور سفر کے درمیاں " (62)

"ہزار شکوہ شکایت سہی لیکن
وہ اس کے سامنے سارے گلے بھلا دینا"

"عمر بھر کے جس سفر کو رائیگاں کہتے ہو تم
اک نہ اک دن دیکھنا کار جہاں ہو جائے گا"

" ا ؟ندھیوں میں اڑا رہی ہے وفا
دشت کیسے دکھا رہی ہے وفا

چلتے چلتے میں تھک گئی ہوں مگر
اک نئی راہ دکھا رہی ہے وفا

مندرجہ بالا شعری مثالوں سے یہ بات ثابکل واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلوں میں جدت کے ساتھ ساتھ روایتی رنگ کی جھلک بھی موجود ہے۔ ناامیدی

کے گرداب میں پھنسے انسانوں کی تمام امیدیں دم توڑنے لگتی ہیں تو اا چانک فکر کی لو تیز ہونے لگتی ہے۔اور اندھیرے میں امید کی کرن جگمگانے لگتی ہے۔

نامور نقاد شبیر ناقد اپنی کتاب ''شاعرات ارض پاک'' میں ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ان کا ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا پیرایہ ?اظہار فطری نوعیت کا ہے۔ان کا لہجہ بھرپور قسم کا ہے۔ان کے جذبوں میں شدت وجدت ہے ان کے کلام میں سوز وگداز ہے۔معرفت ومجاز کے فزوں تر حوالے ہیں ان کے اشعار میں خیالات کے تضاد کا بھی خوبصورت التزام ملتا ہے۔"(66)

نسوانیت:

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں نسوانیت کے توانا لہجے کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔نسوانی رنگ شاعری کے حصار میں اضافہ کرتا ہے۔اردو شاعری میں پروین شاکر فہمیدہ ریاض اور ادا جعفری اور کشور ناہید نے اپنی شاعری میں نسوانیت کو فروغ دیا ہے مگر ان کے بعد نسوانیت کا رنگ ہمیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں منفرد دکھائی دیتا ہے۔مثلاً:

ہنسی نہ دے سکا مگر مجھے ملال دے گیا
وہ ایک شخص روح کو عجب زوال دے گیا

وفا کو پھر لغات میں فریب ہی لکھا گیا
وہ چاہتوں کو دیکھئے عجب مثال دے گیا

قدرت نے عورت کے جذبات میں بے پناہ شدت رکھی ہے کہا جاتا ہے کہ عورتوں کی زبان کی بنیاد ہی جذبات نگاری پر پڑی اور ان کی زبان میں جذبات نگاری اور زور بیان کے الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ایک مشرقی عورت جو سماجی اقدار کی نفی کا حوصلہ نہیں رکھتی جب پہلے پہل اس کے دل میں ایک خوبصورت احساس جاگزیں ہوتا ہے۔تو اس احساس کا اپنے

الفاظ میں کیسے بیان کرتی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں اس کا اظہار کچھ یوں ملتا ہے:

"زندگی جب بھی رو برو ا ?ئی
میں ہر اک دُکھ کو خود ہی چُھو ا ?ئی

جب بھی اس کا خیال ا ?تا ہے
اپنے دل سے بھی خوشبو ا ?ئی

ایک ایسی لڑکی جو صرف اور صرف محبت کو ہی دنیا کا قانون مانتی ہے اس کے نزدیک محبت ہی امن وسکون کا گہوارہ ہے۔وہ جانتی ہے کہ حق کی خاطر موت کو بھی گلے لگانا پڑتا ہے مگر پھر بھی وہ اپنا حق لینے کے لئے پیچھے نہیں ہٹے گی۔زمانے کی باتیں اور رسوائی اسے مزید طاقتور بنا دیتی ہے۔نسوانیت کے یہ جذبات ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

"دیکھا جو خالی ہاتھ سویرے بھی ہنس پڑے
بلایا جو اس نے چاند اندھیرے بھی ہنس پڑے

کل تک الجھ رہی تھیں جن سے وفا کے ساتھ
وہ چھوڑ کر چلے تو لٹیرے بھی ہنس پڑے"

معصوم لڑکی ہاتھ کی پیالی میں ٹھوڑی رکھے اپنے محبوب سے باتیں کرنے میں مگن ہے۔محبت کی ہار میں جیت کے بھی ہی اصول ہوتے ہیں۔محبت کی ہار میں جیت کا مزہ چھپا ہے جسے ایک مشرقی لڑکی سے زیادہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اس کیفیت کا کچھ اس طرح اظہار کرتی ہیں۔

"ا ?ندھیوں میں اڑا رہی ہے وفا
دشت کیسے دکھا رہی ہے وفا

چلتے چلتے میں تھک گئی ہوں مگر
اک نئی راہ دکھا رہی ہے وفا

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ایک انفرادیت ان کی شاعری میں عورت اور رومانویت پسندی کا عنصر ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے عورت ہونے کے خوبصورت جواز کو خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ان کی شاعری میں

عورت کے جذبات و کیفیات، حسیات اور اظہاریات کا ایک ایسا جہاں دکھائی دیتا ہےجہاں روحانیت دھیرے دھیرے رقصاں نظرا?تی ہے۔ان کی شاعری میں جہاں عورت کے جذبات کی عکاسی نظرا?تی ہے وہاں پرمحبت کا عکس نمایاں ہے۔اس لئے وہ ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جس میں خوبصورتی، علمیت، مہارت وقسمت اور اخلاقی مضبوطی یکجا نظرا?تی ہے۔

تیرے لئے کوئی پھول تو ہو میرے لئے کوئی خار تو ہو
جس گلشن جا کر اپنے اشک ہی ا?ج نچوڑتی ہوں

جب سے وفا بیوپار ہوئی اور جس دن عشق کی ہار ہوئی
اس دن سے ہی سر پر اپنے ہجر کی چادر اوڑھتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کوسہ کی شاعری کا موضوع خود نجمہ ہی ہے۔یعنی ایک عورت اور عورت کی نفسیات ہی ہے۔وہ مردوں کے اس معاشرے میں نسوانیت کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے اور کردار بھی وہ جو احساس کی دولت اور اظہار کی طاقت سے مالا مال ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں عورت، اس کے گرد بھنگڑا ڈالتی محرومیوں اور ناکامیوں کے بیچ چکر کاٹتی ہوئی نظرا?تی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے اشعار میں جگہ پانے والا خارجیت کا عنصر دراصل خود کا یعنی عورت کا سماج معاشرے اور معاشرتی رویے، تہذیب وثقافت اور روایات کے خلاف فطری بغاوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

"کوئی شنوائی ملی ہم کو نہ گویائی ملی
دیکھئے تو زندگی میں کیسی تنہائی ملی

جس کی لے میں گونجتا تھا دکھ کہانی کا ہی راگ
اک ایسے گیت والی ہم کو شہنائی ملی

نسوانیت کی چند مزید مثالیں ملاحظہ کیجئے:

"جس رستے میں جگمگ کرتی یاد کے دیپک روشن تھے
اس کی خوشی کی خاطر میں اب وہ رستہ بھی چھوڑتی ہوں

"مقتل میں جان دینا تھی پیاروں کے واسطے
میں ہی تھی ان کو جان سے پیاری گئی ہوں میں

"اس کے قدموں میں جنت ہے تو مطلب یہ ہے
ا?سمانوں سے جسے رب نے اتارا، ماں ہے

نسوانیت اس شاعرہ کی شاعری میں زیادہ نمایاں نظرا?تی ہے جو خانہ داری اور خاندانی نظام کے تحت اپنی زندگی گزار رہی ہوتی ہے جس خاتون کا خاندانی پس منظر، کلچر، تہذیب مضبوط ہوگا وہ حقوق نسواں اور معاشرے میں تعمیری کردار کے لئے اپنی ا?واز بلند کرے گی۔رضی الدین رضی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ ایک باوقار، مہذب، شائستہ خاتون ہیں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ عورت اپنے تقدس کو برقرار رکھتے ہوئے بھی سب کچھ حاصل کرسکتی ہے۔ جس کے حصول کے لئے بعض خواتین اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہیں وہ ایک مثال ہیں ان سیکڑوں ہزاروں لڑکیوں کے لئے اور ان والدین کے

لئے جنہیں کسی انجانے خوف اوراندیشے کے باعث تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے۔انھوں نے ثابت کیا ہے کہ والدین جب اپنی بیٹیوں پر اعتماد کرتے ہیں تو بیٹیاں بھی ان کے اعتماد پر پورا اترتی ہیں اوران کے وقار کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دیتیں۔انہیں اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے شاعری کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے لیکن اس کم وقت میں بھی انہوں نے جس تیزی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کئے ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔"(76)

جب بھی کوئی خاتون شاعرہ اپنی شاعری کا اظہار صیغہ ? واحد متکلم (مو?نث) میں کرتی ہے تو اس کی شاعری میں نسوانیت درا?تی ہے۔ان کی شاعری میں ایسا ہی انداز موجود ہے جو ان کو حقوق نسواں کا علمبردار بنا دیتا ہے۔

"میں بھی کتنی سادہ دل ہوں دشمن جاں کو دوست کہوں
مفت میں خود کو وہم وگماں میں اکثر ڈالے رکھتی ہوں

کہ میں نے چاہت کو بھی عقیدہ بنا لیا ہے
اگر ملی تو عقیدوں میں تمہیں ملوں گی

"پہلے تو پاگل ہوتی ہے کوئی تنہا کسی کی یادوں میں
پھر ہوتے ہوتے ہوتی ہیں یہ پایل، چوڑیاں اور مہندی

"بھول جاتی ہے جو تیری چاہت کو
ا?نکھوں میں ہوتی ہے یہ نمی نہیں ہوتی

مانوں گی ہار ظلمت شب سے نہ میں کبھی
جب تک روشنی ہے اس دل کے چراغ میں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلوں میں نسوانی حسن تقریباً ہر جگہ چھلکتا ہوا نظر ا?تا ہے۔شاعری میں ان کا مقام کیا ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا۔تاہم سعداللہ شاہ ان کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

"شاعری دراصل چاند کے ہالے کی طرح ہوتی ہیجو مرکز کو منبع کا پتہ دیتی ہے۔ڈاکٹر تو ویسے ہی نرم دل، نرم خو ہوتا ہے کہ اس کے من میں انسانیت کا درد اور خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔اور اگر شاعر ہو تو سونے پہ سہاگے والی بات ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ پھولوں کے پودے پر شہد چھتہ لگا ہوا ہے۔مجھے معلوم ہے کہ نجمہ شاہین شاعری کو اتنا وقت نہیں دے پائے گی جتنا یہ ظالم مانگتی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ شاعری کو اپنے منفرد اور والہانہ خیالات سے ضرور ہم ا?ہنگ کر دیں گی کیونکہ شاعری ان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہے۔"(82)

نرگسیت:

نرگسیت ایک ایسا موضوع ہے جو ہر بڑے شاعر کے ہاں ضرور ملتا ہے۔ولی سے لے کر اقبال تک ہر بڑے شاعر کے ہاں نرگسیت کا عنصر موجود ہے۔''نرگسیت'' کا لفظ وسیع معنی رکھتا ہے۔اس کی متعدد شاخیں ہیں جو نرگسیت کے زمرے میں اتی ہیں۔مثلاً الفتِ ذات، خود پسندی، شاعرانہ تعلیٰ، مضبوط تصوریت، عقل وخرد کی پختگی وغیرہ نرگسیت ہی کی شاخیں ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا مواد عشق ومحبت، ہجر وفراق، خواہش وصال اور روح کی پکار ہے۔تاہم ان کی غزلوں میں کہیں کہیں نرگسیت کی جھلک بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔مثلاً:

"مثال بن کے مثالوں کے ساتھ مرنا ہے
مجھے تو اپنے حوالوں کے ساتھ مرنا ہے

وہ کہہ رہے ہیں مقدر ہے تیرگی لیکن
میں کہہ رہی ہوں اجالوں کے ساتھ مرنا ہے

مندرجہ بالا اشعار میں نرگسیت کا عنصر نمایاں ہے یعنی شاعرہ اپنی ذات، تجربات اور مشاہدات کے ساتھ رہنے کا ہنر جانتی ہے۔ ان کی ذات کو کسی بھی قسم کے مسائل نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ زندگی کے نشیب وفراز میں ایسے لمحات بھی ا?تے ہیں جب انسان بالکل نا امید ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے کی سکت ختم ہو جاتی ہے لیکن ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایسے حالات میں بالکل نہیں گھبراتی وہ اپنے معیار سے کم پر کبھی اکتفا نہیں کرتیں۔

"دل کو کیا ملول ، اور ویران ا ? نکھ کو
کچھ یوں بھی جسم وجاں میں قدم دھر رہی ہے رات

رکھ کر ردائے عشق میں کچھ پھول اور خواب
شاہین ا?ج میری طرح مر رہی ہے رات"

ڈاکٹر نجمہ شاہین کوسہ کی شاعری میں نرگسیت کا اعتراف بہت سے ادیبوں نے کیا ہے۔ مثلاً شاکر حسین شاکر لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں رنگ اور پھول نمایاں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نظموں میں روزمرہ کے مسائل کے علاوہ ان اقدار اور کائنات کے دکھوں کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ تخلیقی شعور کی عکاس ہونے کے علاوہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں جس نے نجمہ شاہین کھوسہ کو ہم عصروں سے ممتاز کر دیا ہے۔"(85)

غمِ دوراں:

زمانے کے غم یا شہرا?شوبی شاعری غم دوراں کے زمرے میں ا?تی ہے۔ جب انسان داخلی طور پر ٹوٹ جاتا ہے تو غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کو اپنانے لگتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں غم دوراں کے موضوع نے ان کی اپنی ذات سے جنم لیا ہے۔ شاعرہ کی پرورش جبر اور گھٹن والے ماحول میں ہوئی ہے۔ شاعرہ نے اس جبر کے خلاف جو علم بلند کیا

ہے اس کا واضح اظہار ان کی نظموں میں ملتا ہے لیکن غزلوں میں بھی غم دوراں کا تذکرہ ملتا ہے۔ غم دوراں کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

"اگر ڈھونڈنا ہے وجود اپنا تم کو
کسی دل کے اجڑے مکاں ہی میں ڈھونڈو

ملے گی اندھیرے میں اجلی کرن بھی
اسے سوچ کی کہکشاں ہی میں ڈھونڈو

"زندگی میں زندگی دکھ بھر گئی
روشنی ا ? نکھوں کی مدھم کر گئی

"اب یہاں بس شور ہے اور سسکیاں ہیں چار سُو
دیکھ لینا یہ جہاں وحشت کا گھر ہو جائے گا

عمر بھر کے جس سفر کو رائیگاں کہتے ہو تم
اک نہ اک دن دیکھنا کار جہاں ہو جائے گا

مندرجہ بالا اشعار میں کہیں کلی طور پر اور کہیں جزوی طور پر غم دوراں کا تذکرہ موجود ہے۔ مسائل اور مصائب کے خاتمے کے لئے غور وفکر بھی موجود ہے جو ان کی رجائیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے تیسرے شعری مجموعے میں موضوعات میں کافی حد تک وسعت پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں داخلی کیفیات کا اظہار بھی ملتا ہے اور خارجیت کا عنصر بھی نمایاں نظر ا? تا ہے اور غم دوراں کا ذکر خارجیت کا اظہار کی ہی ایک جھلک ہے۔

"ساری تحریریں مٹیں، ساری تنویریں بجھیں
ہچکیاں ہی ہچکیاں ہیں، سوگئیں پروائیاں

بے بسی کی شام پر سسکی ہے پہروں زندگی
خواب کی خواہش میں ہم تو کھو چکے بینائیاں

"دل بھی پتھر، ، ا? نکھ بھی پتھرا گئی
کھو گئیں دنیا کی سب بینائیاں

دب گئی ان کی صدا چیخوں میں جب
مقتلوں میں رو پڑیں شہنائیاں

"وہ لاپتہ ہوں جس نے خود گنوا دیا تھا راستہ
ہوئی کہاں سے در بدر، مجھے نہیں ہے کچھ خبر

" کبھی محبت تو اپنی نا کی خاطر بھی مارتے ہیں
یہ بھیڑیے شاہ زادیوں کو خدا کی خاطر بھی مارتے ہیں
یہ مقتلوں کی روایتیں بھی عجب ہیں نجمہ یہاں پہ اکثر
گلا دبا کہ کسی کو اپنی صدا کی خاطر بھی مارتے ہیں "

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل کے فکری محاسن کا بنظرِ عمیق جائزہ لیں تو ان میں عشق و محبت میں کامیابی و ناکامی، ہجر و وصال، نسوانیت، قنوطیت و رجائیت، غمِ جاناں، غمِ دوراں اور نرگسیت کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے موضوعات کا احاطہ نظر ا? تا ہے۔

علامتیت:

پچھلی نصف صدی کے دوران اردو غزل نے زمانے کی بدلتی ترجیحات، نئے رویوں اور کرداروں کے باوجود اپنے اصل مزاج سے کبھی بھی روگردانی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بھی اس روایتی غزل کو فروغ دیا جس میں زمانے کی بدلتی ترجیحات، نئے رویوں کو اپنی غزل کا حصہ بنایا۔ ہر زمانے میں غزل نے اپنے دور کی اشیا اور مظاہر کو خود سے جوڑے رکھا۔ غزل اپنے زمانے کی عکاس ہوتی ہے وہ زمانے کی بدلتی ہوئی چیزوں اور رجحانات کی عکاسی اپنے جدید طریقہ اظہار سے کرتی ہے۔ مگر ا? ج کا جدید غزل گو شاعر اپنی غزل میں معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ کا منظر دکھاتا ہے۔ اس کے لئے دھوپ، صحرا، زلزلہ، سوکھی دھرتی، پت جھڑ، راکھ کا ڈھیر، تپتے سورج اور لاتعداد دوسرے مظاہر کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ایسے ہی لاتعداد علامتی الفاظ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا حصہ ہیں۔ انہوں نے دورِ جدید کے لحاظ سے ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جن میں علامتیت کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً:

" گردشوں میں کھو گئے اور داستاں ہم ہو گئے
زندگی تیرے لئے ہے بس نوحہ خواں ہم ہو گئے

اپنی ا? نکھوں میں اگرچہ یاد کے جگنو بھی تھے
راہ پہ نکلے تو بس بجھتا دھواں ہم ہو گئے

مندرجہ بالا اشعار میں انہوں نے زمانے کی گردشوں، جگنوں اور دھواں جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ میں علامتیت کا رنگ غالب نظر ا? تا ہے۔ غزل میں علامتیت کی جھلک گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے شاعری میں جدید دور کا رنگ اپنایا ہے۔ علامتی الفاظ شعری استعارہ ہوتے ہیں۔ ان کو بیان کرنا ا? سان نہیں ہوتا۔ مثلاً:

"جہاں سے بس ایک دن گزرنا تھا تمہارا
فضا ا ?ج تک معطر ہے جاناں

تیرے نام پر چھوڑی ساری دنیا
وہ کہتے ہیں شاہین تو خودسر ہے جاناں "

جاناں، شاہین جیسے الفاظ شاعری کی جان ہیں، شاعری میں اس طرح کے الفاظ ہمیں بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثلاً:

" کیسے جان لوں کہ تجھے ہجر کا دکھ
چہرے کے ساتھ اشک جو تیرے بھی ہنس پڑے

شاہین ٹھہر گئی ہے بہت میری ذات میں
اندھیروں کے ساتھ ساتھ سویرے بھی ہنس پڑے

ہجر، اشک، شاہین جیسے الفاظ علامتی ہیں ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ شاعرہ بے پناہ کرب کی زد میں دکھائی دیتی ہے۔شاعرہ اندر سے بے چینی اور کلبلاہٹ کی کیفیت میں مبتلا ہے۔یہ علامتی الفاظ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ذہنی پختگی کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً:

" نظر کے سامنے ہیں گلشن، ظلم کی تاریخیں،
جنوں کار دیتا ہے ہمیں یہ درد تنہائی
بڑی مشکل سے ملتا ہے مقام ا? گاہی شاہیں
عجب شاہکار دیتا ہے ہمیں یہ درد تنہائی

پت جھڑ میں، خزاؤں میں تجھے ڈھونڈ رہی ہوں
میں زرد فضاؤں میں تجھے ڈھونڈ رہی ہوں

شاہین ابھی تک یہ میرے ہاتھ ہیں خالی
بے مہر دعاؤں میں تجھے ڈھونڈ رہی ہوں

پت جھڑ، خزاؤں، دعاؤں جیسے الفاظ علامتی طور پر استعمال کئے گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ زندگی کے ہر موسم سے بخوبی شناسائی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کی خزاں شاموں اور زرد فضا سےبھی اچھی طرح واقف ہے۔شاعری میں ایک لطیف سا احساس ہوتا ہے وہ اس لطیف جذبے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ جذبہ اور احساس رنگ، نسل اور عمر سے ماورا ہے۔ اس جذبے کو ہر جاندار محسوس کرسکتا ہے مگر اس کو بیان کرنے کا انداز منفرد اور جدا ہوتا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزلوں میں اس جذبے کو اتنی گہرائی اور سچائی سے بیان کیا گیا ہے کہ تمام شاعری تجربے کا تاروبود اس کے گرد بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی سے ان کی غزلوں میں محبت اور ہم ا? ہنگی کا درس جھلکتا ہے۔مثلا:

"نہ گل میں اب نہ گلستاں میں ڈھونڈو
محبت کو بس ا ?ستاں میں ڈھونڈو

نشانی محبت کی تم کو ملے گی
کسی ایک دھندلے نشان ہی میں ڈھونڈو

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل کا فنی جائزہ

شاعر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے الفاظ کا سہارا لیتا ہے اور الفاظ کا صحیح برمحل اور مناسب استعمال ہی شاعر کے انداز بیان کو دلکش اور خوبصورت بناتا ہے۔ اچھے لفظوں سے بُرے معنی لینا اور بُرے الفاظ سے اچھے مفہوم و مطلب کا کھوج لگانا ہی شاعر کو اپنے فن میں کمال عطا کرتا ہے۔ دنیا کے ہر ادب نے اپنے لئے کچھ اصول وضوابط مرتب کئے ہیں۔ اردو زبان اور شاعری بھی ان اصول وضوابط کے سرمائے سے مالا مال ہے۔

کسی غزل گو کے کلام میں موجود محاسن و معائب کا جائزہ لینے کے لئے اس کلام

میں موجود ضائع بدائع اور علم بیان کے ضابطوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ شاعری میں الفاظ کا صحیح برمحل اور مناسب استعمال فصاحت و بلاغت کہلاتا ہے۔ اسی فصاحت و بلاغت کو ضائع بدائع کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی، امام فخر الدین رازی کے نظریہ فن کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

"بلاغت یہ ہے کہ انسان عبارت میں اس باریکی تک پہنچ جائے جو اس کے دل میں ہے اور ساتھ ہی خلل پیدا کرنے والے اختصار اور ملال پیدا کرنے والی طوالت سے بھی عبارت کو بچائے اور فصاحت یہ ہے کہ عبارت تعقید سے خالی ہو فصاحت و بلاغت شاعری کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کو زندہ رہنے کے لئے روح ضروری ہوتی ہے۔"(100)

فصاحت و بلاغت یعنی صنائع بدائع کے حوالے سے علمائے علم و ادب نے بہت سے مشہور مقالے تحریر کئے ہیں تاہم صنائع بدائع کے حوالے سے مستند کام سید انشا اللہ خان انشا، امام بخش ناسخ، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق اور جدید نقادوں نے کیا ہے۔ اس حوالے سے ''مقدمہ شعر و شاعری'' اولین تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی صنائع بدائع سے جو مراد لیتے ہیں اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

"نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو، لفظ نیچرل شاعری کے موافق ہونے کی یہ ترکیب و بندش تا بہ مقدور اور اس زبان کی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔"(101)

نیچرل شاعری کا سہارا لے کر اصل میں الطاف حسین حالی غزل کی مخالفت کرتے نظرا?تے ہیں اور اس طرح صنائع بدائع کی بھی مخالفت کرتے نظرا?تے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ شعرا کے پاس صنائع بدائع کا علم نہیں ہے اور صنعت الفاظ کے ذریعے

ایسے شعرا نے اردو شاعری کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"الفاظ کی فصاحت یہ ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو الفاظ نا موزوں نہ ہوں اور قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں۔ کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا صحیح ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب و توازن حاصل ہو۔ بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا غلط ہے کیونکہ کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے تمام الفاظ مفردات، مرکبات فصیح نہ ہوں۔ پس بلاغت یہ ہے کہ کلام تقاضہ حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔"(102)

صنائع بدائع کی تعداد کیا ہونی چاہیے اس بات کا فیصلہ اور تعین مشکل کام ہے۔ تاہم اردو ادب میں عام طور پر ایہام، تضاد، مراعات النظیر، حسن تعلیل، مبالغہ، تکرار، تلمیح اور تجنیس کی صنعتیں زیادہ تر برتی گئی ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے کلام میں بھی لفظی صنعت گری کے نمونے بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں اگرچہ لفظی و معنوی صنعت گری کی تمام خوبیاں تو نہیں پائی جاتیں تاہم ان کے ہاں چند صنعتوں کے کچھ نمونے ضرور پائے جاتے ہیں۔ مثلاً صنعت تلمیح کی ایک مثال دیکھیں:

"پھر مصر کے بازار میں نیلام ہوا کیوں
اے عشق بتا تیرا یہ انجام ہوں کیوں

اسی شعر میں صفت تلمیح کے ذریعے قصہ یوسف و زلیخا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے مصر کے بازار کا جہاں کہیں بھی ذکرا?ئے گا قاری کا ذہن خود بخود قصہ ؟ یوسف و زلیخا کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ صفت تضاد کی مثال ملاحظہ کیجئے۔

"موت لکھ کہ میری ہتھیلی پہ

زندگی ا ?پ بھی تو شرمائی

مندرجہ بالا شعر میں زندگی اور موت کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔ دو متضاد فلسفے یعنی زندگی اور موت کو ایک ہی شعر میں بڑے احسن انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں صنائع بدائع کے زیادہ نمونے صفت تضاد اور صفت تکرار کے ملتے ہیں۔ تاہم تلمیح ،تجنیس ،مراعا? النظیر اور لف ونشر کی غیر شعوری کوشش بھی نظر ا?تی ہیں۔ علم وفن اور بحور سے شاعرہ زیادہ واقفیت نہیں رکھتی ہیں اس کے باوجود ایک مثال دیکھیں جس میں تضاد کے ساتھ ساتھ غزل کی مشکل پسندی کا اعتراف کر رہی ہیں۔

کل سوچا تھا شعر میں تجھ سے سارے شکوے کر ڈالوں گی
ا?ج غزل کہنے بیٹھی تو کیوں اتنی دشواری سائیں

اپنے من کو آگ لگائی اور پھر اس کی راکھ اڑائی
یوں ہی جلتے بجھتے شاہیں ساری عمر گزاری سائیں

ان اشعار میں ''ا?ج کل'' اور'' جلتے بجھتے'' کے الفاظ بطور صنعت تضاد برتے گئے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی فکر وفن کے حوالے سے نظم کے مقابلے میں غزل پر گرفت زیادہ مضبوط اور پختہ دکھائی دیتی ہے۔ مغربی ادب سے متاثر ہوکر اردو ادب کی جو جدید تحریک پروان چڑھی تھی اس نے جہاں دیگر اصناف ادب پر اثر چھوڑا ہے وہاں غزل کو بھی متاثر کیا۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی نظم میں پختگی بہت دیر بعد ا?ئی لیکن چونکہ غزل ان کے مزاج کے عین مطابق وموافق ہے اس لئے غزل میں ان کی پختگی بہت پہلے ا?چکی تھی۔ بحور، وزن ،نئی زمینیں ،مقفع و مسجع سخن اور ترتیب الفاظ کے اعلیٰ نمونیان کی غزلوں میں ملتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں گہرائی کی بات کہہ جانا معاشرے کی کج رویوں پر نظر رکھنا ، نچلے طبقے کا استحصال خاندانی پس منظر ، دیہات کی رنگینی و رعنائی ،فطرت کی سچی اور

حقیقت پسندانہ عکاسی ان کی غزلوں میں بڑے خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔

حوالہ جات

1۔ بشریٰ رحمٰن (رائے)، مشمولہ، اور شام ٹھہر گئی از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013)،ص18۔
2۔ سعد اللہ شاہ (فلیپ)، مشمولہ، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ(لاہور: خزینہ علم وادب، اپریل 2010)۔
3۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو (ڈیرہ غازی خان : فرید ادبی سنگت، 2007)،ص22۔
4۔ ایضاً،ص23۔
5۔ ایضاً،ص24۔
6۔ ایضاً،ص40۔
7۔ ایضاً،ص145۔
8۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، انٹرویو، راجہ فاسد ساحل، مشمولہ، روزنامہ جناح (مورخہ 11فروری، 2012)
9۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 2016)،ص 36۔
10۔ ایضاً،ص28۔
11۔ ایضاً،ص43۔
12۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص145۔

13۔ ایضاً،ص24۔
14۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں،ص26۔
15۔ ایضاً،ص30۔
16۔ ایضاً،ص34۔
17۔ ایضاً،ص52۔
18۔ ایضاً،ص112۔
19۔ ایضاً،ص119۔
20۔ ایضاً،ص270۔
21۔ ایضاً،ص209۔
22۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص57۔
23۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ،ص55۔
24۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، اور شام ٹھہر گئی،ص109۔
25۔ ایضاً،ص117۔
26۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ،ص60۔
27۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں،ص181۔
28۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، پھول خوشبو اور تارہ،ص110۔
29۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، اور شام ٹھہر گئی،ص68۔
30۔ ایضاً،ص50۔
31۔ حسنین کامران (رائے)، مشمولہ، روزنامہ ''کسک''، (ملتان: مورخہ: 12 جولائی 2010)۔
32۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں،ص16۔
33۔ نجمہ شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، اور شام ٹھہر گئی،ص115۔

34۔ ایضاً،ص122۔

35۔ ایضاً،ص141۔

36۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ،ص135۔

37۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو ص38۔

38۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص118۔

39۔ ایضاً،ص92۔

40۔ ایضاً،ص122۔

41۔ ایضاً،ص164۔

42۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ،ص83۔

43۔ ایضاً،ص116

44۔ بشریٰ رحمٰن (رائے)،مشمولہ،اور شام ٹھہر گئی،از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ،ص115۔

45۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں،ص113۔

46۔ ایضاً،ص115۔

47۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص118۔

48۔ ایضاً،ص122۔

49۔ ستیہ پال ا؟ نند (رائے)،مشمولہ، پھول خوشبو اور تارہ از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ،ص 139,140۔

50۔ ایضاً،ص12,13۔

51۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص38۔

52۔ ایضاً،ص93۔

53۔ نجمہ شاہین کھوسہ، پھول خوشبو اور تارہ،ص122۔

54۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو۔ص98۔

55۔ ایضاً،ص146۔

56۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں،ص197۔

57۔ ایضاً،ص196۔

58۔ ایضاً،ص198۔

59۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص81۔

60۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں،ص216۔

61۔ ایضاً،ص228۔

62۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ،ص73۔

63۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں آنکھیں بند رکھتی ہوں،ص219

64۔ ایضاً،ص85۔

65۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص97۔

66۔ شبیر ناقد، شاعرات ارض پاک (کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز، 2013)،ص 188

67۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص40۔

68۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا؟ نکھیں بند رکھتی ہوں،ص35۔

69۔ ایضاً،ص37۔

70۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص97۔

71۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ،ص110۔

72۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص45۔

73۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ،ص109۔

74۔ ایضاً،ص121۔

75۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص72۔

76۔ ایضاً،ص26

77۔ ایضاً،ص91

78۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبواور تارہ،ص62۔

79۔ ایضاً،ص71۔

80۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا? نکھیں بند رکھتی ہوں،ص195۔

81۔ ایضاً،ص202۔

82۔ سعد اللہ شاہ (فلیپ) مشمولہ، میں ا? نکھیں بند رکھتی ہوں از ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

83۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبواور تارہ،ص99۔

84۔ ایضاً،ص112۔

85۔ شاکر حسین شاکر،''نجمہ شاہین کی شاعری''، مشمولہ،روزنامہ،ا? ج صبح (مورخہ 22دسمبر2013)،ادبی صفحہ۔

86۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبواور تارہ،ص65,66۔

87۔ ایضاً،ص67۔

88۔ ایضاً،ص82۔

89۔ ایضاً،ص85۔

90۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص87۔

91۔ ایضاً،ص89۔

92۔ ایضاً،ص140۔

93۔ ایضاً،ص146۔

94۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول سے بچھڑی خوشبو،ص59۔

95۔ ایضاً،ص146۔

96۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، میں ا? نکھیں بند رکھتی ہوں،ص37۔

97۔ ایضاً،ص42۔

98۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص64,65۔

99۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبواور تارہ،ص,65۔

100۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعرو شاعری (لاہور: خزینہ علم و ادب، 2010)،ص 144۔

101۔ ایضاً،ص82,83۔

102۔ شبلی نعمانی، مولانا،علم الکلام (لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، 1992)،ص 233۔

103۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر،اور شام ٹھہر گئی،ص114۔

104۔ ایضاً،ص129۔

105۔ نجمہ شاہین کھوسہ،ڈاکٹر، پھول خوشبواور تارہ،ص,41۔

باب پنجم

محاکمہ

علوم وآ گاہی اور زبانوں کے ارتقاء ▯ اور پھیلاؤ سے قبل جب انسان تمدنی نہیں تھا۔تب وہ اپنی بات کودوسروں تک پہنچانے کے لئے مختلف اعضاء ▯ اور حرکات وسکنات مخصوص آوازوں اور اشاروں سے کام لیتا تھا۔اس طرح نہ صرف وہ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچا تا بلکہ اپنی ذہنی تسکین بھی حاصل کر لیتا تھا۔اس سے نہ صرف اسے دقت ہوتی تھی بلکہ وقت بھی صرف ہوتا تھا۔

جُوں جُوں انسان شعور وآ گاہی اور ترقی کے منازل طے کرتا گیا اسی طرح اس پر کائنات کے کئی اسرار ورموز بھی کھلتے گئے اور انسان اپنی زندگی کو اور بھی بہتر بنانے لگا۔وہ زندگی میں کھانے پینے، پہننے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی پروان چڑھانے لگا۔

اس طرح وقت کے ساتھ ساتھ اس نے مزید ترقی کی تو سائنس کی آ گاہی کے ساتھ ساتھ زندگی بھی سہل ہوتی گئی۔اس سے نہ صرف انسان کے فکری پہلو روشن ہوئے بلکہ اجتماعی سوچ بھی پروان چڑھی۔اجتماعی سوچ کی وجہ سے نہ صرف معاشرے کی اچھی تشکیل ہوئی۔غرض زندگی میں وقت کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی تبدیلیوں کے اثرات رونما ہوئے۔جو ایک معاشرتی زندگی اور اجتماعی زندگی کا حصہ ہے۔

آج کے دور میں اتنی جدت، آزادی اور انسان کے شعوری ارتقاء ▯ کے باوجود کچھ حقائق ایسے بھی ہیں جو انتہائی تلخ ہیں۔اور کچھ مسائل ایسے بھی ہیں۔جو انسانی ارتقاء ▯ پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔اس آزاد اور مہذب معاشرے نے سچائی اور راست بازی کا گلا

گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔جس سے وہ تمام انسانی جذبات دب کر رہ گئے۔جن کا انسان اظہار کیا کرتا تھا۔

پیار محبت کے جذبات کا اظہار معیوب اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔زمانے کی تنگ نظری،فرسودہ روایات اور خودساختہ حدود وقیود کی وجہ سے ہم آج اپنی خواہشات کی تکمیل کا پیرہن بھی نہیں پہن سکتے۔یہی وجہ ہے کہ وہ خواہشات بھی ہمارے اندر دب کر رہ گئی ہیں۔ہم اپنے محسوسات و جذبات کے اظہار میں ایک کرب، ایک تڑپ اور ایک گھٹن محسوس کرتے ہیں۔اسی گھٹن اسی کرب کا اظہار ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے شاعری کے ذریعے کیا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاھین کھوسہ جنوبی پنجاب کی ادبی شعری روایت میں کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

جنوبی پنجاب کی اردو شاعری کی ادبی شعری روایت میں ان کا اہم مقام ہے انہوں نے بہت کم وقت میں اردو شاعری میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔وہ مستقل مزاج، باوقار سنجیدہ شخصیت اور ایک عمدہ شاعرہ ہیں جن کا شمار پاکستان کی نمایاں شاعرات میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نہ صرف ڈیرہ غازی خان کی شان ہیں بلکہ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو عالمی سطح پر بھی منوایا ہے جس سے نہ صرف انہوں نے ڈیرہ غازی خان کا نام روشن کیا بلکہ پاکستان کی شعری روایت میں بھی اپنا نام روشن کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ایک اوسط عرصے پر محیط ان کا کامیاب شعری سفران کے بھرپور فنی وفکری صلاحیتوں کے حامل ہونے کا ثبوت ہے اپنی مستقل مزاجی، محنت، لگن اور جستجو کے دم پر انہوں نے خوبصورت شعری مجموعے تخلیق کئے جو آج بھی لوگوں میں یکساں مقبول ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی آزاد اور نثری نظمیں اور جدید شگفتہ غزلیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ بھرپور تخلیقی توانائی اور خوبصورت مقصد کے ساتھ نئے شعری امکانات کی کہکشاں سجانے اور باطنی کیفیات کا کتھارسس کرنے میں مصروف ہیں۔اس عمل میں ان کی ذات کا پھیر اور تشنہ لب روح کی آواز بھی شامل ہے۔اک چھوٹی سے بستی کی پگڈنڈیوں پر

ننھی، چہکتی اور کھلکھلاتی گڑیا نے پیدائش سے لے کر انجام تک ان تمام مراحل کو اپنی شاعری کی زینت بنا کر پیش کیا ہے جن سے ایک انسان نہ صرف شعور و تجربات حاصل کرتا ہے بلکہ ان تجربات کو اپنی عملی زندگی میں اپنانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے شعری مجموعوں میں عقل و شعور، عشق و آ گا ہی، حقیقی شعور اور زندگی کے تجربات واحساسات کو جس طرح سمویا ہے وہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کامیاب تخلیق اور خوبصورت اشعار کی وجہ سے ان کو ایک کامیاب شاعرہ کہا جاسکتا ہے ان کی شاعری روح کی شاعری ہے۔ ایک جہان نادیدہ کی شاعری ہے ایک دبی دبی فغاں ہے جس کا شاعرہ اپنی شاعری کی صورت میں اظہار کرتی ہے۔

تخلیق اور اظہار کرنے کا سلیقہ انہیں قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ مگر سہنے اور برداشت کرنے کا کمال اس نے ماحول کی گھٹن سے سیکھا ہے۔ ان کے الفاظ اسی شدت ہی کا اثبات ہیں اور انہیں رسم و وفا کا پاس بھی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں جذبات کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ انہوں نے شاعری میں غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر غزل اور نظم کا انداز ایک دوسرے سے منفرد دکھائی دیتا ہے۔ ان کو نظم کی نسبت غزل میں زیادہ کمال اور گرفت حاصل ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل بھی ایک نمایاں خاصیت رکھتی ہے ان کی غزل شاعری کی شاندار روایات میں رچی بسی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کے مطالعہ سے قاری کو ایک خوشگوار اور لطیف احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کے سوز و گداز کی کیفیت کا احساس ملتا ہے۔ جو ان کے کلاسیکی شعری روایات سے وابستہ ہونے کی بین دلیل ہے۔ آج کے اس پرآشوب عہد میں جہاں انسان کی زندگی محدود ہو چکی ہے وہاں پر ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری انسان کی زندگی میں امید کی کرن پیدا کرتی ہے۔ اور اس کا حوصلہ بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ شاعری میں ذات سے لے کر

کائنات تک کا سفر جاری رہتا ہے۔ اس سفر کو انہوں نے اپنی شاعری میں احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔

ان کی شاعری میں ہمیں رومان کے متنوع رنگ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں بالخصوص یہ رومانوی رنگ ان کی غزل میں بھی ہمیں اکثر جگہوں پر ملتا ہے۔ اس رومانوی رنگ میں ہمیں کیفیات دل کا رنگ اور واردات دل کا رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے جب بھی ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو قاری ایک لطیف اور خوشگوار احساس میں ڈوب جاتا ہے اور یہ احساس اس کے اندر بے چینی پیدا کر دیتا ہے وہ ہر اس احساس کو شاعری کا حصہ بناتی ہیں جو ایک انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں محبت کے جذبات واحساسات مکمل اخلاص کے ساتھ پائے جاتے ہیں انہوں نے ان احساسات کو جس کامیابی کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ ان کی شاندار فکری و فنی صلاحیتوں کا واضح ثبوت ہے۔

شاعری میں شعریت اور ترنم کے ساتھ عقیدت و احترام کے جذبات کو بھی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے بڑی کامیابی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری پڑھنے والوں کو اس جہان کی سیر کراتی ہے جس کی سیر انہوں نے تخیلاتی پرواز کے دوران کی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں رفاقتیں، اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید و یاس، دکھ سکھ آرزو اور خلش اہم موضوعات ہیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا انداز شیریں اور لب ولہجہ دھیما ہے جو پڑھنے والوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری زندہ دلوں کی شاعری ہے۔ حساس جذبوں سے لدی صحراؤں کی منہ زور ہواؤں نے ان کی شاعری کو پروان چڑھایا ہے۔ اور ریت کے ذروں نے ان کی شاعری کے اندر چمکنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے محبت کے موضوع کو اپنی شاعری میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس موضوع کے اندر احساس اور جذبہ تو اس قدر شامل کیا ہے کہ اس کی

دھیمی دھیمی آنچ پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ان کا بات کرنے کا انداز بہت سادہ ہے۔ان کی شاعری میں بھی یہی انداز اور لب ولہجہ ہے جو ہمیں ان کی شخصیت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں لفظوں کی نسبت جذبوں کی سچائی نے مل کر ایسا منظر پیش کیا ہے جو قاری اور سامع کی ذہنی ساخت پر نقش ہو کر رہ جاتا ہے۔

زندگی کے جھمیلوں سے تھک ہار کر شام کو اپنے اپنے گھروں میں لوٹنے والوں کو کوئی پل ایسا ضرور ملتا ہے جب وہ اپنی ذات کا سفر کرتے ہیں۔اپنی سوچ کا سفر اور سفر تو سارا سوچ کا ہی ہوتا ہے۔یہی سوچ تو ہے جو پیٹ کے بل لڑکھڑاتی، اور عشق کا روپ دھار کر زمانے کی تلخیاں سمیٹے تمام کٹھن اور اذیت سے بھرپور راہوں کے سفر کرتے اپنے قبلہ و کعبہ تک پہنچتی ہے۔عشق کی راہوں میں آنے والی مشکلات اور آنسو صرف پانی کے چند قطروں میں ڈھل کر اس پاک مٹی میں مل جاتے ہیں تو وقت کے ساتھ ساتھ ان آنسوؤں کی قدر و قیمت بھی سامنے آجاتی ہے۔

محبت سے عشق کا سفر بھی سوچ ہے ایسی سوچ جو فنکار کی تخلیقی صلاحیت کو عروج پر پہنچا دیتی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں عشق و محبت کے جذبات کے علاوہ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ان کی شاعری میں قیاس آرائی کی بجائے حقائق کے قریب ترین حالات واقعات کی عکاسی ملتی ہے۔استعارہ، کنایہ، اور تشبیہات ان کی شاعری کا خاص زینہ ہیں۔اس لئے انہیں استعاراتی شاعرہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔
ان کی شاعری میں استعارہ اور کنایہ کو جس خوبصورت انداز میں استعمال کیا گیا ہے وہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ان کی شاعری سچے اور کھرے جذبے کی مکمل عکاس ہے کیونکہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں زندگی اور معاشرتی اقدار کی سچی اور منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی آواز ایسی ہے کہ یہ پڑھنے والے کو اپنے دل کی آواز

معلوم ہوتی ہے۔اور یہی حقیقت بھی ہیکہ ان کی شاعری ایک سبک روی کی مانند زندگی کے راہگزاروں میں قدم قدم پر لالہ وگل کھلاتی ہوئی رواں دواں نظر آتی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی غزل اور نظم میں منفرد انداز میں یکساں اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ان کی غزل اور نظم کا الگ رنگ ہے مگر ہر رنگ نئے موضوع کو لے کر سامنے آتا ہے۔اس لئے ان کی غزل اور نظم نئے موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اسی لئے ان کی شاعری دوسرے شعراء سے منفرد نظر آتی ہے۔انکی شاعری کا رنگ ان کے اپنے اطراف میں بکھرا ہوا ہے۔زندگی اور خلق خدا دونوں کے دکھوں، امیدوں، آرزوؤں کا بیان ان کی شاعری میں اخلاص اور دردمندی کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں اشعار کا تاثر اس بات کی نمائندگی کرتا ہے کہ ان کی شاعری شاعرہ کے تخلیقی سفر اور تخلیقی سوچ کی مکمل عکاس ہے۔جس نے زندگی اور اس کے متعلقات کو باریک بینی سے دیکھا ہے۔اور پھر اپنے تاثرات کو شاعری کے ذریعے دوسروں کے سامنے آئینے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نسائی جذبات کے علاوہ معاشرتی نا آسودگیوں کا تذکرہ بھی اپنی شاعری میں بخوبی کیا ہے۔ان کی شاعری میں نسائی تمناؤں کے مدفن بھی ہیں اور مرتب فکر کے پہلو بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے پورے کلام میں پوری سچائی کے ساتھ نسائی جذبات کو بیان کیا ہے۔وہ عورت کی باطنی کیفیات کے زیر و بم کو شعروں کے قالب میں ڈھالنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نیا پنی شاعری میں ایسی عورت کی جھلک پیش کی جو عشق میں پاک بازی کی ردا سر پر رکھے اپنا سماجی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے زندہ شعروں تک رسائی کے لئے برسوں کی مسافت طے کی ہے تب جا کر انہیں یہ دولت نصیب ہوئی ہے۔زندگی کے تلخ و شیریں تجربات نے ان کی شاعری میں فطری رنگینی کا جواز موجود ہے۔اس لیے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے اشعار میں لفظی اور صوتی تکرار

جن نغموں کو چھیڑتی ہے وہ گنگناتے ہیں۔ وہ لفظوں کے استعمال پر مکمل دسترس رکھتی ہے بے ترتیب لفظوں کو یوں سانچوں میں ڈھال لیتی ہیں کہ ان کے درمیان ربط و تسلسل دکھائی دینے لگتا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری ایک نئی روشنی اور معنویت فراہم کرتی ہے انہوں نے نظم اور غزل کے ذریعے سے معاشرتی و سیاسی صورتحال کو بھی بخوبی بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری ایک الگ شناخت کی حامل ہے۔ اپنی شاعری کی وجہ سے وہ اپنا الگ مقام رکھتی ہیں ان کا کلام فکری و فنی محاسن کے اعتبار سے لائق تحسین ہے۔ اسلوبیاتی جاذبیت ان کے کلام کو اور بھی دلکش بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بہت سے روشن امکانات موجود ہیں جو ان کے بہتر ادبی مستقبل کی شہادت دے سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں زندگی کے تمام اہم موضوعات سمٹ کر سامنے آتے ہیں۔ سادہ اور شاندار شیریں الفاظ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ شاعری کے ذریعے سے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ایسا منظر کھینچا ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے تصویر کی صورت گھومنے لگتا ہے۔ تخلیق کی یہ صلاحیت آج بھی ان کی ذہنی ساختوں کی نشوونما کر رہی ہے۔

شاعری کی وجہ سے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ دبے ہوئے اور گھٹے ہوئے انسانی جذبات کی ترجمان بن چکی ہے اس جذبے کے تحت انہوں نے دوسری عورتوں کے اندر امید کی کرن پیدا کی ہے۔ انہی کاوشوں کی وجہ سے انہیں متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ اور اندرون و بیرون ملک کانفرنسوں، مشاعروں اور سیمناروں میں اس ملک اور خواتین کی نمائندگی کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ایک انفرادیت ان کی شاعری میں عورت اور رومانویت پسندی کا عنصر ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے عورت ہونے کے خوبصورت جواز کو خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ ان کی شاعری میں عورت کے جذبات و کیفیات حسیات اور

اظہاریات کا ایک ایسا جہان دکھائی دیتا ہے جہاں روحانیت دھیرے دھیرے رقصاں نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں عورت کے جذبات کی عکاسی نظر آتی ہے وہاں پر محبت کا عکس نمایاں ہے۔ اس لیے وہ ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جس میں خوبصورتی، علمیت، مہارت و قسمت اور اخلاقی مضبوطی یکجا نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری کا موضوع خود نجمہ ہی ہے۔ یعنی ایک عورت اور عورت کی نفسیات ہی ہے۔ وہ مردوں کے اس معاشرے میں نسوانیت کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے اور کردار بھی وہ جو احساس کی دولت اور اظہار کی قوت سے مالا مال ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں عورت اس کے گرد بھنگڑا ڈالتی، محرومیوں اور ناکامیوں کے پیچ چکر کاٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے اشعار جگہ پانے والا خارجیت کا عنصر در اصل خود یعنی عورت کا سماج، معاشرے اور معاشرتی رویے، تہذیب و ثقافت اور روایات کے خلاف فطری بغاوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ان کی شاعری میں جزوی طور پر غم دوراں کا تذکرہ موجود ہے۔ مسائل اور مصائب کے خاتمے کے لئے غور و فکر بھی موجود ہے جو ان کی رجائیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی غزلوں میں داخلی کیفیات کا اظہار بھی ملتا ہے اور خارجیت کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے اور غم دوراں کا ذکر خارجیت کے اظہار کی ہی ایک جھلک ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری پر علامتیت کا رنگ بھی غالب نظر آتا ہے۔ غزل میں علامت کی جھلک گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے شاعری میں جدید دور کے رنگ کو اپنایا ہے۔ علامتی الفاظ شعری استعارہ ہوتے ہیں ان کو بیان کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہجر، اشک، شاہین جیسے الفاظ ان کی شاعری میں علامت کیطور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ علامتی الفاظ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی ذہنی پختگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ پت جھڑ، خزاں دعاؤں، جیسے الفاظ علامتی طور پر استعمال کئے گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ زندگی کے ہر موسم سے بخوبی شناسائی رکھتی ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں اگرچہ لفظی و معنوی صنعت گری کی تمام خوبیاں تو نہیں پائی جاتی لیکن پھر بھی ان کی شاعری میں صنعت تلمیح اور صنعت تضاد جیسی مثالیں کہیں کہیں ان کی شاعری میں دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے یہ حتمی رائے ہے کہ موصوفہ غزل کے میدان میں نظم سے زیادہ کمال اور گرفت رکھتی ہیں۔ قارئین کو ان کا مطالعہ کرتے وقت کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا قدیم اور جدید حسین امتزاج ان کی غزلوں میں واضح نظر آتا ہے۔ ان کی غزل جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ انہوں نے پرانے موضوعات کو جدیدیت کے رنگ میں بھی خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا استعمال کر کے غزل کے شعری حسن میں اضافہ کیا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

1۔ شاہین، نجمہ، ڈاکٹر۔ پھول سےبچھڑی خوشبو (شعری مجموعہ)۔ ڈیرہ غازی خان: فرید ادبی سنگت، 2007

2۔ شاہین، نجمہ، ڈاکٹر۔ میں ا? نکھیں بند رکھتی ہوں (شعری مجموعہ)۔ لاہور: خزینہ علم و ادب، 2010

3۔ شاہین، نجمہ، ڈاکٹر۔ اور شام ٹھہر گئی (شعری مجموعہ)۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013

4۔ نجمہ، شاہین، نجمہ، ڈاکٹر، پھول خوشبو اور تارہ (شعری مجموعہ)۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 2016

ثانوی ماخذات:

1۔ احمد، اشتیاق، جدیدیت کا تنقیدی تناظر۔ لاہور: بیت الحکمت، 2006

2۔ اختر، روشن، ڈاکٹر۔ طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء ۔ دہلی: نعمانی پریس 1984،

3۔ اعظمی، خلیل الرحمٰن۔ نئی نظم کا سفر۔ دہلی مکتبہ جامعہ، 1972

4۔ امجد، رشید، ڈاکٹر۔ شاعری کی سیاسی و فکری روایت۔ لاہور: دستاویز مطبوعات 1993،

5۔ امجد، ساجد، ڈاکٹر۔ اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات۔ لاہور: الوقار پبلی

کیشنز،2003

6۔ آغا،وزیر،ڈاکٹر۔اردو شاعری کا مزاج۔دہلی: سیمانت پرکاش،1961
7۔ بریلوی،عبادت،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری۔کراچی،اردو نیا،1961
8۔ تونسوی، طاہر۔ڈاکٹر (مرتب) صنف نازک کی شاعری۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 1995
9۔ ثاقب، عارف، ڈاکٹر۔ بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس، لاہور غالب نما، 1999
10۔ جالب،افتخار۔نئی شاعری۔لاہور: آصف جمال، جمالیات،1988
11۔ جالبی،جمیل،ڈاکٹر۔میرا جی ایک مطالعہ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،1990
12۔ حامد،عزیز،مدنی۔جدید اردو شاعری۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،1994
13۔ حسین،منیر، بدر۔بیسویں صدی کا شعری ادب۔لاہور: ضیاالحق قریشی، ہجویری پارک،1978
14۔ حنفی شمیم،نئی شعری روایت۔نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،1978
15۔ ذوالفقار حسین،غلام،ڈاکٹر۔اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر۔لاہور: جامعہ پنجاب،1966
16۔ رضا،تعبیر،اکیسویں صدی کا شعری رجحان،لاہور:علم وعرفان پبلشرز،2002
17۔ رضوی،زبیر۔(مرتب) اردو نظم 1960 کے بعد۔دہلی: اردو اکادمی،1995
18۔ سدید،انور،ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔پاکستان: انجمن ترقی اردو،2007
19۔ سندیلوی،سلام۔اردو شاعری میں خودداری۔دہلی: انجمن ترقی اردو،1979
20۔ فتح پوری،،فرمان،ڈاکٹر (مرتب) اردو شاعری کا فنی ارتقا۔کراچی: اردو اکیڈمی سندھ،1990
21۔ قاسمی،ناہید۔جدید شاعری میں فطرت نگاری۔کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان،

2002

22۔ کاشمیری،تبسم،ڈاکٹر۔جدید اردو شاعری میں علامت نگاری۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،1978
23۔ کاشمیری،تبسم،ڈاکٹر۔نئے شعری تجزیے۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،1978
24۔ کاشمیری ، حامد، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات۔ دہلی: مجلس اشاعت ادب ، 1988
25۔ کامران،جیلانی۔نئی نظم کے تقاضے۔لاہور: مکتبہ عالمیہ،1985
26۔ کامران،جیلانی۔ہمارا ادبی وفکری سفر۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ،1987
27۔ کامران،یوسف،ڈاکٹر۔سفر تمام ہوا۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،1984
28۔ کبیر، الیاس۔(ترتیب) جدید اردو شاعری (روایت سے تعارف تک) ملتان بیکن بکس،2016
29۔ کیفی ،حنیف ، ڈاکٹر۔اردو میں نظم مصری اور ا؟ زاد نظم، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 1995
30۔ محمد،علی،ڈاکٹر،لاہور کا دبستان شاعری۔لاہور: مقبول اکیڈمی،1992
31۔ منہاس،ظہیر،علی،اردو ا؟ زاد نظم۔تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔لاہور: جامعہ پنجاب غیر مطبوعہ
32۔ میرا جی۔اس نظم میں۔دہلی: علمی پریس دلدن،1997
33۔ نسیم،حمید، کچھ اہم شاعر،کراچی: فضلی سنز لمیٹیڈ، 1994
34۔ نیر طاہرہ، ڈاکٹر، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار۔ پاکستان: انجمن ترقی اردو،1997
35۔ ہاشمی،طارق،جدید نظم کی شعری جہت۔لاہور: لاہور: دستاویز مطبوعات،2003

تحقیقی مقالہ

مقالہ نگار

ماریہ امبر

(غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان)

باب اول

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ضلع ڈیرہ غازی خان کے پسماندہ علاقہ ''جندانی والا'' میں پیدا ہوئیں۔ وہ ایک سنجیدہ خاتون ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک معروف گائنا کالوجسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعرہ بھی ہیں۔ وہ ایک کامیاب شاعرہ ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور پُر تاثیر ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دادا کا نام ''پیر بخش'' تھا۔ ان کے دادا جدی پشتی زمیندار انسان تھے۔ ان کا تعلق کھوسہ بلوچ خاندان سے ہے۔ ان کے دادا اپنے علاقے میں ایک اہم شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے خاندان کے افراد مختلف سرکاری عہدوں پر فائز ہیں اور اپنے اپنے کام سرانجام دے رہے ہیں۔

ان کے دادا ''پیر بخش'' کے سات بچے تھے۔ جن میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے بڑے چچا تعلیم یافتہ نہیں تھے وہ اپنے والد کے ساتھ کاشت کاری کرتے تھے۔ ان کے دوسرے چچا سکول ماسٹر تھے۔ باقی بیٹوں نے بھی تعلیم حاصل کی اور بیٹیوں کو تعلیم سے دور رکھا۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے والد کا نام ''جان محمد کھوسہ'' ہے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سے آخری نہیں پر ہیں۔ اپنے گاؤں میں سکول نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے دوسرے گاؤں جانا پڑتا تھا وہ ایک تعلیم یافتہ باشعور اور انسان دوست شخصیت ہیں۔ انہیں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہیں اپنے گاؤں میں سکول کی کمی محسوس ہوئی۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے گاؤں میں سکول قائم کرنے کے لئے اپنی ذاتی زمین وقف کر دی۔ یہ سکول آج بھی گورنمنٹ پرائمری سکول سے آج بھی ہزاروں طالب علم تعلیم کے ہنر سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

آپ کے والد جان محمد کے چار بچے ہیں جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں جن کے نام بالترتیب ڈاکٹر نجمہ شاہین، سلمیٰ شاہین کھوسہ، محمد سلیم کھوسہ اور محمد خلیل کھوسہ

ہیں۔ان کی والدہ کا نام ''امیر بیگم'' ہے۔ان کی والدہ پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہیں وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔آپ کے بڑے بھائی محمد سلیم کھوسہ وکالت کرتے ہیں۔ڈیرہ غازی خان میں ان کی وکالت خوب چلتی ہے۔اور آپ کے چھوٹے بھائی محمد خلیل کھوسہ سول انجینئر ہیں۔اور آپ کی بہن سلمیٰ شاہین کھوسہ نے ایم اے اسلامیات کیا ہوا ہے وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔

ان کے والد جان محمد کھوسہ کا شوق تھا کہ ان کی اولاد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہوں۔ان کا یہ خواب پورا ہوا۔ان کی چاروں اولادیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور سب اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں اور اپنی زندگی کی مشکلات کو آسان کر رہے ہیں۔پہلے ان کے والد کاشت کاری کرتے تھے۔اس کے بعد ان کے والد کراچی چلے گئے۔وہاں ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرنا شروع کیا۔کچھ عرصے کے بعد آپ کے والد اپنے شہر ڈیرہ غازی خان میں واپس آ گئے اور اپنے ہی شہر میں ٹریول ایجنسی کھول لی اور یہ ایجنسی عرب ٹریول ایجنسی کے نام سے مشہور ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ 5 دسمبر 1973ء کو ضلع ڈیرہ غازی خان کے نواحی ''جندانی والا'' میں پیدا ہوئیں۔وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہیں مگر وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ان سے پہلے ان کے بھائی جڑواں پیدا ہوئے۔مگر ان کی وفات ہو گئی۔ان کی آنکھ ایک ایسے پسماندہ گاؤں میں کھلی جہاں لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے دور رکھا جاتا تھا۔ان کے والد ایک تعلیم یافتہ، سمجھدار اور باشعور انسان ہیں۔انہوں نے اپنی بیٹیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔انہیں محسوس ہوا کہ بیٹوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ان کے والد نے آبائی گاؤں میں جو سکول قائم کرایا تھا اس سکول میں ان کا داخلہ کر دیا۔وہ کلاس سوم میں تھیں۔تو ان کے والدین نے انہیں اور ان کی بہن (سلمیٰ شاہین کھوسہ) کو ننھیال میں بھیج دیا۔تعلیم حاصل کرنے کے لئے انہوں نے چھوٹی سی عمر میں ہجرت کی۔ان کا بچپن بہت سنجیدہ گزرا ہے وہ زیادہ تر کھیل

لڑکیوں والے جیسے کہ کرکٹ، گلی ڈنڈا کھیلا کرتی تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ آپ ایک ہونہار طالبہ تھیں۔

> سکول میں نصابی سرگرمیوں میں اچھی کارکردگی کی بدولت ان کا نام پرنسپل بورڈ پر آویزاں ہے۔(۱)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ''جندانی والا'' گورنمنٹ پرائمری سکول تکیانی سے حاصل کی۔وہ ابھی تیسری جماعت میں تھیں ڈاکٹر صاحبہ کے والدین نے انہیں اور ان کی بہن (سلمیٰ شاہین کھوسہ) کو ننھیال بھیج دیا۔تعلیم کے سلسلہ میں ان دونوں بہنوں نے چھوٹی سی عمر میں ہجرت کی۔دو سال تک انہوں نے اپنی نانی کے گھر (ڈیرہ غازی خان) میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔جب انہوں نے پرائمری پاس کیا تو ان کے والدین بھی ڈیرہ غازی خان میں منتقل ہو گئے۔انہوں نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 2 سے 1988ء میں پاس کیا۔انہوں نے ایف ایس سی کا امتحان گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین ڈیرہ غازی خان سے پاس کیا۔وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتی تھیں۔انہیں مصوری کا بہت شوق تھا مگر اپنی تعلیم کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے سکیں۔ایف ایس سی کرنے کے بعد انہوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں M.B.B.S میں داخلہ لیا اور 1994ء میں M.B.B.S کا امتحان پاس کیا۔

> ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد جنوری 1997ء میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال ڈیرہ غازی خان میں بطور میڈیکل آفیسر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔(۲)

ان سے پہلے ان کے گاؤں کی کسی لڑکی نے تعلیم حاصل نہیں کی۔وہ اپنے گاؤں کی واحد لڑکی ہیں جو اس مقام پر پہنچی ہیں۔انہوں نے گورنمنٹ جاب آٹھ سال تک کی۔ملازمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے پرائیویٹ ہسپتال بھی بنایا۔جب ان کا پرائیویٹ ہسپتال (جان سرجیکل ہسپتال) معروف ہوا تو انہوں نے سرکاری ملازمت کرنا چھوڑ دی۔

ان کا پرائیویٹ ہسپتال (جان سرجیکل ہسپتال) کا نام ڈیرہ غازی خان کے نمایاں ہسپتالوں میں شمار ہوتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے وہ ایک خوش مزاج اور بااخلاق خاتون ہیں۔ وہ اپنی کامیاب زندگی کے بارے میں لکھتی ہیں:

"میں اپنی کامیاب زندگی اور شاعری کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد اپنے والد کی دل و جان سے مشہور ہوں کہ جنھوں نے خاندان کے ہزار رکاوٹیں ڈالنے کے باوجود مجھے بیٹوں کی طرح پالا اور میری تعلیم میں ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اللہ تعالیٰ اور اپنی ماں کی قربانیوں اور باپ کی محبتوں کی بدولت ہوں۔" (۳)

نجمہ شاہین کھوسہ کی 11 اپریل 1997ء کو اپنی برادری میں شادی ہوئی ان کا رشتہ اس وقت طے ہوا جب وہ اپنی ماں کے پیٹ میں تھیں۔ ان کا رشتہ ان کی پھوپھی کے بیٹے سے طے ہوا۔ ان کے خاندان میں یہ رواج تھا کہ بیٹیوں کا رشتہ دوسرے خاندان والوں سے نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے شوہر سے دس سال چھوٹی ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے شوہر کا نام غلام فرید کھوسہ ہے۔ انہوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی ایس کیا ہوا ہے۔ اور وہ سیمنٹ فیکٹری میں بطور انجینئر ملازمت کرتے ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ جب آپ ہاؤس جاب مکمل کر کے واپس آئیں تو ان کے گھر میں رسوم و رواج کو خصوصی اہمیت حاصل تھی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے دو بیٹے ہیں۔ انہیں کبھی بیٹی کی خواہش نہیں ہوئی۔ وہ کہتی ہیں کہ:

"کیا میں نے ایک بیٹی ہوتے ہوئے کم مشکلات کا سامنا کیا ہے؟ جتنی مشکلات کا سامنا میں نے کیا ہے، کیا اتنا ایک بیٹا مشکلات کا سامنا کرتا؟ بے شک کرتا لیکن اسے اتنی رکاوٹیں تو نہ آتیں۔ لیکن مجھے ہر موڑ پر رکاوٹ ملی۔" (۴)

میرا جس فیڈل سے تعلق ہے ہر دوسری عورت آتی ہے۔ ان کا الٹراساؤنڈ کرتی

ہوں۔ اگر اس کے سات بیٹے بھی ہوئے ہیں تو وہ بیٹی کی خواہش نہیں کرتی بلکہ وہ کہتی ہے ہے کہ میرا بیٹا ہو۔ وہ اپنے ماحول سے اتنی پسی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ بیٹی کی خواہش نہیں کرتی۔ وہ اپنی زندگی ایسی گزار رہی ہوتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اُس جیسی زندگی اُس کی بیٹی گزارے۔ وہ کہتی ہیں:

"بیٹیوں سے کبھی ڈر نہیں لگتا۔ ان کی چوڑیاں ان کی مہندی سے ڈر نہیں لگتا۔ ان چیزوں سے خوشی ہوتی ہے ڈر لگتا ہے تو بیٹیوں کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔" (۵)

مگر انہوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت بڑے احسن طریقے سے کی۔ والدین کے پڑھے لکھے ہونے کے سبب اپنی اولاد کو بھی اچھی تعلیم دے رہے ہیں ان کے بڑے بیٹے کا نام حمزہ فرید کھوسہ ہے جو آج کل سول انجینئرنگ کے سلسلہ میں امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان ک چھوٹے بیٹے کا نام عمر فرید کھوسہ ہے۔ وہ آج کل یونیورسٹی آف انٹرنیشنل سکول آف میڈیسن(I.U.K) کرغستان سے M.B.B.S کر رہے ہیں۔

بی اے خرم کے مطابق:

"نجمہ نے شاعری کا آغاز تو باقاعدہ طور پر اپنی پہلی نظم "ملاقات آخری" میں جو کہ انہوں نے اپنی ہاؤس جاب کے دوران 12 دسمبر 1996ء میں لکھی سے کیا۔" (۶)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ایک کامیاب شاعرہ ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز 1996ء سے کیا۔ ان کو شاعری کا بہت شوق تھا۔ وہ ساتویں جماعت میں تھیں اس وقت وہ ایک شعر سے بہت متاثر ہوئیں کہ کوئی ایسا بھی لکھ سکتا ہے۔ وہ شعر کچھ یوں ہے:

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد نے ہم بچتے دیکھا کم

یہ شعر امجد صاحب کا ہے وہ اس شعر سے بہت متاثر ہوئیں۔ اس عمر میں انہوں

نے اپنی پہلی نظم شائع کرائی۔ جس کا نام ''ہم پاگل لڑکیاں'' تھا۔ اوران کی دوستوں نے اُن آنکھوں پر ایک نظم لکھی جس کا نام ''یہ سمندر آنکھیں'' تھا۔ وہ ترکی کی استنبول یونیورسٹی میں ایک کانفرنس میں گئیں اور وہاں کا ایک انٹرویو لیا گیا اور وہاں ایک نیوز اینکر نے آپ سے کہا کہ:

''آپ کی یہ نظم تو میری سمجھ میں نہیں آرہی مگر آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ میں آپ کے ساتھ تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔'' (۸)

یہ تصویر آج بھی فیس بک پر لگی ہوئی ہے۔ وہ اپنی پہلی نظم کا شمار 1996ء سے کرتی ہے۔ جس کا نام ''ملاقات آخری'' ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ شاعری کیا کرتی تھیں۔ جب بھی انہیں وقت ملتا تو وہ ڈائری لکھا کرتی تھیں۔ ڈائری آپ کی سہیلی تھی۔ مگر ان کا یہ شعری مجموعہ دس سال تک کی کتاب کی شکل میں نہ آیا۔ وہ اپنی شاعری منظر عام پر نہیں لانا چاہتی تھیں۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

''2007ء میں کسی کانفرنس میں شرکت کیلئے جارہی تھیں تو سفر کے دوران حادثے کا شکار ہوگئیں۔ یہ دن ان کی زندگی کے بہت مشکل دن تھے۔ ایک ملازمت پیشہ شخصیت اچانک سے بستر تک محدود ہو جائے۔ تو یہ دن ان کے لئے بہت کٹھن ہے''۔ (۹)

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' تعاون فرید ادبی سنگت (رجسٹرڈ) حمید صدیقی پرنٹر ڈیرہ تاریخ اشاعت جولائی 2007ء میں رمضان طالب صاحب کی خصوصی شفقت اور محبت کے باعث شعری وادبی منظر نامے پر طلوع ہوا۔

آپ کے چار شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام بالترتیب ''پھول سے بچھڑی خوشبو''، ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، ''اور شام ٹھہر گئی'' اور ''پھول خوشبو اور تارہ'' ہیں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ خود کہتی ہیں:

''اگر میں طب کے شعبے میں نہ آتی تو مصورہ ہوتی۔''

ان کا ہاتھ بہت آرٹسٹک ہے۔ وہ سلائی کڑھائی میں بھی بہت اچھی کر لیتی تھیں اور سات سال کی عمر میں روٹی بنانا سیکھ لی تھی۔

نجمہ شاہین کھوسہ نے اپنے علاقے کی خواتین شعراء کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اس حوالے سے شگفتہ بلوچ رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر نجمہ شاہین نے خطے کی خواتین کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے لکھاری خواتین کو یکجا کرنے اور نئی لکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک تنظیم ''آنچل'' کے نام سے بنائی اور اس تنظیم کے تحت متعدد ادبی پروگرام کروا چکی ہیں۔'' (۱۰)

وہ جنوبی پنجاب میں (خواتین ونگ) کی مذہبی وذہنی ہم آہنگی وامن کمیٹی کی چیئر پرسن ہیں۔ (۱۱)

رضی الدین رضی نجمہ شاہین کی جرأت مندی اور شاعری سے لگاؤ کے متعلق رقم طراز ہیں:

''بلا شبہ ہمارے لئے یہ اعزاز کی بات ہے کہ ایک ایسے خطے سے یہ آواز اُبھری جہاں بات کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے جہاں اگر مرد بھی بات کرلے تو اسے بولنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر نجمہ شاہین نے بڑی جرأت مندی سے اپنی بات کہی بھی اور ان کی بات سنی بھی گئی تو یہ ایک اعزاز کی بات ہے۔'' (۱۲)

اس کے علاوہ وہ ''اکادمی ادبیات ملتان'' کی مشاورتی کمیٹی کی رکن بھی ہیں۔ اگرچہ جنوبی پنجاب مرد شعراء کے مقابلے میں خواتین شعراء کی تعداد کم ہے۔ مگر انہوں نے مرکزی سطح پر پذیرائی حاصل کی۔ پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کی شاعری نے مرکزی حلقوں میں توجہ حاصل کی۔

''جنوبی پنجاب کے حوالے سے ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہمارے خطے

سے جنم لینے والی شاعرات اگر چہ تعداد میں کم ہیں مگر وہ مرکزی دھارے
میں شامل ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے اور اپنی شخصیت
کے لحاظ سے اپنا نام پیدا کیا ہے۔'' (۱۴)

محبت جو کہ تمام مضامین میں نجمہ کی ہم رکاب رہتی ہے۔ان کی شاعری میں نا امیدی اور مایوسی بالکل بھی دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ تمام تر شاعری میں امید نظر آتی ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ نے امید کی روشنی میں محبت کی شاعری کی ہے۔اسی لئے وہ کہتی ہیں:

زخموں سے کہاں لفظوں سے ماری گئی ہوں میں
جیون کے چاک سے یوں اُتاری گئی ہوں میں
افسوس مجھ کو اس نے اتارا ہے گور میں
جس کے لئے فلک سے اُتاری گئی ہوں میں

کتابی چہرہ، ستواں ناک، گہری آنکھیں اور دیدہ زیب ریشمی بال اور طرح دار شخصیت کی مالک ہیں کہا جاتا ہے کہ مشاعروں میں لوگ انہیں خصوصی طور پر دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ نجمہ شاہین کھوسہ صورت اور سیرت ہر دو لحاظ سے متاثر کن ہے۔ محمد حسنین کامران ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

'' آپ کا اخلاق اور کردار واقعی قابل تعریف ہے کیونکہ نجمہ شاہین کو دیکھتے
ہی پاکیزہ رشتوں کا خیال آنے لگتا ہے۔جیسے کہ کوئی آپ کو بیٹی مادر یا بہن
جیسا سمجھتا ہے آپ واقعی قابل تعریف ہیں۔'' (۱۵)

محمد حسنین کامران نجمہ شاہین کی شخصیت اور شاعری کا محاکمہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

'' آپ کی شاعری میں سماجی رویوں اور معاشرتی تضادات کا اظہار بھی
ہے دکھی اور غریب عورت کے جذبات کے اظہار کے اس سفر میں آپ
نے بلوچوں کی عزت اور وقار کا بھی خیال رکھا اور بلوچ ثقافت کی سفیر بھی

بنی رہیں آپ نے روایات کا علم بھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اپنی
خوبصورتی اور خوب سیرتی کے باوجود مردوں کے اس معاشرے میں
پاکیزگی اور حیاء کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔آپ نے بطور شاعرہ اور ڈاکٹر
ترقی کی تمام منزلیں بڑی جلدی عبور کر لیں ۔ قدرت نے آپ کو
خوبصورتی کے ساتھ ساتھ خوش قسمتی سے بھی نوازا ہے۔'' (۱۶)

بشریٰ اعجاز، نجمہ شاہین کی سچائی اور صاف گوئی کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اس نے نہایت دھیمے لہجے میں پوری سچائی سے بتایا۔اس کا تعلق جس
قبیلے سے ہے وہاں دور دور تک شاعر تو کیا کوئی ڈاکٹر بھی نہیں''۔(۱۷)

نجمہ شاہین کھوسہ ہمیشہ یتیم بچوں اور بیواؤں کی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ان کی بدولت بہت سے گھر روشن ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آگے بھی جاری رکھنا چاہتی ہیں۔اس کے علاوہ سماجی وادبی تنظیم جو خواتین کی بہبود کے لئے کام کرتی رہتی ہیں۔ نجمہ شاہین کھوسہ اس تنظیم کی صدر ہیں۔ یہ تنظیم آنچل کے نام سے خواتین کی پہلی تنظیم ہے۔ جو ابھی بھی سرگرم عمل ہے۔

نجمہ شاہین کھوسہ اپنی میڈیکل کی زندگی میں بھی ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔شاعری کے علاوہ بھی کسی نہ کسی صورت میں ادب کی خدمت کرتی رہیں ہیں۔ان مختلف اوقات میں ادبی حلقوں اور ادب نواز شخصیات نے اعزازات وانعامات سے نوازا ہے۔

اعزازات وایوارڈ میں اب تک آپ کو روشن میگزین ایوارڈ، خوشبو رائٹرز ایوارڈ، بے نظیر بھٹو ایوارڈ اور حسن کارکردگی ایوارڈ ملے ہیں۔اس کے علاوہ اکادمی ادبیات ملتان میں آپ ایڈوائزری کمیٹی کی ممبر بھی ہیں۔اکادمی ادبیات ملتان کی اہم تقریب میں آپ کی شرکت یقینی ہوتی ہے۔خواتین کے حوالے سے بھی آپ کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔آپ جنوبی پنجاب خواتین ونگ قومی یکجہتی اور بین المذاہب ہم آہنگی کی چیئرپرسن رہی

ہیں اور عرصہ دراز سے خواتین کی خدمت کرتی چلی آ رہی ہیں۔(۱۸)

نجمہ شاہین کھوسہ کی زندگی کے ارتقاء کی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے رضی الدین رضی لکھتے ہیں:

> وہ بچی نجمہ شاہین کھوسہ جب پیدا ہوئی تو اس کے والد نے اس کا نام نجمہ شاہین رکھا تھا۔ یہ نام بلندی کی علامت ہے، ''نجمہ'' ایک چمکتا ستارہ اور ''شاہین'' جو بہت بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ اس کے والد جان محمد کھوسہ نے یہ نام ممکن ہے لاشعوری طور پر ہی رکھا ہو لیکن آج نجمہ شاہین واقعی بلندی پر ہیں اور اس مقام تک پہنچنے میں بنیادی کردار ان کے والد کا ہی ہے کہ اس معاشرے میں کسی بھی عورت کو عملی زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سہارا شادی سے پہلے اس کا باپ اور بھائی، شادی کے بعد اس کا شوہر بنتا ہے۔ جن خواتین کو یہ سہارا میسر نہ ہو ان میں کتنی ہی صلاحیت کیوں نہ ہو وہ پرواز نہیں کر سکتی۔ نجمہ شاہین کو شادی سے پہلے اپنے والد جان محمد کھوسہ اور شادی کے بعد اپنی شوہر غلام فرید کھوسہ کا سہارا میسر آیا تو ان کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں دور ہو گئیں۔''(۱۹)

حوالہ جات وحواشی

1۔ شگفتہ بلوچ، مصاحبہ، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، روزنامہ ''جنگ'' ملتان، 7 دسمبر 2015ء، ص:16
2۔ انٹرویو، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، بمقام رہائش گاہ بلاک 48، رات 8 بجے تا 10 بجے بروز ہفتہ
3۔ رازش لیاقت پوری، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ سے ایک مکالمہ، مشمولہ ''خبریں'' سنڈے میگزین، ملتان 28 اکتوبر 2018ء، ص 17
4۔ ایضاً
5۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بیٹیوں کے نصیب اور میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے مشاہدات و تجربات کے حوالے سے سنجیدگی اختیار کی، ان کی آواز بھیگ گئی۔
6۔ بی اے خرم ڈاکٹر، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر ''اردو نیٹ جاپان'' 26 جون 2016ء
7۔ شاعر امجد اسلام امجد، کتاب ''ذرا پھر سے کہنا'' ناشر خالد شریف، سن اشاعت 22 اگست 1988ء ص:20
8۔ ترکی کانفرنس کے دوران وہاں کے ایک مقامی چینل نے ان کا انٹرویو لیا ان کے جذبات کا اظہار کیا، 14-12 اکتوبر 2015ء
9۔ سفر لاہور، نیشنل ہسپتال لاہور، زیر علاج ڈاکٹر جاوید 2007ء
10۔ شگفتہ بلوچ، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، روزنامہ ''جنگ'' ملتان، 7 دسمبر 2015ء، ص:16
11۔ خاور چوہدری، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، روزنامہ ''کسک'' 13 ستمبر 2011ء
12۔ رضی الدین رضی، تقریب رونمائی، ''پھول خوشبو اور تارہ'' بمقام ٹی ہاؤس ملتان،

24دسمبر 2016ء
13۔ قمر رضا شہزاد، تقریب رونمائی، ''پھول خوشبو اور تارہ'' بمقام ٹی ہاؤس ملتان، 24دسمبر 2016ء
14۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول، خوشبو اور تارہ''، ص:121
15۔ محمد حسنین کامران، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، روزنامہ ''جناح'' 26 جولائی 2016ء
16۔ ایضاً
17۔ بشریٰ اعجاز، مضمون ''عورت اور عورت ہے''، مشمولہ ''پھول خوشبو اور تارہ'' ص:126
18۔ نجمہ شاہین کھوسہ، کوائف نامہ نجمہ شاہین کھوسہ (غیر مطبوعہ)، ص:1
19۔ رضی الدین رضی، شام کیوں ٹھہرتی ہے (دیباچہ)، مشمولہ ''اور شام ٹھہر گئی''، ص:23

باب دوم

(الف)

ڈیرہ غازی خان میں اُردو غزل کی روایت

ڈیرہ غازی خان میں ادبی لحاظ سے بہت سی نام ور شخصیات موجود ہیں۔ اس علاقے کے بہت سے شعراء گوشہ ءگم نامی میں رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ معاشی بحران، پسماندگی، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی سہولت سے محرومی ہے۔ یہ شہر ادبی لحاظ سے ایک دبستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شعر کی اعلیٰ پائے کی ادبی شخصیات نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ اب بھی روایتی اور جدید دونوں انداز سے ادب تخلیق ہو رہا ہے۔

محسن نقوی سے پہلے ''ڈیرہ غازی خان'' میں ادبی لحاظ سے جو نام مشہور تھا وہ شفقت کاظمی ہیں۔ 14 فروری 1914ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1934ء سے کیا۔ ان کی شاعری کے باقاعدہ استاد حسرت موہانی تھے۔ اور مشورہ سخن ندیم جعفری اور صادق ایوبی سے لیتے رہے۔
خود کو شاگرد کی بجائے ''خاکپائے حسرت'' کہلواتے تھے۔ اپنے جملہ شعری مجموعوں میں ''حسرت'' کا نام شامل کر کے اپنی عقیدت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ حسرت کدہ، نغمہ حسرت، داغ حسرت اور زخمِ حسرت ان کے مشہور مجموعے ہیں۔ (۱)

شفقت کاظمی نے اس دور میں آنکھ کھولی جب پورے برصغیر میں اُردو غزل کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس دور کے مشہور شعراء عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی ہیں۔ اس معروف دور میں جنوبی مغرب میں بیٹھ کر اپنی غزل کا لوہا منوایا۔ شفقت نے حسرت کے اسلوب کو اپنی غزل میں اپنایا ہے۔ اور ان کے رنگ کو قائم رکھا ہے۔

مرے ڈھب کی کسی نے نہ کہی
یوں تو کتنے پیام بر آئے

ندیم جعفری 1900ء میں پیدا ہوئے اور 1980ء کو وفات پائی۔ ان کا اصل نام فیض محمد تھا۔ مگر شہرت ندیم جعفری کے نام سے پائی تھی۔ ''خانہ زنجیر'' ان کی ادبی تخلیق ہے۔(۲)

کوئی تو بات ہے بیٹھے ہیں یہیں پر ورنہ
راستے اور بھی ہیں راہ گزر اور بھی ہیں

معاشرے میں موجود رشوت، لوٹ کھسوٹ، ڈکیتی، قتل و غارت، دہشت گردی کے ماحول نے ندیم جعفری کو مایوس کیا۔

مت دیکھو کہ کس سمت بھڑک اٹھتے ہیں شعلے
یہ دیکھ کر ان تا بہ کراں آگ لگی ہے

کسی کی یاد بے چین نے بستر سے علیحدگی کی ایک عادت بنادی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کی یاد میں اتنا جلدی اُٹھتا ہے کہ در و دیوار سے ٹکرا کر رہ جاتا ہے۔

تیری تنہائیاں راتوں کو جو محسوس ہوئیں
کوئی اُٹھ کر درودیوار سے ٹکرایا ہے

فیض تبسم ایک معلم تھے۔ انہوں نے معلم کا پیشہ اختیار کیا۔ ملتان میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے مشہور تھے اور پبلک ہائی سکول لاہور کے پرنسپل کے فرائض انجام دیئے۔ فیض تبسم اختر شیرانی، اختر الایمان اور منشور علیگ سے متاثر تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''لوح ایام'' منظر عام پر آیا، فیض تونسوی کی شاعری سیاسی حالات، معاشرتی حالات رویے عوام روزگار صحت اور تعلیم کی عکاسی کرتی ہے، ان سب حالات کی عکاسی فیض تونسوی کے اس شعر سے ملاحظہ کر سکتے ہیں:

جس نے چھین لیا ہے ہمارا سرورِ قلب
اس عہد بے ثبات کا کچھ تذکرہ کریں

ہدایت اللہ فکر 6 جون 1932ء کو اللہ بخش کھتران کے ہاں لتڑہ شریف میں

پیدا ہوئے۔ ایم اے اردو بی ایڈ تھے۔ 2003ء میں سپرد خاک ہوئے۔ شائقین کسی نظر سے اور کیسے دیکھتے رہے مگر صاحب ان شائقین کی نفسیات پڑھتے اور اپنے وجود کی تبدیلی کو بھی نوٹ کرتے رہے۔(۳)

سعد اللہ کھتران 29 اکتوبر 1933ء کو وہوا تحصیل تونسہ شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد رب نواز کھتران تھا۔ سعد اللہ کھتران نے 1951ء سے شاعری کا آغاز کیا۔

''حلقہ دام خیال'' ان کی شاعرانہ تخلیق ہے۔ ان کی لکھی ہوئی۔ ''سرائیکی لغت'' زکریا یونیورسٹی نے شائع کی ہے اور تاریخ کھتران بھی شائع ہو چکی ہے۔(۴)

سعد اللہ کھتران کہتے ہیں کہ خود کار خدائی تحفہ تو ہمیں بتا دیتا ہے۔ دل کا دھڑکنا ایک قسم کی گھنٹی ہے۔ ضمیر بتا رہا ہوتا ہے کہ منزل سے بھٹکتے جا رہے ہو۔ راہ راست پر آجاؤ۔ اب انسان کی مرضی کہ وہ خطا کار بنے یا توبہ کی طرف توجہ دے۔

کیوں دھڑکتا ہے دل سعد خدا خیر کرے
کوئی راہی کہیں منزل پر بھٹکتا ہوگا

انصاف کرنے والے کو بتایا جاتا ہے کہ مجھ میں انبیاء کرام والی صفات نہیں ہیں میں ایک انسان ہوں خطا کا پتلا ہوں پھر بھی توبہ و معذرت کرتا ہوں۔ اب فیصلہ عدل تیرے ہاتھ میں ہے۔

میں انسان ہوں مجھ میں سب خامیاں ہیں
ذرا سوچ لینا سزا دینے والے

رشید قیصرانی 13 دسمبر 1930ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ قادیان 1945ء میں میٹرک کی۔ ایف اے ڈگری کالج ڈیرہ غازی خان سے کی۔ ایس ای کالج لاہور سے 1950ء کو بی اے کیا۔ 1953ء میں پاک فضائیہ میں ونگ کمانڈر تعینات ہوئے اور 1979ء کو سبکدوش ہو گئے۔ اخبار نیوز ٹائمنر کے ایڈیٹر رہے۔ ان کی 1965ء

میں لکھی جانے والی رزمیہ نظمیں بہت مشہور ہوئیں گو کہ شاعری 1942ء سے کر رہے ہیں۔ میرا جی اور فیض سے متاثر تھے۔ اُردو زبان نہیں جانتے تھے ایک مہاجر دوست سے خصوصی طور پر سیکھی تھی۔(۵)

تیرے در پہ آئے تھے کچھ لوگ بڑے ارمانوں سے
لسی پانی پوچھ تو لے گھر آئے مہمانوں سے

ذکاءاللہ انجم 1950ء کو تونسہ کے قریب بستی سوکڑ میں پیدا ہوئے۔ اور ان کے والد کا نام محمد اجمل خان ملغانی تھا۔ ذکاءاللہ انجم نے بستی سوکڑ سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اور تونسہ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈیرہ غازی خان سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے اکنامکس کرنے کے بعد اُردو کالج کراچی سے ایل ایل بی کی۔

ذکاءاللہ انجم ''خواہشوں کا صحرا'' اُٹھائے سوکڑ تحصیل تونسہ شریف سے کراچی تک کا سفر کرتا ہے۔ ذکاءاللہ انجم نے یہ جو اتنا بڑا سفر طے کیا ہے اس کا اس طرح سے نتیجہ نکالتا ہے۔

منظر ہے نیا صورت حالت وہی ہے
کچھ ہونٹ تو بدلے ہیں مگر بات وہی ہے

انجم سے بڑا اور بھلا کون ہے شاید
بے خانماں سورج ہے سیاہ رات وہی ہے

ذکاءاللہ انجم نے محکمہ تعلقات عامہ میں بطور آفیسر فرائض انجام دیئے۔ الغاری ماہِ نو، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ جنگ، روزنامہ خبریں اور بیاض وغیرہ کے ادبی صفحات ذکاءاللہ انجم کی قلمی رنگینیوں سے ادب کا حسن نکھار ہوتے ہیں۔ ڈیرہ غازی خان میں محسن نقوی اور پروفیسر محسن حیات اثر (مرحوم) کی ادبی صحت نے اندر کی فطری صلاحیت کو جلا بخشی ہے۔ اور ذکاءاللہ انجم کا تخلص بطور تحفہ لے کر سامنے آ گئے۔

شب ہجراں ہو یا وصل کی شب
مقدر میں ہمارے رت جگے ہیں

سبھی کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے
سبھی کے ساتھ ایسے سلسلے ہیں

آخر انجم صاحب محمد اسلم خان کے پوتے ہیں کیوں نہ جرأت کا مظاہرہ کریں۔
ذکاءاللہ انجم کو جرأت، فکری اور غیرت وراثت میں ملی ہے۔

ممکن ہے کہ سقراط سا انجام ہو مرا
جو اس کی تھی میری بھی شروعات وہی ہے

جب ایک شاعر عشق نبی سرشار جذب و مستی میں ڈوبا حالت بے خود میں مئے مودت پیتا تو پھر اُسے کسی اور چیز کا ہوش تک نہیں رہتا ہے۔

جس جگہ ان کی ذاتی ہوتی ہے
سرنگوں کائنات ہوتی ہے

بارش رنگ و نور ہوتی ہے
جب مدینہ میں رات ہوتی ہے

ساری دنیا کو بھول جاتا ہوں
جب مدینہ کی بات ہوتی ہے

عبدالغنی عاصم صاحب یکم مئی 1947ء کو پیدا ہوئے۔ ایم بی بی ایس، ایم سی پی ایس، ڈی او ایم ایس ڈاکٹر ہیں۔
صاحب قلم ہیں ''امام سکشتگان''، ''لب بستہ''، ''آنکھیں نہ کھولنا'' اور ''صبا صبا

تیرے ہاتھ'' جیسی مشہور تخلیقات منظر عام پر آ چکی ہیں اور عنقریب زمانہ ''فرصت گریہ''، ''بدن کاغذ کی ناؤ'' اور ''نوحہ بغداد'' جیسی شاہکار کتب کا مطالعہ کرے گا۔غنی عاصم ان کا قلمی نام ہے۔(۶)

ضلع ڈیرہ غازی خان کے مختلف ہسپتالوں میں بطور میڈیکل آفیسر کام کرتے رہے ہیں۔سعودی عرب میں ''دمام'' کے لعاقے میں بھی سرکاری ڈاکٹر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے۔اور فوج میں بھی کیپٹن رہے ہیں۔عبدالغنی عاصم صاحب کو تمغہ جنگ ،تمغہ خدمت،تمغہ جرأت جیسے اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔

مودّتِ آلِ رسولؐ کا خزانہ رکھنے والا یہ شاعر برملا اظہار کرتا ہے کہ:

میں ہوں سادات کا حقیر غلام
میرے آقا میر حضور حسین

داستان عشق کا آغاز دکھ سے ہے اور آخر تک رہے گا۔مگر اس میں کردار ہر زمانے میں اپنے ہوں گے۔ڈاکٹر صاحب اس بارے میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

عشق کا روگ کوئی کھیل نہیں ہے عاصم
اس کو سمجھے گا وہی جس نے محبت کی ہے

آغا اعجاز اکرم خاموش تقریباً 1906ء کو پیدا ہوئے تھے۔آغا زمنیر احمد خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ان کا تعلق لدھیانہ کے پٹھان سدوزی قبیلے سے تھا۔

غزل اور نظم دونوں لکھیں۔مشہور شاعر ساحر لدھیانوی کے استاد تھے۔ہجرت کر کے ڈیرہ غازی خان میں رہائش پذیر ہوئے۔پھر اپنے بڑے بھائی منیر احمد ایڈووکیٹ کے ہمراہ ملتان رہائش پذیر ہو گئے۔''گردالم'' کے نام سے ان کی کتاب شائع ہوئی تھی۔(۷)

نہ جانے کون سی منزل کا درد ہے دل میں
جو زیر سایہ گیسو بھی کم نہیں ہوتا

وہی یہ ہم کو عدم کا گمان گزرتا ہے
شریک حال جہاں تیرا غم نہیں ہوتا

رہ جنوں میں اک ایسا مقام بھی ہے جہاں
قدم تو اُٹھتے ہیں نقش قدم نہیں ہوتا

یہ مرحلہ بھی غم بے بسی یہ گزرا ہے
دلوں کا فاصلہ مل کر بھی کم نہیں ہوتا

اللہ وسایا جعفر 1939ء کو سخی سرور میں پیدا ہوئے۔اللہ وسایا جعفر ایک عزت دار، ملنسار اور مہمان نواز انسان ہیں۔اپنے علاقے (سخی سرور) کے پہلے وہ واحد شخص ہیں۔جو ایم اے کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ان کی شاعری جاگیرداروں کے خلاف اور غریبوں کی حمایت میں ہے۔یہ دنیا فانی ہے اور ہر انسان چند سانس لینے آتا ہے اور پھر عدم کے سفر کو روانہ ہو جاتا ہے۔انسان کا دنیا میں آنا اور پھر چلے جانا یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گا۔(۸)

شعر ملاحظہ فرمائیں:

یہ جہاں بزم ہستی ہے سرائے کارواں
یہ انجمن ہے چند روز ہم مسافر ہیں یہاں

آئے بھی وہ بزم میں گویا ابھی ہی چل دیئے
تشنہ صحبت رہیں گے بعد ان کے ہم یہاں

وحید بخش غیاث ایک نفیس، شریف، ملنسار اور سادہ طبیعت کے شاعر ہیں۔وہ 3 مارچ 1936ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔مگر اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ قطر میں

گزارا۔ ان کی شاعری امیروں اور جاگیرداروں کے خلاف ہے۔ اکبر الہ آباد، حالی اور اقبال سے متاثر تھے۔

قطر میں ہی شاعری پر گولڈ میڈل جیتا۔ پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شعری تصنیف ''کلیات غیاث'' ہے۔(۹)

قطر میں پاکستانی lovely شاعر کہلائے گئے۔ وحید بخش غیاث نے شاعری میں روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور دوسروں کو بھی سچ بولنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ منافقت اور ریاکاری سے سخت نفرت کرتے ہیں۔

نیز دیوان ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ اقبال شاہد کے شاگرد رہے ہیں۔ منیر دیوان کے کلام میں اُستاد کے انقلابی مزاج کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔

غربت اور معاشی بغاوت کے باوجود اگر انسان کے اندر قناعت اور غیر کا مادہ موجود ہے تو انسان عزت سے زندگی گزار سکتا ہے۔

مجھے طلب ہی نہیں مخملیں شہادت کی
میں باوجود غریبی بڑے وقار میں ہوں

اگر انسان کے اندر ضمیر ہے تو کمزور طاقتیں کبھی بھی جھکا نہیں سکتیں۔

جھکا نہ پایا کوئی تقاضا
میں خود پہ اتنا اٹل رہا ہوں

عبدالوحید مسلم آرائیں 15 اکتوبر 1932ء کو ابوہر ضلع فیروز پور بھارت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام چوہدری عبدالکریم تھا۔ انہوں نے ایف اے میں پنجابی کا مضمون بالخصوص رکھا۔ آرٹ اور کرافٹ میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر کے ڈیرہ غازی خان میں سکونت اختیار کی۔ ریٹائرڈ مدرس ہیں۔ بلال، غرب اور اختر اخبار میں لکھتے رہے۔ ماہر القادری کے رسالے ماہنامہ فاران کراچی 1967ء میں جو غزل شائع ہوئی تھی اس کے کچھ شعر سپرد قلم کئے جاتے

ہیں۔

کیسے ممکن ہے دھواں بھی نہ اُٹھے دل بھی جلے
آگ لگتی ہے تو پتے بھی ہوا دیتے ہیں
جس پہ ہوتا ہے بہت دل کو بھروسا تابش
وقت پڑنے پر وہی لوگ دغا دیتے ہیں

محسن نقوی ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ڈیرہ غازی خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ محسن نقوی نے ادب کی دنیا میں اپنا ادبی ورثہ چھوڑا۔ محسن نقوی اپنے والد محترم کی طرح لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ ''عکس محسن نقوی''، ''تعلق'' جیسی کتاب شعر پسند طبقے کو دان کر چکا ہے۔

شعر ملاحظہ فرمائیں:

منظر سے اندھیروں کو مٹاتے ہوئے ہم
آئیں گے نظر دور سے آتے ہوئے ہم

میری دھڑکن میں دھڑکتے ہوئے نوحے سن لو
میرے ہونٹوں پر دہکتے ہوئے نغمات کہاں

طنز کا بھی بھرپور جواب دیتے تھے:

مرے جنوں کی تھکاوٹ پہ اتنا طنز نہ کر
مرے شباب کا سورج بھی ڈھلنے والا ہے

عبدالقدیر المعروف عامل متھراوی 1920ء کو ہندوستان کے علاقے متھرا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ہجرت کا ارادہ کیا۔ ہندوستان سے پاکستان کے علاقے ڈیرہ غازی خان میں سکونت اختیار کی۔

ڈیرہ غازی خان میں ٹین سازی کا کام کر کے روزی کماتے رہے۔ ''منزل ایام''

قلمی اثاثہ چھوڑا۔ جبکہ سلیم جیسا شاعر بیٹا بطور بشریٰ ادبی اثاثہ دان کر کے 4 دسمبر 1976ء کو انتقال کر گئے۔ ان کے کلام کی نتھری ہوئی ادبی چاشنی کا مزہ ہی لے لیجئے کہ بجلیاں کس طرح ٹوٹ پڑتی ہیں۔(۱۰)

عشق میں گاہ ادھر گاہ ادھر سے گزرے
پڑتی افتاد لہر گام جو پر سے گزرے

آدمی کیا کہ فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
فرمن دل کو بچایا تھا مگر اے عامل

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ ادھر سے گزرے

شیریں لغاری یکم فروری 1949ء کو بہاولنگر کی تحصیل ہارون آباد میں پیدا ہوئیں۔ ایم اے 1970ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اُردو زبان و ادب میں کیا۔ شیریں لغاری کا ادبی سفر ایم اے میں لکھے گئے مقالے سے شروع ہوا۔

شیریں لغاری کی جائے پیدائش تو بہاولنگر ہے مگر ان کی شادی ڈیرہ غازی خان کے ایک شخص موسیٰ خان لغاری سے ہوئی۔ شادی کے بعد وہ بہاولنگر سے ڈیرہ غازی خان آ گئیں۔ مگر ڈیرہ غازی خان کی محبت نے ان کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے شہر کی محبت کو شاعر کا جزو بھی بتاتی ہیں۔

میں اس کے خواب کی سسی دکھائی دوں شیریں
یہ شہر تھل ہے میں اس شہر کو پُنل بھی کہوں

دلبر حسین مولائی ان کی شہر سے محبت کے بارے میں کہتے ہیں:

''ڈیرہ غازی خان کی محبت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شیریں لغاری کو یہیں بسا دیا ہے۔''(۱۲)

شیریں لغاری کی گفتگو میں نرمی اور منفرد انداز بیان جھلکتا ہے۔

نجمہ شاہین کھوسہ بنیادی طور پر غزل گو شاعرہ ہیں۔ ان کی غزل کے اہم ترین موضوعات عشقیہ شاعری، رجائیت، قنوطیت، نرگسیت اور غم دوراں ہیں۔ انہیں نظم سے لگاؤ بھی ہے نظم گوئی پہ بھی بہت سے تجربات کئے ہیں۔ غزل گوئی کا حسن نظم کے مقابلے میں بہتر ہے۔ نجمہ شاہین کی شاعری میں عشق میں ناکامی، بے نیازی، مجاز سے حقیقت تک کا سفر ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی غزل عشقی و عاشقی کی آئینہ دار ہیں۔

ہنسی نہ دے سکا مجھے مگر مجھے ملال دے گیا
وہ ایک شخص روح کو عجب زوال دے گیا

دیکھو تو کتنے درد ملے کوئے یار میں
کاٹا جو ہم نے ہجر ترے انتظار میں

یہ اشعار عشق میں ناکامی اور ہجر و فراق کی تڑپ کو واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی تعلیم اور دنیاوی معاملات میں کبھی ناکام نہیں ہوئی مگر ان کے جذبات و احساسات کو ہمیشہ ٹھیس پہنچتی رہی۔ انہیں جذبات و احساسات کو اپنی ڈائری پر لکھ دیا۔ وہ اپنی غزلوں میں بے کل بے کل سی نظر آتی ہیں۔ اس حوالے سے حسنین کامران لکھتے ہیں۔

''نجمہ شاہین کھوسہ نے کوہ سلمان کے غریب معاشرے میں جکڑی ہوئی عورت کے درد کو خود پر طاری کر کے اس کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اس درد کی کیفیت اور تکلیف کو اپنے استعار میں پیش کیا ہے۔''(۱۵)

رجائیت میں نجمہ شاہین کی شاعری پر علامہ اقبال کے اثرات ہیں جبکہ قنوطیت انہوں نے روایت سے لی ہے۔ شاعرہ اپنی غزلوں میں کبھی رجائیت کے پردے سے جلوہ گر ہوتی ہیں تو کبھی قنوطیت کی تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہیں، ان دونوں کو یکجا کرنا شاعرہ کا کارنامہ ہے۔

شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وعدہ بھی ساتھ لے گیا جاتے ہوئے وہ آگ
ملنے کا آخری تھا جو امکان لے گیا

زندگی بسر کرنا اس قدر نہیں آسان
تشنگی ہے صحرا کی اس کے گہرے پانی میں

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری میں جہاں عشق و محبت اور ہجر و فراق کے سچے جذبات موجود ہیں وہاں نسوانیت کی علم برداری بھی ان کی شاعری کے حصے میں آ گئی ہے۔ ان کی غزلوں میں نسوانی حسن تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔
چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میں بھی کتنی سادہ ہوں، دشمن جاں کو دوست کیوں
مفت میں خود کو وہم و گماں میں اکثر ڈالے رکھتی ہوں

کہ میں نے چاہت کو بھی عقیدہ بنا لیا ہے
اگر ملی تو عقیدوں میں تمہیں ملوں گی

(ب)

ڈیرہ غازی خان میں اُردو نظم کی روایت

ڈیرہ غازی خان تہذیب و ثقافت کا امین ہے اس کے ساتھ ساتھ جغرافیائی اہمیت کا حامل ہے۔

ڈیرہ غازی خان میں درجنوں ادبی ستارے کام کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ نظم گو شعراء ہیں اور کچھ غزل گو شعراء ہیں۔ ڈیرہ غازی خان ادبی لحاظ سے مالا مال ہے۔ نظم گو شعراء کا ذکر مختصر ہوا جاتا ہے۔

ان کی دو کتابیں ''زنجیروں کا نوحہ'' تقریباً 1965ء میں اور ''کس نے دیکھا میرا چہرہ'' تقریباً 1980ء میں شائع ہوا۔ 1946ء سے شاعری کا آغاز کیا۔

غلام محمد انصاری جو ڈیرہ شہر کے معروف حکیم اور جراح تھے۔ ان کے ہاں 1920ء کو ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام خیر محمد رکھا گیا۔ جب یہ 26 سال کے جوان ہوئے کیف انصاری مشہور ہو گئے۔(۲۰)

ڈیرہ غازی خان میں 6 ستمبر 1965ء کو جناب عبدالرحیم غوری صاحب نے ہفت روزہ غرب نکالا تو اس دن سے ہی اخبار میں کام کرنے لگے۔ عبدالرحیم غوری کی وفات کے بعد یہ ادارہ بے سکونی کا شکار ہو گیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور بے روزگاری کے مایوس مستقبل کا ایک صاحب شعور اور عاقبت اندیش شاعر ہی اندازہ لگا سکتا ہے۔ اور ہر پیدا ہونے والا بچہ تو جدی مقروض ہے۔

سر پہ ہوں گی اے میرے بچے غموں کی گٹھڑیاں
اس طرح تجھ کو بلوغت کی سزا دی جائے گی

گرمیوں کے موسم میں لوگ رات کا کافی حصہ جاگ کر گزارتے ہیں مگر موسم سرما میں سردی ہونے کی وجہ سے ہیٹر و انگیٹھی کی تلاش کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ

سے زیادہ بند کمرے میں رات گزاری جائے مگر اسی ماحول میں بھی شاعر اپنے چاند کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیف انصاری ان مظلوم افراد کو ''چاند'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ تیرا غمگسار بن کر تنہائی کا احساس نہیں ہونے دوں گا۔

اس لئے بھی رات کو گھر سے نکل آتا ہوں میں
سردیوں کے چاند کو احساس تنہائی نہ ہو

ایک ذہن بے مایہ جو بے چارگی و غربت کا زیر دام ہے اور پھر وہ معاشی پالیسی کی نظر ہو جاتا ہے۔ جس کی ذہانت سے ملک کامیاب ہو سکتے تھے مگر وہ مارا مارا اِدھر اُدھر پھرتا نظر آتا ہے۔

اے کیف عجیب چیز ہے مفلس کی ذہانت
پھولوں سے لدی بیل ہے دیوارِ خزاں پر

کیف انصاری رومانی شاعری بھی کرتے ہیں۔ رومانی شاعری میں اپنے رومینٹک مزاج کی انوکھی یادیں چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان کا محبوب تو روٹھ کر چلا جاتا ہے مگر خود کو رومانی و معنوی انداز سے پیچھے عاشق کے پاس ہی چھوڑ جاتا ہے۔ مومن نے کہا تھا کہ:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

محمد شریف اشرف 26 نومبر بستی بنڈی تحصیل تونسہ شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام گل محمد نتکانی ہے۔ میٹرک ہائی سکول تونسہ شریف، ایف اے ڈیرہ غازی خان، بی اے ملتان اور ایم اے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ بہاولنگر کالج میں 6 نومبر 1963ء کو لیکچرار تعینات ہوئے۔ زندگی بھر کا ادبی سرمایہ ''شہر شب چراغ'' 2003ء میں شائع ہوا۔ جاگیردارانہ دور کا یہ سرکاری ملازم ایک اُمنگ کی پریشانی وہ ہنگامے کے زمانے میں خاموشی کو اہمیت دیتا رہا۔ محمد شریف اشرف نے اپنی ساری زندگی اس اُمید پر گزار دی کہ ایک ایسا وقت بھی آجائے جب اہل دل کی بات پر توجہ بھی دے سکے۔ اُس ظالم سماج

میں منزل مراد کا کہیں بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ لہٰذا وہ کہتے رہے کہ ابھی گردِ راہ سے راستہ ملنے کی اُمید نہیں ہے۔ صدیوں نہیں تو سالوں کا سفر باقی ہے۔

مٹتی قدروں کا نوحہ کہتا رہا۔ لوحِ احساس سے حرفوں کو مٹتا دیکھتا رہا اور دل کے قرار کے لئے ''دلدار'' کے نظارے کا بھی جوش وجذبے سے انتظار کرتا رہا۔

ہر دانا اور صاحب فکر تیرگی بھری رات میں اُمید صبح کے خوبصورت خواب دیکھتا ہے۔ ایک معاشرہ جو استاد کے احترام میں ''سلام ٹیچر ڈے'' تو مناتا ہے مگر اسے بھرے سماج میں سپاہی سے پٹواتا بھی ہے۔ مایوسی کے ہالے میں معلم سوائے دہائی کے اور کیا کر سکتا ہے۔

میں معلم ہوں
ایک غم زدہ شخص سے
ایک سپاہی سے گڑگڑا کر کرہا
ایک تھپڑ پڑا
ایک گولی چلی
پھر معلم نہیں خاک کا ڈھیر تھا
خون کی لہر تھا
خاک پھر خاک ہے
خون پھر خون ہے
خاک سہمی رہی
خون بہتا رہا
اور کہتا رہا
میں معلم ہوں
میں ثناء خواں ہوانسان کی تکریم کا

اس ظلمت شب میں بھی معلّمی سے معاشرے کو روشن کیئے رکھا۔ پیچیدہ لفظوں کے باوجود معاونت کے تیور سے حوصلہ دیتا رہا اور وصل کے ادراک لمحوں کے بھی دکھاتا رہا۔

کیونکہ دانا لوگ رات کی بھیگی پلکوں سے عبرت کے موتی چن لیتے ہیں بلکہ علانیہ طور پر کہا کہ آنے والی صدیاں اپنی ہیں ابھی خون کا دریا عبور کرتا ہے۔

نکہت گل کے پاسبانوں کی موت دل پر کیا اثر کرتی ہے۔ ذرا منظر دیکھئے:

اک شہر شب چراغ کے بے سمت راستے
اور دل وہ اجنبی کے زبان کھولتا نہیں

بے صرفہ جو پھرے ہے مسافر یہ کون ہے
تکتا ہے ہر کسی کو مگر بولتا نہیں ہے

جاوید احسن یکم اگست 1948ء کو تحصیل تونسہ کے علاقے ڈیروہ فتح خان میں پیدا ہوئے۔ ڈیرہ غازی خان میں شعروادب کی عظمت تہذیب وثقافت کی اشاعت مقامی تاریخ وآثار کی تحقیق نوجوان اہل قلم کی رہنمائی اور قومی تشخص کو عیاں کرنے میں جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں جاوید احسن کا نام اور کام انتہائی قابل قدر ہے۔ پاکستان نیشنل سینٹر میں پروگرام آفیسر تھے۔

تحقیقی کتاب سرائیکی ثقافت فی احسن تقویم اور لوح شفاعت ان کی تصانیف ہیں اُردو زبان میں شاعری کرتے تھے۔ جمال صحرا، چشم غزال اُردو کے شعری مجموعے ہیں۔ 5 اکتوبر 2014ء کو خالق حقیقی سے جاملے۔

نمونہ کلام:

میں نے صحرا میں بھی پھولوں کو کھلا دیکھا ہے
صرف گلشن ہی کو اعجاز نہ بخشا جائے

خالد احمد نام اور تخلص خالد ہی ہے۔ 25 مئی 1975ء کو لیہ پیدا میں ہوئے۔

اس کے بعد ڈیرہ غازی خان میں مستقل سکونت اختیار کی۔ مگر حصول رزق کی خاطر کوٹ ادو میں قیام پذیر ہیں۔ خالد صاحب نے ماسٹر کیا ہوا ہے۔ شاعری میں اُردو کلام میں عبور حاصل ہے۔ اعجاز ڈیروی مرحوم سے شاعری کا سبق حاصل کرتے رہے۔ اعجاز ڈیروی ایک شاعر کے علاوہ ایک شاعر گُر بھی تھے۔ خالد صاحب کی پہلی کتاب منظومات کی صورت میں 1997ء دوسرا ایڈیشن 2009ء اور تیسرا ایڈیشن 2013ء کو کتاب ''چاہت'' شائع ہوئی۔ ان کی دوسری کتاب ''ردائے دل'' 1998ء میں شائع ہوئی۔

نمونہ کلام:

ملتان ہے تیرے نام سے خالد کو جو سکون
اظہار اس کا لفظوں لفظوں میں کرنا محال ہے

حراساں ہوں اپنے جذبوں سے خود میں
اے زندگی مجھے الزام زندگی نہ دے

اعجاز ڈیروی 13 جون 1938ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام حاجی محمد اعجاز تھا۔ بی اے ادیب زائد تھے۔ مدرس تھے۔ سرائیکی اور اُردو زبان میں شاعری کرتے تھے۔ اور شاعری میں شفقت کاظمی کے شاگرد تھے۔ ان کی تصانیف ''پردیسی ول آ''، ''سسی''، ''بہار عقیدت''، ''اکھان''، ''پھل پیار دے''، ''سچے موتی''، ''تاب سخن''، ''زخم آرزو'' اور کلیسا شامل ہیں۔

نمونہ کلام:

خدا سکھا دے بہاروں کا احترام ہمیں
وگرنہ تاک میں بیٹھی ہے رُت خزاؤں کی

محمد رمضان طالب 1935ء میں پتھر بازار ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے۔ محمد رمضان طالب معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر ہڈی جوڑ

اور سرائیکی شاعر کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔تقریباً 30 چھوٹی بڑی کتابیں تحریر کیں۔سرائیکی سنگت کے بانی فرید اور ممتاز شاعر نور محمد سائل کے شاگرد تھے۔جبکہ اُردو شعری مجموعہ ''دل ایک سمندر کے نام'' سے شائع ہوا۔11 نومبر 2009ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

فرید ساجد یکم اپریل 1974ء میں پیدا ہوئے۔چوٹی بالا سے تعلق ہے۔اُردو اور سرائیکی زبانی کے معتبر شاعر ہیں۔علم کعبہ پر بساط رکھتے ہیں۔ان کی تصانیف میں ''چنتے'' اور ''بھوئیں کراماں'' شامل ہیں۔دامان کے نام ادبی تنظیم اور ادبی رسالہ شائع کرتے ہیں۔
نمونہ کلام:

نزول خوف کے انبار پر رکا ہوا ہوں
نگر میں جبر کے آثار پر رکا ہوا ہوں

سلیم فراز 3 فروری 1947ء کو عبدالقدیر متھراوی کے ہاں پیدا ہوئے۔(۲۱)
میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آبائی پیشے ''ٹین سازی'' میں روزی کی تلاش کی۔سلیم فراز کو ادبی ذوق ورثے میں ملا۔گزری گھڑی ہی مستقبل کی منصوبہ بندی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔انسان اپنے ماضی سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔گو کہ زیرک فرد کی طبیعت میں چلبلہ پن سا زیادہ ہوتا ہے۔اور وہ پارے کی طرح وقت تڑپتا رہتا ہے۔

منظروں کو دیکھ کر پس منظروں کو دیکھنا
کس قدر مشکل ہے گزری ساعتوں کو دیکھنا

سلیم فراز کیف انصاری کے شاگردوں میں سے ہیں اُمیدوں کے سہارے پر سفر کیا جاتا ہے۔اگر یہ بکھر جائیں تو پھر کہاں کا عشق اور کیسا رونا؟ آخر زندگی سے انسان سمجھوتا کر ہی لیتا ہے۔

میرے کی طرح کا نہ تمہارے کی طرح کا
ایک شوخ تھا صدرنگ نظارے کی طرح کا

گر چھوٹ گیا ہے تو اسے روئے کب تک
اس بھیڑ میں ایک ہاتھ سہارے کی طرح کا

عزیز شاہد 28 جولائی 1947ء میں پیدا ہوئے۔عزیز شاہد کا اصل نام عزیز اکبر ہے۔عزیز شاہد سرائیکی وسیب کے بہت بڑے شاعر ہیں ان کے والد نور سائل محمد سرائیکی شعر و ادب میں ایک عمدہ شاعر مانے جاتے ہیں۔ان کے شعری مجموعے میں ''من دریائے''، ''پھل سرمی دے''، ''سلسلے سلونی دے'' شامل ہیں۔

امداد نظامی 14 اگست 1935ء میں کوٹ مٹھن شریف میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مشرق پنجاب کے ایک پرائمری سکول سے حاصل کی۔اس کے بعد ڈیرہ غازی خان کے ڈگری کالج میں بھی تعلیم حاصل کی۔دو پاکستانی اور دو غیر ملکی یونیورسٹیوں سے علم حاصل کیا۔امداد نظامی علمی ادبی اور صحافتی حلقوں کا ایک معتبر حوالہ ہے۔مختلف قومی اخبارات کے مدیر رہے۔چھ شعری مجموعوں سمیت 17 اُردو انگریزی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔مزید 40 تصانیف بھی مکمل تھیں مگر زندگی نے ساتھ نہ دیا۔عارضہ دل کے باعث 16 اپریل 2008ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔
نمونہ کلام:

اک پل کے سکھ چین کے بدلے ساری عمر رلاتے ہو
دور کہیں جا بسنے والو! دل میں کیوں بس جاتے ہو

علامہ طالوت نسیم یکم فروری 1909ء کو چوٹی زیریں ضلع ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام عبدالرشید آرائیں تھا۔علامہ طالوت نسیم نے ڈیرہ غازی خان سے ملتان میں سکونت اختیار کی۔بے خوف صحافی تھے۔20 مارچ 1963ء کو ملتان میں سپرد خاک ہوئے۔

ان کا گھر ہے کہ کوئی ہوٹل ہے
ایک آتا ہے ایک جاتا ہے

آگے بیوی ہے پیچھے ہے شوہر
ہاتھ میں بیگ اور چھاتا ہے

محبوب حسین خان بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور اور بہاولپور سے حاصل کی۔ ملازمت کے سلسلے میں بہاولپور سے جھنگ چلے گئے اور پچھلے اور پچھے 32 برس سے ڈیرہ غازی خان میں مستقل مقیم ہیں اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ گورنمنٹ ٹیکنیکل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ریلوے روڈ بطور سینئر انسٹرکٹر ریٹائر ہوئے۔ پروفیسر محبوب حسین خان (محبوب جھنگوی) علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی حلقوں میں ایک دانشور مصنف، محقق، کالم نگار، ماہر تعلیم، کمپیئر اور موسیقار کے طور پر جانے جاتے ہیں تین زبانوں اُردو سرائیکی اور پنجابی میں شاعری کرتے ہیں۔ اُردو شعری مجموعہ ''خدا خیر کرے'' کو علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ نیا شعری مجموعہ ''تیرا خیال'' بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ مختلف موضوعات قومی اور مقامی اخبارات میں 900 سے زائد کالم اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تین کتابوں موٹر کار (سرائیکی)، کار کی (سرائیکی) آٹو موبائل کے فارم مشینری (پنجابی) پر 1994ء، 1995ء اور 1996ء کے مسعود کھدر پوش ایوارڈ جیت چکے ہیں۔

نمونہ کلام:

کسی کی یاد میں کھو جاتی ہے
رم جھم بارش ہو جاتی ہے

صحرا پیاسا رہ جاتا ہے
یوں بھی بارش ہو جاتی ہے

شیریں لغاری بہاولنگر میں پیدا ہوئیں مگر ان کی شادی ڈیرہ غازی خان میں ہوئی۔

شیریں لغاری نے اپنے اظہار کے لئے شاعری کے دو مقبول اصناف غزل اور نظم

کو منتخب کیا ہے اور دونوں اصناف کو یکساں مہارت اور خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ مصرعوں کی نسبت اور اشعار کی بناوٹ سے اُن کی فنی ریاضت کا پتہ چلتا ہے۔(۲۲)

نظم ''پھر یاد اُسی کی آتی ہے'' ملاحظہ فرمائیں:

جب رات کے تنہا لمحوں میں
میں کھوئی کھوئی رہتی ہوں
کوئی آہٹ مجھ سے کہتی ہے
کیوں ہلچل دل میں رہتی ہے
کوئی جگنو پاس سے گزرے تو
کوئی بات زباں سے نکلے تو
میں خود سے اُلجھنے لگتی ہوں
پھر یاد اُسی کی آتی ہے
اور سانس میری رُک جاتی ہے
اک درد جگر میں اُٹھتا ہے
وہ درد سحر تک رہتا ہے
اک وہم مجھے یہ کہتا ہے
کوئی تیرے دل میں رہتا ہے

محسن نقوی 5 مئی 1947ء کو محلّہ سادات ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ محسن نقوی اُردو کے مشہور شاعر تھے۔ اُن کا مکمل نام سید غلام عباس تھا۔ لفظ محسن ان کا تخلص تھا۔ اور نقوی کو وہ تخلص کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اور محسن نقوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''کلام'' چھپا۔ بعد میں وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ محسن نقوی خطیب کے روپ میں بھی سامنے آئے۔

محسن نقوی شاعری کے علاوہ مرثیہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ محسن نقوی

نے اپنی شاعری میں واقعہ کربلا کے جابجا استعارے استعمال کئے ہیں۔ ان کی تصانیف میں ہندقبا، عذابِ دید، خیمہ جان، برگ صحرا، طلوع اشک، حق ایلیا، رخت شب، ریزہ حرف، موج ادراک اور دیگر شامل ہیں۔

محسن نقوی کی شاعری میں رومان اور درد کا عنصر نمایاں تھا۔ اُن کی رومانوی شاعری نوجوانوں میں بھی خاصی مقبول تھی۔ محسن نے بڑے نادر اور نایاب خیالات کو استعارے کا لباس اس طرح پہنایا ہے کہ شاعری کی سمجھ رکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

اک ''جلوہ'' تھا، سو گم تھا حجابات عدم میں
اک ''عکس'' تھا، سو منتظر چشم یقین تھا

اُردو ادب کا یہ دمکتا چراغ لاہور میں اپنے دفتر کے باہر دہشت گردوں کی فائرنگ سے 15 جنوری 1996ء کو بجھ گیا تھا۔ شہادت سے چند لمحے قبل محسن نقوی نے ایک لازوال شعر کہا تھا۔

سفر تو خیر کٹ گیا
میں کرچیوں میں بٹ گیا

نجمہ شاہین کھوسہ بنیادی طور پر غزل گو شاعرہ ہیں۔ انہوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ انہیں غزل سے زیادہ نظم میں زیادہ کمال حاصل ہے۔ اصناف کے حوالے سے وہ بیک وقت غزل اور نظم دونوں کی شاعرہ ہیں۔

نجمہ شاہین کھوسہ کے پہلے شعری مجموعہ ''پھول، خوشبو اور تارہ'' میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ پہلا شعری مجموعہ ہونے کی وجہ سے فنی خامیاں جابجا موجود ہیں۔ نظموں کے زیادہ تر موضوعات ناکام محبت اور ہجر و فراق کی کیفیت کے متعلق ہیں۔

نظم ''ناسور'' ملاحظہ فرمائیں۔

اے دل میرے آمل بیٹھیں
آقصہ چھیڑ پرانا تو

آخواب سناؤں میں تجھ کو
جو چار دنوں کا قصہ ہے
جو جیون باب کا قصہ ہے
آ اس ناسور کی بات کریں
جو روح کے اندر اُتر گیا
جو تجھ کو چاٹ کے رہ گیا

نجمہ شاہین کھوسہ کا دوسرا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' میں 58 نظمیں شامل ہیں۔ پچھلے مجموعے (پھول، خوشبو اور تارہ) میں ہجر و فراق کے موضوعات کی تعداد زیادہ ہے مگر اس مجموعے میں شاعرہ نے مختلف موضوعات کو اپنایا ہے۔ دیہات کے رسم و رواج، اپنے ذاتی حالات اور جزئیات نگاری اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ میں آنکھیں بند رکھتی ہوں کی پہلی نظم کا عنوان کتاب کے عنوان کا دیا گیا ہے۔

میں آنکھیں بند رکھتی ہوں
جب اس کی یادوں کے جھروکوں میں
میں خیالوں کا ریشم بنتی ہوں
اور وہ ریشم کھل کے بکھرنے لگتی ہے
میں آنکھیں بند رکھتی ہوں

نجمہ شاہین کھوسہ نے عورتوں کے دکھوں کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے دکھوں کو اپنا موضوع بنایا۔ عورتوں کے مسائل کے حوالے سے ایک نظم ''دوسری عورت'' کے عنوان سے ہے۔

وہ ایک خواب تھی
پہلو بہ پہلو ثواب تھی
کیوں اپنی ذات کی اذیت بن گئی

اپنی ہستی کھو کر وقت کی صورت بن گئی

وہ کیوں دوسری عورت بن گئی

تیسرے شعری مجموعے میں ''اور شام'' ٹھہر گئی میں نجمہ شاہین کھوسہ ہر بات سنجیدگی سے کہتی نظر آتی ہیں۔ اس مجموعے میں شاعرہ کی محبت کا ایک رخ سامنے آیا ہے۔ جو اپنی والدہ سے محبت اور پیار ہے۔

نظم ''ماں اک ایسی ہستی ہے'' چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ابر کی صورت میرے سر پر
ایک دعا سی رہتی ہے
میری اپنی ذات بھی اس کی
خوشبو سے ہی مہکی ہے
میرا ہر اک دکھ جو سمجھتے
بس وہ ماں کی ہستی ہے

نجمہ شاہین کھوسہ کائنات کے دکھ دیکھ کر اپنے دکھ بھول گئیں۔ انہیں لوگوں کی پریشانیوں سے ہمدردی ہوگئی۔ نجمہ شاہین کھوسہ کا شعری سفر آگے کی طرف بڑھتا ہے تو وہ داخلیت سے خارجیت کی طرف آتی ہیں ''ایک بختوں والے کا قصہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

لیکن ہجر کا آب زم زم اس نے ہاتھ سے جھٹک دیا تھا
درد کا وہ انمول سا قطرہ
وصل کا اک انمول سا لمحہ
اس پل خاک میں خاک ہوا تھا
ہجر کے دریا کے شعلوں میں
میرا جیون راکھ ہوا تھا

ڈیرہ غازی خان کی شعری روایت میں جہاں مرد شعراء نے اپنے حصہ ڈالا ہے۔

وہاں خواتین شعراء بھی پیچھے نہیں محترمہ شیریں لغاری، محترمہ نجمہ شاہین کھوسہ، کائنات ملک، بشریٰ قریشی، نیز رانی شفق اور ایمان قیصرانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنے ابتدائی دور میں تتلیوں اور رنگوں کی باتیں کرنے والی کومل جذبات اور احساسات کی ترجمان رہی ہیں۔ وہ ایک خوش شکل، خوش مزاج اور خوش گلو شاعرہ ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے رنگوں میں گہرا رنگ جو کبھی رومان کا تھا اب حقیقت تک کا سفر کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ محبوب ذات حق کو قرار دینے لگی ہیں اس کے لئے انہوں نے ''پیا'' کا استعارہ ذات حق کے لئے استعمال کیا ہے وہ اپنے شوخ اور شریر، جذبات کے دائرے سے نکلتے ہوئے حقیقی اسلوب سے آشنا ہو رہی ہیں، کبھی وہ اپنی شاعری میں اپنی ماں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں، کبھی دھرتی کو سلام کرتی ہیں۔ ممتاز کے رنگ وہ اپنی چاروں اطراف اوڑھ لیتی ہیں۔ وقت نے ان کی سوچ میں گہرائی اور ذہن میں وسعت پیدا کر دی تھی انہیں ادراک ہوا کہ کائنات اور موجودات کا مرکز اور مہور صرف خدا ہے۔ غزل اور نظم ہر دو میدان میں اب وہ حب خداوندی کی پیروکار نظر آتی ہیں۔ اس مطالعے میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے انہی رنگوں اور اسلوب کی جانچ پرکھ کی گئی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ وسیبی سخن ور، دلبر مولائی، ہوتانی پرنٹنگ پریس ڈیرہ غازی خان 2008ء ص:8

2۔ ایضاً ص:13

3۔ ایضاً ص:12

4۔ ایضاً ص:28

5۔ اقبال شاہد فن اور شخصیت، جعفر ناظم ص:48

6۔ ایضاً ص:48

7۔ ایضاً ص:50

8۔ ایضاً ص:52

9۔ ایضاً ص:51

10۔ وسیبی سخن ور، دلبر مولائی، ہوتانی پرنٹنگ پریس ڈیرہ غازی خان 2008ء ص:9

11۔ ڈی جی خان میں اُردو شاعرات ثمینہ یونس علی، ص:41

12۔ ایضاً ص:41

13۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول، خوشبو اور تارہ''، فرید ادبی سنگت ڈیرہ غازی خان، 2007ء ص:40

14۔ ایضاً ص:145

15۔ حسنین کامران، رائے، مشمولہ، روزنامہ ''کسک''، ملتان 12 جولائی 2010ء

16۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، ص:196

17۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''اور شام ٹھہر گئی''، ص:81

18۔ ایضاً ص:91

19۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول، خوشبو اور تارہ''، ص:62

20۔ اقبال شاہد فن اور شخصیت، جعفر ناظم، ص:20

21۔ ایضاً ص:21

22۔ آبنائے درد، آفاقی پبلشرز کراچی، 2013ء ص:19

23۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول، خوشبو اور تارہ''، فرید ادبی سنگت رجسٹرڈ، ڈیرہ غازی خان، 2007ء، ص12

24۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، خزینہ علم و ادب لاہور، 2010ء، ص:16

25۔ ایضاً ص:82

26۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''اور شام ٹھہر گئی''، ص:2

27۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول، خوشبو اور تارہ''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور 2016ء پس ورق

باب سوم

نجمہ شاہین کی چار کتابوں کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے وہ ڈیرہ غازی خان کی شیریں روایت کا ایک اہم حصہ ہیں اگر چہ ان کا پیشہ مسیحائی ہے تاہم ان کی شاعری بھی زندگی کے نشتر سہنے والوں کے لئے عیسیٰ صفت ہے۔ نشتر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے آبائی شہر کا انتخاب کیا۔ ابتداء میں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال ڈیرہ غازی خان میں بطور میڈیکل آفیسر کام شروع کیا۔ لیکن جلد ہی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنا کلینک جان میڈیکل کلینک سے شروع کیا جسے بعد میں ہسپتال کا درجہ دیا گیا۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے شعری دنیا میں قدم رکھا اور اس روایت کو ایمان کی حد تک نباہ رہی ہیں۔

1۔ پھول سے بچھڑی خوشبو

2007ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' منظر عام پر آیا۔ یہ شعری مجموعہ اپنے نام اور اسلوب کی وجہ سے ادبی حلقوں میں معتبر ٹھہرا۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''، 2010ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کو بھی بھر پور پذیرائی ملی۔ تیسرا مجموعہ ''اور شام ٹھہر گئی'' 2013ء ادبی افق پر نمودار ہوا۔ ''پھول، خوشبو اور تارہ'' 2016ء میں شائع ہوا۔ اگر چہ سارے نام بہت رومانوی ہیں۔ تاہم ان کی شخصیت کا رومان ان ناموں سے بھر پور تال رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ غزل اور نظم کے ہر دو اصناف میں مہارت رکھتی ہیں انہوں نے سرائیکی وسیب کی عورت کے دکھوں کو قریب سے دیکھا۔ اور ان کی آواز سے آواز ملا دی۔ وہ عورت کے دکھوں کی آواز بن گئیں۔ انہیں اپنے آپ کو اجاگر

کرنا اور منوانا آتا ہے۔ وہ اپنی ابتداء سے اب تک کا شعری اثاثہ اور اخبارات و جرائد میں چھپنے والی تحریریں بہت سینچ سنبھال کر رکھتی ہیں۔ اخبارات میں لگی ہر سرخی انہوں نے البم کی صورت میں محفوظ کر رکھی ہے۔ سرائیکی علاقے کی اس خاتون نے اندرون ملک اور بیرون ملک اپنی شاعری سے لوگوں کو مسحور کیا۔ اور کئی اعزازات حاصل کئے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نے نامساعد حالات میں تعلیم حاصل کی اپنا گھر اپنا علاقہ چھوڑ کر ڈیرہ غازی خان میں آئیں۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول نمبر 2 میں داخلہ لیا۔ اور مختلف تقاریب میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ ڈرامیٹک کلب کا حصہ تھیں اور خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گلو بھی تھیں۔ اس لئے اساتذہ اور طالبات میں مقبول تھیں۔ ایف ایس سی گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج ڈیرہ غازی خان سے کی اور میڈیکل آفیسر بن کر بھی ڈیرہ غازی خان میں اپنی خدمات دیں۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ نرم دل اور حساس طبیعت کی مالک ہیں۔ وہ اپنی بساط کے مطابق لوگوں کی خدمت کرتی رہی ہیں۔ فلاحی کاموں میں بھی انہوں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا پہلا مجموعہ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' محبتوں کا دکھ ہے۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرتا ہے اپنے ٹوٹے بکھرے خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے وہ خود کو بھی زخمی کر بیٹھی ہیں۔ ماضی حال اور مستقبل کے درمیان پُل کا کام دینے والی نجمہ شاہین ایک زنجیر بن جاتی ہیں۔ جو اس رشتے کو ٹوٹنے نہیں دیتیں مگر اس سارے سفر کے درمیان جو بھگتان ان کی روح بھگتی ہے اس کا ازالہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ''پھول سے بچھڑی خوشبو'' کے بارے میں وہ خود کہتی ہیں۔

> ''پھول سے بچھڑی خوشبو بھی ایسے ہی بے تعبیر خوابوں کا عکس ہے کہ جن سے منعکس ہونے والی شعاعوں سے میرا ماضی حال اور فردا روشن ہیں اور تا قیامت رہیں گے''(۱)

نجمہ شاہین کی زندگی میں بہت سارے ثمر بار لمحات بہت بے معنی ہو کر بھی

گزرے۔ وہ ان لمحوں کے عذاب سہتی ہوئی نئی رُتوں کا خواب دیکھتی ہے اور خواہش رکھتی ہے کہ اسے بہر کیف جینے کا مفہوم سمجھ میں آ جائے گا۔ وہ محبت کرنے والی روح ہے جو یہ اثاثہ دوستوں، دشمنوں، پیاروں اور غم خواروں پہ لٹاتی رہتی ہے وہ اپنی سوچوں اور جذبوں کو کسی حادثے کا مرہون منت مانتی ہے۔

''میں ان لفظوں کی اشاعت کے حق میں نہ تھی جو میرے سوچوں اور جذبوں کا عکس ہیں مگر ایک بہت بڑے حادثے نے اس کو منظر پر لانے میں مدد کی جب ان لوگوں کو پرکھنے کا موقع ملا کہ ذہن و دل میں ہمیشہ سے اپنے بنا کر رکھے تھے۔ تب اندازہ ہوا کہ اس دنیا میں جذبوں کی قدر نہیں۔ سب کچھ ضرورتوں میں چھپا ہے اور شاید ہم بھی کبھی ضرورت تھے۔''(۲)

نجمہ شاہین کھوسہ کی شاعری اس سخن نا آشنا کے نام بھی ہے جو اس کا ہم سخن بھی ہے اور نا آشنا دوست بھی کبھی وہ اسے روح کا ملال سناتی ہے۔ کبھی اپنی شعری جمال کی بات کرتی ہے اور کبھی اس کے بخشے ہوئے ہجر کے تحفے کو سنبھال کر رکھ لیتی ہے۔ اور ان عنایتوں کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتی ہے۔ جو اسے شہر نامہرباں نے بخشی ہیں۔ وہ رُت جگوں کا عذاب سہتی ہے اور روز و شب کی ریاضتوں میں ایک لمحہ ٹھہر کر پوچھتی ہیں کہ کتنا سفر باقی ہے۔ کبھی انہیں اپنی دعاؤں کی رائیگانی کا دُکھ ستاتا ہے اور دُہائی دیتی ہیں کہ دعائیں بے اثر کیوں ہو گئیں۔ وہ تو حسین اور رنگین دنیاؤں کے خواب دیکھنے والی ذی روح تھیں۔ وہ گلاب لمحے کسی چشمے کے منتظر کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ جنہیں سرد خانوں کا عذاب ستاتا ہے اور وہ پھر تڑپ کر کہتی ہیں کہ یہ دعائیں کیوں بے اثر ہو گئیں کبھی انہیں دکھ ستاتا ہے کہ کون بچھڑے ہوؤں کو آ کر ملائے گا۔ اور جلتے ہوئے دشت کی پیاس بجھانے کیلئے اور نئے سنہرے خواب دکھانے کیلئے کون آئے گا۔ یا کوئی آئے گا جو بچھڑے ہوؤں کو ملا جائے گا۔ اور کبھی ان کی شاعری کے نسائی رویے خود کو تیاگ دینے کی آرزو میں مسکراتے ہیں اور اس کو

بھی دعائیں دیتی ہیں جو ہم سفر تو نہ بنا سکا۔ مگر دل کی آہ اور لب کی دعا بن گیا۔

نجمہ کی شاعری میں ''آخری ملاقات'' خصوصیت کا درجہ رکھتی ہے۔

مجھ کو رہے گی یاد وہ ملاقات آخری
ہونٹوں پہ رہ گئی تھی کوئی بات آخری
آنکھوں کے دشت میں تھے نگینے سجے ہوئے
چاہت کی جس طرح سے ہو سوغات آخری
ٹھہرا ہوا سا دن تھا اور
گہری اداس شام
دل کے نگر میں چھائی تھی
دل جذبوں کی وہ نمی
بھولوں گی کس طرح سے میں
لمحات آخری
وہ ملاقات آخری
رک رک کے مڑ مڑ کے دیکھتا تھا بے نوا کوئی
اور دوڑتی تھی سائے کے پیچھے میں بے خطر
اک شام سے تھا رات کا تنہا کٹھن سفر
مرجھا گیا چمن میں ہر اک پھول ہر شجر
آہوں کا سسکیوں کا سمندر تھا موجزن
اس کا خیال روح کے اندر تھا موجزن
ہو گی نہ اب کبھی بھی وہ برسات آخری
مجھ کو رہے گی یاد ملاقات آخری
کیسا وہ آشنا تھا اور کیسا تھا اجنبی

اپنے لئے یہ دکھ بھی بہت ہی عجیب تھا
گو فاصلے بہت تھے مگر وہ قریب تھا
شکوہ مرے لبوں پہ تو آیا نہ تھا کبھی
وہ کہہ رہا تھا ہجر ہی اپنا نصیب ہے
بھولوں گی کس طرح سے میں کلمات آخری
وہ ملاقات آخری
پھر اس کے بعد روح میں پھیلا وہ انتشار
جیسے پکارتے ہوں وہ جذبے سے بےقرار
دشت طلب میں جیسے کوئی روئے زار زار
پھولوں کو چھوڑ کر لئے کانٹوں کے ہم نے ہار
دن رات کا سفر بھی کٹے ایک آس پر
ممکن ہے نام لے وہ مرا پھر سے بار بار
دل بےقرار ہو کوئی دھڑکن بھی لے پکار
اس دن چھلک رہے تھے وہ جذبات آخری
اب تو بس اک امید ہے اک آس ہے مجھے
ممکن ہے اس طرح سے بھی اک روز ہو کبھی
خوابوں کے اس نگر میں یونہی لوٹ آئے وہ
دل پر دیں دستکیں اگر جذبے وہی کبھی
چھا جائے پھر سے شام کبھی سرد سی وہی
دل کی خلش تو اب نہ مٹے گی تمام عمر
آنے پہ اس کے ہوں گی رسومات آخری
میرے کٹیں گے ایسے اب لمحات آخری

بھولوں گی اس طرح سے ملاقات آخری

اس نظم میں ڈاکٹر صاحبہ آخری ملاقات کے وہ لمحے یاد کر رہی ہیں کہ جب آنکھوں کے دشت میں چاہ کے نگینے سجے ہوئے تھے۔ وہ گہری اداس شام تھی۔ جس میں آہوں اور سسکیوں کا سمندر رہوا تھا۔ اور اس آخری برسات کے لئے بے تاب تھا۔ آخری برسات کے لئے رکا ہوا تھا۔ مگر آخری ملاقات، آخری لمحات اور آخری کلمات اس بند کو نہ روک سکے اور وہ چھلک پڑیں۔ یقیناً ایسی ملاقاتیں سرمایہ بھی ہوتے ہیں۔ اور بے مایہ بھی کر دیتی ہیں۔

نجمہ شاہینکے دل دریا میں درد کی صورت کوئی مکیں چھپا ہوا ہے جو بدلتے موسموں میں بھی اذیت کا سامان فراہم کرتا ہے جانے والا جا چکا ہے۔ مگر وہ اپنی ہتھیلیوں میں دعا کی صورت میں اسے تلاش کرتی ہیں اور رگوں میں دوڑتے لہو میں اس کی روانی محسوس کرتی ہیں۔ وہ گھرے جہاں میں تنہائی کا عذاب سہتی ہیں۔ وہ گزرے ہوئے لمحات کے اشک ان کی تنہائی کو منور کر دیتے ہیں۔

ان لبوں پر آج بھی اُس کی خوشی کی ہے دعا
جس نے میری ہر خوشی پر غم کا سایہ کر دیا

اس کی یادیں خود بخود شاہین اِس میں آ گئیں
میں نے بس اتنا کیا تھا، دل کو رستہ کر دیا

محبت اور چاہت کے جذبے شاعری کی روح ہوا کرتے ہیں۔ اگرچہ آج کی مشینی زندگی بہت سے جذبوں کو کچل چکی ہے اور بہت سے رویوں کو مسخ کر چکی ہے مگر اُردو غزل کے رومان کو مسخ نہ کیا جا سکتا یہ جذبے تقریباً تمام شعراء اور شعرات کے ہاں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ بھی اپنے احساسات کی دنیا کو جذبوں کی روشنی سے منور رکھتی ہیں۔

2۔ میں آنکھیں بند رکھتی ہوں

ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' چاہت کے احساسات کی شدت کا مظہر ہے انہوں نے اس مجموعے میں بھرپور نظمیں کہیں ۔مگر ان کی غزلیات میں نظموں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ان کی غزلوں میں بھرپور تغزل ہے۔غزل کا اسلوب نہایت شائستہ سادہ اور رواں ہے حسن اس کا اضافی وصف ہے ۔عشق حقیقی کے حوالے سے دو نظریات صوفیاء کرام کے ہاں پائے جاتے ہیں۔جن کی صوفی پیروی کیا کرتے ہیں۔

منظور انتساب کو داد وتحسین دیتے ہوئے مقیم معرف شاعر منور احمد کنڈے اس بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''خزینہ علم وادب لاہور کے زیر سایہ اہتمام شائع شدہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا مجموعہ کلام ثانی ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' تین صد سے زائد صفحات پر مشتمل ہے ۔ دنیائے سخن وری میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جس میں انتساب کو بھی منظوم کیا گیا ہے۔نجمہ شاہین کی یہ کتاب بھی انہی میں سے ایک ہے۔''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں'' کا گراں کتابی رنگ و روپ اور اس میں موجود معیار نظم دونوں سے قاری متاثر ہوئے بگیر نہیں رہی سکتا۔یعنی حسن ظاہری سے بھی اور بیان باطنی سے بھی دوران مطالعہ خط اُٹھاتا چلا جاتا ہے۔سخن وری کے گلہائے حقیقت کی مہک پیہم دل و دماغ کو معطر کرتی غزل میں خیالات کی پختگی اور نظم میں موضوعات کے تنوع کی موجودگی تخلیقات کو مزید زور آور بنا رہی ہیں۔''(۵)

''ہمہ اوست'' اور ''ہم از اوست'' جس کا اصلاحی مفہوم ہے سب کچھ خدا ہے جبکہ ''ہم از اوست'' کا مطلب ہر چیز خدا سے نسبت رکھتی ہے۔ڈاکٹر نجمہ شاہین کے ہاں ان دونوں نظریات کے حوالے سے اشعار ملتے ہیں۔ان کی جہاں جہاں نظر جاتی ہے انہیں وہاں وہاں خدا ملتا ہے گویا انہوں نے غم دوراں اور غم جاناں سے گزر کر غم جاں اور غم جہاں کا

راستہ طے کیا۔اور ان کا عشق واصل بالحق ہونے کو بے چین ہے۔وہ ہر جگہ ہر ایک نگر میں اس کی جلوہ سامانیہ دیکھتی ہیں۔رنگ ونور کی محفلوں میں وہ وجود حق کو تلاش کرتی ہیں۔چمن چمن دمن دمن وہ جمال حقیقی کا پرتو تلاش کرتی ہیں۔کبھی بحر میں کبھی بر میں اور کبھی وجود خیر و شر میں وہ زمانی امتحان سے گزرتی ہیں۔

ہر ایک بحر و بر میں تو ، وجود خیر و شر میں تو
ہر ایک سمت جلوہ گر جاں میں اے خدا ہے تو

وہ ہر ایک سمت رب کائنات کی جلوہ گری محسوس کرتی ہیں۔وہ خدائے الم یزل کی بحر بے کراں عنایتوں سے آشنا ہیں۔عالم ہجراں اور موسم کرب سوز حیات اور گداز جہاں وہ سر سوعشق ربی کی جلوہ سامانیہ دیکھتی ہیں کبھی کبھی یہ کیفیتیں انہیں کرب جہاں سے بھی گزارتی ہیں اور وہ حواس گم قیاس گم کی سی کیفیت میں آجاتی ہیں وہ جانتی ہیں کہ عشق کی پرآشوب وادیوں میں عالم جنوں میں اپنے آپ سے انجان بن جانے کا کرب کتنا جان لیوا ہے اب وہ ہجر کی وحشتیں جو دل کو رنجور کیا کرتی تھیں انہیں بھولتی جارہی ہیں اور دیکھی بھالی صورتیں اب انہیں اجنبی سی لگتی ہیں اس کتاب میں نجمہ کی رجائیت سے بھرپور شاعری بھی موجود ہے۔جو اس دور پرآشوب میں انہیں سکون بخشتی ہے۔حالانکہ زندگی کی رانائی اور توانائی جوان کی حُب کی گواہ تھی۔وہ ایک سوز دروں کے ساتھ دھیمی دھیمی کسک کی صورت موجود ہے۔وہ ہجر کی پر اذیت وحشت میں بھی امید کا دامن تھامے رکھتی ہیں۔شاید ہجر میں اگر سانس چل رہی ہے تو گویا محبت میں کچھ اثر باقی ہے۔وہ اس بے حس احد میں زندہ ہیں۔جہاں اخلاقی اقدار زوال پذیر ہیں۔خلوص اور الفت نایاب ہوچکے ہیں۔ہر انسان اپنی ذات کے خول میں مقید ہے اور خود اسیری کی یہ زندگی کوئی بہت دل رُبا نہیں ہے۔حصارِ ذات نے انسان کو خود فریبوں میں مبتلا کر دیا ہے۔اصول جاناں کی شرط اولین ہے کہ انسان سارے کٹھن راستے طے کر کے اس مقام تک پہنچ جائے جہاں دعویٰ ممکن ہے۔استحقاق جتایا جاسکتا ہے تب اس مقام پر پہنچ کر وہ جان جاتی ہیں۔

''دنیا میں کوئی ہم ہمارا نہیں ملتا۔''

ڈاکٹر نجمہ شاہین کا عشق نہ دیوانہ ہے نہ مجنوں نہ مخبوط الحواس ہے نہ مجذوب بلکہ ان کا عشق تو خوشبو ہے جو پورے جہان کو معطر کر دے۔ وہ من کی دنیا میں سوز و مستی اور جذبہ و شوق رکھتی ہیں۔ انہیں سود و سودا اور فکر و فن کی پروا نہیں وہ اپنے محبّ کی یادیں پل پل اپنے دل میں بسائے صحراؤں کو گلزار کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ لیکن یہی جذبہ ہذمت میں ڈھلتا ہے تو گلزار کو صحرا بنا دیتا ہے وہ صحرا میں بھی اپنی ذات کا بھرقائم رکھتی ہیں۔

عشق کا روگ بھی روگ ہے عجیب سا ہوتا ہے
صحرا کو گلزار بنائے پھرتی ہوں

اس کی آواز اور لہجے کی شبنم اور خال وخد کا دم خم انہیں خشک صحرا میں بھی تنہا نہیں رہنے دیتا۔ اور وہ اک چراغ ہتھیلی پہ جلائے پھرتی ہیں۔

وہ آواز ، وہ لہجہ اسکے خال و خد
کس کی یاد میں من مہکائے پھرتی ہوں

شاہین اس سے روشن میری روح بھی ہے
میں جو ایک چراغ جلائے پھرتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری سے قاری لطف کشید کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کی لطافت سے وقت کے آشوب کو پیچھے چھوڑ دیتی ہیں کبھی اُمید کی شمع جلانا نہیں بھولتیں۔ وہ جذبوں کی پاس دار ہیں اور زندگی کا ولولہ حوصلہ عطا کرتا ہے۔ ان کے فکر تلازمے رجا کی شمع روشن کرتا ہے وہ اپنی ذات کو اجتماعیت میں ڈھالنا بھی خوب جانتی ہیں یوں ذات کا سفر کائنات کا سفر بن جاتا ہے اور وہ اپنے آنگن کو نئے اُجالے بخشتے ہوئے راہوں میں پھول کلیاں بچھانے کا عظیم بھی رکھتی ہیں۔

پھول کھلتے رہیں شاہین ترے آنگن میں
ہم تہی دست بس یہی دعا لائے ہیں

چاہت کا جذبہ اپنے خالص روپ میں ان کی شاعری میں موجزن ہے جہاں غم کی ہلکی آنچ اور امیدوں کے امکانات بھی موجود ہیں۔ وہ شعری احساسات میں وفا کے ارفع موتی پروتی ہوئی دیکھائی دیتی ہیں۔

''جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے ان سے آشوب جاں کے فرائض تو عمدگی سے ادا ہوتے ہیں۔ وہ تربیت جاں اور غم جہاں میں بھٹک جاتے ہیں۔''(۱۱)

چاہت میں دنیا داری نہیں ہوا کرتی جو محبوب کہے وہی سچ لگتا ہے۔ ڈاکٹر نجمہ شاہین بھی گمان جیسے شخص پہ یقین کر بیٹھی ہیں ان کے ہاں غم جاناں اور غم دوراں باہم مل جاتے ہیں۔ اگر غم جاناں اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ تو غم دوراں بھی اپنی آب وتاب برقرار رکھے ہوئے ہے۔ وہ دن تو غم دوراں میں گزار دیتی ہیں۔ مگر شام ہوتے ہی بکھر جاتی ہیں۔

دن تو اپنے غم دوراں میں گزر جاتے ہیں
شام ہوتے ہی ترے غم میں بکھر جاتے ہیں

ان کے ہاں رومان کے رنگ متنوع ہیں۔ جن میں کیفیاتِ قلبی اور واردات دل عاشقی کے تمام رنگوں میں نمایاں کرتے ہیں ان کی شاعری لطف اور خوش گوار جرت کا نام ہے۔ کبھی وہ خواجہ فرید کی پیاسی روحی میں ان کافی کی طرح کُرلاتی پھرتی ہیں۔ وہ کبھی خود پر جبر کر کے عہد حاضر سے خود کو ہم آہنگ کر دیتی ہیں۔ ان کے محسوسات میں مجاز کا جذبہ مستقل ہے۔ وہ دل زدوں کی دل بستگی کا سامان اپنی شاعری کی صورت میں پیش کرتی ہیں ان کے چاہت مکمل اخلاص ہے۔ مصرعوں کا دروبست بھی حسن کے ساتھ اسلوب کی چاشنی لہجہ کی شیریں اور غم کی کسک کے ساتھ رواں دواں ہے۔ وہ غم کی شدت کو کرب محبوب کے مرکزی

تلازمے کے طور پر ابھارتی ہیں۔ کیوں کہ ان کی ہستی محبوب کے بغیر ادھوری بلکہ ناپید ہے۔ مگر دل کشی کا پہلو دیکھئے۔ کہ عالم ہجراں میں بھی ذکر یار سے وہ اپنے اندھرے اُجال دیتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اگر محبت ان کی پنچی نہ ہوتی تو شاید وہ زندگی کو زندگی نہ مانتی اور وہ وحشتِ ہجر کو بھی زیست کی دلکشی قرار دیتی ہیں اور یہ بھی مانتی ہیں کہ ان کی شاعری بھی اس محبت کا پیش خیمہ ہے۔

ڈاکٹر نجمہ کے اسلوب کی سادگی اور بے تکلفی ان کے کلام کا حسن ہے۔ ان کی بحور رواں دواں ہے جس میں خاص آہنگ اور موسیقیت جلوہ گر ہے وہ غم دوراں کو غم جاناں سے بھلانے کی کوشش کرتی ہیں انکے چہرے پہ سجا تبسم انکے ہنر کا گواہ ہے۔ وہ اس شہر آشوب میں بھی بذب محبت سجانے کو ترجیح دیتی ہیں اور غم روزگاہ کو بھلا دینا چاہتی ہیں۔ انکے ہاں معاملہ بندی ہے اور منظر نگاری بھی وصل کے قصے بھی اور ہجر کے فسانے بھی محبت کا فقدان بھی ہے اور ماضی میں اسکی دلکش دست بھی حال کا وجدان بھی ہے اور مستقبل سے اُمیدیں بھی بندھی ہوئی ہیں۔ مگر اسکے باوجود وہ کربت کی باتیں اور مہکی سی راتیں کہاں کھوگئی ہیں کی بازگشت بھی انہیں جینے نہیں دیتی اور کبھی تو وہ محبت کی کھوجی بن جاتی ہیں کہ جن سے محبت روٹھ کر کہیں دور چلی گئی اور ان کے ہاتھ دعا کی صورت بلند ہیں۔ مگر دعا رو رہی ہے۔

''زندگی سے زندگی نہ ملی، مقدر نے کھینچ لیں سانسیں لکیروں میں بکھر گئیں
ساری مناجاتیں، دعا رو رہی ہے۔''(۱۳)

ان کا کلام فکری اور فنی اعتبار سے لائق تحسین ہے اسلوب کا جمال اور نسائی احساسات و خیالات بھی ان کی روحانی حیات کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور کبھی وہ پروین شاکر کی صورت میں وصل جاناں کی آرزو رکھتی ہیں اور کبھی فراز کی طرح حب جاناں میں گم دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی وہ ساحر لدھیانوی کی طرح دل میں نازک خیال لاتی ہیں اور کبھی اختر شیرانی کی محبت کی شیرین میں گھل جاتی ہیں۔ ان کی شاعری میں کبھی شام کی دہلیز پر درد انگڑائیاں لیتے ہیں اور کبھی ان کی تنہائیاں رو دیتی ہیں۔ کبھی ان کے مشکبور راستے خاک بسر

ہوتے ہیں اور کبھی دن کے امکان ڈھونڈ تیرات کی سیائیاں انہیں نگل لیتی ہیں۔ تب وہ اپنی گھائل وفا کا نوحہ ساحل کی صورت سناتی ہیں۔ تب گم گشتہ خوشیاں انہیں رسوائیاں لگتی ہیں ان کی تحریریں ہچکیاں لیتی ہوئیں اور تنویریں بجھی بجھی سی محسوس ہوتی ہیں بے بسی کی اس شام میں وہ پہروں سسکتی ہوئی زندگی پر خوابوں کا مرہم رکھتی ہیں۔ روشنی کی اُمید میں دھواں وصال کی اُمید میں ہجر خوشی کی اُمید میں رنج و غم اسے بخشا گیا۔ تب وہ جان پاتی ہیں کہ جس نے زندگی کے ویرانوں کو گلزار کرنا تھا۔ اور وہی دوست کے روپ میں دشمن اور مسیحا کے روپ میں قاتل نکلا۔ تب وہ جان پاتی ہیں۔ وہ شخص ان کی کہانی کا وہ کردار تھا۔ وہ خود حقیقت اور انہیں داستاں بنا گیا۔

وہ کہانی کا عجب کردار تھا شاہین
وہ حقیقت تھی مجھے ہی داستاں کرتا گیا

نجمہ شاہین کھوسہ کے ہاں جذبہ محبت عقلیم سخن کی جان ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ جدت پسندوں نے اپنی تمام تر کوشش کے باوجود غزل سے رومان کو ختم نہ کر پائے عام طور پر عشق کو جنوں خیز مانا جاتا ہے مگر نجمہ دیوانگی میں بھی فرزانگی رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری لطف کا بحر بے کراں ہے۔ جہاں جذبوں کی پاسداری ایک مثبت اقدام کے طور پر لی جاسکتی ہے۔ اور زندگی نئے ولولے اور جوش و جذبے سے آشنا ہوتی ہے ان کے ہاں نئے فکری تلازمے بھی منفرد ہیں۔ رومان کے سارے رنگ اور کیفیات قلبی ان کی شاعری کو منفرد انداز عطا کرتے ہیں۔ مجاز سے حقیقت تک کے سفر کو وہ باوقار طریقے سے طے کرتی ہیں۔ نجمہ شاہین اپنے محسوسات کو دل نشین قالب میں ڈھالتی ہیں اور قاری ان بے مثال جذبوں میں بہتا چلا جاتا ہے۔ شب ظلمت کی تیرگی میں بھی ان کے حرف کبھی جگنو اور کبھی ستارا بنتے ہیں ان کی آواز اور لہجے کے خدوخال کو نکھارتی سنوارتی اور کسی یاد کے حوالے سے مہکائے پھرتی ہیں اور اپنے جذبوں سے صحرا کو گلزار کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہیں کسی یاد کے جگنو کو اپنی ہتھیلیوں پہ دعا کی صورت میں جلائے رکھنا بھی ان کا حوصلہ ہے۔ وہ اپنے عہد کے آشوب کو اُمید کی شمعوں

سے روشن رکھتی ہیں ۔ وہ اپنے آنگن کو پھول کلیوں سے مہکاتی ہیں اور اسی مہک سے وہ اپنے پورے اطراف کو خوشبو عطا کرنا چاہتی ہیں ۔ وہ اُمید کے نئے امکانات کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہیں ۔ وہ غم دوراں ہو یا غم جاناں ہو ان کی اُمید افرینی سے دونوں منور ہیں ان کی شاعری میں قنوطیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کے برعکس رجائیت کو اہمیت دیتی ہیں ۔ ان کے ہاں جذبے جرم نہیں بلکہ پاکیزہ اور مقدس ہیں اور وہ ان کی حرمت اور تقدیس پہ خود کو وار دیتی ہیں ۔ کبھی وہ اپنی اس حب سے غم دوراں کو ٹالتی ہیں اور کبھی آس کے جگنو جلا کر غم جاناں کا علاج کرتی ہیں ۔ وہ سمجھتی ہیں زندگی سے نبرد آزما ہونا بھی بہت معتبر ہے ۔ ان کے ہاں مومن کی سی معاملہ بندی بھی موجود ہے ۔ اور میر کا سُلگاؤ بھی ۔ وہ غالب کی طرح فکری مسائل حل نہیں کرتی بلکہ وہ اپنی تلاش کے لئے چاہت کا دیا لے کر اندر بلکہ بہت اندر کا طفر طے کرتی ہیں ۔ نسائی احساسات و خیالات جذبوں کی حدت اور طلب کی شدت ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں ۔ وہ نئے امکانات کی شاعرہ ہیں ۔ اور اپنے بہتر ادبی مستقبل کی بشارتیں اپنے ہاتھ سے لکھ رہی ہیں ۔ کبھی وہ شام کی دہلیز پر بیٹھ کر درد کی انگڑائیاں محسوس کرتی ہیں ۔ اور کبھی وہ تنہائیوں کے غم سمیٹ کر خاک رستوں پہ پھول بچھاتی خوشبو بانٹتی نئی رعنائیوں کے خواب بانٹتی آگے بڑھ جاتی ہیں ۔ ان کی گھائل کی بے توقیری پر خنک محسوس ہوتی ہیں ۔ ان کی ہچکیاں مٹی میں ملی عزت نفس کے لئے تنویریں ڈھونڈتی ہیں ۔ وہ جس سے روشنیوں کی آرزو رکھتی ہیں ۔ وہ رنج و ملال دے کر رخصت ہو جاتا ہے ۔ انہیں گمان تھا کہ دل حزیں کو پاسباں مل ہی جائے گا مگر ان کے حصے میں بدگمانیاں ہی آئیں اور وہ کام جو دشمنوں کو زیب دیتا تھا وہ ایک مہرباں کے ہاتھوں ہو گیا ۔

3۔ اور شام ٹھہر گئی

نجمہ شاہین کھوسہ کا تیسرا شعری مجموعہ ہے ۔ جس میں حمد ،نعت ،سلام غزلیات اور نظموں ،گیتوں پر مشتمل گل ہائے رنگا رنگ کا یہ پورا باغیچہ سجا ہے ۔ یہ مجموعہ حمد ،نعت ،سلام کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے ۔ نجمہ شاہین کھوسہ کے شاعرانہ رنگ اور موسیقیت

بھرے آہنگ یہاں ذات باری کی طرف رخ موڑ رہے ہیں ۔ ان کی شاعری لباس مجاز چھوڑ کر حقیقت کے رنگوں میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے ۔ یہ ان کا ارتقائی سفر ہے اور اس سفر کی جانب پرواز بہت بلند ہے ۔ حمد میں وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے حضور عجز کے موتی نچھاور کرتی ہیں ۔ نعت میں ان کی حُب ،حُبِ نبویؐ بن جاتی ہیں ۔ اور پھر وہ عقیدت بھرا سلام پیش کر دیتی ہیں ۔ اس مجموعے میں :

1۔	حمد	1عدد
2۔	نعت	1عدد
3۔	سلام	1عدد
4۔	گیت	2عدد
5۔	نیثری	5عدد
6۔	نظمیں	21عدد

اس کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے بیٹوں اور والدین کے نام کیا ہے ۔ کتاب کا پیش لفظ ''کچھ سوچیں کچھ باتیں آپ سے'' کے عنوان سے انہوں نے خود تحریر کیا ہے جبکہ بشریٰ رحمٰن نے ''رنگ حنائی''، ''غنائی رنگ'' کے عنوان سے ان کے بارے میں خوبصورت رائے دی ہے ۔ وہ ان کے کار مسیحائی اور رنگ غنائی کے حوالے سے خوبصورت حروف تراشی ہیں ۔ ان کے تاثرات اور تجزیاتی مطالعے نے کتاب کو حُسن بخشا ہے جبکہ نجمہ شاہین کھوسہ کے نظریہ سن پر امجد اسلام امجد نے ''اور شام ٹھہر گئی'' کی مناسبت سے قیمتی رائے دی ہے ۔ لاہور کے ایک بڑے ادارے سنگ میل پبلی کیشنز 2013ء نے اس کتاب کو چھاپا اور ترسیل کی ۔ اور شام ٹھہر گئی 172ء صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب میں ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا ذہنی سفر ارتقاء پذیر ہے ۔ وہ اپنے اشعار کی صورت ادب دھرتی پر اپنا منفرد تعارف رقم کراتی ہیں ۔ اور شام ٹھہر گئی کے موضوعات محبت ،ہجر و فراق و وصال کی خواہش ، دیہاتی زندگی سے عقیدت ،غم دوراں کی تڑپ وغیرہ موضوعات ہیں ۔ نجمہ شاہین کھوسہ ''اور

شام ٹھہر گئی'' کے بارے میں خود لکھتی ہیں۔

''پھول سے بچھڑی خوشبو اور میں آنکھیں بند رکھتی ہوں کہ بعد سوچا تھا کہ شاید سفر کٹ گیا ہے مگر یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ تنہائیوں، محرومیوں، محبتوں اور جدائیوں کے دکھ کہیں انت ہی نہیں ٹھہرتا ان کا۔ ایسی رفاقتیں جو اداسی، ہجر، خاموشی، اضطراب، امید، یاس، دکھ، سکھ، ہنسی، آنسو، آرزو، خلش اور کسک بانٹتی ہیں جو دل کی دنیا کو غم کے اندھیروں کے باوجود روشن و منور کرتی ہیں۔'' (۱۵)

4۔ پھول، خوشبو اور تارہ

پھولوں کی طرح مہکتی تاروں کی طرف دمکتی اور خوشبو کی طرح مہکتی نجمہ شاہین کھوسہ کی کتاب ''پھول، خوشبو اور تارہ'' الحمد پبلی کیشنز نے 2016ء میں شائع کی اس کا انتساب حیران کن ہے۔ درد کے پیکر میں ڈھلتی ہوئی یہ شاعرہ اپنے اور غیروں کے ان زخموں کے نام اپنی شاعری کرتی ہیں۔ جو انہیں جلا بخشتے ہیں اور قلم کی اس سیاہی کے نام وہ انتساب کرتی ہیں کہ لفظوں کی صورت کاغذ پر اترتی اور ساتھ ہی اس واحد لاشریک ہستی کے نام اپنے حروف کرتی ہیں۔ جس کا عشق سچا اور کھرا عشق ہے۔ ان کا یہ شعری اثاثہ 159 غزلیات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی سوچ کے سفر کے حوالے سے خود لکھتی ہیں۔

''سفر تو اتنا سا تھا کہ جو پھول سے بچھڑی خوشبو نے ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک کرنا تھا۔ ایک فرق روپ کا روح سے اور ایک خیال مکاں سے لامکاں تک کا۔ ہوا جو سب کے وجود کے لئے سانس ہے، آسودگی ہے زندگی ہے مگر پھول سے خوشبو کی جدائی کا سبب بھی یہی ہے، خوشبو جو پھول سے بچھڑی تو اُسی ہوا کے سنگ دور تک اُڑتی اپنے وجود سے بے خبر، اپنے نشان اپنی منزل سے دور ایسے مقام تک جا پہنچی کہاں

اسے اپنی آنکھیں بند رکھنی تھیں کیونکہ اگر وہ آنکھیں کھولتی تو زمانے کی تمام بدصورتیاں اس کے سامنے آتیں جن کو دیکھنے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بدصورتیاں چاہے شب کے اندھیروں میں پلتیں یا دن کے اُجالوں میں سخت کڑکتی، جلتی دھوپ میں آنکھوں کو چندھیاتیں سو وہ اس مقام پر ٹھہر گئی جہاں ایک شام اسکے تمام دکھ سکھ اپنی گٹھڑی میں لپیٹے اس کیلئے رکی ہوئی تھی جہاں اس کی منزل، اس کا نشاں، اس کا وجود ٹھہرا تھا۔ ایک ایسی شام جو بے عمیق گہرائیوں میں ڈھل کے بھی رات نہ بن سکتی کہ وہ رات بنتی تو اسکا انت سحر ہوتی۔ مگر سحر بچھڑنے والوں کے نصب میں کہاں۔'' (۱۶)

ڈاکٹر نجمہ شاہین اس شام کا نوحہ کہتے نہیں تھکتی جس کا نصیب علم ٹھہرا۔ یہ شام شب نہ بن سکتی کہ شب تاریک بنتی تو آخر کار سحر ہوتی مگر وہ شام کہیں منجمد ہو گئیں۔ ان پر اس سفر میں یہ انکشاف ہوا کہ خوشبو اور پھول لازم و ملزوم ہیں اور پھول کی عمر جاویداں نہیں ہوتی۔ خوشبو بھی ہمیشہ کے لئے نہیں ٹھہرتی۔ چاند کا سفر بھی جاری و ساری رہتا ہے اور تارے بھی دمک دمک کر تھک جاتے ہیں۔ وہ لفظوں کو تاروں کی جھلملاہٹ دیتی ہیں۔ چاند کی ضیاء بخشتی ہیں اور پھولوں کو معطر بناتی ہیں۔ وہ اپنے سفر کی رائیگانی پہ بہت افسردہ نہیں۔ ان کی روح بھی ملال سے بھری ہوئی ہے۔ جس کی تلاش تلاش رہی۔ اس کے لئے وہ بڑے استعارے تخلیق کرتی ہیں۔ عمر کی رائیگانی اور لاحاصلی وقت کی لپٹی لپٹی زندگی کے جھمیلوں میں ان کے ساتھ رواں دواں ہے۔ وہ زندہ ہیں اس لئے کہ وہ سوچتی ہیں۔ وہ سوچتی ہیں۔ اس لئے وہ زندہ ہیں۔ وہ اپنے خلوص کا نظرانہ لئے منزلیں مارتی ہوئی سفر در سفر جب پہنچتی ہیں تو آگے سراب ان کا منتظر ہے۔ وہ خود کہتی ہیں۔

''اپنے لامتناہی دائروں میں گردش کرتی اپنے خوابوں کی روح کی پاکیزگی میں جا کے ڈھونڈے یا زمانے کی طرح نظر آنے والے کسی مجسم روپ کو ہی اپنا محور بنائے بہر حال خیالات کا دیوتا تو بنانا ہوتا ہے کہ جینے

کے لئے خیال ضروری ہے ۔ یہ خیالات کا دیوتا بھی کس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ اپنے پیچھے پوجنے والوں کو ساری زندگی یوں لگائے رکھتا ہے کہ جیسے اس کی اجازت کے بغیر ایک سانس لینا بھی گناہ ہو اور کتنی عجیب سی بات ہے کہ جب پجاری اس کے عادی ہو کر اسے پوجتے پوجتے مٹی سے دیوتا اور دیوتا سے معبد بنا لیتے ہیں تو ایکدم سے سارا منظر ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔''(۱۷)

نجمہ شاہین کی شاعری روح کی تار کو چھیڑنے والی شاعری ہے ۔ پھول اور خوشبو جیسی تازگی اور چاند اور تاروں جیسی دلکشی ان کی شاعری میں موجود ہے ۔ وہ دو مصرعوں میں ایک جہاں مانی کھول کے رکھ دیتی ہیں ۔ نجمہ شاہین کھوسہ اپنی شاعری کالم اُٹھائے اپنی ذات کا لوہا منوانے کے لئے تگ و دو کرتی نظر آتی ہیں ۔ کتاب کا باقاعدہ آغاز ''حمد'' سے ہوتا ہے اور یہاں وہ اپنے وسیب سرائیکی لہجے کا رس گھولتی دکھائی دیتی ہیں وہ اردو کا لفظ ''سائیں'' سرائیکی کے مروج لفظ ''سئیں'' کی صورت بیان کرتی ہیں ۔ اور دہائی دیتی ہیں کہ میری اُجڑی لمبی راتوں کو کب منزل نصیب ہو گی اور کب میرے حالات میرے عشق مسلک کو کوئی نوید سنائیں گے ۔ وہ اپنے رب سے ہم کلام ہو کر کہتی ہیں ۔

مری اُجڑی لمبی رات سئیں
کب بدلیں گے حالات سئیں

مرا عشق ہی مذہب مسلک ہے
اور عشق ہے تیری ذات سئیں

مجھے اپنا پتہ درکار ہے اب
بس اتنی سی خیرات سئیں

مرشد میں تیری منگتی ہوں
مری تجھ سے ہی بس بات سئیں

میں تیرے در پر حاضر ہوں
لئے آنکھوں میں برسات سئیں

ہر بات تری میں مانتی ہوں
لیکن میری اک بات سئیں

مجھے اپنی خطائیں یاد آئیں
مجھے خود سے ہوئی ہے مات سئیں

کبھی گیتوں میں تبدیل تو ہوں
مرے درد بھرے نغمات سئیں

سئیں کا استعارہ نجمہ کی شاعری میں ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ وہ وادی شعر و سخن میں پابجوں لاں سفر کرنے والی اپنی چشم تر لئے صحرا ہجر عبور کرتی ہے ۔ جس کی تپش انہیں جینے نہیں دیتی اور ان کی تشنہ آرزوئیں بے مہر زمان سے زخمی ہیں ۔ سناٹا ان کی روح میں در آتا ہے اور کبھی کبھار تو وہ اپنے آپ سے بھی ڈر جاتی ہیں ۔ لیکن درد کے ان لمحوں میں بھی وہ خود کو ثمر یاب سمجھتی ہیں کہ دکھ بھی اس کی طرف سے ملے جو جان سے عزیز تھا تب وہ اپنے عجز کو شان کبریائی سے جوڑ دیتی ہیں اور ان کی نگاہیں منتظر رہتی ہیں اور وہ باوضو ہو کر رات دن جستجو کرتی ہیں اور چاہتی ہیں جو سب پہ نیاں ہے وہ اُن پر عیاں ہو جائے ۔

نعتیہ اشعار بھی منفرد اسلوب رکھتے ہیں ۔ جن میں وہ پھر سے سرفرازی چاہتی

ہیں۔ جو انہیں مقام مجاز تک لے جائے وہ دہائی دیتی ہیں کہ پیارے ہمیں دشمنوں نے چار سو گھیر لیا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ نبی آخر الزماں ﷺ انہیں ملت بیضا غازی لٹا دیں۔ وہ اُمرا کی عیش وعشرت سے شاکی ہیں وہ غریبوں کی کارسازی کے لئے دعا گو ہیں اور اب وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان ملت کی بھلائی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔

درودوں کا ثمر ہے نعمتوں کا سلسلہ شاہین
سدا حاصل رہے یہ دلنوازی یا رسول اللہؐ

وہ حب اللہ اور عشق رسولؐ سے سرفراز ہو کر شہداء کو سلام پیش کرتی ہیں اور امام علی مقام کے حضور سر جھکاتی ہیں۔ انہوں نیزوں پر چڑھ کر سروں کی وہ تلاوتیں یاد ہیں۔ کہ جب اسلام کی سربلندی کیلئے انہوں نے بے مثال قربانی دی۔ تب وہ منظر نگاری میں کمال کر دیتی ہیں۔ انہیں نوک سناں پہ کربلا کا سفر یاد آتا ہے۔ جب بے نیام تیغ اور دہکتے انگاروں جیسی دھوپ مسافران حق کے لئے آزمائش کا سامان مہیا کر رہی ہے۔ چشم فلک بھی حیران ہے وہ قیامت کی اس شام کا نوحہ لوح دوام پر محفوظ ہوتا دیکھتی ہیں اور شہیدوں کے نام کتاب دل پہ محفوظ پاتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ خدا نے جن کی تطہیر ہمیشہ کے لئے جاری و ساری رکھی۔ ان کی شان میں وہ سلام پیش کرتی ہیں۔ یہ ان کے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں ۔ آگے چل کر وہ آسمان بے مروت سے بھی عرض گزار ہیں کہ ان کے دل کے مکیں ان کے مہرباں انہیں میسر ہوں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ہجر کے صحرا میں صفر کرتے ہوئے ان کی تمام نشانیاں کہیں کھو گئی ہیں اور غم شب کی تیرگی عمر بھر کے لئے ان کی ہم نشین ہو گئی ہے۔ تب وہ تڑپ کر کہتی ہیں کہ جو ستارہ ان سے چھین گیا ہے اس کی روشنی ہی انہیں مل جائے۔ اگر چہ وہ جانتی ہیں کہ ان کا چارہ ساز سنگ دل ہے۔ بے وفا ہے۔ مگر پھر بھی انہیں عزیز تر ہے۔

مجھے جس کی اب بھی ہے جستجو، پڑھوں رات دن اسے باوضو
مری آنکھ سے جو نہاں ہے اب، مجھے رازداں تو ملے وہی

تری کبریائی سے ہے جڑا، مرے عجز کا جو جہاں ہے
پڑے اک نگاہ تری اگر، مجھے کہکشاں تو ملے وہی

نہ وہ دشت ہے، نہ چناب ہے، نہ میں کوئی سسی، نہ ہیر ہوں
مجھے عشق نے کیا بے نشاں، مجھے داستاں تو ملے وہی

’’غزل کے مزاج کا اہم ترین عنصر داخلیت ہے۔ غزل ان تاثرات کیفیات اور جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جس کا براہ راست تعلق دل کی دھڑکنوں سے ہوتا ہے۔ اگر چہ تحریک خارجی دنیا سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ مگر شاعر تحریک کی بجائے اثر کو قبول کرتا ہے۔‘‘(۲۱)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی غزل یقین و گمان کے بیچ و بیچ سلسلہ دراز رکھتی ہے یہ سب سلسلے عشق سے جا کے ملتے ہیں۔ انہیں راستوں میں اُڑتی خاک اور شل وجود تھکاتا نہیں بلکہ منزل کی جستجو میں وہ محو سفر رہتی ہیں۔ وہ غزل کی زلفیں سنوارتی ہوئی جذباتیت کا آئینہ دکھاتی ہیں تب ان کا دل اور دھڑکن ایک تال پہ رقص کرتے ہیں۔ وہ جذبوں کی تحریک کا اثر اپنے دل میں قبول کرتی ہیں اس ضمن میں عطش درانی کی رائے بہت محترم ہے۔

’’غزل لفظ اور معنی کا حسین ولطیف امتزاج ہے اس میں جذبے کی سچائی، نغمگی موسیقیت اس کے اعلیٰ ہونے کا ثبوت ہوتی ہے۔ اس کا ہر شعر ترشا نگینہ ہوتا ہے۔‘‘(۲۲)

نجمہ شاہین کا وجود مجاز میں پگھل گیا اور روح حقیقت میں سلگتی رہی مگر وہ چراغ جاں کا شعلہ بجھنے نہیں دیتی وہ غزلوں کی نغمگی اور سروں سے آراستہ نظمیں کہتی ہوئی یقین کے سرحد پر کھڑی ہیں۔ دہشت گردی سے متاثر ہو کر نظم لکھتی ہیں میں کیسے پرسہ دوں یقیناً ثانیہ پشاور پہ یہ ایک احساس تحریر ہے۔ کبھی کبھی وہ بے ساختہ سوال کرتی ہیں کہ آخر مجھے ہی کیوں غموں سے ملنا ہے۔ وہ اپنے خیال کے کینوس پر فکر کے رنگوں سے وادی شعر وسخن میں

کئی گل بوٹے سجاتی ہیں مگر ان کا یہ سفر کانٹوں بھرا ہے۔ مگر وہ اپنے عزم صمیم سے اُمید کے دیپ جلاتی ہیں۔ کبھی کبھار تو غم جاں سے غم جہاں تک اپنی رائیگاہ مسافتوں کا حساب طلب کرتی ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان کے اندر کی ممتا انہیں دعا پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر چہ وہ حالات کا نوحہ بھی پیش کرتی ہیں جہاں بستی میں نہ کوئی مکیں سلامت ہے نہ کوئی مکاں سلامت۔ اس میں ان کو اپنی ذات کا دکھ بھی ستاتا ہے انہیں دکھ ہے کہ روشنی ان کی گرفت سے نکل چکی ہے جس کی کوئی نشانی بھی نہیں بچی۔ مگر ان کے دل پر ہجر کا نشاں تا حال سلامت ہے۔ وہ اپنے مہرباں کے عطا کردہ دکھوں کے مرثیے نہیں لکھتی بلکہ ان زخموں کو پھول سمجھ لیتی ہیں۔ تب یہ اداسیاں بے سبب لگتی ہیں۔ اور روگ سہتی کے شناور محسوس ہوتے ہیں۔ یہ ایک عورت ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ دکھوں کے پروردگار اس عہد میں ہر دکھ دینے والے کو دعا دینے کا ظفر رکھتی ہیں۔ اگر چہ ان کا دل جذبے اور عشق سے اُجڑ گیا ہے مٹ گیا ہے۔ مگر وہ کمین گاہوں میں رہنے والے راہزنوں کو دعا دیتی ہیں کیونکہ ابھی ان کا گماں سلامت ہے۔

میں اشک آنکھوں کے پی رہی ہوں، میں وار سہہ سہہ کے جی رہی ہوں
دعا کرو بس رہے ابد تک ، مری یہ آہ و فغاں سلامت

ابھی تو زندہ ہیں ہم جہاں میں ، ابھی کہانی نہیں بچے گی
تمام کردار جب مریں گے، رہے گی پھر داستاں سلامت

ڈاکٹر نجمہ شاہین کی شاعری میں سراپا نگاری نہیں ملتی ایمیجز بھی سامنے نہیں لائے جاتے۔ وہ صرف اپنے چاہنے والے کو جذبوں کی روشنی سے دیکھتی ہیں۔ اور جذبوں کا تیار کردہ یہ ڈرافٹ انہیں مرہم سے کم نہیں لگتا۔

''بیسویں صدی کی ابتدا میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حیات و کائنات کے مسائل کا بیان قبولیت عام کی سند حاصل کرے گا۔ یا ادب نسلوں تک زندہ رہے گا۔ زندہ ادب وہ ہے جسے قارئین کے کم از کم ایسے حلقے میسر

ہوں جو اسے بار بار پڑھیں اور ہر بار اپنے دل کے قریب پائیں۔''(۲۴)

لیکن ڈیرہ غازی خان جیسے قبائلی روایات کے امین علاقے میں جنم لینے والی اس شاعرہ نے قبولیت عام کی سند حاصل کر لی۔ اور نوعمر بچے بچیاں ان کے کلام سے لطف کشیدہ کرتے ہیں۔ سنجیدہ پڑھنے والے بھی اس شیرینی سے محروم نہیں رہتے۔ وہ غزل اور نظم میں یکساں مہارت رکھتی ہیں۔ ان کی روح میں محبت کہیں اٹک گئی ہے تبھی تو وہ کہہ اُٹھتی ہیں۔ ''عجیب ہوتی ہے یہ محبت'' انہیں یقین ہے کہ یہ نصیب والوں کے دل میں جاگتی ہے کبھی جھومتی گاتی ناچتی پھیلتی چلی جاتی ہے اور کبھی اُجاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ اس کے وعدے اس کی قسمتیں دھنک رنگ ہیں کبھی یہ پیڑ کی چھاؤں بن جاتے ہیں اور کبھی بہتی ندیاں اور جھرنے اور نگاہ کی دھوپ روپ کو چمکا دیتی ہے۔ وہ ایک مختلف بات بھی کہتی ہیں کہ کبھی کبھی محبت بھی رقیب بن جاتی ہے۔

کبھی کبھی تو بس آپ اپنی رقیب ہوتی ہے یہ محبت
عجیب ہوتی ہے یہ محبت
لہو کی صورت رگوں میں دوڑے
یہ خواب بن کر نظر میں ٹھہرے
سحاب بن کر فلک سے برسے
اسے جو دریا میں ڈال آؤ تو اک سمندر کا روپ دھارے
کہیں جو دیوار میں بھی چُن دو تو ہر کلی میں ہو عکس اس کا
ہر اک گلی میں ہو رقص اس کا
حبیب ہوتی ہے یہ محبت
عجیب ہوتی ہے یہ محبت
کسی کسی کو

کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے یہ محبت

نظم کا لفظ مختلف ادوار میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے دراصل تمام اصناف شاعری کے زمرے میں آتی ہیں نظم کی سب سے بڑی خوبی موضوع اور ہئیت کی آزادی ہے نظم فرد کی انفرادیت کی عکاس ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں۔

''نظم فرد کے ذہنی اور احساسی سفر کی داستان ہے۔''(۲۶)

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ استعارے، کنائے تشبیہات اور تلمیحات کے استعمال کا فن بخوبی جانتی ہیں،ان کی اکثر کتابوں کے نام بھی استعاراتی ہیں۔وہ اپنے مدعا،اپنی بات اور اپنے اظہار کے لئے استعاروں کا استعمال کر کے کمال مہارت کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ جاتی ہیں۔

چلتے چلتے وصل اچانک ہجر کی شام میں ڈھل جاتا ہے
تم کیا جانو کیا ہوتا ہے بات سے نکلی بات کا دکھ

بعض اوقات ہماری زندگی میں ہمارے معاشرے یا اپنوں کی طرف سے اس طرح کے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ ہم ہر جگہ خود کو محبوس تصور کرتے ہیں ہماری شخصی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔سانسوں تک پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ہم اپنے خیر خواہوں کے بیچ بھی خوف اور گھٹن کی زندگی جیتے ہیں۔اس طرح کے کرب کا اظہار ایک شاعرہ ایک عورت کتنی خوبصورتی کے ساتھ کر سکتی ہوگی جس کا زادِ سفر بہتے اشک اور آہیں ہوں۔

دشت میں زادِ سفر اتنا ہی تھا میرے لئے
اشک تھے اور ساتھ تھا بس، میری آہوں کا حصار

کیا کریں ہم کو تو پڑھنے ہی نہیں دیتا کہیں
گم شدہ منزل اور کچھ الجھی راہوں کا حصار

سانس لینے سے بھی اکثر روک دیتے ہیں ہمیں
جان لیوا ہو چلا ہے خیر خواہوں کا حصار

کہتے ہیں اگر انسان اندر سے خوشگوار اور پر مسرت ہوتا ہے تو انسان باہر سے بھی خوشگوار اور پر مسرت نظر آتا ہے۔ ہر طرف رنگینی اور رعنائی نظر آتی ہے اور دیکھنے والے بھی با آسانی ہماری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔اس کے برعکس اگر انسان یاس و غم کی کیفیت میں ہو تو اس کے معنی اور ناخوشگوار اثرات بھی نظر آتے ہیں۔جب انسان دکھوں اور مصائب میں گرا ہو تو آنکھوں میں ہزاروں سوالات کے ساتھ چہرے پر مایوسی،شب کے اندھیرے کی طرح پھیل جاتی ہے۔اور چشم تر کو ہر سمت پیاس کا صحرا دکھائی دیتا ہے۔

میرے عارض جس سے دمکے تھے کبھی
ایک دن وہ آواز بھی مر گئی

ہر طرف اک پیاس کا صحرا تھا بس
جس طرح بھی میری چشم تر گئی

افسوس مجھ کو اس نے اتارا ہے گور میں
جس کیلئے فلک سے اتاری گئی ہوں میں

پروفیسر بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے فن اور اخلاقی جرات کو سلام کرتے ہوئے ان کی کتاب ''پھول،خوشبو اور تارہ'' کے دیباچے میں لکھتے ہوئے کہتی ہیں۔

''مجھے نجمہ شاہین کھوسہ کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی اُداسی دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا مگر ''پھول،خوشبو اور تارہ'' کے مسودے کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے اس پر عورت اور عورت کا گمان گزرتا رہا ہے۔یعنی کہ عورت کا عورت سے مکالمہ! عورت بھی وہ جو ڈاکٹر ہے، ماں ہے،فرمان بیٹی اور

بیوی ہے،مگراس کی ذات کے کچھ حصے شاید ان تمام حیثیتوں کے درمیان
ان بوجھےاوران کہے رہ گئے ہیں۔‘‘(۳۱)

حوالہ جات وحواشی

1۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر،’’پھول سے بچھڑی خوشبو‘ کچھ باتیں کچھ سوچیں(دیباچہ) ص:10
2۔ ایضاً ص:11
3۔ ایضاً ص:18 تا21
4۔ ایضاً ص:23
5۔ منور احمد کنڈے،معروف شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین اور ان کی تصنیف دوم،(غیر مطبوعہ مضمون)،ص:1
6۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر’’میں آنکھیں بند رکھتی ہوں‘‘ص:18
7۔ ایضاً ص:111
8۔ ایضاً ص:110
9۔ ایضاً ص:111
10۔ ایضاً ص:113
11۔ خواجہ محمد زکریا ڈاکٹر’’چند اہم جدید شاعر‘‘ مثال پبلشر فیصل آباد 2020ء، ص:127
12۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر’’میں آنکھیں بند رکھتی ہوں‘‘ص:202
13۔ ایضاً ص:282
14۔ ایضاً ص:197
15۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر،’’اور شام ٹھہر گئی‘‘،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،ص:11
16۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر’’پھول خوشبو اور تارہ‘‘ص:11

17۔ ایضاً ص:13
18۔ ایضاً ص:15 تا16
19۔ ایضاً ص:18
20۔ ایضاً ص:22
21۔ صدف نقوی ڈاکٹر’’گوہرادب‘‘ (اصناف نظم ونثر کا مفصل جائزہ) مثال پبلشر 2014ء ص:161
22۔ ایضاً ص:161
23۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ’’پھول،خوشبواورتارہ‘‘،ص:24
24۔ محمد زکریا خواجہ ڈاکٹر’’چنداہم جدید شاعر‘‘مثال پبلشر 2020ء،ص:156
25۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر’’پھول خوشبواورتارہ‘‘،ص:26
26۔ صدف نقوی ڈاکٹر’’گوہرادب‘‘ (اصناف نظم ونثر کا مفصل جائزہ) مثال پبلشر 2014ء،ص:176
27۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر’’پھول خوشبواورتارہ‘‘ص:28
28۔ ایضاً ص:29
29۔ ایضاً ص:27
30۔ ایضاً ص:121
31۔ بشریٰ اعجاز،’’عورت اورعورت ہے‘‘مشمولہ،’’پھول،خوشبواورتارہ‘‘،ص:160

چوتھا باب

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کے کلام میں صوفیانہ رنگ

وفا اور جفا کی نغمے گانے والی نجمہ شاہین کھوسہ کومل جذبوں اور لطیف احساسات کی ترجمانی کرتے کرتے اچانک پھولوں،تتلیوں،رنگوں،رشنیوں کے اس جہان سے کنارہ کش ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔اب وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی’’حمد وثناء‘‘میں مھود کھائی دیتی ہیں۔ان کی نظر جہاںؔ جہاں جاتی ہے وہاں وہاں ذات حق کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ہر جگہ ہر نگر اور سوجلوہ حق انہیں محسوس ہوتا ہے۔انہیں کوبکو اور چار سو چمن چمن اور دمن دمن اللہ ہو کی صدائیں سنائی دیتی ہیں کہیں وہ حضرت بلال حبشیؓ کے عشق ربی کے ترانے اپنے دل میں بجتے ہوئے محسوس کرتی ہیں اور کبھی پالن ہار کی تشکر گزار ہو جاتی ہیں وہ ہی ہے جو زندگی کو آگے بڑھا رہا ہے۔اس کی رونقوں اور رنگوں کا مرکز ومہور ہے۔انہیں زندگی کی تمام گلفشانیوں میں اور اپنے سکھ چین کی زندگی میں خدا کا کرم محسوس ہوتا ہے،وہ بحر و بر اور موجودات حیات میں پروردگار کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتی ہیں۔

جہاں جہاں گئی نظر، وہاں وہاں ملا ہے تو
ہر اک جگہ، ہر اک نگر، جو دیکھئے خدا ہے تو

ہیں رنگ و نور چار سو ترا وجود کوبکو
چمن چمن دمن جمن جمال دلربا ہے تو

کہیں ہے تو بلالؓ میں، کہیں کسی جمال میں
نہ ہو کسی کا گر کوئی اسے بھی پالتا ہے تو

یہ زندگی کی رونقیں ترے ہی دم سے گل فشاں
مرا نصیب ہے بلند ، میرا آشنا ہے تو

ہر اِک بحروبر میں تو ، وجودِ خیر شر میں تو
ہر ایک سمت جلوہ گر جہاں میں اے خدا ہے تو

ذات حق سے حُب کا دم بھرنے والی نجمہ شاہین کھوسہ عقیدت محمدؐ سے بھی سرشار ہیں اس لئے وہ بے ساختہ پکار اُٹھتی ہیں۔

مدینے کو جاؤں مدینے کو جاؤں

وہ مدینے میں جا کر عقیدت کی ساری رسمیں نبھانا چاہتی ہیں اور جی بھر کر اپنا حال دل آنسو کے نظرانے کی صورت پیش کر دینا چاہتی ہیں۔ان کا دل وفورِ عقیدت سے بھر جاتا ہے۔اور وہ آگے بڑھ کر مقدس جالیوں کو چھونا اور آنکھوں سے لگانا چاہتی ہیں۔ان کے دل میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔وہ اپنے رب کے حضور محبوب رب کے در پر سربسجود ہونا چاہتی ہیں۔اپنی وفائیں اور اپنی عقیدتیں نثار کرنے کی آرزو رکھتی ہیں۔اور اپنی تشنگیوں کی سرابی اُسی در سے چاہتی ہیں وہ روزہ رسولؐ کے جلوے دیکھنا چاہتی ہیں اور اپنی چشم تخیل سے یہ نورانی محفل سجانا چاہتی ہیں۔اب ان کا ذکر اور ان کی فکر ان کا دین ان کے راستے اور ان کی منزل سبھی ذات حق اور مدینے کی گلیوں میں نسدق ہونے کو تیار ہے۔اور خواہش رکھتی ہیں کہ جب وہ وقت آخر الوداعی سلام پیش کریں تو اپنی روح کو وہیں چھوڑ آئیں۔کیونکہ انہیں ادب کے تقاضے کا اس سے بڑا سلیقہ نہیں آتا۔

مدینے کو جاؤں ، مدینے کو جاؤں
عقیدت کی ساری رسمیں نبھاؤں

میں جب بھر کے روؤں ، میں آنسو پروؤں
میں حال اپنا رو رو کے اُنؐ کو سناؤں

میں بڑھ بڑھ کے چوموں جو روضے کی جالی
یہ پلکیں جو بھیگی ہیں اُس پر لگاؤں

میں سجدے کروں گی ، نمازیں پڑھوں گی
اُنہی کو میں اپنی وفائیں دکھاؤں

مرے سامنے بس ہوں روضے کے جلوے
اُنہی کے تصور کی محفل سجاؤں

مری فکر بھی مرا دین و دھرم بھی
اُنہی کی محبت کو منزل بناؤں

مدینے میں آئے مجھے وقت آخر
کہ میں روح کو اپنی واں چھوڑ آؤں

ہے شاہین نعت نبیؐ ان لبوں پر
تقاضے ادب کے میں کیسے نبھاؤں

عقیدت اور محبت سے لبریز نجمہ شاہین کھوسہ اپنے رب کے حضور جب دست بہ دعا ہوتی ہیں۔تو اس پاک ذات کے احساسات اور نعمتوں کا شکر بجالاتی ہیں اور اپنی

لغزشوں کے اعتراف اور درگزر کی آرزومند بھی ہے وہ اُسی ذات سے ہیں۔اور زندگی کی آسانیاں اور وقت کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ کی آرزومند بھی اسی ذات کے آگے ہیں۔وہ چاہتی ہیں کہ زندگی جب ان پر مہربان نہ رہے تو ایک مہربان سایہ انہیں اپنی آغوش میں لے لے۔اور کرم کی بارش ہوجائے۔

اے خدا تو محتسب ہے مجھ پہ اک احسان کر
بھول کر لغزش مری یہ زندگی آسان کر

وقت کی اس دھوپ میں جلتے ہیں مرے جسم وجان
چلچلاتے موسموں میں اپنا سایہ مہربان کر

نجمہ شاہین کھوسہ اپنی حیات مثال آئینہ رب کے حضور پیش کر دیتی ہیں اور اپنی ناآسودہ آرزوؤں کو بھی بڑے سلیقے سے رب دو جہاں کے سامنے رکھ دیتی ہیں کیونکہ وجانتی ہیں کہ زندگی فانی ہے۔جس نے فنا ہو جانا ہے۔اُس کی پرستش کی جگہ اُس کی عبادت کیوں نہ کی جائے۔جو اس فانی حیات کا مالک وخالق ہے۔وہ گردش دوران سے گھبراتی نہیں بلکہ وہ جستجو حیات کو بھی رب کی رضا سے باندھ لیتی ہیں۔وہ اپنی زندگی کے بے رفو زخموں کی نمائش نہیں کرتیں بلکہ اپنی حیات کا سارا سفر رب دو جہاں کے سپرد کر دیتی ہیں۔وہ رب کائنات کی بارگاہ میں چشم تر لے کر آبرو حیات کی دعا کرتے ہیں۔کہ اُنہیں پروردگار کے ہاں شرف قبولیت ملتا ہے۔تو اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی۔

آپ کے ہیں روبرو میں اور میری زندگی
جلوۂ صد آرزو میں اور میری زندگی

آپ ہی ہیں بزم آرا اور بزم ناز
پھر رہے ہیں کوبکو میں اور میری زندگی

گردش دوراں سے ہیں دست وگریباں دیر سے
صورت جام وسبو ، میں اور میری زندگی

ہم وفا کی آرزو میں دربدر پھرتے ہیں
ہیں سراپا جستجو ، میں اور میری زندگی

آسمان کے چاند کیا تجھ کو بتاؤں حال راز
زخم دل ہیں بے رفو میں اور میری زندگی

زندگی کا قافلہ، دشت تپاں میں ہے رواں
سر بسر جوش نمو ، میں اور میری زندگی

موسم ہجراں سے ہے شاہین اس دل کی بہار
چشم تر کی آبرو ، میں اور میری زندگی

فرائض محبت کی ادائیگی سے سرشار نجمہ شاہین جب حق کے حضور حاضری دیتی ہیں۔تو وہ بندگی کے سارے مراحل طے کرنے کے بعد اپنی حاضری کو معتبر بنانا چاہتی ہیں۔
ان کی نظم:

''مجھے فرائض محبت سے آزاد کردے''
اللہ سے

بہت وہ رب کائنات سے چاہت کا اظہار اس طرح کرتی ہیں کہ وہ دنیاوی محبتیں قربان کر دینا چاہتی ہیں۔وہ بندگی کا قرینہ چاہتی ہیں کہ وہ جب رب کے حضور حاضر ہوں تو معبود برحق ان کی شجدہ ریز پیشانی کو شرف قبولیت بخشے اور ان کا دل دنیا کی محبت سے آزاد

کر کے رب سچے کے عشق میں سرشاری کا درجہ انہیں مل جائے۔ دنیاوی خداؤں کے دیئے گئے زخم وہ ذاتِ حق کے مرہم سے مندمل کرنا چاہتی ہیں۔

میں حاضر ہوں
مرے مالک، مرے خالق
سربسجود ہوں معبود مرے
اپنے سجدہ ریز کو آج شاد کر دے
مرا دل اپنی معبودیت سے آباد کر دے
دنیا کی محبت سے مجھ کو آزاد کر دے

وہ اپنے رب کو مسیحا سمجھتی ہیں جو ہر دم کارِ مسیحائی میں مصروفِ عمل ہیں۔ اب وہ کسی غیر اللہ کو دل میں جگہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔

عمر بھر غیر رہا ، پل کو بھی اپنا نہ ہوا
اے خدا! غیر کو کیوں دل میں جگہ دیتا ہے

موم کر دیتا ہے شاہین یہ پتھر دل کو
عشق انسان کو معبود بنا دیتا ہے

اب نجمہ شاہین کھوسہ نئے منظر اور نئے اُفق تلاش کر رہی ہیں وہ شہرِ خواب و خیال کے بلاوے نظر انداز کر رہی ہیں اور اب انہیں محسوس ہوتا ہے۔

میں اپنے آنگن کو دے رہی ہوں نئے اُجالے
وہ میری راہوں میں پھول کلیاں بچھا رہا ہے

میں شامِ غربت میں ٹمٹماتا دیا ہوں شاہین
وہ تیز جھونکوں کے ساتھ مجھ کو بچا رہا ہے

نجمہ شاہین کھوسہ اپنے دل میں جب دھونی جلا کر دیدارِ کعبہ کی سعادت تک حاصل کر لیتی ہیں۔ اور اپنے پاک خدا سے یوں مخاطب ہوتی ہیں۔

اے میرے پاک خدا
آج ہی تو نے مجھے مکمل کیا
تو نے مجھے خاک سے اُٹھا کر آسمان کا ستارہ کیا
سجدہ ریز ہوں آج آنکھوں نے جو نظارہ کیا
آج میں کو یہیں سپردِ زمین کر دے
یا کر قبول دعا اپنے شہر کا مکیں کر دے
مجھ کو باندی بنا، مجھ کو غلام کر
مگر مجھ کو واپس نہ بھیج
اُس ادھورے تڑپتے جہاں میں
جہاں نفرتوں اور منافقتوں کا پہرہ ہے بس
جہاں چہرے کے پیچھے یک اور چہرہ ہے بس
مجھے جو تو نے اپنا پیار دیا
میری زندگی کو سولہ سنگھار دیا
میلے من کو میرے تو نے نکھار دیا
اس محبت کے صدقے! مجھ سے یہ محبت نہ چھین
دنیا کی نفرتوں میں یہ سچی اُلفت نہ چھین
اپنے محبوب کے صدقے مجھے کر دے اس خاکِ پاک کا مکیں
چاہے اب زندہ رہوں یا مر جاؤں میں
بس تیرے در کا ہی دیدار پاؤں میں

نجمہ شاہین کھوسہ جب جب الٰہی سے سرشار ہوتی ہیں تو کبھی رب کا نام دیتی ہیں

کبھی پیا کہتی ہیں اور کبھی سائیاں کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔

میرا دل تیرا جہاں ہے سائیاں

تو ہی میرا مولا ہے، تو آج کہاں ہے سائیاں
کیسی دور جب میرا دل تیرا جہاں ہے سائیاں

وہ میری تقدیر تو جانے کب سے نوحہ کناں تھی
یہ میری تصویر بھی تجھ سے نوحہ کناں ہے سائیاں

اے چارہ گر میں تجھ کو بھلا کیسے یقین دلاؤں
تجھ سے ہی منسوب یقین اور میرا گمان ہے سائیاں

جب میری تخلیق میں تیرا دست ہنر ہی ہے بس
پھر بھی میری منزل کیوں بے نام ونشان ہے سائیاں

نور ترا جب رقصاں چاروں جانب ہجر کی شب میں
پھر بھی میری آنکھ میں کیوں اتنا دھواں ہے سائیاں

میں اس دل کے ٹکڑے چنتی پھرتی ہوں کیوں شاہین
تیری دنیا میں تو چاہت بہت گراں ہے سائیاں

کبھی نجمہ شاہین اللہ کے سامنے اشک ندامت بہاتی ہے اور در پہ گریاں کناں ہوتی ہیں۔ تب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ زمین آسمان دیر اور حرم سبھی نالہ وفغاں وکر رہے ہیں اور اپنے رب سے ''اماں'' کے خواستگار ہیں۔

اللہ ہم شرمندہ ہیں

تیرے در آج یہ گریہ کناں ہے زندگی
میرے مولا اب تو بس محوِ فغاں ہے زندگی

زمین رو رہی ہے اپنی بے بسی پہ آج کل
کہ دیر اور حرم میں بھی اب فغاں ہے زندگی

اک ردائے خوف میں لپٹے ہوئے سب مکاں
مکیں سہم کے پوچھتے تو کہاں ہے زندگی

تو اپنے دل پہ ہاتھ رکھ اور اے بشر مجھ کو بتا
کہ اب سجود میں تجھے یہ کیوں گراں ہے زندگی

خدائے لم یزل کی رحمتوں سے مت ہو بدگماں
یقین کی آنکھ سے پرے تو بس گماں ہے زندگی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ عشق مسلک کے لوگوں کی رمز آشنا ہونا چاہتی ہیں اور اس کی الفت میں منزلیں چاہتی ہیں جن کی راہیں بھی آسودہ کر دیں۔ انہیں حدود قیود کی پروا نہیں کہ ان کا دل عشق اپنی روح میں پاتی ہیں۔ وہ پھول سے بچھڑی ایسی خوشبو ہیں جن کی پتیاں جا بجا ذات حق کی تلاش میں سرگرداں اور بکھری ہوئی ہیں۔ وہ معاملات حق میں خود کو حقیر سمجھتی ہیں اور در دولت کی فقیر بن جانا چاہتی ہیں۔ اور قریاں جان میں ایک سائبان کی متلاشی ہیں۔ اب ان کی آرزویں خاک ہو چکیں۔ بس وہ ازل ابد کے بھید بھرے اسرار جاننا چاہتی ہیں وہ ایک ایسا شہر دل آباد کرنے کی آرزومند ہیں کہ جہاں حُب کی بشارتیں اور اندر

کی بصارتیں نصیب ہوں اور من مندر میں چراغ حق جلانے کی آرزو انہیں مسترب رکھتی ہیں۔

یہ عشق مسلک کے لوگ ہیں، انہیں رمز سارے سکھا پیا!
یہ جنون عشق کی داستان ، انہیں حرف حرف سنا پیا!

مرے چارہ گر، میں ہوں دربدر، میں تو تھک گئی، ہے عجب سفر
مری بے نشاں سی ہیں منزلیں ، مجھے راستہ بھی دکھا پیا!

نہ حدود میں ، نہ قیود میں ، مرا دل ترے ہی وجود میں
یہ سجود کا حسین پیرہن میری روح پر تو سجا پیا

میں تو آس تھی، میں تو پیاس تھی، کسی پھول کی میں بس تھی
مری پتیاں گریں جابجا ، انہیں شاخ پر تو سجا پیا!

میں فقیر ہوں، میں حقیر ہوں، کسی خواب کی نہ اسیر ہوں
میں عزیز ہوں تو تجھے ہی بس ، سو عزیز تر ہی بنا پیا!

میں فلک سے آئی خطا مری، اسے ڈھونڈنا ہے وفا مری
یہ جفا کی جو ہیں حق یقیں ، مری آنکھ کو وہ دکھا پیا!

مرے آسمان مرے سائیاں، تو ہی رازداں، تو ہی مہرباں
جہاں لامکاں کے ہیں سلسلے، وہی میرا گھر بھی بنا پیا!

یہ جو آرزوؤں کا دیس ہے، یہ جو خاک خاک سا بھیس ہے
جو ازل ابد کا یہ بھید ہے ، اسے بھید ہی میں بتا پیا

یہ قدم قدم پہ بشارتیں ، یہ نظر نظر میں زیارتیں
یہ بصارتیں ، یہ بجھارتیں ، مرے شہر دل کو دکھا پیا!

یہ میرے من میں ہے روشنی ، یہی زندگی یہ بندگی
مری فکر میں ترے ذکر میں جو چراغ ہیں وہ جلا پیا!

جذبہ عشق سے سرشار نجمہ شاہین کبھی عشق کو آنکھ میں جلتے ہوئے اور کبھی دار پہ چڑھتے ہوئے دیکھتی ہیں اور کبھی رگ جاں تک اُترتا ہوا محسوس کرتی ہیں۔

عشق کو آنکھ میں جلتے دیکھا
پھول کو آگ میں کھلتے دیکھا

عشق کے راز نہ پوچھو صاحب
عشق کو دار پہ چڑھتے دیکھا

نجمہ شاہین کھوسہ اپنی نوحہ کناں سوچوں میں تقدیر سے شاکی دکھائی دیتی ہیں اور پکار اُٹھتی ہیں کعہ اے میرے رب تو جو میری شہ رگ سے قریب ہے تو اس وقت کہاں ہے اس قدر قربت اس قدر فاصلہ اور وہ اپنے رب کے قریب تر وہ جانا چاہتی ہیں۔ یقین اور گمان کی ساری حدیں توڑ کر نور حق جو ان کے اندر رقصاں ہے اس کی تپش وہ انہی دل و نگاہ میں محسوس کرتی ہیں کبھی وہ اپنے رب کو سچا سائیں کبھی پیا اور کبھی سائیاں کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔

تو ہی میرا مولا ہے ، تو آج کہاں ہے سائیاں
کیسی دوری جب میرا دل تیرا جہاں ہے سائیاں

وہ میری تقدیر تو جانے کب سے نوحہ کناں تھی
یہ میری تصویر بھی تجھ سے نوحہ کناں ہے سائیاں

اے چارہ گر میں تجھ کو بھلا کیسے یقین دلاؤں
تجھ سے ہی منسوب یقین اور میرا گماں ہے سائیاں

جب میری تخلیق میں تیرا دست ہنر ہی ہے بس
پھر بھی میری منزل کیوں بے نام ونشان ہے سائیاں

نور ترا جب رقصاں چاروں جانب ہجر کی شب میں
پھر بھی آنکھوں میں کیوں اتنا دھواں ہے سائیاں

میں اس دل کے ٹکڑے چنتی پھرتی ہوں کیوں شاہین
تیری دنیا میں تو چاہت بہت گراں ہے سائیاں

کبھی کبھی وہ بیگانگی ذات کا شکار ہو جاتی ہیں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جہاں ان کا جہاں ہی نہیں ہے انہیں کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔مگر بادل نخواستہ انہیں یہاں رہنا پڑ رہا ہے۔اس زمین پر قیام ان کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔انہیں یہ دھرتی دکھوں کی پروردگار محسوس ہوتی ہے۔کشمکش حیات انہیں بے کل رکھتی ہے۔یہ عزت یہ شہرت یہ مقام اور مرتبہ ان کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے اور وہ آرزو مند ہیں۔
کہ وہ درِ حق کی فقیر بن کے رہ جائیں۔

کہاں پہ رہنا تھا مجھ کو، مگر کہاں پہ رہی
میرا جہاں ہی کب ہے یہ، میں جہاں پہ رہی

بجھے تھے درد ک جو بھی دیئے تھے آنکھوں میں
جہاں پہ درد کا ڈیرہ تھا، میں وہاں پہ رہی

جو شور مجھ میں بپا تھا وہ ختم ہو نہ سکا
کہیں یقین کو کھویا، کہیں گماں پہ رہی

نہ اس میں دوش تھا میرا، نہ اس زمانے کا
حیات موت کی خواہش میں خود سناں پہ رہی

ہزار پردوں میں اس نے چھپا کے بھیجا جسے
وہ خود نمائی کی خواہش میں خود دکاں پہ رہی

کہاں تھا میرا ٹھکانہ سمجھ نہ آیا مجھے
میں لامکاں سے گزری تو کس مکان پہ رہی

میں چپ تھی جب تو کوئی تذکرہ نہیں تھا کہیں
لیا جو نام ترا پھر تو ہر زباں پہ رہی

نجمہ شاہین کھوسہ درد کا بوجھ اُٹھائے ہوئے اور غموں کو سینے پہ سجائے ہوئے رواں دواں ہیں۔کبھی وہ روح اور بدن کے رشتے کے حوالے سے سوچتی ہیں اور کبھی غم حیات سے غم کائنات تک کے بارے میں مستغرق دکھائی دیتی ہیں۔تب اُن پر انسان کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔کبھی انہیں لگتا ہے انسان نے روح کا بوجھ بدن پہ اُٹھایا ہوا ہے۔کبھی وہ وحشتوں کے ستائے لوگوں کا تذکرہ کرتی ہیں لیکن ہر دکھ کا مداوا انہیں سچے سائیں کے سامنے سربسجود

ہونے میں ملتا ہے۔اور بھٹکے ہوئے لوگوں کی منزل انہیں سوئے حرم میں ملتی ہے۔

ہیں اس آسیب کے ہر روپ سے انجان بھی
یہ جو ہیں عشق حقیقت کو بھلائے ہوئے لوگ

وہ منصب عشق سے مالا مال دل و جاں میں ذات حق کا ذکر کرتی ہوئی اس مقام تک جا پہنچتی ہیں کہ جہاں دھمال کی سی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے اور پھر میر رقصم کا نظارہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ہجر سے نڈھال اور ریسال کی آرزو رکھنے والی اپنے عشق میں کمال پیدا کرنا چاہتی ہے جو خیال ربی سے سرشار ہو۔وہ ہر حال رب کی رضا پہ راضی ہیں مگر اک نظرِ کرم کی متمنی بھی ہیں۔وہ راہ سلوک کی منازل طے کرتی کرتی اس مقام تک جہاں پہنچنا چاہتی ہیں کہ جہاں من و تو کی منفریق مت جائے بالکل اس طرح کہ جیسے اقبال نے خودی کی مثال دی تھی۔اقبال کی خودی میں عنانیت نہیں اثبات ہے۔اقبال کے ہاں خدا کی خودی سمندر ہے۔اور انسان کی خودی ایک قطرہ، اگر قطرے کو سمندر میں ڈال دیا جائے تو وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ پائے گا بلکہ خود سمندر ہو جائے گا۔

تو روگ مرا ، تو جوگ مرا
میں ہوگئی تری مثال پیا

زیرہ زیرہ وجود کی کرچیاں چنتی نجمہ شاہین خود کو جوڑنے کے لئے دست دعا بلند کرتی ہیں تاکہ رنج اور غم کا کاسہ ٹوٹ جائے وہ اپنے خالی دامن اور خالی آنکھوں میں مثل سوال کھڑی ہیں تاکہ رب سائیں ان کے جیون کی راہیں سنوار دے۔اور دل جانب منزل موڑ دے۔

کوئی وظیفہ میں کب جانوں ، اپنا من کیا میں پہچانوں
میری منزل تیرا در ہے مت رستے میں چھوڑ وے سائیاں

الجھے لیکھ ہیں میرے سائیاں، درد مجھے ہیں گھیرے سائیاں
جیتے جی میں مر ہی نہ جاؤں، رحمت کو جھنجھوڑ وے سائیاں

اَدھ ادھوری ذات ہے میری، بے تاثیری بات ہے میری
سُن شاہین کی بپتا اب تو، مت اُس کا دل توڑے وے سائیاں

نجمہ شاہین کھوسہ کی حمد یہ شاعری اس حوالے سے معتبر ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور حُب سجدہ ریز ہوتی ہیں تو ان کا صرف تن من ہی نہیں بھیگتا بلکہ ان کے اطراف موجود جمادات و نباتات اور حیات و کائنات سب کے سب محبت کی شیرینی میں گھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔اگر ان کے پہلی شعری مجموعے کا جائزہ لیا جائے تو کبھی وہ پھولوں سے متاثر ہوتی ہیں کبھی جگنو کی ضد کرتی ہیں اور کبھی ماحول کو مشکبو کر دیتی ہیں۔لیکن عمر عزیز کی مختلف مناظر طے کرنے کے بعد ان کا شعری ارتقاء پختگی کی جانب ایک اہم قدم محسوس ہوتا ہے۔فنی حوالے سے ان کا کلام قواعد و عراض کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے اور فکری حوالوں سے ان کی قابلیت اور مشق مطالعہ کے باعث یہ سفر معتبر ٹھہرتا ہے۔یہ پختی خیالات اور فن ہر دو سطح پر قاری محسوس کر سکتا ہے۔پیکر تراشی اب معدور ہو رہی ہے۔ان کے اسلوب کی نئے رنگی اور خیال کی جمالیت نے بڑے شعراء کو بھی متاثر کیا۔جن میں امجد اسلام امجد سرفہرست ہیں۔اب وہ صرف عشق حقیقی کو حمد، نعت اور سلام تک محدود نہیں کرتیں بلکہ ان کی غزل اور نظم میں بھی حقیقی حُب کے امکانات روشن ہیں۔حسنین ساحر کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے۔

''اور شام ٹھہر گئی ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا حال ہی میں منظر عام پر آنے والا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو حمد، نعت، غزلوں، گیتوں پر مشتمل رنگا رنگ خیالات کا عکاس ہے چونکہ ان کی غزل معروضی حالات کا صاف شفاف آئینہ ہے اس لئے اس کے بین السطور خود اپنی زندگی اور معاشرتی اقدار کی سچی اور نہ بولتی تصویر نظر آتی ہیں''۔(۲۱)

نجمہ شاہین کھوسہ کے شعری موضوعات میں محبت، ہجر پیہم اور وصال کی آرزو ملتی ہے غم دوراں جو کہ غم جاوداں بنتا چلا جا رہا تھا۔اس کی تڑپ روحانی موضوعات کی وجہ سے کم ہوئی۔تیسری مجموعے تک آتے آتے نجمہ شاہین کھوسہ کے فن میں نہ صرف پختگی آئی بلکہ

نکھار بھی آیا اور یہیں سے اضطراب اُمید میں ڈھل گیا۔ یاس کو آنکھوں کے پانی نے سراب کیا تب ان کی اندر کے اندھرے بھی جگمگا اُٹھے۔ اب ان کی شاعری داخلیت اور خارجیت کے حسین سنگم پہ کھڑی ہے۔ ہر لمحہ فنکار کے لئے نئے جہان سر کرنے کا ہے۔ اور ہر لمحے کی دین نئے تجربات ہوا کرتے ہیں اور انسان ان ہی تجربات، مشاہدات اور رنگ بدلتی دنیا سے سیکھتا ہے۔ نجمہ شاہین کھوسہ بھی ابھی ایک آنچ کی کمی پر ہیں۔ ابھی ان کا مجاز انہیں کعبہ سے کلیسا کی جانب کھینچ لے جاتا ہے۔ مگر وہ ثابت قدم رہنے کی بھرپور کاوش کر رہی ہیں۔

''اُن کی (ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی) شخصیت اور ماحول کے مخصوص حوالے کم و بیش ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' (۲۲)

مختلف ناقدین اور شعراء نے نجمہ شاہین کے فنی وفکری حوالوں سے بھرپور داد دی ہے۔ اور انہیں ادبی حلقوں میں سراہا بھی گیا ہے۔ ان کی شیریں لب ولہجہ اور مٹھاس کی وجہ سے ان کی شریں بیانیہ مزید متاثر کن ہو گیا ہے۔

''نجمہ جب بات کرتی ہے تو اس کے لہجے کی شیرینی ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے اور جب شعر کہتی ہے۔ تو کلبلاتے، تڑپتے، مچلتے اور سلگتے جذبوں کے اوپر شہد کا چھڑکاؤ کرتی جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کیلئے سکھ اور سکون کی خیرات مانگنے نکلی ہے۔ وہ چاہتی ہے کسی آنکھ میں آنسو نہ ہوں، کوئی مانگ نہ اُجڑے، کوئی دل نہ ٹوٹے، نظام ہستی میں بلندی، پستی ،اونچ نیچ نہ ہو۔'' (۲۳)

نجمہ کی شاعری میں عشق مقدس ہے۔ اس عشق کا نفس سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا شعری پیکر بھی منزہ ہیں۔

سب سرحدیں پھلانگ کر عقل و شعور کی
راہ وفا میں خود سے بھی انجان ہو گئی

جس نے مجھے عطا کیا یہ خامشی کا گیت
اس کی صدا ہی اب مری پہچان ہو گئی

رنگ مجاز کی شاعری کرنے والی نجمہ شاہین حب آشنائے حقیقت ہوتی ہیں۔ تو ان کی زندگی بامعنی اور بامقصد ہو جاتی ہیں اور یہ پہچان میں جلد ہی مقامیت سے آفاقیت تک لے جا سکتی ہوں۔

''ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اب ڈیرہ غازی خان میں ہی نہیں اپنے پورے وسیب کی پہچان بن چکی ہیں۔'' (۲۵)

نجمہ کی شاعری میں چھوٹے چھوٹے موضوعات اور عام فہم باتیں خاص انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ پھول، خوشبو اور تارہ کی باتیں کرنے والی شاعرہ کے ہاں وہ مقام بھی آتا ہے جب شام ٹھہر جاتی ہے۔ اُن کی غزل بعض مقامات پر کلاسیکیت سے مصحافیہ کرتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی دور جدید کے تقاضوں سے ہی ان کی شاعی ہم آہنگ ہے۔ کبھی کبھار تو ان کا آب گینے جیسا دل ٹوٹنے، بکھرنے لگتا ہے اور وہ خود کہہ دیتی ہیں۔

''اپنی اور غیروں کے ان زخموں کے نام جو جلا بخشتے ہیں اور قلم کی سیاہی بن کر لفظوں کی صورت میں کاغذ پر اترتے ہیں اور شاعری بنتے ہیں اور اس واحد لاشریک کے نام جس کا عشق ہی اصل عشق ہے، سچا اور کھرا عشق۔'' (۲۶)

مری اُجڑی لمبی رات سئیں
کب بدلیں گے حالات سئیں

مرا عشق ہی مذہب مسلک ہے
اور عشق ہے تیری ذات سئیں

ہمیں پھر سے عطا ہو سرفرازی یارسول اللہؐ
جوان جذبوں میں ہو روحِ مجازی یارسول اللہؐ

ہمیں گھیرا ہوا ہے دشمنوں نے چار جانب
کہاں ہیں ملت بیضا کے غازی یارسول اللہؐ

بنام شاہ شہیداں ، سلام کیا لکھوں
حقیر لفظ ہیں مدحِ ایام کیا لکھوں

دہک رہے ہیں ہر اک سمت دھوپ کے شعلے
مسافرانِ وفا کا قیام کیا لکھوں

نجمہ شاہین کی رنگِ حقیقی میں ڈوبی ہوئی شاعری کا بنیادی موضوع عشق ہے۔وہ اپنے جذبوں کی تطہیر صوفیانہ رنگ میں کرتی ہیں۔اور وہاں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ جہاں من وتو کی تفریق مٹ جائے۔

’’ان کی (ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ) کی کچھ نظمیں یقیناً بڑی نظمیں ہیں جنہیں سراہا جانا چاہیے۔محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہےاس میں صوفیاہ عشق کی آسماں بدست بلندی سے لے کر تعشق اور ہوس کی تحت السرا تک شعراء نےطبع آزمائی کی ہے۔نجمہ شاہین کھوسہ کی نظموں میں یہ جذبہ ان دو بےنہایت حدود کے درمیان اس سطحِ مرتفع پر قائم ہے۔جسے ہم ’’من وتو‘‘ میں ’’من‘‘ تو یقیناً شاعرہ کا واحد متکلم ہے۔وہ خود ہے یا اس کی انا ہے لیکن ’’تو‘‘ محبوب بھی ہوسکتا ہے، دوست بھی ہوسکتا ہے، نامہرباں آسماں بھی ہوسکتا ہے۔اور ظالم حاکم بھی‘‘(۳۰)

نجمہ کی شاعری میں عشق کی سچائی اور فن کی گہرائی انہیں خوب گرفت عطا کرتی ہے۔جو اُردو شاعرات کو بہت کم نصیب ہوئی۔

زمیں ملے کہیں ہمیں ، کہیں تو آسماں ملے
دکھوں کی دھوپ میں شجر کوئی تو مہربان ملے

ترے فراق میں جیے ترے فراق میں مرے
چلو یہ خواب ہی سہی وصال کا گماں ملے

اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میٹھی زبان رکھنے والے مستند اسلوب کی حامل اور متنوع موضوعات پر طبع آزمائی کرنے والی یہ شاعرہ جب روحانیت سے ہم کلام ہوتی ہیں تو انہیں تمام آسائشاتِ حیات ہیچ محسوس ہوتی ہیں۔ان کا آخری مجموعہ ابھی زیرِ طبع ہے۔مگر مسودے کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ صوفیانہ طرزِ احساس اس مجموعے کی شان ہے۔یہ وہ مجموعہ ہے۔کہ جو شاعرہ کو منفرد اور حقیقی پہچان عطا کردے گا۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، خزینہ علم وادب کریم گیٹ اُردو بازار، لاہور، 2010ء، ص:19 تا 20

2۔ ایضاً ص:21

3۔ ایضاً ص:21 تا 22

4۔ ایضاً ص:23

5۔ ایضاً ص:24 تا 25

6۔ ایضاً ص:90

7۔ ایضاً ص:113

8۔ ایضاً ص:113

9۔ ایضاً ص:116

10۔ ایضاً ص:117

11۔ ایضاً ص:171 تا 172

12۔ غیر مطبوعہ کلام، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (واٹس ایپ پر ارسال کردہ تحریر جو ضمیمہ جات میں شامل کی جائے گی) 16 اکتوبر 2020ء، 5:50PM

13۔ غیر مطبوعہ کلام، کرونا کے حوالے سے، ''اللہ ہم شرمندہ ہیں'' (واٹس ایپ پر ارسال کردہ تحریر جو ضمیمہ جات میں شامل کی جائیگی)، 2 اگست 2020ء 11:35AM

14۔ غیر مطبوعہ کلام، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر (واٹس ایپ پر ارساد کردہ تحریر جو ضمیمہ جات میں شامل کی جائے گی) 28 اگست 2020ء، 8:10PM

15۔ ایضاً، 4 ستمبر 2020ء، 7:28PM

16۔ ایضاً، 12 ستمبر 2020ء، 8:03PM

17۔ ایضاً، 14 اکتوبر 2020ء، 7:35PM

18۔ ملاقات، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، 24 اکتوبر 2020ء

19۔ ڈاکٹر صاحبہ کی زیر طبع کتاب سے ایک شعر جو انہوں نے اپنی قلم سے تحریر کر دیا۔

20۔ غیر مطبوعہ کلام، نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر (واٹس ایپ پر ارسال کردہ تحریر) 14 اگست 2020ء، 1:03PM

21۔ حسنین ساحر، رائے، مشمولہ فیملی میگزین، لاہور، 22 جون 2008ء، ادبی صفحہ

22۔ امجد اسلام امجد، ''اور شام ٹھہر گئی'' (دیباچہ) مشمولہ ''اور شام ٹھہر گئی'' ص:15 تا 16

23۔ بشریٰ رحمٰن، حنائی رنگ، غنائی رنگ (دیباچہ) مشمولہ ''اور شام ٹھہر گئی''، ص:18

24۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''اور شام ٹھہر گئی''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1203ء ص:126

25۔ رضی الدین رضی، شام کیوں ٹھہرتی ہے (دیباچہ) مشمولہ ''اور شام ٹھہر گئی''، ص: 25 تا 26

26۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول، خوشبو اور تارہ''، الحمد پبلی کیشنز لاہور، 2016ء پس ورق

27۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول خوشبو اور تارہ''، الحمد پبلی کیشنز لاہور، 2016ء ص:15

28۔ ایضاً ص:17

29۔ ایضاً ص:19

30۔ ستیہ پال آنند ڈاکٹر، محبت کی شاعرہ (دیباچہ) مشمولہ ''پھول خوشبو اور تارہ''، ص: 139 تا 140

31۔ نجمہ شاہین کھوسہ ڈاکٹر، ''پھول خوشبو اور تارہ''، الحمد پبلی کیشنز لاہور، 2016ء، ص:76

کتابیات

1۔ ''پھول سے بچھڑی خوشبو''، جان کلینک بلاک 48 کنگن روڈ ڈیرہ غازی خان، 2007ء
2۔ ''میں آنکھیں بند رکھتی ہوں''،خزینہ علم وادب، لاہور، 2010ء
3۔ ''اور شام ٹھہر گئی''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2013ء
4۔ ''پھول خوشبو اور تارہ''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور 2012ء
5۔ محبوب عالم محبوب ڈاکٹر، تاریخ نعت کے تناظر میں ڈیرہ غازی میں نعت نگاری اور تنقیدِ نعت کی روایت صائم پبلشرز لاہور 1971ء
6۔ رضا ٹوانہ، گیسوئے ریگ زار (مرتبہ) عبدالحمید راحی، مکتبہ بشارت مظفر گڑھ 1971ء
7۔ رضا ٹوانہ کربِ سحر 1985ء
8۔ رضا ٹوانہ، سورج سے بغاوت، حماد پبلشرز لاہور 2002ء
9۔ رضا ٹوانہ، چادر زینبؑ، ایم۔اے پرنٹرز چکوال 2004ء
10۔ رضا ٹوانہ، انتظار مت کر، آفتاب پبلشرز لاہور 2005ء
11۔ رضا ٹوانہ، مقتل میں چاندنی، سیدان پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان 2007ء
12۔ سجاد حیدر پرویز ڈاکٹر، تاریخ مظفر گڑھ س۔ن
13۔ ملک خیر محمد بدھ، تاریخ مظفر گڑھ س۔ن
14۔ انور جمال، نصف النہار، بیکن بکس ملتان 1991ء
15۔ انور سعید ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریک، انجمن ترقی اردو پاکستان 1989ء
16۔ تاباں عابدی، پیکر احساس، مکتبہ اہل قلم ملتان 1982ء

17۔ تبسم کشمیری ڈاکٹر، جدید اُردو شاعری علامت نگاری سنگ میل پبلی کیشنز س۔ن
18۔ جزیں صدیقی، ففس رنگ، مکتبہ جدید پریس لاہور 1988ء
19۔ حسین سحر، تخاطب، کتاب نگر ملتان، 1990ء
20۔ رضی الدین رضی، دن بدلیں گے جاناں، کتاب نگر ملتان 1995ء
21۔ روبینہ ترین ڈاکٹر، ملتان کی ادبی تہذیب زندگی میں صوفیائے اکرام کا حصہ، بیکن ہاؤس ملتان 1989ء
22۔ زوار حسین، شاخ ویرانہ دل، مکتبہ شجر ملتان 1985ء
23۔ سید عبداللہ ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، مکتبہ خیابان ادب لاہور س۔ن
24۔ گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز 1994ء
25۔ روبینہ ترین ڈاکٹر، تاریخ ادبیات ملتان، مقتدرہ قومی زبان پاکستان 2012ء
26۔ فتح محمد ملک، تعقبات، سنگ میل پبلی کیشنز 1991ء
27۔ تبسم کشمیری ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز 1991ء
28۔ افسر صدیقی امروہوی، مصحفی حیات وکلام، مکتبہ نیا دور 1975ء
29۔ سیماب اکبر آبادی، دستور الاصلاح، ناشر پرچم حسن علی آفنڈی روڈ، تیسرا ایڈیشن 1959ء
30۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، کتابیان لاہور 1967ء
31۔ حنیف کیفی ڈاکٹر، اردو نظم میں نظم مرا اردو نظم آزاد، الوقار پبلی کیشنز، لاہور 1995ء
32۔ شمیم حیدر ترمذی ڈاکٹر، ادب آثار، کارون ادب لاہور 1992ء
33۔ شوکت سبزواری ڈاکٹر، نئی اور پرانی قدریں، کراچی 1961ء
34۔ شیر افضل جعفری، ہمدم دیرینہ، یاراں دا یار، مکتبہ عالیہ 1997ء
35۔ اصغر حسین خان نظیر، تذکرہ شعرائے اُردو، بار اول، عشرت پبلشنگ ہاؤس 1953ء
36۔ ناصر ملک، لیہ دی تاری، لہراں ادبی بورڈ 2008ء

37۔ ظریف احسن، حرف زار، رضا کمپوزنگ پارلر گلستان جوہر 2015ء
38۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، بار بھتیس 2003ء
39۔ نواز صدیقی، سادگی ہائے تمنا، مثال پبلشنگ ہاؤس 2004ء
40۔ مہر محمد عاجز باروی، خوشبوئے فکر، ملتان رب نواز پرنٹنگ پریس، 2012ء
41۔ شعیب جاذب، پیاسی چھاگل پیارے لوگ، ڈیرہ غازی خان، ناصر پبلی کیشنز 2005ء
42۔ سعید احمد سعید، گردش دوراں، ایبٹ آبادی ندیم اے زیڈ گرافکس 2006ء
43۔ محمد رمضان زاہد، رہ نورد شوق، اظہار سنز پرنٹرز لاہور، 2004ء
44۔ شمیم حیدری ترمذی ڈاکٹر، ادب آثار، کاروان ادب لاہور 1996ء
45۔ ضیاء شبنمی، تشبیب، باراول کاروان ادب ملتان 1980ء
46۔ ضیاء شبنمی، تشبیب، باردوم الحمد پبلی کیشنز لاہور 1997ء
47۔ طاہر تونسوی ڈاکٹر، ملتان میں اردو، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1984ء
48۔ طاہر تونسوی ڈاکٹر، تذکرہ کتابوں کا، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 1996ء
49۔ طاہر تونسوی ڈاکٹر، ہم سخن فہم ہیں، یونیورسل بکس لاہور 1989ء
50۔ طاہر تونسوی ڈاکٹر، لمحہ موجود ادب اور ادیب مقبول اکیڈمی لاہور 1992ء
51۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر، غزل اور مطالعہ غزل، انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان س۔ن
52۔ جمیلی جالبی ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، طبع ہفتم نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد 2013ء
53۔ مظفر احمد، غالب، غالب الکریم کمپوزرز 2001ء
54۔ عرش صدیقی ڈاکٹر، محاکمات تنقیدی مقالات، سارنگ پبلی کیشنز جون 1996ء
55۔ سید عابد علی پروفیسر، اصول انتقاد ادبیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1997ء
56۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1991ء

57۔ اے۔ بی۔ اشرف ڈاکٹر، مسائل ادب، سنگ میل پبلی کیشنز 1995ء
58۔ سہیل عباس ڈاکٹر، تفہیمی تنقید، مثال پبلشرز، دسمبر 2009ء
59۔ مزمل حسین ڈاکٹر، ادبی مطالعات، مثال پبلشرز 2010ء
60۔ قاضی افضال حسین، تحریر احساس تنقید، مثال پبلشرز 2011ء
61۔ نجیب جمال ڈاکٹر، نگاہ (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ) بیکن بکس 1994ء
62۔ ابن عامی، مسائل ادب اور اسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز 1994ء
63۔ عارف ملک، تاریخ علی پور، جھوک پبلشرز 2010ء
64۔ عبدالعزیز نادر، گفتگوئے کلیم، علم وعرفان پبلشرز 2002ء
65۔ مظہر قلندری، پرندے ہجرت کر رہے ہیں، صفدر منیر پرنٹنگ پریس 1993ء
66۔ اختر انصار دہلوی، غزل اردو درس غزل، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1959ء
67۔ ارشد ملتان، شبات، بزم ثقافت ملتان 1983ء
68۔ اسلم انصاری، خواب وآگہی، کاروان ادب ملتان، 1983ء
69۔ اظہر سلیم مجوکہ، کتاب دوستاں، بیکن بکس ملتان، 1992ء
70۔ اظہر علی، خواب کہاں مرجھاتے ہیں، بک اوشن میٹر پلازہ ملتان، 1995ء
71۔ اقبال راشد، نظر انداز، کتاب نگر ملتان 1990ء
72۔ امتیاز بلوچ، حاصل مطالعہ، بیکن بکس ملتان 1991ء
73۔ طاہر تونسوی ڈاکٹر، ملتان میں اُردو شاعری سنگ میل پبلی کیشنز 1984ء
74۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر، جدید شاعری، اردو دنیا، کراچی 1961ء
75۔ عبدالقادر سروری، جدید اردو شاعری، کتاب منزل لاہور 1946ء
76۔ عزیز حامد مدنی، جدید اُردو شاعری، انجمن ترقی اُردو پاکستان 1990ء
77۔ وزیر آغا ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مکتبہ عالیہ لاہور 1993ء
78۔ پرتاب گنوری رانا، تذکرہ شعرائے ہریانہ، نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ 1983ء

79۔ تنویر شاہد محمد زئی، مٹی ہجرت لکھتی ہے، ملتان، سرائیکی ادبی ایوارڈ 2014ء
80۔ جعفر بلوچ، آیات ادب، لاہور، سلمان آرٹ پریس 1988ء
81۔ مختار ظفر ڈاکٹر، ملتان کی شعری روایت، بیکن بکس 2014ء
82۔ طاہر تونسوی ڈاکٹر، شجر سایہ دار صحرا کا، مکتبہ عالیہ 1977ء